إنّ اللهَ يرفعُ بهذا الكتابِ أقواماً ويضعُ بهِ آخرين (صحیح مسلم)

ترجمان القرآن

یعنی

قرآنِ حکیم کے مطالب اردو زبان میں

ضروری تفسیر کے ساتھ

مع

تفسیر سورۂ فاتحہ

از

مولانا ابوالکلام آزاد

ادبیات لاہور

قیمت ——— ۱۴۰/= روپے

ISBN 969 442 133 0

اِنتساب

غالباً دسمبر ۱۹۱۶ء کا واقعہ ہے کہ میں رانچی میں نظر بند تھا۔ عشاء کی نماز سے فارغ ہو کر مسجد سے نکلا تو مجھے محسوس ہوا، کوئی شخص پیچھے آرہا ہے۔ مڑ کے دیکھا تو ایک شخص کمل اوڑھے کھڑا تھا:

"آپ مجھ سے کچھ کہنا چاہتے ہیں؟"

"ہاں جناب، میں بہت دور سے آیا ہوں"

"کہاں سے؟"

"سرحد پار سے"

"یہاں کب پہنچے؟"

"آج شام کو پہنچا۔ میں بہت غریب آدمی ہوں۔ قندھار سے پیدل چل کر کوئٹہ پہنچا۔ وہاں چند ہم وطن سوداگر مل گئے تھے۔ اُنھوں نے نوکر رکھ لیا۔ اور آگرہ پہنچا دیا۔ آگرہ سے یہاں تک پیدل چل کر آیا ہوں"

"افسوس تم نے اتنی مصیبت کیوں برداشت کی؟"

"اِس لیے کہ آپ سے قرآنِ مجید کے بعض مقامات سمجھ لوں۔ میں نے الہلال اور البلاغ کا ایک ایک حرف پڑھا ہے"

یہ شخص چند دنوں تک ٹھہرا، اور پھر یکایک واپس چلا گیا۔ وہ چلتے وقت اِس لیے نہیں ملا کہ اُسے اندیشہ تھا، میں اُسے واپسی کے مصارف کے لیے روپیہ دوں گا، اور وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کا بار مجھ پر ڈالے۔ اُس نے یقیناً واپسی میں بھی مسافت کا بڑا حصّہ پیدل طے کیا ہوگا۔

مجھے اُس کا نام یاد نہیں۔ مجھے یہ بھی نہیں معلوم کہ وہ زندہ ہے یا نہیں۔ لیکن اگر میرے حافظہ نے کوتاہی نہ کی ہوتی، تو میں یہ کتاب اُس کے نام سے منسوب کرتا۔

۱۲ ستمبر ۱۹۳۱ء

کلکتہ

ابوالکلام

فہرست مندرجات

ترجمان القرآن جلد اوّل

دیباچہ

امّ القرآن یعنی تفسیر سورۂ فاتحہ

سورۂ فاتحہ (۱)

صفحہ ۲۲۶

سورۂ بقرہ (۲)

صفحہ ۲۲۷

کرلے۔ نہ تو اس سے روکنا چاہیے، نہ اُس کی پسند کے خلاف اُس
پر زور ڈالنا چاہیے۔ چونکہ اس بارے میں مردوں کی خود پسندیوں
سے مخالفت کا اندیشہ تھا، اس لیے خصوصیت کے ساتھ زور
دیا گیا کہ ذٰلك یوعظ به من كان منكم یؤمن باللّٰه" ٢٨٦
(١١) طلاق کی صورت میں ایک اہم سوال شیر خوار بچوں کی پرورش
کا تھا۔ بڑا محل نقصان پہنچنے کا ماں تھی کہ طلاق کی وجہ سے جُدا
ہو گئی تھی، مگر محبت مادری کی وجہ سے مجبور تھی کہ بچے کی پرورش
کرے۔ پس فرمایا، دودھ پلانے تک ماں کا خرچ بچے کے باپ
کے ذمّے ہے۔ 〃

دُودھ پلانے کی مدت دُو برس ہے۔ 〃

اس بارے میں اصل یہ ہے کہ نہ تو بچے کی وجہ سے ماں کو
نقصان پہنچایا جائے، نہ باپ کو۔

نیز تمام معاملات میں اصل یہ ہے کہ کسی انسان پر اُس 〃
کی وسعت سے زیادہ خرچ کا بار نہیں ڈالا جاسکتا۔ 〃

بیوہ عورتوں کے متعلق احکام، اور اُن مفاسد کی اصلاح
جو اس بارے میں پیدا ہو گئے تھے: ٢٨٧

(١) وفات کی عدت چار مہینے دس دن مقرر کر کے اُن
مفاسد کی اصلاح کر دی جو افراط و تفریط کا موجب ہوئے تھے۔ 〃

(٢) اگر عورت عدت کے بعد دوسرا نکاح کرنا چاہے، تو اُسے
نہیں روکنا چاہیے۔ نہ اس بات کا خواہشمند ہونا چاہیے کہ عدت
کی مقررہ میعاد سے زیادہ سوگ منائے۔ 〃

(٣) نکاح کے بارے میں عورت سے جو کچھ بات چیت یا نامہ و پیام
ہو، علانیہ اور دستور کے مطابق ہونا چاہیے۔ 〃

(٤) جب تک عدت کی میعاد نہ گزر لے، نکاح کا قول و
قرار نہ کرو۔ 〃

مہر، اور عورتوں کے مالی حقوق کا تحفظ۔ ٢٨٨

اگر نکاح کے بعد شوہر اور بیوی میں کوئی تعلق نہ ہوا ہو، اور
شوہر طلاق دیدے، تو اس صورت میں مہر کے احکام: 〃

(١) اگر مہر کی مقدار مُعیّن نہ ہوئی ہو، تو مرد کو چاہیے، اپنی حیثیت
کے مطابق سلوک کرے۔

(٢) اگر مُعیّن ہو تو آدھا مہر عورت کو ملنا چاہیے۔ اگر مرد اس
سے زیادہ دے سکے، تو یہ تقویٰ و فضیلت کی بات ہوگی۔ 〃

(٣) نکاح کے معاملہ میں مرد کا ہاتھ عورت سے زیادہ قوی ہے
پس عفو و بخشش بھی اُسی کی طرف سے زیادہ ہونی چاہیے۔ 〃
آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ احسان اور بھلائی کرنے

کی کوشش کرو۔ ٢٨٨

لیکن انسان جو خواہشوں کا بندہ اور غرض پرستیوں کی
مخلوق ہے، کیونکر ایسی اخلاقی طاقت پیدا کر لے سکتا ہے کہ
ازدواجی زندگی کی ان آزمائشوں میں پورا اُترے؟ 〃

اس کی راہ صرف یہ ہے کہ خدا پرستی کی سچی رُوح اپنے اندر
پیدا کرو! ٢٨٩

اگر شوہر نے وصیت کر دی ہو کہ ایک برس تک عورت
اُس کے گھر میں رہے (یعنے اُس کا سوگ منائے جیسا کہ اہل عرب
میں دستور تھا) تو اب ایسی وصیت واجب التعمیل نہیں۔ اگر 〃
عورت چار مہینے دس دن کے بعد دوسرا نکاح کرنا چاہے، تو 〃
کسی ایسی وصیت کی بنا پر اُسے روکا نہیں جاسکتا۔ 〃

نکاح و طلاق کا بیان ختم کرتے ہوئے، مطلقہ عورتوں کے
ساتھ احسان و سلوک کا مکرر حکم تاکہ اس معاملہ کی اہمیت 〃
زیادہ سے زیادہ واضح ہو جائے۔ 〃

سلسلۂ بیان پھر اُسی طرف پھرتا ہے، جہاں سے نکاح و
طلاق کا بیان شروع ہو، تھا۔ یعنے جہاد کے احکام و مصالح کی طرف۔

جو جماعت موت سے ڈرتی ہے، وہ کبھی زندگی کی کامرانیاں
حاصل نہیں کر سکتی۔ ٢٩٠

بنی اسرائیل کے ایک گروہ کی عبرت انگیز سرگزشت جس
نے باوجود کثیر التعداد ہونے کے جہاد سے اعراض کیا تھا۔ 〃

راہِ جہاد میں مال خرچ کرنا، اللہ کو قرض دینا ہے!

طالوت کی سرگزشت، اور قوموں کے ضعف و قوت اور
فتح و ہزیمت کے بعض اہم حقائق:

(١) جس گروہ میں صبر و استقامت کی رُوح نہیں ہوتی،
اُس میں بسا اوقات سعی و عمل کے ولولے پیدا ہو جاتے ہیں،
لیکن جب آزمائش کا وقت آتا ہے، تو بہت کم نکلتے ہیں
جو ثابت قدم ہوتے ہیں۔ ٢٩١

(٢) حکومت و قیادت کی جس میں صلاحیت ہوتی ہے وہی
اُس کا اہل ہوتا ہے، اگرچہ مال و دولت اور جاہ و حشم سے محروم ہو۔ 〃

(٣) صلاحیت کے لیے اصلی چیز علم اور جسم کی قوت ہے۔ یعنے
دماغی اور جسمانی استعداد 〃

(٤) جو شخص سردار مقرر ہو جائے۔ جماعت کو چاہیے، سچے دل
سے اُس کی اطاعت کرے۔ اگر ایک جماعت میں اطاعت نہیں
ہے، تو وہ کبھی زندگی کی کشاکش میں کامیاب نہیں ہو سکتی۔ 〃

(٥) طالوت کا پانی سے روک کر صبر و ثبات اور اطاعت و انقیاد

کا امتحان لینا، جو لوگ ایک گھڑی کی پیاس ضبط نہیں کر سکتے، وہ
میدانِ جنگ کی محنتیں کیونکر برداشت کر سکینگے! ۲۹۲
(۶) کتنی ہی چھوٹی جماعتیں ہیں جو بڑی جماعتوں پر غالب
آجاتی ہیں، اور کتنی ہی بڑی جماعتیں ہیں جو چھوٹی جماعتوں
سے شکست کھا جاتی ہیں۔ فتح و شکست کا دار و مدار جسموں
کی کثرت و قلت پر نہیں ہے۔ دلوں کی قوت پر ہے۔ ۰
اللہ کی مدد اُنہی کو ملتی ہے جو صابر اور ثابت قدم ہوتے ہیں 〃
(۷) یہی دعا وہ ہے جو استعدادِ عمل کے ساتھ ہو۔ ۲۹۳
(۸) اگر جماعتوں اور قوموں میں باہمی کش مکش اور مدافعت
نہ ہوتی، تو دُنیا ظلم و فساد سے بھر جاتی۔ یہ اللہ کا فضل ہے
کہ ایک گروہ کا ظلم، دوسرے گروہ کی مقاومت سے دفع ہوتا
رہتا ہے۔ 〃
(۹) خدا نے مختلف عہدوں میں یکے بعد دیگرے پیغمبر مبعوث کیے
اُنہوں نے لوگوں کو تفرقہ و فساد کی جگہ حق پرستی و یگانگت
کی تعلیم دی۔ اگر لوگ اس تعلیم پر قائم رہتے، تو کبھی باہمی جنگ و
جدال میں مبتلا نہ ہوتے، لیکن اُنہوں نے گروہ بندیاں کر کے
الگ الگ جتھے بنا لیے، اور باہمی جنگ کا وہ بیج بو دیا جو
ہمیشہ پھل لاتا رہتا ہے! 〃
اگر خُدا چاہتا تو انسان کی طبیعت ایسی بنا دیتا کہ اُس
میں نزاع و خلاف کی استعداد ہی نہ ہوتی، لیکن اُس کی
حکمت کا فیصلہ یہ ہوا کہ انسان کو مجبور و مضطر نہ بنائے، ہر
راہ میں چلنے کی قدرت دیدے۔
(۱۰) جب جنگ ناگزیر ہے، تو اس سے غفلت نہ کرو، اور ۲۹۴
بڑی طیاری یہ ہے کہ اس کے لیے اپنا مال خرچ کرو۔ ،
(۱۱) ضمناً اس حقیقت کا اعلان کہ آخرت کی نجات کا تمام تر
دار و مدار ایمان و عمل پر ہے۔ وہاں نہ تو نجات کی خرید و فروخت
ہو سکتی ہے، نہ کسی کی دوستی آشنائی کام دے سکتی ہے، نہ کسی
کی سفارش سے کام نکالا جا سکتا ہے۔ 〃
اس اصل عظیم کا اعلان کہ دین و اعتقاد کے معاملہ میں
جبر و اکراہ جائز نہیں۔ دین کی راہ دل کے اعتقاد و یقین
کی راہ ہے، اور وہ دعوت و موعظت سے پیدا ہو سکتا ہے، نہ کہ
جبر سے۔
(۱) جہاد کے ذکر کے ساتھ یہ ذکر اس لیے کیا گیا، تاکہ واضح ۲۹۵
ہو جائے، جنگ کی اجازت ظلم و تشدد کے انسداد کے لیے
دی گئی ہے، نہ کہ دین کی اشاعت کے لیے۔ دین کی اشاعت

کا ذریعہ ایک ہی ہے، اور وہ دعوت ہے ۲۹۵
(۲) سچائی روشنی ہے۔ اگر تاریکی چھائی ہوئی ہے، تو
صرف اس بات کی ضرورت ہے کہ روشنی نمایاں ہو جائے
اگر روشنی نمایاں ہو گئی، تو پھر روشنی کو روشن دکھانے کے
لیے اور کسی بات کی ضرورت نہیں۔ ۲۹۶
(۳) دعوت کی تاثیر و فتحمندی کی وضاحت کے لیے
حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ایک واقعہ کی طرف اشارہ
وہ مادّی ساز و سامان سے یک قلم محروم تھے، اور وقت کا
سرکش بادشاہ ہر طرح کی طاقتوں سے مسلح تھا۔ لیکن تنِ تنہا ۰
دعوت کا حربہ لے کر کھڑے ہو گئے، اور فتحمند ہوئے! 〃
(۴) ضمناً اس حقیقت کی طرف اشارہ کہ دعوت کی راہ تلقین و ہدایت
کی راہ ہے۔ جدل و خصومت کی راہ نہیں ہے۔ 〃
(۵) بنی اسرائیل کے ایام و وقائع میں سے اس واقعہ کی طرف
اشارہ کہ وقت کے ستمگر شہنشاہوں کے دل بنی اسرائیل کی دعوت
سے مسخر ہو گئے، اور اُن کے مُردہ شہر، مُردہ ہیکل، اور مردہ جماعت
کی دوبارہ زندگی کا سامان ہو گیا! ۲۹۷
(۶) دعوتِ حق سے مُردہ روحوں کا زندہ ہو جانا، اور متوحش
و گمراہ افراد کا تربیت یافتہ جماعت بن جانا، اور اس بارے میں وہ 〃
بصیرت جو حضرت ابراہیم پر واضح کی گئی تھی۔ 〃
جہاد کا بیان ختم ہو گیا۔ اب یہاں احکام کا سلسلہ ایک
دوسرے حکم کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ ۲۹۸
گزشتہ بیانات میں جس قدر احکام دیے گئے ہیں، اُن سب
کی سچی تعمیل جبھی ہو سکتی ہے کہ نیکی کے لیے مال خرچ کرنے کی پوری
استعداد پیدا ہو جائے۔ اس لیے بیان احکام کے بعد، اب
خصوصیت کے ساتھ انفاق فی سبیل اللہ کے مواعظ پر زور
دیا جاتا ہے۔ یہ گویا تمام پچھلے بیانات کے لیے ایک متمم بیان ہے: 〃
(۱) نیکی کے لیے خرچ کرنا، اللہ کے لیے خرچ کرنا ہے۔ اب
دیکھو، کائناتِ خلقت میں خدا کا قانونِ مکافات کیا ہے؟ 〃
تو یہ بات ہر انسان دیکھ رہا ہے، کہ اگر غلہ کا ایک دانہ
زمین کے حوالے کر دیا جائے، تو وہ ایک کے بدلے پورا درخت
واپس کر دیتی ہے!
(۲) البتہ کامیابی کی شرط یہ ہے کہ دانہ خراب نہ ہو، اور زمین
میں ڈالا جائے، پتھر کی چٹان پر پھینک دیا جائے۔ ۲۹۹
(۳) دکھاوے کی خیرات بھی اکارت جاتی ہے، اور جو شخص
نیکی، نیکی کے لیے نہیں، نام و نمود کے لیے کرتا ہے، وہ خدا پر

سچا ایمان نہیں رکھتا۔
(۴) خیرات کی حقیقت واضح کرنے کے لیے کاشتکاری کی
دومثالیں۔ ۲۹۹
(۵) عالم مادی اور عالم معنوی، دونوں کے احکام و قوانین
یکساں ہیں۔ جو بوؤگے اور جس طرح بوؤگے، ویسا ہی اور اُسی
طرح پھل بھی پاؤگے! ۳۰۰
(۶) دکھاوے کی نیکیوں کا رائگاں جانا، اور اُس کی ایک مثال //
(۷) نکمی چیز خیرات کے نام سے محتاجوں کو نہ دو۔ اگر تمہیں کوئی
ایسی چیز دے، تو تم لینا پسند کروگے؟ //
(۸) انسان میں ایسی سمجھ بوجھ کا پیدا ہوجانا کہ اچھائی اور
بُرائی کی راہوں کا شناسا ہوجائے، اُن باتوں میں سے ہے جنہیں
قرآن حکمت سے تعبیر کرتا ہے۔ ۳۰۱
(۹) دکھاوے کی خیرات سے روکا گیا ہے، لیکن اس کا یہ مطلب
نہیں کہ جب تک چوری چھپے خیرات نہ کرسکو، خیرات کرو ہی نہیں
مطلب یہ ہے کہ دل میں اخلاص ہونا چاہیے۔ //
(۱۰) خیرات کرنا، ادائے فرض ہے، اور خود اپنے کو فائدہ پہنچانا ہے۔
ایسا نہ سمجھو کہ دوسروں پر احسان کررہے ہو۔ ۳۰۲
(۱۱) خیرات کا ایک بڑا مصرف، اُن لوگوں کی اعانت ہے
جو دین و ملت کی خدمت کے لیے وقف ہوگئے ہوں۔ صورت
اُن کی بے نیازوں کی ہوتی ہے، مگر حالت حاجتمندوں کی۔ //

(۱۲) بھیک مانگنے والوں کو سب دیتے ہیں، لیکن خوددار ۳۰۲
حاجتمندوں کو کوئی نہیں پوچھتا۔
(۱۳) دینے والوں کو چاہیے، ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر دیں۔
حاجتمندوں کو چاہیئے، سوال کرکے اپنی خودداری و عفت
تاراج نہ کریں۔ //
سُود کی حرمت:
(۱۴) نیکی کی راہ میں خرچ کرنے کی استعداد نشوونما نہیں پاسکتی
تھی اگر خیرات کے حکم کے ساتھ سود لینے کی ممانعت بھی نہ کردی
جاتی جو ٹھیک اُس کی ضد ہے۔
دینِ حق کا مقصد یہ ہے کہ خیرات کا جذبہ بڑھائے، سود کو
مٹائے۔ اگر خیرات کا جذبہ پوری طرح ترقی کرجائے تو سوسائٹی
کا کوئی فرد محتاج نہ رہے۔ ۳۰۳
لین دین کے احکام: چونکہ سود کے ذکر سے لین دین کا معاملہ
چھڑ گیا تھا، اس لیے اُس کے ضروری احکام بھی بیان کردیے گئے
اور اُن مفاسد کی اصلاح کردی جو اس بارے میں پھیلے ہوئے
تھے: //
لین دین کی درستگی کے آٹھ بنیادی اصول۔ ۳۰۴
رہن یعنے گرو رکھ کر قرض لینا۔ ۳۰۶
سورت کا اختتام اور دینِ حق کے عقائد و اعمال کا خلاصہ
سورت کی ابتدا بھی اسی سے ہوئی تھی اختتام بھی اسی پر ہوا۔ ۳۰۶

آلِ عمران

صفحہ ۳۱۲

اللہ "الحیّ" اور "القیوم" ہے۔ حیّ و قیوم ہونے کا مقتضیٰ یہ تھا کہ
انسان کی زندگی و قیام کی تمام احتیاجات مہیا کردے۔ احتیاجات
دو طرح کی ہیں: جسمانی اور روحانی۔
روحانی احتیاجات کے لیے دو چیزیں دی گئیں: الکتاب اور
الفرقان
سنّتِ الٰہی یہ ہے کہ جو لوگ کفر و سرکشی کے ساتھ الکتاب کا
مقابلہ کرتے ہیں، اور فرقان یعنے جوہرِ عقل و تمیز سے کام نہیں لیتے،
اُن کے لیے دنیا میں بھی نامرادی ہوتی ہے، اور آخرت میں عذاب! ۳۱۲
اس اصلِ عظیم کا بیان کہ الکتاب یعنے قرآن کے مطالب کی
دو قسمیں ہیں: محکمات اور متشابہات۔ محکمات اصل و بنیاد
ہیں۔ اس لیے عقلِ انسانی کے لیے صاف صاف اور کھلے احکام
ہیں۔ متشابہات کا تعلق اُن حقائق سے ہے جو ماوراءِ عقلِ انسانی

ہیں، اور انسان اپنے حواس و ادراک سے اُن کی حقیقت معلوم
نہیں کرسکتا۔
جن لوگوں کی سمجھ میں کجی ہے، وہ محکمات کو چھوڑ کر متشابہات
کے پیچھے پڑجاتے ہیں اور اُن کی حقیقت معلوم کرنی چاہتے ہیں لیکن جو
لوگ سمجھ کے سیدھے اور علم میں پکے ہیں، وہ اُن میں کاوش نہیں کرتے
وہ کہتے ہیں جو کچھ کلامِ الٰہی میں ہے، ہمارا اُس پر ایمان ہے۔ ۳۱۳
جن لوگوں نے الکتاب کا معاندانہ مقابلہ کیا ہے، وہ وہی چال
چل رہے ہیں جو حضرت موسیٰ کے مقابلہ میں آلِ فرعون نے اختیار
کی تھی، اور قریب ہے کہ انہیں بھی وہی پیش آئے جو آلِ فرعون کو
پیش آیا تھا: ۳۱۴
جنگِ بدر کا نتیجہ اس معاملہ کی ابتدا تھا، تاہم فیصلہ کن تھا۔
پیروانِ دعوت کو موعظت کہ اپنی وجود بے سروسامانی سے

برداشتہ خاطر نہ ہوں ۳۱۵
ضمناً اس حقیقت کا اظہار کہ خدا نے انسان کی طبیعت و
حالت ایسی ہی بنائی ہے کہ اہل و عیال اور مال و متاع کی فراوانی
میں بڑی وابستگی محسوس کرتا ہے۔ //
متقی انسانوں کے خصائل۔ //
دین الٰہی کی حقیقت یہ ہے کہ خدا کے ٹھہرائے ہوئے قانون
کی اطاعت کی جائے۔ خدا کا ٹھہرایا ہوا قانون کیا ہے؟ میزانِ
عدل کا قیام ہے، جس پر تمام کارخانۂ خلقت چل رہا ہے ۳۱۶
اس حقیقت کی معرفت یوں حاصل ہو سکتی ہے کہ کائناتِ
ہستی کی شہادت پر غور کرو۔
شہادتیں تین ہیں: اللہ کی۔ ملائکہ کی۔ اصحابِ علم کی۔ یہ
تینوں شہادتیں اعلان کرتی ہیں کہ خدا کے سوا کوئی معبود نہیں،
اور اُس نے تمام کارخانۂ ہستی قانونِ عدل پر استوار کیا ہے۔
"الدین" یعنی انسان کے لیے قانونِ اعتقاد و عمل یہی ہے،
اور اسی کا نام "الاسلام" ہے۔ //
پیروانِ مذاہب کا تفرقہ و اختلاف اس لیے نہیں ہوا کہ دین
مختلف تھے۔ کیونکہ اوّل دن سے دین یہی ایک ہے۔ تفرقہ و
خلاف اس لیے ہوا کہ ضد اور تعصب میں آکر لوگوں نے الگ
الگ گروہ بندیاں کرلیں، اور اصل دین سے پھر گئے۔ //
یہود و نصاریٰ اور مشرکینِ عرب سے اِتمامِ حجت۔ اصل
دین خدا پرستی ہے۔ ساری باتیں چھوڑ دو۔ یہ بتلاؤ، تمہیں خدا
پرستی سے اقرار ہے یا انکار؟ اگر اقرار ہے تو سارا جھگڑا ختم
ہوگیا۔ کیونکہ اسلام کی حقیقت اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ //
یہودیوں کی قومی گمراہیوں اور شقاوتوں کی طرف
اشارہ۔ جو لوگ حق و عدالت کے داعیوں کو قتل کرتے رہے
اُن سے قبولیتِ حق کی کیا اُمید ہو سکتی ہے؟ ۳۱۶
علماء یہود کی یہ گمراہی کہ جس تورات کو شب و روز بغل
میں لیے پھرتے تھے، جب اُسی تورات پر عمل کرنے کا مطالبہ
کیا گیا، تو صاف انکار کر گئے۔ //
مذہبی گروہ بندی کے غرور نے اُن میں یہ زعمِ فاسد پیدا
کر دیا ہے کہ ہم نجات یافتہ اُمت ہیں۔ ہمارا عمل کیسا ہی کیوں
نہ ہو، لیکن ہمیشہ کے لیے جہنم میں نہیں ڈالے جائینگے۔ //
وقت آگیا ہے کہ حق و باطل کا فیصلہ ہو جائے۔ جسے اُٹھنا
ہے، اُٹھ کھڑا ہو۔ جسے گرنا ہے، گرا دیا جائے! ۳۱۸
پیروانِ دعوت سے خطاب کہ سرگرمِ عمل ہو جائیں، اور

راہ کی ٹھوکروں سے محفوظ رہیں۔
اپنے ذاتی رشتوں کو جماعت کے رشتے پر ترجیح نہ دیں اور ۳۱۸
محاربینِ ملت کو اپنا مددگار و رفیق نہ بنائیں۔ //
جو کوئی خدا سے محبت کا مدعی ہے، اُسے چاہیے، خدا کے رسول
کی پیروی کرے۔ ۳۱۹
خدا کا قانون یہ ہے کہ ہدایتِ خلق کے لیے پیغمبروں کو مبعوث
کرتا ہے۔ جو اُن کی پیروی کرتے ہیں، کامیاب ہوتے ہیں۔ جو
سرکشی سے مقابلہ کرتے ہیں، ناکام رہتے ہیں۔ //
اسی قانون کے ماتحت خدا نے آدم، نوح، آلِ ابراہیم،
اور آلِ عمران (علیہم السّلام) کو برگزیدگی عطا فرمائی۔
حضرت مسیح علیہ السّلام کی دعوت سے استشہاد، اور
حضرت مریم علیہا السّلام کی پیدائش کا ذکر۔ //
حضرت مریم کا بچپنے میں ہیکل کے سپرد ہونا، اور زاہدانہ
توکّل۔ ۳۲۰
حضرت زکریا علیہ السّلام کی دعا، اور حضرت یحییٰؑ کی پیدائش
کہ ظہورِ مسیح کا مقدمہ تھی۔ •
حضرت مریمؑ کا بلوغ اور برگزیدگی۔ ۳۲۱
حضرت مریمؑ کے سوانح حیات کی بعض جزئیات جن کا علم
پیغمبرِ اسلام کو بغیر وحی کے نہیں ہو سکتا تھا۔ //
حضرت مریمؑ کو حضرت مسیحؑ کی پیدائش کی بشارت
حضرت مسیح کا ظہور اور اُن کی منادی۔ ۳۲۲
تمام رسولوں کی طرح حضرت مسیح بھی پچھلی صداقتوں کو
جھٹلانے نہیں، بلکہ از سرِ نو قائم کرنے کے لیے آئے تھے۔ //
یہودیوں کے سرداروں کا مخالفت میں سرگرم ہونا، اور
صرف حواریوں کا ایمان لانا۔ //
یہودیوں کی حضرت مسیح کے خلاف مخفی سازش، مگر خدا کا
اُنہیں ناکام کرنا، اور حضرت مسیحؑ کو اپنی حفاظت میں لے لینا۔ ۳۲۳
حضرت مسیح کی نسبت خدا کا وعدہ کہ میں تیرا وقت پورا
کروں گا، تجھے اپنی طرف اُٹھا لوں گا، منکروں کی افترا پردازیوں
سے تیری پاکی آشکارا کردوں گا، اور تیرے ماننے والوں کو تیرے
منکروں پر ہمیشہ برتر رکھوں گا! //
عیسائیوں کی گمراہی کہ اُلوہیتِ مسیح کا اعتقادِ باطل پیدا
کرلیا۔ ۳۱۲
ضمناً اس حقیقت کی طرف اشارہ کہ اگرچہ مسیحی کلیسا نے صدیوں
سے یہ اعتقاد قائم کر رکھا ہے، لیکن قرآن کی دعوت اُس کے برخلاف

کامیاب ہوگی۔

عیسائیوں کو مباہلہ کی دعوت۔ ۳۲۴

رفع نزاع اور اتمامِ حجت کی دوسری دعوت: اختلاف و نزاع کی ساری باتیں چھوڑ دیں، اُن بنیادی صداقتوں پر متحد ہو جائیں جو تمہارے یہاں بھی مسلّم ہیں۔ یعنے خدا کے سوا کوئی عبادت کا مستحق نہیں جو کچھ اُس کے لیے ہے، اُس میں کسی کو شریک نہ کیا جائے۔ کوئی انسان دوسرے انسان کو ایسا مقدس اور معصوم نہ بنالے، گویا اُسے خدا بنالیا ہے۔ ״

توحید و خدا پرستی کا یہی طریقہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا طریقہ تھا، یہودیت یا نصرانیت کی گروہ بندی اور اُس کی گمراہیاں نہ تھیں۔ اگر یہود اور نصاریٰ اس بارے میں حجت کرتے ہیں، تو یہ جہل و تعصب کی انتہا ہے۔ ۳۲۵

اہل کتاب کی مذہبی زندگی کی شقاوتیں۔

اہلِ کتاب کی بنیادی گمراہی کہ انہوں نے دین و صداقت کو صرف اپنی نسل اور گروہ بندی کا ورثہ سمجھ لیا ہے، اور کہتے ہیں یہ ممکن نہیں کہ ایک شخص ہم میں سے نہ ہو، اور دین کی صداقت رکھتا ہو۔ ۳۲۶

اہلِ کتاب کی یہ گمراہی کہ سمجھتے ہیں، غیر مذہب والوں کے ساتھ دیانت داری اور معاملہ کی سچائی ضروری نہیں۔ ۳۲۷

اصل یہ ہے کہ ان کے علماء اور مشائخ کی گمراہیوں اور بدعملیوں نے تمام قوم کو ہدایت کی روح سے محروم کر دیا ہے۔ ان میں عالموں اور فقیہوں کا ایک گروہ ہے جو کتاب اللہ کی تلاوت کرتا ہے، لیکن ہوائے نفس سے اُس کے مطالب میں تحریف کر دیتا ہے۔

اُن کے علماء اور مشائخ ہدایت کرنے کی جگہ خدائی کرنے لگے ہیں۔ عوام سمجھتے ہیں، نیک و بد، حلال و حرام، اور دوزخ و جنت کا سارا اختیار انہی کے ہاتھ میں ہے۔

کسی انسان کے لیے جائز نہیں کہ خدا کے احکام کی جگہ انسان کی رائے و قیاس کے گڑھے ہوئے حکموں کی اطاعت کرے، ایسا کرنا خدا کو چھوڑ کر بندوں کی بندگی کرنا ہے۔ ۳۲۸

اس اصلِ عظیم کی طرف اشارہ کہ تمام پیغمبر ایک ہی دین کے داعی اور ایک ہی زنجیر کی مختلف کڑیاں ہیں۔ اُن میں سے کسی ایک کا انکار، پورے سلسلۂ ہدایت کا انکار ہے۔ ״

کیا تم چاہتے ہو، اللہ کا ٹھہرایا ہوا دین چھوڑ کر، کوئی اور دین ڈھونڈھ نکالو؟ لیکن اس دنیا میں تو کوئی دوسرا دین ہو نہیں سکتا، کیونکہ آسمان اور زمین میں جو کوئی بھی ہے، اللہ کے قانون کے آگے جھکا ہوا ہے۔ اُس کے قانون کے دائرۂ اطاعت سے باہر نہیں جا سکتا۔ ۳۲۹

یہی ایک دین، نوعِ انسانی کی ہدایت کی عالمگیر راہ ہے، لیکن لوگوں نے الگ الگ گروہ بندیاں کر لیں، اور ایک دوسرے کو جھٹلانے لگے۔ قرآن اس لیے آیا ہے کہ اس گمراہی سے انسان کو نجات دلائے۔ پس وہ تمام رہنمایانِ عالم کی یکساں طور پر تصدیق کرتا ہے، اور کہتا ہے اس عالمگیر سچائی کے سوا، جو الاسلام ہے، دین کی کوئی راہ خدا کے نزدیک مقبول نہیں۔

جن لوگوں کا حال یہ ہے کہ ہدایت کی راہ پا کر پھر اُس سے منحرف ہو گئے۔ اور سچائی کی کوئی روشنی اُن کی بصیرت کے لیے سود مند نہ ہوئی، اور آج بھی دعوتِ حق کا معاندانہ مقابلہ کر رہے ہیں، تو خدا کا قانون یہی ہے کہ ایسے لوگوں پر فلاح و سعادت کی راہ کبھی نہیں کھل سکتی۔ ۳۳۰

جزائے عمل، عمل کا قدرتی نتیجہ ہے۔ پس نہ سمجھو کہ آخرت کی سزائیں بھی دنیا کی سزاؤں کی طرح ہیں کہ ایک مجرم چاہے تو مال و دولت خرچ کر کے اپنے کو بچا لے سکتا ہے۔ ״ خدا کی عدالت میں کوئی فدیہ اور معاوضہ قبول نہیں ہو سکتا۔

صرف توبہ و انابت ہی ایک ایسی چیز ہے جو تمام گناہوں کو محو کر دیتی ہے۔ ״

مال و دولت گناہ کے فدیہ میں مقبول نہیں، لیکن مال و دولت کا خدا کی راہ میں خرچ کرنا نیکی کی سب سے بڑی شرط ہے۔ ״

علماءِ یہود کے دو اعتراض اور اُن کا جواب: ۳۳۱

(۱) اگر قرآن کی دعوت بھی وہی ہے جو پچھلے نبیوں کی دعوت تھی، تو کیوں قرآن نے بھی کھانے کی وہ تمام چیزیں حرام نہیں کر دیں جو یہودیوں کے یہاں حرام ہیں؟ ״

(۲) بیت المقدس کی جگہ خانۂ کعبہ کیوں قبلہ قرار دیا گیا؟

پہلے اعتراض کا جواب کہ کھانے کی تمام اچھی چیزیں جنہیں قرآن حلال ٹھہراتا ہے، بنی اسرائیل کے لیے بھی حلال تھیں، اور جن چیزوں کو وہ حرام سمجھتے ہیں، وہ تورات میں حرام نہیں ٹھہرائی گئی ہیں، بلکہ نزولِ تورات سے پہلے خود بنی اسرائیل نے اپنے اوپر حرام ٹھہرائی تھیں۔ ״

دوسرے اعتراض کا جواب کہ خانۂ کعبہ پہلا گھر ہے جو انسان کے لیے خدا پرستی کا معبد ٹھہرایا گیا۔ اور یروشلم کے

(۱۳) جس طرح بدر کی فتحمندی سے مسلمانوں کی تربیت مدِنظر
تھی اُسی طرح اُحد کی عارضی ناکامیابی میں بھی تربیت کا پہلو
پوشیدہ تھا۔ ۳۴۵
بدر کی فتح نے مسلمانوں کو سعی و تدبیر کی طرف سے بے
پروا کر دیا تھا۔ اُحد کے تجربے نے بتلا دیا کہ خدا کے تمام کاموں
کی طرح اُس کی تائید و نصرت کے بھی قوانین ہیں۔ جو جماعت
کمزوری و غفلت میں پڑ جائے گی، صبر و ثبات میں پوری نہیں
اُترے گی، اطاعت و نظام میں کچی ہوگی، وہ کبھی کامیاب نہیں
ہوسکتی! ۳۴۶
(۱۴) سچا مومن، موت سے نہیں ڈرتا، لیکن جن میں ایمان
نہیں، وہ کہتے ہیں، اگر فلاں آدمی جنگ میں شریک نہ ہوتا تو
کاہے کو مرتا
(۱۵) پیغمبرِ اسلام سے خطاب اور منصبِ امامت کی بعض
اصولی جہات۔ امام کے لیے ضروری ہے کہ جماعت سے مشورہ
کرے، لیکن ساتھ ہی ضروری ہے کہ صاحبِ عزم ہو ۳۴۷
(۱۶) مسلمانوں سے خطاب کہ پیغمبر ادائے فرضِ امامت میں
کبھی خیانت نہیں کرسکتا۔ ۳۴۸
سچے انسان کی زندگی جھوٹے سے اس درجہ مختلف ہوتی ہے
کہ ممکن نہیں، اس میں دھوکا ہوسکے۔ ״
(۱۷) جنگِ اُحد کی آزمائش نے منافقوں کے چہروں سے
نقاب اُلٹ دی۔ بعض واقعات کی طرف اشارہ جن سے
منافقوں کی نفسیاتی حالت پر روشنی پڑتی ہے۔ ״
(۱۸) قانونِ الٰہی یہ ہے کہ دنیا میں نیکی اور بدی، دونوں کو
مہلت ملتی ہے، پس اس بات سے دھوکا نہیں کھانا چاہیے۔
دیکھنا یہ چاہیے کہ آخر کی کامیابی کس کے حصے میں آتی ہے؟ ۳۵۰
(۱۹) وقت آگیا ہے کہ مومنوں اور منافقوں میں امتیاز
ہوجائے۔ ۳۵۱
(۲۰) منافقوں پر راہِ حق میں مال خرچ کرنا شاق گزرتا
تھا۔ فرمایا، جو لوگ بخل کرتے ہیں، اُن کی دولت اُن کے
لیے وسیلۂ عذاب ہوگی۔ ۳۵۲
اب پھر وہی بیان شروع ہوجاتا ہے، جو اس سے پہلے تھا
یعنے اہلِ کتاب سے خطاب اور دعوتِ حق کی فتحمندی کا اعلان ״
علماءِ یہود کا یہ قول کہ ہمیں اُسی نبی کے ماننے کا حکم دیا
گیا ہے جو سوختنی قربانی کے حکم کے ساتھ آئے اور اس کا جواب ״
پیروانِ دعوت سے خطاب کہ اس راہ میں جان و مال
کی آزمائشوں سے گزرنا ناگزیر ہے۔ نیز ضروری ہے کہ دشمنوں
کے ہاتھوں اذیت برداشت کرو۔ لیکن اگر سررشتۂ صبر و تقویٰ
ہاتھ سے نہ چھوٹا، تو بالآخر کامیابی تمہارے ہی لیے ہے! ۳۵۴
حق کی معرفت و استقامت کا سرچشمہ، ذکر اور فکر ہے۔
ذکر سے غفلت دور ہوگی۔ فکر سے معرفتِ حقیقت کے دروازے
کھل جائیں گے۔
اللہ کا قانون ہے کہ وہ کسی انسان کا عملِ حق ضائع نہیں
کرتا۔ پس جو لوگ راہِ حق میں مصائب برداشت کررہے ہیں
وہ یقین رکھیں کہ اُن کے اعمال کے ثمرات عنقریب حاصل ہونگے ۳۵۵
سورت کی ابتدا جس بیان سے ہوئی تھی، اُسی پر اختتام
اور تین بصیرتیں جو گویا سورت کے بیانات کا خلاصہ ہیں۔ ۳۵۶

النّسآء

صفحہ ۳۵۸

خدا نے افرادِ انسانی کے باہمی اجتماع و اتحاد کے لیے صلۂ
رحمی یعنے نسلی قرابت کا رشتہ پیدا کردیا ہے، اور سوسائٹی
کا نظام اسی پر قائم ہے۔ اگر اس رشتہ کے موثرات نہ ہوتے
تو انسان کی زندگی میں انفرادیت کی جگہ اجتماعیت پیدا
نہ ہوتی۔ ۳۵۸
پس صلۂ رحمی کے حقوق، خدا کے ٹھہرائے ہوئے حقوق
ہیں۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلے یتیموں کے حقوق پر
زور دیا گیا۔
(۱) یتیم کا سرپرست یتیم کا مال اُلگ رکھے۔ ״
(۲) یتیم لڑکی کے سرپرست کو ایسا نہیں کرنا چاہیے کہ محض اُس
کی دولت پر قابض ہوجانے کے لیے اُس سے نکاح کرلے۔ ۳۵۹
(۳) ضمناً نکاح کا حکم کہ بیک وقت چار بیویاں تک رکھ سکتے
ہو، بشرطیکہ عدل کرسکو۔ ״
(۴) جب تک یتیم بچے عاقل و بالغ نہ ہوجائیں، مال اُن
کے حوالے نہ کرو۔ ״
(۵) اس ڈر سے کہ اولاد بڑی ہوکر قابض ہوجائے گی یا یتیم
بالغ ہوکر مطالبہ کریں گے، مال و دولت کو فضول خرچی میں اُڑا
دینا بڑی معصیت ہے۔ ״

پس ضروری ہے کہ اُن کی گمراہیوں سے اپنی حفاظت کرو۔ ٣٧٢

یہود مدینہ کی یہ شقاوت کہ ذومعنی اور مشتبہ الفاظ کہہ کر
دل کا بخار نکالتے۔ ״

اہلِ کتاب کی یہ گمراہی کہ اپنے پیشواؤں اور فقیہوں کو ایسا
مقدس اور بااختیار سمجھ رکھا ہے، گویا خدا کی خدائی میں شریک
ہیں۔

سارے گناہ بغیر توبہ کے بھی بخش دیے جا سکتے ہیں لیکن
شرک نہیں بخشا جائے گا۔ ٣٧٣

یہودیوں کا غرورِ باطل کہ اپنی مذہبی گروہ بندی کی بڑائیوں
اور پاکیوں کی ڈینگیں مارتے ہیں۔ ״

گروہ پرستی کے بعد حق و باطل کا امتیاز باقی نہیں رہتا۔

یہود مدینہ مسلمانوں کی ضد میں آکر مشرکینِ عرب کو اُن پر
ترجیح دیتے۔ ٣٧٤

مسلمانوں سے خطاب، اور قیامِ عدل، ادا امانت،
اور رفعِ نزاع کے مہمات: ٣٧٥

(١) اصل یہ ہے کہ جو شخص جس بات کا حقدار ہو، اُس کا
اعتراف کرو، اور جو چیز جسے ملنی چاہیے، وہ اسی کے حوالے
کرو۔ ״

(٢) جب دو فریقوں میں فیصلہ کرو، تو حق و انصاف
کے ساتھ کرو۔ ״

(٣) اصلِ دین یہ ہے کہ اللہ کی اطاعت کرو، رسول کی
اطاعت کرو، اور تم میں سے جو صاحبِ حکم و اختیار ہو، اُس
کی اطاعت کرو۔ ״

اگر نزاع و اختلاف ہو، تو قرآن و سُنت کی طرف رجوع
کرنا چاہیے۔ ٣٧٦

منافق اپنے جھگڑے چکانے کے لیے مخالفینِ اسلام کے
آگے پیش کرتے تھے۔ فرمایا، جو شخص اللہ کے رسول کے حکم
اور فیصلہ پر مطمئن نہیں، وہ مومن نہیں! ״

جس کسی نے اللہ اور رسول کی اطاعت کی، تو وہ
انعام یافتہ جماعتوں کا ساتھی ہوا۔ انعام یافتہ جماعتیں چار
ہیں: انبیاء، صدیقین، شہداء، صالحین۔ ٣٧٨

منافقوں کی یہ روش کہ جنگ سے الگ رہتے۔ پھر اگر
کوئی حادثہ پیش آجاتا تو خوش ہوتے کہ ہم بچے رہے۔ اگر
کامیابی ہوتی، تو حسد سے جل مرتے کہ کاش ہم نے بھی ساتھ
دیا ہوتا! ״

قرآن نے جنگ کا حکم اِس لیے نہیں دیا کہ دوسروں پر چڑھ
دوڑو، بلکہ اس لیے کہ ظلم کا مقابلہ کرو۔ اِسی لیے وہ کہتا ہے
مومن کا لڑنا اللہ کی راہ میں ہوتا ہے۔ ٣٧٩

عرب کے لوگ باہمی خونریزی میں مبتلا تھے۔ اسلام
نے اس سے روکا۔ اب جب مظلوموں کی حمایت اور ظالموں
کے دفاع میں جنگ کا حکم دیا گیا، تو منافق جی چرانے لگے۔

مسلمانوں کو جب کبھی منافقوں کی وجہ سے کوئی حادثہ
پیش آجاتا، تو منافق اُس کی ذمہ داری پیغمبرِ اسلام پر ڈالتے
فرمایا، جو کچھ پیش آتا ہے، خدا کے ٹھہرائے ہوئے قوانینِ عمل کا
لازمی نتیجہ ہے۔ پیغمبر کا کام پیامِ حق پہنچا دینا ہے۔ اگر تم عمل
نہ کرو، تو نتائج کے خود ذمہ دار ہو۔ ٣٨١

امام و قائد کو چاہیے، لوگوں کی کج اندیشیوں سے دل گرفتہ
نہ ہو، اور اللہ پر بھروسہ رکھے۔

اللہ کا رسول اس لیے نہیں آتا کہ لوگوں سے بہ جبر اطاعت
کرائے، اور اُن کے اعمال کا پاسبان ہو۔

منافق زبان سے اقرارِ اطاعت کرتے، مگر راتوں کو
مجلسیں جما کر مخالفانہ سازشیں کرتے۔

ضمناً اس حقیقت کا استنباط کہ قرآن ہر انسان سے مطالبہ
کرتا ہے، اُس کے مطالب میں غور و فکر کرے۔ پس جو شخص
قرآن کو سمجھ بُوجھ کے نہیں پڑھتا، وہ قرآن کا مطالبہ پورا نہیں
کرتا۔ جو شخص قرآن میں تدبر کرے گا، وہ معلوم کر لے گا کہ یہ کلام
الٰہی ہے!

جب کبھی امن و خوف کی کوئی بات سُننے میں آئے، تو
عوام میں نہ پھیلاؤ، اولوالامر کے آگے پیش کرو۔ ٣٨٢

جب کبھی کوئی سلام و دُعا بھیجے، تو چاہیے، اُس سے زیادہ
اچھی بات جواب میں کہو۔ یا کم از کم ویسی بات اُس پر لوٹا دو
جنگ کی حالت ہو یا امن کی، موافق ہو یا مخالف، لیکن
حُسنِ اخلاق و انسانیت کا مقتضٰی یہ ہے کہ جو کوئی تم پر سلامتی
بھیجے تم بھی اُس کا ویسا ہی جواب دو۔

جب جنگ چھڑی، تو مسلمانوں میں منافقین مکہ کی نسبت
اختلافِ رائے ہوا۔ فرمایا، اگر وہ مکہ سے ہجرت کر جائیں اور
دشمنوں کے ساتھ نہ رہیں، تو انہیں مخالف نہ سمجھو، ورنہ
جو کوئی دشمنوں کے ساتھ رہیگا، دشمن ہی سمجھا جائے گا۔ ٣٨٣

ایسے لوگوں سے رفاقت و مددگاری کا رشتہ نہ رکھو کہ
فی الحقیقت دشمنوں کے ساتھی ہیں۔ البتہ دو طرح کے

اس ممانعت میں داخل نہیں ۔ اولاً، جو لوگ کسی ایسے گروہ
کے پاس چلے جائیں جس کے ساتھ تمہاری صلح ہے ۔ ثانیاً جو
لوگ ناطرفدار ہو جائیں ۔ ۳۸۳
اصل اس بارے میں یہ ہے کہ تم صرف اُنہی لوگوں کے
خلاف ہتھیار اُٹھا سکتے ہو جنہوں نے تمہارے خلاف ہتھیار
اُٹھایا ہو۔ اگر ایک گروہ جنگ پر مُصر نہیں، تو تمہارے لیے کسی
حال میں بھی جائز نہیں کہ اُس پر ہتھیار اُٹھاؤ۔ ،،
مسلمانوں کے لیے جائز نہیں کہ بغیر حالتِ جنگ کے
کسی انسان کو دیدہ و دانستہ قتل کریں۔ اگر کسی کے ہاتھ سے
نادانستہ یا شبہ میں قتل ہو جائے، تو مقتول کی تین حالتیں
ہو سکتی ہیں۔ چنانچہ تینوں حالتوں کے احکام بتلائے گئے۔ ۳۸۴
مسلمان جان بوجھ کر کسی مسلمان کو قتل کر دے، تو اُس
کے لیے آخرت کا دائمی عذاب اور خدا کی لعنت ہے۔ ۳۸۵
خدا کے حضور تمام نیکیوں کے لیے اجر ہے، مگر تمام
نیکیاں یکساں نہیں ۔ جان و مال سے جہاد کرنے والوں کے
درجہ کو وہ لوگ نہیں پہنچ سکتے جو مُجاہد نہیں ہیں۔ ۳۸۶
پیغمبر اسلام کی ہجرت کے بعد عرب کی دو قسمیں ہو گئی
تھیں:
دار الہجرت یعنے مدینہ، اور دار الحرب یعنے مکہ۔ فرمایا،
باوجود استطاعت کے جو مسلمان دار الحرب سے ہجرت نہ
کریں، اور دشمنانِ اسلام کا جور ظلم ذلت کے ساتھ سہتے رہیں
وہ بڑی ہی معصیت کے مرتکب ہونگے۔
خدا کی زمین وسیع ہے۔ اگر اپنا وطن چھوڑ کر نکلو گے تو
نئی نئی اقامت گاہیں اور معیشت کے نئے نئے سامان ملیں گے ،،
سفر کی حالت میں نماز قصر کرنے کا، اور بہ حالتِ جنگ
ایک خاص طریقہ پر نماز کی جماعت کا حکم جسے صلوٰۃ خوف کہتے
ہیں۔ ۳۸۷
مقاصد کی راہ میں مشقتیں مومن کو بھی پیش آتی ہیں اور کافر
کو بھی، لیکن مومن کے لیے اُن کا جھیلنا سہل ہوتا ہے۔ ۳۸۸
پیغمبر اسلام سے خطاب کہ قرآن اس لیے نازل ہوا ہے
کہ حق و عدل کا قیام ہو، پس اُن لوگوں کی پروا نہ کرو جو چاہتے
ہیں، انصاف و حقیقت کے خلاف فیصلہ حاصل کریں۔
اس سلسلہ میں قضا و عدالت کی بعض بنیادی جہات۔
قاضی کے لیے جائز نہیں کہ غیر مسلم کے مقابلہ میں مسلم کی بیجا
رعایت کرے۔ ۳۸۹

مسلمانوں کے لیے جائز نہیں کہ ہم مذہب ہونے کی وجہ
سے مسلمان مجرم کی بمقابلہ غیر مسلم، حمایت کریں۔ اُس کی
حمایت میں جتھا بندی کرنا اور زیادہ معصیت ہے۔ ۳۸۹
جس شخص پر راہِ ہدایت واضح ہو جائے اور پھر اُس سے
پھر جائے، تو اُس نے شقاوت کی راہ اختیار کر لی، اور
خُدا کا قانون ہے کہ جو شخص جیسی راہ پسند کرتا ہے، ویسے ہی
نتیجہ تک پہنچا دیا جاتا ہے۔ ۳۹۰

مشرکین عرب کے بعض عقائد و اعمال ۳۹۱

شیطان کی بڑی وسوسہ اندازی یہ ہے کہ حقیقت و عمل
سے ہٹا کر باطل آرزوؤں اور جھوٹی اُمیدوں میں آدمی کو
مگن کر دیتا ہے! ،،
یہودیوں اور عیسائیوں کا سرمایۂ دین، یہی جھوٹی اُمیدیں
ہیں۔ یہودی کہتے ہیں، ہم نجات یافتہ اُمت ہیں، عیسائی
کہتے ہیں، کفارۂ مسیح پر ایمان لانے کے بعد نجات ہی نجات ہے
مسلمانو! نہ تو تمہاری آرزوؤں سے کچھ بننے والا ہے، نہ
یہودیوں اور عیسائیوں کی۔ خدا کا قانون تو یہ ہے کہ جیسا جس
کا عمل ہوگا، ویسا ہی نتیجہ پائے گا! ۳۹۲
قانونِ عمل کے ذکر نے سلسلۂ بیان پھر قرابت داروں کے
حقوق کی طرف پھیر دیا ہے۔ ۳۹۳
(۱) عرب میں دستور تھا کہ اگر یتیم لڑکی خوبصورت اور مالدار
ہوتی تو سرپرست بطمع زر خود نکاح کر کے اُسے نقصان پہنچاتا
یا دوسرے سے نکاح کرا دیتا مگر اس شرط پر کہ مال کا ایک حصہ
اُسے مل جائے۔ یا پھر یتیم لڑکیوں کا نکاح ہونے ہی نہیں
دیتے کہ شوہر مال کا مطالبہ کریگا۔ قرآن نے اس ظلم سے روکا۔ ،،
(۲) اگر بیوی شوہر کو اپنے سے پھرا ہوا پائے، اور اُسے خوش
کرنے کے لیے اپنے حق میں سے کچھ چھوڑ دے اور ملاپ ہو جائے
تو اس میں کوئی حرج نہیں۔ یہ بیوی کے مال پر جبراً قبضہ کرنا
نہیں ہے۔ ،،
مال و دولت کی خواہش ہر انسان میں ہے، پس ایسا
نہ کرو کہ مال کی وجہ سے باہم نا اتفاقی ہو۔ ،،
(۳) ایک سے زیادہ بیویاں کرنے کی صورت میں عدل کی
شرط جو لگائی گئی ہے، تو اُس کا مطلب یہ ہے کہ جتنی باتیں
تمہارے اختیار میں ہیں اُن میں ہر ایک کے ساتھ یکساں
سلوک کرو، اور کسی ایک ہی کی طرف بالکل جھک نہ پڑو۔ ،،
بیانِ احکام کے بعد پھر تذکیر و موعظت، کہ اصلی شے

عمل واستوامت ہے۔ ۳۹۴
مسلمانوں کو چاہیے "قوامون بالقسط" اور "شہداء
للہ" ہوں۔ یعنے انصاف پر مضبوطی کے ساتھ قائم رہنے
والے اور اللہ کے لیے گواہی دینے والے۔ اگر سچائی خود ان
کی ذات کے یا اُن کے ماں باپ کے خلاف ہو، جب بھی
اس کے اظہار میں تامل نہ کریں! ۳۹۵
گواہی دینے میں نہ تو کسی کی دولت کی پروا کرو۔ نہ کسی
کی محتاجی پر ترس کھاؤ۔ جو بات کہو، صاف صاف اور بے
لاگ کہو!
یہ خصائل جبھی پیدا ہو سکتے ہیں کہ سچا ایمان دل میں
راسخ ہو جائے۔ ″
ایمان باللہ کی تفصیل۔
ایسا ایمان، ایمان نہیں جس میں استقامت نہ ہو ۳۹۶
منافقوں کے خصائل واعمال:
(۱) مومنوں کو چھوڑ کر منکرین حق کو رفیق ومددگار بناتے
ہیں تاکہ عزت حاصل کریں۔
(۲) منکرینِ حق کی مجلسوں میں شریک ہو کر خدا کی
آیتیں جھٹلاتے ہیں۔ ″
(۳) الگ تھلگ رہ کر واقعات کی رفتار دیکھتے ہیں۔ جو
فریق کامیاب ہوتا ہے، اُس سے کہتے ہیں، ہم دل سے
تمہارے ساتھ تھے۔ ۳۹۷
(۴) نماز پڑھیں گے تو کاہلی کے ساتھ۔ ″
(۵) ان کا ایک قدم کفر میں ہے۔ ایک ایمان میں۔ ″
اس حقیقت کی طرف اشارہ کہ دنیا میں اچھوں کی طرح
بُروں کو بھی مہلت عمل ملتی ہے۔ شریر آدمی اس مہلت سے
نڈر ہو جاتا ہے اور سمجھتا ہے، میرے لیے کچھ ہونے والا نہیں،

حالانکہ سب کچھ ہونے والا ہے، مگر اپنے مقررہ وقت پر ۳۹۷
عذاب وثواب اعمال انسانی کا قدرتی نتیجہ ہے۔ ۳۹۸
اگر کسی انسان میں کوئی بُرائی ہو تو اُسے مشہور کرنا اور
پکارتے پھرنا جائز نہیں۔ ہاں اگر کوئی مظلوم ہو تو ظالم کے
خلاف آواز بلند کر سکتا ہے۔ ۳۹۸
جو لوگ خدا کے بعض رسولوں کو مانتے ہیں، بعض کو نہیں
مانتے، وہ ایمان وکفر کے درمیان تیسری راہ نکالنی چاہتے
ہیں۔ ۳۹۹
علماءِ یہود کا یہ مطالبہ کہ اگر پیغمبر اسلام سچے ہیں، تو کیوں
آسمان سے ایک لکھی لکھائی کتاب ہم پر نازل نہیں ہو جاتی
اور قرآن کا جواب۔
یہودیوں کی تاریخی شقاوتوں کی طرف اشارہ۔ ″
یہودیوں کی یہ شقاوت کہ حضرت مریم علیہا السلام پر بہتان
لگایا، اور کہتے ہیں، ہم نے مسیح کو سولی پر چڑھا کر ہلاک کر دیا۔ ۴۰۰
جب کسی گروہ میں اتباعِ حق کی روح باقی نہیں رہتی،
تو وہ جائز ومباح باتوں کا بھی اس طرح استعمال کرتا ہے کہ طرح
طرح کی برائیوں کا ذریعہ بن جاتی ہیں۔ یہودیوں پر اسی لیے
بعض جائز باتیں سداً للذریعہ روک دی گئیں۔ ۴۰۱
وحدتِ دین کی اصل عظیم، اور اس حقیقت کا اعلان کہ
دنیا کی کوئی قوم نہیں جس پر ہدایت الٰہی نے اتمام حجت نہ
کر دی ہو، اور پیغمبروں کا ظہور نہ ہوا ہو۔ قرآن میں بعض کا ذکر
کیا گیا بعض کا نہیں کیا گیا۔ ۴۰۲
اہل کتاب کی ایک بڑی گمراہی دین میں غلو ہے۔ ۴۰۴
دینِ حق بُرہان ہے۔ یعنے سرتاسر دلیل وبصیرت۔ ۴۰۵
سورت کا اختتام بھی قرابت داروں کے حقوق کے ذکر
پر ہوا۔ کلالہ کی میراث کی دو بقیہ صورتیں۔ ″

المائدہ

صفحہ ۴۰۶

"مسلمانو! اپنے معاہدے پورے کرو" یعنے احکام الٰہی کی تعمیل
واطاعت کا عہد پورا کرو! ۴۰۶
(۱) مویشی کا گوشت حلال ہے۔ بجز اُن کے جو مستثنیٰ کر دیے
گئے۔ ″
(۲) احرام کی حالت میں شکار جائز نہیں۔ ″
(۳) خدا کے شعائر کی بے حرمتی نہ کرو۔ ″

(۴) از انجملہ حُرمت کے مہینے ہیں۔ ۴۰۶
(۵) ایسا نہ ہو کہ قربانی کے جانوروں اور حاجیوں اور
تاجروں کو نقصان پہنچایا جائے۔ ″
(۶) مشرکوں نے تمہیں حج سے روکا تھا۔ اب تم اُس کے
بدلے اُن کے حاجیوں کو نہ روکو۔ تمہارا دستور العمل یہ ہونا چاہیے
کہ "نیک کام میں مدد کرنا۔ بُرائی میں نہ کرنا" ″

دین کی تکمیل کا اعلان۔ ۴۰۶
چونکہ دین کامل ہو چکا، اس لیے کھانے پینے اور اس
طرح کے معاملات میں بے جا قیدیں اور وہم پرستانہ بندشیں
باقی نہیں رہیں۔ تمام اچھی چیزیں حلال ہیں۔ ۴۰۸
اگر سدھائے ہوئے شکاری کتے یا پرندے کے ذریعہ شکار
کیا جائے، تو وہ بھی جائز ہے۔ ״
اہل کتاب کے ذبح کیے ہوئے جانور کا گوشت بھی
حلال ہے۔ نیز ان کی عورتوں کے ساتھ نکاح بھی جائز ہے۔ ۴۰۹
وضو اور تیمم کا حکم، اور اس حقیقت کی توضیح کہ مقصود
صفائی اور پاکیزگی ہے۔ یہ بات نہیں ہے کہ خواہ مخواہ کی ״
پابندیاں لگادی جائیں۔ ״
مسلمانوں سے خطاب کہ دین کی تکمیل اور نعمت کا اتمام
چاہتا ہے کہ تم اپنی سیرت (کیرکٹر) میں سرتاسر عدل و صداقت
کا پیکر بن جاؤ! ۴۱۰
جس طرح ایمان و عمل کا عہد تم سے لیا ہے، اسی طرح اہل
کتاب سے بھی لیا تھا۔ ان کی حالت سے عبرت پکڑو! ۴۱۱
علماء یہود کی یہ شقاوت کہ کلامِ الٰہی میں تحریف کر دیتے
تھے۔ ״
عیسائیوں نے بھی عہدِ ہدایت فراموش کر دیا۔ وہ بہت
سے فرقوں میں الگ الگ گروہ بند ہو گئے، اور ہر فرقہ
دوسرے فرقے کا دشمن ہو گیا۔ ۴۱۲
قرآن اپنے پیرووں کو جہل و گمراہی کی تاریکیوں سے نکالتا
اور علم و بصیرت کی روشنی میں لاتا ہے۔ ״
عیسائیوں کی یہ گمراہی کہ الوہیتِ مسیحؑ کا عقیدہ پیدا
کر لیا۔ ۴۱۳
یہودیوں اور عیسائیوں کی یہ گمراہی کہ کہتے ہیں، ہم خدا کی
محبوب امت ہیں۔ ہمارے لیے نجات ہی نجات ہے۔ حالانکہ
خدا نے کسی خاص امت کو نجات و سعادت کا پٹہ لکھ کر نہیں
دے دیا ہے۔ ״
جب ایک قوم عرصہ تک محکومی کی حالت میں مبتلا رہتی
ہے، تو اس میں بلند مقاصد کے لیے جدوجہد کی استعداد باقی
نہیں رہتی۔ حضرت موسیٰ کا بنی اسرائیل کو حکم دینا کہ مردانہ وار
سرزمین موعود میں داخل ہو جاؤ، اور ان کی بزدلی و بے ہمتی۔ ۴۱۴
اسی لیے حکم ہوا کہ چالیس سال تک اس سرزمین سے محروم
رہو گے۔ تاکہ اس عرصہ میں ایک نئی نسل جو غلامانہ خصائل سے
محفوظ ہو، ظہور میں آجائے۔ ۴۱۴
بنی اسرائیل کی یہ شقاوت کہ قتل و خونریزی میں بے باک
ہو گئے تھے۔ ۴۱۵
ہابیل و قابیل کی سرگزشت ۴۱۶
باغیوں اور رہزنوں کی سزا، جو قتل و بدامنی کا موجب
ہوتے ہیں۔ ۴۱۷
چوروں کی سزا ۴۱۸
کسی بات کی ٹوہ میں رہنا، اور اِدھر کی بات اُدھر لگانا،
ایمان و راستی کے خلاف ہے۔ مدینہ کے علماء یہود منافقوں کو
ٹوہ کے لیے بھیجا کرتے تھے۔ ״
معاملات و قضایا میں علماء یہود کی دین فروشی، اور
کتاب اللہ کے احکام میں تحریف۔ ״
وہ جب کسی مجرم کو شریعت کی سزا سے بچانا چاہتے، تو
شرعی حیلے نکالتے، اور کبھی ایسا کرتے کہ معاملہ پیغمبر اسلام کے
سامنے پیش کرا دیتے۔ مقصود یہ ہوتا کہ کسی طرح حکمِ شریعت کی تعمیل
سے بچ جائیں۔ قرآن کا اس پر انکار۔ ۴۱۹
قرآن پچھلی صداقتوں کا مصدِّق اور ان پر نگہبان ہے۔ ۴۲۰
اگر مختلف مذاہب ایک ہی صداقت کی دعوت ہیں، تو
پھر شرائع و احکام میں اختلاف کیوں ہوا؟ قرآن کہتا ہے، یہ
شرع اور منہاج کا اختلاف ہے جو فرع ہیں۔ دین کا
اختلاف نہیں ہے جو اصل ہے۔ ۴۲۱
یہود و نصاریٰ سے رفاقت و مددگاری کا رشتہ رکھنے کی
ممانعت جو مشرکینِ مکہ کی طرح مسلمانوں کی دشمنی میں سرگرم
رہتے تھے اور جنگ کی حالت پیدا ہو گئی تھی۔ ۴۲۳
منافق دشمنانِ قوم کی طرف دوڑے جا رہے ہیں، لیکن
عنقریب اپنی اس روش پر نادم ہوں گے۔ ״
مسلمانوں سے خطاب کہ عنقریب اللہ مومنوں کا ایک
ایسا گروہ پیدا کر دے گا جو خدا کو دوست رکھے گا اور خدا انہیں
دوست رکھے گا۔ ״
حزب اللہ، یعنے اللہ کا گروہ کبھی مغلوب نہیں ہو سکتا۔ ״
ان لوگوں سے رفاقت و مددگاری کے رشتے نہ رکھو جنہوں
نے تمہارے دین کو ہنسی کھیل بنا رکھا ہے۔ ۴۲۴
اہل کتاب سے خطاب کہ جب پیروانِ قرآن کا طریقہ عالمگیر
سچائی کی تصدیق کا ہے، تو پھر تمہیں ان کے خلاف کیوں کد ہوئی
ہے؟ ״

الانعام

صفحہ ۴۳۹

إِنَّ اللّٰهَ يَرْفَعُ بِهٰذَا الْكِتَابِ أَقْوَامًا وَيَضَعُ بِهِ آخَرِيْنَ

ترجمان القرآن

یعنی

قرآنِ حکیم کے مطالب اُردو زبان میں ضروری تشریحات کے ساتھ

مع

تفسیر سُورۂ فاتحہ

از

ابُوالکلام احمد

جلد اوّل

ادبیات لاہور

مطبع — — معظم پرنٹنگ پریس لاہور
قیمت ———

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمدُ للہِ وحدَہٗ

۱۹۱۶ء میں جب البلاغ کے صفحات پر ترجمان القرآن اور تفسیر البیان کا اعلان کیا گیا، تو میرے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہ تھی کہ ایک ایسے کام کا اعلان کر رہا ہوں جو پندرہ برس تک التوا و انتظار کی حالت میں معلّق رہے گا، اور جو ملک کے شوق و انتظار کے لیے ایک ناقابلِ برداشت بوجھ، اور میرے ارادوں کی ناتمامیوں کے لیے ایک دردانگیز مثال ثابت ہوگا ؛

لیکن واقعات کی رفتار نے بہت جلد تبلا دیا کہ صورتِ حال ایسی ہی تھی!

جلاوطنی

ابھی اس اعلان پر بہ مشکل چند مہینے گزرے ہونگے کہ ۳۔ مارچ ۱۹۱۶ء کو حکومتِ بنگال نے ڈیفنس آرڈینینس[1] کے ماتحت مجھے حدودِ بنگال سے باہر چلے جانے کا حکم دیا، اور دفعۃً البلاغ اور البلاغ پریس کے ساتھ تصنیف و طباعت کا تمام کارخانہ درہم برہم ہوگیا ؛

چونکہ اس سے پہلے اِسی آرڈننس کے ماتحت دہلی، پنجاب، یو، پی اور مدراس کی حکومتیں اپنے اپنے صوبوں میں میرا داخلہ روک چکی تھیں، اس لیے اب صرف بہار اور بمبئی ہی کے دو صوبے رہ گئے تھے جہاں میں جا سکتا تھا۔ میں نے رانچی منتخب کیا۔ میرا خیال تھا کہ کلکتہ سے قریب رہ کر شاید تصنیف و طباعت کا کام جاری رکھ سکوں ؛

۱۹۱۵ء میں جب میں نے اس کام کا ارادہ کیا، تو بہ یک وقت تین چیزیں پیشِ نظر تھیں۔ ترجمہ، تفسیر، اور مقدمہ تفسیر۔ میں نے خیال کیا تھا کہ یہ تین کتابیں قرآن کے فہم و مطالعہ کی تین مختلف ضرورتیں پوری کر دیں گی۔ عام تعلیم کے لیے ترجمہ۔ مطالعہ کے لیے تفسیر۔ اہلِ علم و نظر کے لیے مقدمہ ؛

البلاغ میں جب ترجمہ و تفسیر کی اشاعت کا اعلان کیا گیا ہے، تو ترجمہ پانچ پاروں تک پہنچ چکا تھا۔ تفسیر سورۂ آل عمران تک مکمل ہو چکی تھی، اور مقدمہ یادداشتوں کی شکل میں قلمبند تھا۔ اس خیال سے کہ تھوڑے وقت کے اندر زیادہ

---

[1] جنگ یورپ کے زمانے میں جو موقت احکام نافذ کیے گئے تھے اُن میں ایک آرڈینینس "ڈیفنس آف انڈیا" کے نام سے مشہور ہوا تھا۔ یہ آرڈینینس حکومتِ ہند اور مقامی حکومتوں کو اختیار دیتا تھا کہ بغیر عدالتی کارروائی کے جس کو چاہیں، ہندوستان یا ہندوستان کے کسی صوبے سے جلاوطن کر دیں یا نظربند کر دیں۔

سے زیادہ کام انجام پا جائے، میں نے تصنیف کے ساتھ چھپائی کا سلسلہ بھی جاری کر دیا۔ میرا خیال تھا کہ اس طرح سال بھر کے اندر ترجمہ مکمل بھی ہو جائے گا اور چھپ بھی جائے گا۔ نیز تفسیر کی بھی کم از کم پہلی جلد شائع ہو جائے گی۔ ہر سات دن کی مشغولیت میں نے یوں تقسیم کر دی تھی کہ تین دن البلاغ کی ترتیب میں صرف کرتا تھا، دو دن ترجمے میں اور دو دن تفسیر میں:

۳-مارچ ۱۹۱۶ء کو جب میں کلکتہ سے روانہ ہوا، تو تفسیر کے چھ فارم چھپ چکے تھے اور ترجمہ کی کتابت شروع ہو رہی تھی۔ اب میں نے کوشش کی کہ میری عدم موجودگی میں پریس جاری رہے اور کم از کم تفسیر اور ترجمہ کا کام ہوتا رہے۔ چنانچہ جون ۱۹۱۶ء میں پریس کے دوبارہ اجراء کا انتظام ہو گیا۔ اور میں مسودات کی ترتیب میں مشغول ہو گیا تاکہ پریس کے حوالے کر دوں:

نظر بندی

لیکن ۸-جولائی ۱۹۱۶ء کو بیک حکومتِ ہند نے میری نظر بندی کے احکام جاری کر دیے اور اس طرح اُس اُمید کا بھی خاتمہ ہو گیا۔ نظر بندی کے بعد کوئی موقع باقی نہیں رہا کہ باہر کی دنیا سے کسی طرح کا علاقہ رکھ سکوں:

اب میرے اختیار میں صرف ایک ہی کام رہ گیا تھا یعنی تصنیف و تسوید کا مشغلہ۔ نظر بندی کی اُنیس دفعات میں سے کوئی دفعہ بھی مجھے اس سے نہیں روکتی تھی۔ میں نے اس پر قناعت کی۔ اتنا ہی نہیں، بلکہ میں نے خیال کیا، اگر زندگی کی تمام آزادیوں سے محروم ہونے پر بھی لکھنے پڑھنے کی آزادی سے محروم نہیں ہوں اور اُس کے نتائج محفوظ ہیں، تو زندگی کی راحتوں میں سے کوئی راحت بھی مجھ سے الگ نہیں ہوئی۔ میں اس عالم میں پوری زندگی بسر کر دے سکتا ہوں۔ لیکن ابھی اس صورتِ حال پر تین مہینے بھی نہیں گزرے تھے کہ معلوم ہو گیا، اس گوشہ میں بھی مجھے محرومی ہی سے دوچار ہونا تھا!

دوبارہ تلاشی اور مسودات کی ضبطی

نظر بندی کے احکام جس وقت نافذ کیے گئے ہیں، تو میرے قیام گاہ کی تلاشی بھی لی گئی تھی، اور جس قدر کاغذات ملے تھے، افسرانِ تفتیش نے اپنے قبضہ میں کر لیے تھے۔ انہی میں ترجمہ اور تفسیر کا مسودہ بھی تھا۔ لیکن جب معائنہ کے بعد معلوم ہوا کہ ان میں کوئی چیز قابلِ اعتراض اور حکومت کے مفید مقصد نہیں ہے، تو دو ہفتے کے بعد واپس دیدیے گئے:

لیکن جب تفتیش کے نتیجے سے حکومتِ ہند کو اطلاع دی گئی تو اُس نے مقامی حکومت کے فیصلے سے اتفاق نہیں کیا۔ وہاں خیال کیا گیا کہ مقامی حکومت نے کاغذات واپس دیدینے میں جلدی کی، اور بہت ممکن ہے کہ پوری ہوشیاری کے ساتھ معائنہ نہ کیا گیا ہو۔ اس زمانے میں حکومتِ ہند کے محکمۂ تفتیش کا افسر اعلیٰ سر چارلس کلیولینڈ تھا، اور مختلف اسباب سے جن کی تشریح کا یہ موقع نہیں، اُسے میری مخالفت میں ایک خاص کد ہو گئی تھی۔ وہ پہلے کلکتہ آیا اور دو ہفتے تک تفتیش میں مشغول رہا، اور پھر رانچی آیا اور از سرِ نو میرے مکان کی تلاشی لی گئی۔ تلاشی کے بعد کہا گیا کہ

جو کاغذات پچھلی تلاشی کے موقع پر لیے گئے تھے، اب حکومتِ ہند کے معائنے کے لیے بھیجے جائیں گے۔ چنانچہ تمام کاغذات حتٰی کہ چھپی ہوئی کتابیں بھی لے لی گئیں۔ ان میں نہ صرف ترجمہ و تفسیر کا مسودہ تھا، بلکہ بعض دوسری مصنفات کے بھی مکمل و نامکمل مسودات تھے ؛

جس وقت یہ معاملہ پیش آیا، ترجمہ کا مسودہ آٹھ پاروں تک اور تفسیر کا مسودہ سورۂ نسا ر تک پہنچ چکا تھا لیکن اب ان کا ایک ورق بھی میرے قبضہ میں نہ تھا۔ تاہم میں نے نویں پارے سے ترجمے کی ترتیب جاری رکھی، اور ۱۹۱۸ء کے اواخر میں کام ختم کر دیا۔ اب اگر ابتداء کے آٹھ پاروں کا ترجمہ واپس مل جائے تو پورے قرآن کا ترجمہ مکمل تھا ؛

میں نے کاغذات کی واپسی کے لیے خط و کتابت کی، لیکن جواب ملا کہ نہ تو سر دست واپس دیے جا سکتے ہیں۔ نہ یہی بتلایا جا سکتا ہے کہ کب تک واپس کیے جائیں گے۔[1] چونکہ کاغذات کی واپسی کی بظاہر کوئی قریبی اُمید نظر نہیں آتی تھی، اور کچھ معلوم نہ تھا کہ آگے چل کر کیا صورتِ حال پیش آئے، اس لیے یہی مناسب معلوم ہوا کہ از سرِ نو ان پاروں کا ترجمہ کر کے کتاب مکمل کر لی جائے۔ یہ کام آسان نہ تھا۔ ایک لکھی ہوئی چیز کو دوبارہ لکھنا طبیعت پر بہت شاق گزرتا ہے، تاہم میں نے چند ماہ کی محنت کے بعد یہ حصہ بھی از سرِ نو مکمل کر لیا :

"گفتہ" گر شد ز کفم شکر کہ "ناگفتہ" بجاست

از دو صد گنج، یکے مشتِ گہر باختہ ام!

اِس خیال سے کہ مسودہ بہتر حالت میں مرتب ہو جائے اور اگر کسی دوسرے شخص کے حوالے کیا جائے تو تصحیح میں آسانی ہو، میں نے اُردو ٹائپ رائٹر منگوا کر اُسے ٹائپ کرانا شروع کر دیا تھا۔ چنانچہ ڈسمبر ۱۹۱۹ء میں نصف سے زیادہ حصہ ٹائپ ہو چکا تھا ؛

رہائی اور تحریک لاتعاون

۲۷۔ دسمبر ۱۹۱۹ء کو حکومت نے مجھے رہا کر دیا، اور اب طباعت و اشاعت کی تمام رُکاوٹیں راہ سے دور ہو گئیں۔ لیکن یہ وقت وہ تھا کہ مُلک میں ایک عام سیاسی حرکت کا مواد طیار ہو رہا تھا، اور جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے، الہلال کی سیاسی دعوت کی صدائے بازگشت ہر گوشے سے بلند ہونے لگی تھی۔ میرے لیے ممکن نہ تھا کہ وقت کے تقاضے سے تغافل کرتا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ رہا ہوتے ہی تحریک لاتعاون کی سرگرمیوں میں مشغول ہو گیا، اور عرصہ تک اس کی مہلت ہی نہیں ملی کہ کسی دوسری طرف نگاہ اُٹھا سکتا ؛

لیکن ۱۹۲۱ء میں جب مُلک کے ہر گوشے سے ترجمان القرآن کے لیے تقاضہ شروع ہوا، تو مجھے اُس کی اشاعت

---

[1] یہ کاغذات مجھے رہائی کے بعد ۱۹۲۰ء میں واپس ملے۔ رہائی کے بعد جب میں نے مطالبہ کیا تو کئی ماہ تک کوئی نتیجہ نہیں نکلا، اُس زمانے میں صوبہ بہار کے گورنر لارڈ سنہا تھے۔ مجھ میں اور اُن میں اُس وقت سے شناسائی تھی جب ۱۹۰۹ء میں وہ حکومتِ ہند کے ایگزیکٹو کونسل کے ممبر ہوئے تھے۔ وہ علاج کے لیے کلکتہ آئے اور ایک دوست کے یہاں اتفاقاً ملاقات ہو گئی۔ میں نے یہ واقعہ اُن سے بیان کیا، اُنہوں نے حکومتِ ہند سے خط و کتابت کی، اور دو ہفتے کے بعد تمام کاغذات مجھے واپس مل گئے ؛

کے لیے آمادہ ہوجانا پڑا چونکہ ٹائپ کی چھپائی اُس کے لیے موزوں نہیں سمجھی گئی تھی، اس لیے کتابت کا انتظام کیا گیا۔ پہلے متن کی کتابت کرائی گئی۔ پھر ترجمہ لکھوانا شروع کیا۔ نومبر ۱۹۲۱ء میں متن کی کتابت ختم ہو چکی تھی۔ ترجمہ کی کتابت شروع ہوئی تھی ؞

لیکن وقت کا فیصلہ اب بھی میرے خلاف تھا!

گرفتاری اور تمام مسوّدات کی بربادی

۱۹۲۱ء کے اواخر میں تحریکِ لاتعاون کی سرگرمیاں منتہائے عروج تک پہنچ گئی تھیں، اور اب ناگزیر تھا کہ حکومت بھی اپنے تمام وسائل کام میں لائے۔ ۲۰۔ نومبر کو سب سے پہلے حکومتِ بنگال نے قدم اُٹھایا، اور اُن تمام مجالس کو خلافِ قانون قرار دے دیا جو تحریک کی سرگرمیوں میں مشغول تھیں، اس اقدام نے کانگریس کو عدمِ متابعتِ قانون کے اجرا کا موقع دے دیا، اور ۱۰۔ دسمبر ۱۹۲۱ء کو بعض دیگر رفقائے بنگال کے ساتھ مجھے بھی گرفتار کرلیا گیا ؞

اس مرتبہ میری گرفتاری پریس کے انتظامات میں خلل نہیں ڈال سکتی تھی۔ کیونکہ کتاب مکمل موجود تھی، اور میں نے اس کا پورا انتظام کرلیا تھا کہ میری عدم موجودگی میں بھی کام بدستور جاری رہے۔ لیکن گرفتاری کے بعد جو واقعہ پیش آیا، وہ اس افسانہ کی آخری المناکی ہے۔ اس کی وجہ سے نہ صرف ترجمان القرآن اور تفسیر کی اشاعت رُک گئی، بلکہ میری علمی زندگی کے ولولے افسردہ ہوگئے!

گرفتاری کے بعد جب حکومت نے محسوس کیا کہ میرے برخلاف مقدمہ چلانے کے لیے کافی مواد موجود نہیں ہے، تو اُسے مواد کی جستجو ہوئی، اور اس لیے تیسری مرتبہ میرے مکان اور مطبع کی تلاشی لی گئی۔ تلاشی کے لیے جو لوگ آئے تھے، اُن میں کوئی شخص ایسا نہ تھا جو اُردو یا عربی و فارسی کی استعداد رکھتا ہو۔ جو چیز بھی ان زبانوں میں لکھی ہوئی ملی، اُنہوں نے خیال کیا اس میں کوئی نہ کوئی بات حکومت کے خلاف ضرور ہوگی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ قلمی مسوّدات کا تمام ذخیرہ اُٹھا لے گئے، حتیٰ کہ ترجمان القرآن کی تمام لکھی ہوئی کاپیاں بھی توڑ مروڑ کر مسودات کے ڈھیر میں ملا دیں!

سوءِ اتفاق سے اُس وقت کسی شخص نے مطالبہ نہیں کیا کہ کاغذات مرتب کر کے لیے جائیں اور حسبِ قاعدہ اُن پر گواہوں کے دستخط ہو جائیں، نیز اُن کی رسید تفصیل کے ساتھ مرتب کر کے دی جائے۔ افسرانِ تفتیش اپنے ساتھ چھپا ہوا فارم لائے تھے۔ صرف یہ لکھ کر کہ متفرق قلمی کاغذات لیے گئے، چھپا ہوا فارم دے دیا اور روانہ ہوگئے ؞

پندرہ ماہ کے بعد جب میں رہا ہوا، تو حکومت سے کاغذات کا مطالبہ کیا۔ ایک عرصہ کی خط و کتابت کے بعد کاغذات ملے، مگر اس حالت میں ملے کہ تمام ذخیرہ برباد ہو چکا تھا ؞

افسرانِ تفتیش نے جب ان کاغذات پر قبضہ کیا ہے، تو یہ قلمی مسودات کے مختلف مجموعے تھے، اور الگ الگ پٹھوں کی دفتیوں میں ترتیب دیے ہوئے تھے۔ ان میں مختلف مکمل و غیر مکمل تصنیفات کے علاوہ بڑا ذخیرہ

یادداشتوں کا تھا، لیکن جب واپس ملے، تو محض اوراقِ پریشاں کا ایک ڈھیر تھا، اور نصف سے زیادہ اوراق یا تو ضائع ہو چکے تھے، یا اطراف سے پھٹے ہوئے اور پارہ پارہ تھے!

یہ میرے صبر و شکیب کے لیے زندگی کی سب سے بڑی آزمائش تھی، لیکن میں نے کوشش کی کہ اس میں بھی پورا اُتروں۔ یہ سب سے زیادہ تلخ گھونٹ تھا جو جامِ حوادث نے میرے لبوں سے لگایا، لیکن میں نے بغیر کسی شکایت کے پی لیا۔ البتہ اس سے انکار نہیں کرتا کہ اُس کی تلخی آج تک گلوگیر ہے:۔

رگ و پے میں جب اُترے زہرِ غم تب دیکھیے کیا ہو
ابھی تو تلخیِ کام و دہن کی آزمائش ہے!

سیاسی زندگی کی شورشیں اور علمی زندگی کی جمعیتیں ایک زندگی میں جمع نہیں ہو سکتیں، اور پنبہ و آتش میں آشتی محال ہے۔ میں نے چاہا، دونوں کو بہ یک وقت جمع کروں۔ میں نامراد ایک طرف متاعِ فکر کے انبار لگاتا رہا، دوسری طرف برقِ خرمن سوز کو بھی دعوت دیتا رہا۔ نتیجہ معلوم تھا، اور مجھے حق نہیں کہ حرفِ شکایت زبان پر لاؤں۔ عرفی نے میری زبانی کہہ دیا ہے:۔

زاں شکستم کہ بہ دُنبالِ دلِ خویش مدام   در شیب شکنِ زلفِ پریشاں رفتم!

اب ترجمان القرآن اور تفسیر کی ہستی اس کے سوا ممکن نہ تھی کہ از سرِ نو محنت کی جائے لیکن اِس حادثے کے بعد طبیعت کچھ اس طرح افسردہ ہوگئی کہ ہر چند کوشش کی مگر ساتھ نہ دے سکی۔ میں نے محسوس کیا کہ حادثے کا زخم اتنا ہلکا نہیں ہے کہ فوراً مندمل ہو جائے۔

طبیعت کی بڑی رُکاوٹ جو رہ رہ کر سامنے آتی تھی، یہ تصور تھا کہ ایک تصنیف کی ہوئی چیز دوبارہ تصنیف کی جائے۔ واقعہ یہ ہے کہ ایک اہلِ قلم کے لیے اس سے زیادہ مشکل کام کوئی نہیں۔ وہ ہزاروں صفحے نئے بآسانی لکھ دیگا، لیکن ایک ضائع شدہ صفحے کے دوبارہ لکھنے میں اپنی طبیعت کو یک قلم درماندہ پائے گا۔ فکر و طبیعت کی جو گرمجوشی پچھلی محنتوں کی بربادی کے تصور سے بجھ جاتی ہے، بہت دشوار ہوتا ہے کہ اُسے دوبارہ پیدا کیا جائے۔ اس حالت کا اندازہ صرف وہی لوگ کر سکتے ہیں، جو ایسی بدقسمتیوں سے دوچار ہوئے ہوں۔ میں نے ٹامس کارلائل کے حالات میں جب پڑھا تھا کہ اُس نے انقلابِ فرانس پر اپنی مشہور کتاب دوبارہ تصنیف کی، اور اہلِ فن نے اسے قوتِ تصنیف کا ایک غیر معمولی مظاہرہ سمجھا، تو میں نہیں سمجھ سکا تھا کہ اس میں غیر معمولی بات کیا ہے؟ لیکن اس حادثے کے بعد مجھے معلوم ہو گیا کہ یہ نہ صرف غیر معمولی ہے، بلکہ اس سے بھی کچھ زیادہ ہے، اور فی الحقیقت کارلائل کی مصنفانہ عظمت کا اس سے بڑھ کر اور کوئی ثبوت نہیں ہو سکتا!

ترجمان القرآن کی از سرِ نو ترتیب

کئی سال گزر گئے، مگر میں اپنے آپ کو اس کام کے لیے آمادہ نہ کر سکا:

دلے سرگشتہ دارم کہ در صحراست پنداری!

بارہا ایسا ہوا کہ ترجمہ و تفسیر کے بچے کھچے اوراق نکالے، لیکن جونہی برباد شدہ کاغذات پر نظر پڑی، طبیعت کا انقباض تازہ ہوگیا، اور دو چار صفحے لکھ کر چھوڑ دینا پڑا ؛

لیکن ایک ایسے کام کی طرف سے جس کی نسبت میرا یقین تھا کہ مسلمانوں کے لیے وقت کا سب سے زیادہ ضروری کام ہے، ممکن نہ تھا کہ زیادہ عرصہ تک طبیعت غافل رہتی۔ جس قدر وقت گزرتا جاتا تھا، اس کام کی ضرورت کا احساس میرے لیے ناقابلِ برداشت ہوتا جاتا تھا۔ میں محسوس کرتا تھا کہ اگر یہ کام مجھ سے انجام نہ پایا، تو شاید عرصے تک اس کی انجام دہی کا کوئی سامان نہ ہو ؛

سنہ ۱۹۲۷ء قریب الاختتام تھا کہ اچانک مدتوں کی رکی ہوئی طبیعت میں جنبش ہوئی اور رشتہ کار کی جو گرہ ذہن و دماغ کی پیہم کوششیں نہ کھول سکی تھیں، دل کے جوششِ بے اختیار سے خود بخود کھل گئی۔ کام شروع کیا، تو ابتدا میں چند دنوں تک طبیعت رکی رکی رہی، لیکن جونہی ذوق و فکر کے دو چار جام گردش میں آئے، طبیعت کی ساری رکاوٹیں دور ہوگئیں، اور پھر تو ایسا معلوم ہونے لگا، گویا اس شورش کدۂ ہستی میں افسردگی و خمار آلودگی کا کبھی گزر ہی نہیں ہوا تھا!

بہ بد مستی سزد گر متہم سازد مرا ساقی

ہنوز از بادۂ دوشینہ ام پیمانہ بو دارد!

اتنا ہی نہیں، بلکہ کہنا چاہیے، شورشِ تازہ کی سرمستیاں، مجلسِ دوشیں کی کیفیتوں سے بھی کہیں تندتر ہوگئیں :

چہ مستی ست ، نہ دانم، کہ رو بہ ما آورد کہ بود ساقی و ایں بادہ از کجا آورد؟

سبحان اللہ! عالمِ روح و قلب کے تصرفات کا بھی کچھ عجیب حال ہے۔ یا تو یہ حال تھا کہ بار بار کوشش کی مگر طبیعت کا انقباض دور نہیں ہوا۔ یا اب خود بخود کھلی، تو اس طرح کھلی کہ قلم روکنا بھی چاہوں تو نہیں رک سکتا!

شورِیست نوا ریزی تارِ نفسم را پیدا نہ کہ جنبشِ مضراب کجائی؟

بہر حال کام شروع ہوگیا، اور اس خیال سے کہ سورۂ فاتحہ کی تفسیر ترجمہ کے لیے بھی ضروری تھی، سب سے پہلے اُس کی طرف متوجہ ہوا۔ پھر ترجمہ کی ترتیب شروع کی۔ حالات اب بھی موافق نہ تھے۔ صحت روز بروز کمزور ہو رہی تھی، سیاسی مشغولیت کی آلودگیاں بدستور خلل انداز تھیں، تاہم کام کا سلسلہ کم و بیش جاری رہا، اور ۲۰ جولائی سنہ ۱۹۳۰ء کو آخری سورت کے ترجمہ و ترتیب سے فارغ ہوگیا :

تا دست رسم بود، زدم چاک گریباں

شرمندگی از خرقۂ پشمینہ ندارم!

اُصولِ ترجمہ وتفسیر

ترجمان القرآن میں قرآن کے مقاصد ومطالب جن اصول ومبادیات کے ماتحت ترتیب دیے گئے ہیں قدرتی طور پر طبیعتیں منتظر ہونگی کہ اصل کتاب کے مطالعے سے پہلے اُن سے آشنا ہو جائیں۔ اس دیباچے کے لکھنے کے وقت تک میرا بھی یہی خیال تھا کہ اس بارے میں ایک مختصر سی تحریر بطور مقدمۂ کتاب شامل کردی جائے گی۔ لیکن اب کہ دیباچہ لکھ رہا ہوں ان اصول ومبادیات کو سمیٹنا چاہا، تو معلوم ہوا، موضوع کی پیچیدگیاں اور مباحث کی گہرائیاں ایسی نہیں ہیں کہ تفصیل واطناب کے بغیر بیان میں آسکیں۔ مباحث میں سے ہر مبحث کی وضاحت کے لیے مقدمات اور تمہیدات ناگزیر ہیں۔ اور ہر مبحث کے اطراف اس طرح دُور دُور تک پھیلے ہوئے ہیں کہ نہ تو سمیٹے جاسکتے ہیں نہ مجمل اشارات عام مطالعے کے لیے کفایت کرسکتے ہیں مجبوراً اس خیال سے دست بردار ہوتا ہوں۔ اور ایک سرسری اشارہ اُن مشکلات وموانع کی طرف کردیتا ہوں جو اس راہ میں حائل تھے، تاکہ اندازہ کیا جاسکے، معاملے کی عام حالت کیا تھی، اور مطالعۂ قرآن کا جو قدم اُٹھایا گیا ہے، وہ کس رُخ پر جارہا ہے ؛

باقی رہے ترجمان القرآن کے اصولِ تفسیر، تو ان کے لیے مقدمۂ تفسیر کا انتظار کرنا چاہیے جو ترجمان القرآن کے بعد اس سلسلے کی دوسری کتاب ہے، اور جس کے قدیم مسودات کی تہذیب وترتیب میں آج کل مشغول ہوں ؛

قرونِ اخیرہ، اور قرآن کے مطالعۂ وتدبر کا عام معیار

مختلف اسباب سے جن کی تشریح کا یہ محل نہیں، صدیوں سے اس طرح کے اسباب ومؤثرات نشو ونما پاتے رہے ہیں، جن کی وجہ سے بہ تدریج قرآن کی حقیقت نگاہوں سے مستور ہوتی گئی اور رفتہ رفتہ اُس کے مطالعہ وفہم کا ایک نہایت پست معیار قائم ہو گیا۔ یہ پستی صرف معانی ومطالب ہی میں نہیں ہوئی، بلکہ ہر چیز میں ہوئی۔ حتٰی کی اُس کی زبان، اُس کے الفاظ، اُس کی تراکیب اور اُس کی بلاغت کے لیے بھی نظرو فہم کی کوئی بلند جگہ باقی نہیں رہی!

ہر عہد کا مصنف، اپنے عہد کی ذہنی آب وہوا کی پیداوار ہوتا ہے، اور اس قاعدے سے صرف وہی دماغ مستثنٰی ہوتے ہیں جنہیں مجتہدانہ ذوق ونظر کی قدرتی بخشائش نے صفِ عام سے الگ کردیا ہو۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اسلام کی ابتدائی صدیوں سے لے کر قرونِ اخیرہ تک جس قدر مفسّر پیدا ہوئے، اُن کا طریقِ تفسیر ایک روبہ تنزل معیارِ فکر کی مسلسل زنجیر ہے، جس کی ہر پچھلی کڑی، پہلی سے پست تر، اور ہر سابق، لاحق سے بلند تر واقع ہوئی ہے۔ اس سلسلے میں جس قدر اوپر کی طرف بڑھتے جاتے ہیں، حقیقت زیادہ واضح، زیادہ بلند، اور اپنی قدرتی شکل میں نمایاں ہوتی جاتی ہے۔ جس قدر نیچے اُترتے آتے ہیں، حالت برعکس ہوتی جاتی ہے!

یہ صورتِ حال فی الحقیقت مسلمانوں کے عام دماغی تنزل کا قدرتی نتیجہ تھا۔ اُنھوں نے جب دیکھا کہ قرآن کی بلندیوں کا ساتھ نہیں دے سکتے، تو کوشش کی کہ قرآن کو اُس کی بلندیوں سے اس قدر نیچے اُتا لیں کہ اُن کی پستیوں کا ساتھ دے سکے!

اب اگر ہم چاہتے ہیں کہ قرآن کو اُس کی حقیقی شکل و نوعیّت میں دیکھیں، تو ضروری ہے کہ پہلے وہ تمام پردے ہٹائیں، جو مختلف عہدوں اور مختلف گوشوں کے خارجی موثرات نے اُس کے چہرے پر ڈال دیے ہیں۔ پھر آگے بڑھیں، اور قرآن کی حقیقت خود قرآن ہی کے صفحوں میں تلاش کریں ؛

بعض اسباب و موثرات جو فہمِ حقیقت میں مانع ہیں

یہ مخالف اثرات جو یکے بعد دیگرے جمع ہوتے رہے، دو چار نہیں، بے شمار ہیں، اور ہر گوشے میں پھیلے ہوئے ہیں۔ ممکن نہیں کہ اختصار کے ساتھ بیان میں آسکیں۔ لیکن میں نے مقدمۂ تفسیر میں کوشش کی ہے کہ اُنہیں چند اصول و انواع کے ماتحت سمیٹ لوں۔ اس سلسلے میں حسبِ ذیل دفعات قابلِ غور ہیں:

(۱) قرآنِ حکیم اپنی وضع، اپنے اسلوب، اپنے اندازِ بیان، اپنے طریقِ خطاب، اپنے طریقِ استدلال، غرضکہ اپنی ہر بات میں ہمارے وضعی اور صناعی طریقوں کا پابند نہیں ہے، اور نہ اُسے پابند ہونا چاہیے۔ وہ اپنی ہر بات میں اپنا بے میل فطری طریقہ رکھتا ہے، اور یہی وہ بنیادی امتیاز ہے، جو انبیاء کرام (علیہم السّلام) کے طریقِ ہدایت کو علم و حکمت کے وضعی طریقوں سے ممتاز کر دیتا ہے۔

قرآن جب نازل ہُوا، تو اُس کے مخاطبوں کا پہلا گروہ بھی ایسا ہی تھا۔ تمدّن کے وضعی اور صناعی سانچوں میں ابھی اُس کا دماغ نہیں ڈھلا تھا۔ فطرت کی سیدھی سادی فکری حالت پر قانع تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ قرآن اپنی شکل و معنی میں جیسا کہ واقع ہُوا تھا، ٹھیک ٹھیک ویسا ہی اُس کے دلوں میں اُتر گیا، اور اُسے قرآن کے فہم و معرفت میں کسی طرح کی دشواری محسوس نہیں ہوئی۔ صحابۂ کرام پہلی مرتبہ قرآن کی کوئی آیت یا سورت سُنتے تھے، اور سُنتے ہی اُس کی حقیقت پا لیتے تھے ؛

لیکن صدرِ اوّل کا دور ابھی ختم نہیں ہُوا تھا کہ روم و ایران کے تمدّن کی ہوائیں چلنے لگیں، اور پھر یونانی علوم کے تراجم نے علوم و فنونِ وضعیہ کا دور شروع کر دیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ جوں جوں وضعیت کا ذوق بڑھتا گیا، قرآن کے فطری اسلوبوں سے طبیعتیں نا آشنا ہوتی گئیں۔ رفتہ رفتہ وہ وقت آگیا کہ قرآن کی ہر بات وضعی اور صناعی طریقوں کے سانچوں میں ڈھالی جانے لگی۔ چونکہ ان سانچوں میں وہ ڈھل نہیں سکتی تھی، اس لیے طرح طرح کے اُلجھاؤ پیدا ہونے لگے اور پھر جس قدر کوششیں سُلجھانے کی کی گئیں اُلجھاؤ اور زیادہ بڑھتے گئے!

فطریّت سے جب بُعد ہو جاتا ہے، اور وضعیت کا استغراق طاری ہو جاتا ہے، تو طبیعتیں اس پر راضی نہیں ہوتیں

کہ کسی بات کو اس کی قدرتی سادگی میں دیکھیں۔ وہ سادگی کے ساتھ حُسنِ عظمت کا تصور کر ہی نہیں سکتیں۔ وہ جب کسی بات کو بلند اور شاندار دکھانا چاہتی ہیں، تو کوشش کرتی ہیں کہ زیادہ سے زیادہ وضعیت اور صناعیت کے پیچ وخم پیدا کر دیں۔ یہی معاملہ قرآن کے ساتھ پیش آیا۔ سلف کی طبیعتیں وضعی طریقوں میں نہیں ڈھلی تھیں، اس لیے وہ قرآن کی سیدھی سادی حقیقت بے ساختہ پہچان لیتے تھے، لیکن خلف کی طبیعتوں پر یہ بات شاق گزرنے لگی کہ قرآن اپنی سیدھی سادی شکل میں نمایاں ہو۔ ان کی وضعیت پسندی اس پر قانع نہیں ہو سکتی تھی۔ اُنھوں نے قرآن کی ہر بات کے لیے وضعیت کے جامے تیار کرنے شروع کر دیے، اور چونکہ یہ جامہ اس پر راست نہیں آ سکتا تھا، اِس لیے بہ تکلف پہنانا چاہا، نتیجہ یہ نکلا کہ حقیقت کی موزونیت باقی نہ رہی۔ ہر بات ناموزوں اور اُلجھی ہوئی بن کر رہ گئی!

تفسیرِ قرآن کا پہلا دور وہ ہے، جب علوم اسلامیہ کی تدوین و کتابت شروع نہیں ہوئی تھی۔ دوسرا دور تدوین و کتابت سے شروع ہوتا ہے، اور اپنے مختلف عہدوں اور طبقوں میں اُترتا آتا ہے۔ ہم محسوس کرتے ہیں کہ ابھی دوسرا دور شروع ہی ہوا تھا کہ یہ جامہ قرآن کے لیے بننا شروع ہو گیا۔ لیکن اس کا منتہا بلوغ، فلسفہ و علوم کی ترویج و اشاعت کا آخری زمانہ ہے۔ یہی زمانہ ہے جب امام فخرالدین رازیؒ نے تفسیر کبیر لکھی، اور پوری کوشش کی کہ قرآن کا سراپا اس مصنوعی لباسِ وضعیت سے آراستہ ہو جائے۔ اگر امام رازیؒ کی نظر اس حقیقت پر ہوتی، تو اُن کی پوری تفسیر نہیں تو دو تہائی حصہ یقیناً بیکار ہو جاتا۔

بہرحال یاد رہے، وضعیت کے سانچے جتنے ٹوٹتے جائیں گے، قرآن کی حقیقت اُبھرتی آئے گی۔

قرآن کے اسلوبِ بیان کی نسبت لوگوں کو جس قدر مشکلیں پیش آئیں، محض اس لیے کہ وضعیت کا استغراق ہوا اور فطریت کی معرفت باقی نہ رہی۔

قرآن کے مختلف حصّوں اور آیتوں کے مناسبات و روابط کے سارے اُلجھاؤ صرف اس لیے ہیں کہ فطریت سے بُعد ہو گیا، اور وضعیت ہمارے اندر بسی ہوئی ہے۔ ہم چاہتے ہیں، قرآن کو بھی ایک ایسی مرتب کتاب کی شکل میں دیکھیں جیسی کتابیں ہم مرتب کرتے ہیں۔

قرآن کی زبان کی نسبت بحثوں کا جس قدر انبار لگا دیا گیا ہے، وہ بھی محض اس لیے ہے کہ فطریت کے سمجھنے کی ہم میں استعداد باقی نہیں رہی۔

قرآن کی بلاغت کا مسئلہ ہمارے وجدان کے لیے اس قدر سہل، مگر ہمارے دماغ کے لیے اس قدر دشوار کیوں ہو رہا ہے؟ صرف اِسی لیے کہ وضعیت کا خود ساختہ ترازو ہمارے ہاتھ میں ہے۔ ہم چاہتے ہیں، اسی سے قرآن کی بلاغت بھی وزن کریں!

قرآن کا طریقِ استدلال کیوں نمایاں نہیں ہوتا؟ اُس کے تمام دلائل و براہین جنھیں وہ حجۃ بالغہ سے تعبیر

کرتا ہے، کیوں مستور ہو گئے ہیں؟ اسی لیے کہ وضعیت کے استغراق نے منطق کا سانچہ ہمیں دے دیا ہے۔ ہم چاہتے ہیں، قرآن کے دلائل و براہین بھی اسی میں ڈھالیں!

غرضکہ جس گوشے میں جاؤ گے یہی اصل سامنے پاؤ گے!

(۲) جب کسی کتاب کی نسبت یہ سوال پیدا ہو، اس کا مطلب کیا ہے؟ تو قدرتی طور پر اُن لوگوں کے فہم کو ترجیح دی جائیگی جنہوں نے خود صاحبِ کتاب سے مطلب سمجھا ہو۔ قرآن تیئیس برس کے اندر بہ تدریج نازل ہوا۔ وہ جس قدر نازل ہوتا تھا صحابۂ کرام سُنتے تھے، نمازوں میں دُہراتے تھے، اور جو کچھ پوچھنا ہوتا تھا، خود پیغمبرِ اسلام (صلعم) سے پوچھ لیتے تھے۔ ان میں بعض افراد خصوصیت کے ساتھ فہمِ قرآن میں ممتاز ہوئے، اور خود پیغمبر اسلام (صلعم) نے اس کی شہادت دی۔ مذہبی خوش اعتقادی کی بنا پر نہیں بلکہ قدرتی طور پر اُن کے فہم کو بعد کے لوگوں کے فہم پر ترجیح ہونی چاہیے لیکن بدقسمتی سے ایسا نہیں سمجھا گیا۔ بعد کے لوگوں نے اپنے اپنے عہد کے فکری مؤثرات کے ماتحت نئی نئی کاوشیں شروع کر دیں، اور سلف کی صریح تفسیر کے خلاف، ہر گوشے میں قدم اُٹھا دیے۔ کہا گیا "سلف ایمان میں قوی ہیں، لیکن علم میں خلف کا طریقہ قوی ہے" حالانکہ خود سلف کا اپنی نسبت یہ اعلان تھا کہ "ابرھم قلوباً واعمقھم علماً" نتیجہ یہ نکلا کہ روز بروز حقیقت مستور ہوتی گئی، اور اکثر گوشوں میں ایک صاف بات اُلجھتے اُلجھتے بالکل ناقابلِ حل بن گئی:

آفت پر آفت یہ ہوئی کہ پہلے ایک کمزور پہلو اختیار کیا گیا، پھر بڑھتے بڑھتے، دور تک نکل گئے، پھر جب مشکلوں سے دوچار ہوئے، تو نئی نئی بحثوں اور کاوشوں کی عمارتیں اُٹھانے لگے۔ متون، شروح، حواشی اور انہات و تعلیقات کا طریقہ یہاں بھی چلا۔ اس نے اور زیادہ اُلجھاؤ میں اُلجھاؤ ڈالے، اور بعض صورتوں میں تو پردوں کی اتنی تہیں جمع ہو گئیں کہ ایک کے بعد ایک اُٹھاتے چلے جاؤ، ظلماتٌ بعضھا فوق بعضٍ کا عالم دکھائی دیگا!

اس بات کا اندازہ کرنے کے لیے کہ قرآن کا کوئی ایک مقام لو۔ پہلے اُس کی تفسیر صحابہ و تابعین کی روایات میں ڈھونڈھو۔ پھر بعد کے مفسروں کی طرف رُخ کرو، اور دونوں کا مقابلہ کرو۔ صاف نظر آجائیگا کہ صحابہ و سلف کی تفسیر میں معاملہ بالکل واضح تھا۔ بعد کی بے محل دقیقہ سنجیوں نے اُسے کچھ سے کچھ بنا دیا اور اُلجھاؤ پیدا ہو گئے۔

مثلاً سورۂ بقرہ کی ابتدائی آیتوں کی نسبت حضرت عبداللہ ابن عباس اور ابن مسعودؓ سے مروی ہے کہ اَلَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ وَیُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ الخ سے مقصود عرب کے اہلِ ایمان ہیں، اور وَالَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ الخ سے اہلِ کتاب۔ امام ابنِ جریر نے بھی یہی تفسیر اختیار کی۔ لیکن بعد کے مفسر اس پر قانع نہیں ہوئے، اور عجیب عجیب دور از کار بحثیں پیدا کر دیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ پہلے ھُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ کے مطلب کی نشست بگڑ گئی۔ پھر قرآن نے تین گروہوں کی تقسیم کر کے جس بات پر زور دیا تھا، اُس کی ساری خوبی اور حقیقت گم ہو گئی!

(۳) نومسلم اقوام کے قصص و روایات اوّل دن سے پھیلنا شروع ہو گئے تھے۔ ان میں سے اسرائیلیات (یعنی یہودیوں

کے قصص وخرافات) کو ہمیشہ محققین نے چھانٹنا چاہا۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ اِن عناصر کے مخفی اثرات دُور دور تک سرایت کر چکے تھے، اور وہ برابر جسمِ تفسیر میں پیوست رہے ؛

(۴) ایک طرف تو صحابہؓ وسلف کی روایات سے تغافل ہُوا، دوسری طرف روایاتِ تفسیر کے غیر محتاط جامعوں نے الگ آفت بپا کر دی، اور ہر تفسیر جس کا سِرا کسی نہ کسی تابعی سے مِلا دیا گیا، سلف کی تفسیر سمجھ لی گئی ؛

(۵) اس صورتِ حال کا سب سے زیادہ افسوسناک نتیجہ یہ نکلا کہ قرآن کا طریقِ استدلال دور از کار دقیقہ سنجیوں میں گم ہو گیا۔ یہ ظاہر ہے کہ اُس کے تمام بیانات کا محور و مرکز، اُس کا طریقِ استدلال ہی ہے۔ اس کے ارشادات و بصائر، اُس کے قصص و امثال، اُس کے مواعظ و حِکَم، اُس کے مقاصد و مہمات سب اسی چیز سے کھُلتے اور اُبھرتے تھے۔ یہ ایک چیز کیا گم ہوئی گویا اُس کا سب کچھ ہی گم ہو گیا :

ہمیں ورق کہ سیہ گشتہ، مُدّعا ایں جاست!

انبیاءِ کرام کا طریقِ استدلال یہ نہیں ہوتا کہ منطقی طریقہ پر نظری مقدمات ترتیب دیں۔ پھر اُن کی بحثوں میں مخاطب کو اُلجھانا شروع کر دیں۔ وہ براہِ راست تیقّن واذعان کا فطری طریقہ اختیار کرتے ہیں۔ اُسے ہر دماغ وجدانی طور پر پالیتا ہے! ہر دل قدرتی طور پر قبول کر لیتا ہے۔ لیکن ہمارے مفسّروں کو فلسفہ و منطق کے انہماک نے اس قابل ہی نہ رکھا کہ کسی حقیقت کو اُس کی سیدھی سادی شکل میں دیکھیں اور قبول کر لیں۔ انہوں نے انبیاءِ کرام کے لیے بڑی فضیلت اس میں سمجھی کہ انہیں منطقی بنا دیں، اور قرآن کی ساری عظمت اس میں نظر آئی کہ اُس کی ہر بات ارسطو کی منطق کے سانچے میں ڈھلی ہوئی نکلے۔ اس سانچے میں وہ ڈھل نہیں سکتی تھی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ قرآن کے دلائل و براہین کی ساری خوب روئی اور دلنشینی طرح طرح کی بناوٹوں میں گم ہو گئی۔ حقیقت تو گم ہو ہی چکی تھی، لیکن وہ بات بھی نہ بنی جو لوگ بنانی چاہتے تھے۔ شکوک و ایرادات کے بے شمار دروازے کھُل گئے۔ اُن کے کھولنے میں تو امام رازی کا ہاتھ بہت تیز نکلا، لیکن بند کرنے میں تیزی نہ دکھا سکے۔

(۶) یہ آفت صرف طریقِ استدلال ہی میں پیش نہیں آئی، بلکہ تمام گوشوں میں پھیلی۔ منطق و فلسفہ کے مباحث نے طرح طرح کی نئی مصطلحات پیدا کر دی تھیں۔ عربی لغت کے الفاظ اِن مصطلحہ معانی میں مستعمل ہونے لگے تھے۔ یہ ظاہر ہے کہ قرآن کا موضوع فلسفۂ یونانی نہیں ہے، اور نہ نزولِ قرآن کے وقت عربی زبان اِن مصطلحات سے آشنا ہوئی تھی۔ پس جہاں کہیں قرآن میں وہ الفاظ آئے ہیں، اُن کے معانی وہ نہیں ہو سکتے جو وضعِ مصطلحات کے بعد قرار پائے، لیکن اب اُن کے وہی مفہوم لیے جانے لگے، اور اس کی بنا پر طرح طرح کی دور از کار بحثیں پیدا کر دی گئیں۔ چنانچہ خلود، احدیت، تثلیث، تفصیل، حُجّت، بُرہان، تاویل، وغیرہم نے وہ معانی پیدا کر لیے، جن کا صدرِ اول میں کسی سامعِ قرآن کو وہم و گمان بھی نہ ہُوا ہو گا ؛

(۷) اسی تخم کے یہ بھی برگ و بار ہیں کہ سمجھا گیا کہ قرآن کو وقت کی تحقیقاتِ علمیہ کا ساتھ دینا چاہیے۔ چنانچہ کوشش

کی گئی کہ نظامِ بطلیموسی اس پر چپکا یا جائے۔ ٹھیک اسی طرح جس طرح آج کل کے دانش فروشوں کا طریق تفسیر یہ ہے کہ موجودہ علم ہیئت کے مسائل قرآن پر چپکائے جائیں ؞

(۸) ہر کتاب اور تعلیم کے کچھ مرکزی مقاصد ہوتے ہیں، اور اُس کی تمام تفصیلات اُنھی کے گرد گردش کرتی ہیں۔ جب تک مراکز سمجھ میں نہ آئیں، دائرہ کی کوئی بات سمجھ میں نہیں آسکتی۔ قرآن کا بھی یہی حال ہے۔ اُس کے بھی چند مرکزی مقاصد و مہمّات ہیں، اور جب تک وہ صحیح طور پر نہ سمجھ لیے جائیں، اُس کی کوئی بات صحیح طور پر سمجھی نہیں جاسکتی ؞

متذکرۂ صدر اسباب سے جب اُس کے مرکزی مقاصد کی وضاحت باقی نہ رہی، تو قدرتی طور پر اُس کا ہر گوشہ اس سے متأثر ہوا۔ اُس کا کوئی بیان، کوئی تعلیم، کوئی استدلال، کوئی خطاب، کوئی اشارہ، کوئی اجمال، ایسا نہ رہا جو اس تأثر سے محفوظ ہو۔ افسوس یہ ہے کہ اختصار کا تقاضہ مثالیں پیش کرنے سے مانع ہے، اور بغیر مثال کے حقیقت واضح نہیں ہوسکتی۔ مثلاً آلِ عمران کی آیت وَمَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَغُلَّ (۱۶۱) کی تفسیر نکال کر دیکھو کیا دور از کار بحثیں نہیں کی گئیں؟ یہودیوں کے اس قول کی تعبیر میں کہ يَدُ اللهِ مَغْلُوْلَةٌ (۵: ۶۴) کن کن گوشوں میں نہیں نکل گئے، اور کس طرح محلِ بیان اور سیاق و سباق کا صاف صاف مقتضا نظر انداز کر دیا گیا؟

(۹) قرآن کے صحتِ فہم کے لیے عربی لغت و ادب کا صحیح ذوق شرطِ اوّل ہے، لیکن مختلف اسباب سے جن کی تشریح محتاجِ تفصیل ہے، یہ ذوق کمزور پڑتا گیا۔ یہاں تک کہ وہ وقت آگیا جب مطالب میں بے شمار اُلجھاؤ محض اس لیے پڑ گئے کہ عربیت کا ذوقِ سلیم باقی نہیں رہا، اور جس زبان میں قرآن نازل ہوا تھا، اُس کے محاورات و مدلولات سے یک قلم بُعد ہو گیا ؞

(۱۰) ہر عہد کا فکری اثر تمام علوم و فنون کی طرح تفسیر میں بھی کام کرتا رہا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ تاریخِ اسلام کا یہ پُر فخر واقعہ ہمیشہ یادگار رہیگا کہ علماءِ حق نے وقت کے سیاسی اثرات کے سامنے کبھی ہتھیار نہیں ڈالے، اور کبھی یہ بات گوارا نہ کی کہ اسلام کے عقائد و مسائل اُن سے اثر پذیر ہوں لیکن وقت کی تاثیر صرف سیاست ہی کے دروازے سے نہیں آتی۔ اس کے نفسیاتی مؤثرات کے بے شمار دروازے ہیں، اور جب کھُل جاتے ہیں تو کسی کے بند کیے بند نہیں ہوسکتے۔ اُن کے استیلا سے عقائد و اعمال محفوظ رکھے جاسکتے تھے، اور علماءِ حق نے محفوظ رکھے، لیکن دماغ محفوظ نہیں رکھے جاسکتے تھے، اور محفوظ نہیں رہے۔ یہاں ضرورت مثالوں کی ہے، لیکن اس کی مثالیں تفصیل طلب ہیں، اور اختصار کا تقاضہ اجازت نہیں دیتا ؞

(۱۱) چوتھی صدی ہجری کے بعد علومِ اسلامیہ کی تاریخ کا مجتہدانہ دور ختم ہو گیا، اور شواذ و نوادر کے علاوہ عام شاہراہ، تقلید کی شاہراہ ہو گئی۔ اس داءِ عُضال نے جسمِ تفسیر میں بھی پوری طرح سرایت کی۔ ہر شخص جو تفسیر کے لیے

قدم اُٹھاتا تھا، کسی پیش رو کو اپنے سامنے رکھ لیتا تھا، اور پھر آنکھیں بند کر کے اُس کے پیچھے پیچھے چلتا رہتا۔ اگر تیسری صدی میں کسی مُفسّر سے کوئی غلطی ہوگئی ہے، تو ضروری ہے کہ نویں صدی کی تفسیروں تک وہ برابر نقل در نقل ہوتی چلی آئے۔ کسی نے اِس کی ضرورت محسوس نہیں کی کہ چند لمحوں کے لیے تقلید سے الگ ہو کر تحقیق کرے کہ معاملہ کی اصلیت کیا ہے؟ رفتہ رفتہ تفسیر نویسی کی ہمتیں اس قدر پست ہوگئیں کہ کسی متداول تفسیر پر حاشیہ چڑھا دینے سے آگے نہ بڑھ سکیں۔ بیضاوی اور جلالین کے حاشیے دیکھو، ایک بنے ہوئے مکان کی لیپ پوت کرنے میں کس طرح قوتِ تصنیف رائگاں گئی ہے؟

(۱۲) زمانے کی بدذوقی نے بھی ہر کج اندیشی کو سہارا دیا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ قرونِ اخیرہ میں درس و تداول کے لیے وہی تفسیریں مقبول ہوئیں جو قدما کے محاسن سے یک قلم خالی تھیں۔ وقت کا یہ سوءِ انتخاب ہر علم و فن میں جاری رہا ہے۔ جو زمانہ جرجانی پر سکّاکی کو، اور سکّاکی پر تفتازانی کو ترجیح دیتا تھا، یقیناً اُس کے دربار سے بیضاوی و جلالین ہی کو حُسنِ قبول کی سند مل سکتی تھی!

(۱۳) متداول تفسیریں اُٹھا کر دیکھو جس مقام کی تفسیر میں متعدد اقوال موجود ہونگے، وہاں اکثر اُسی قول کو ترجیح دینگے جو سب سے زیادہ کمزور اور بے محل ہوگا، جو اقوال نقل کرینگے، اُن میں بہتر قول موجود ہوگا، لیکن اُسے نظر انداز کر دینگے!

(۱۴) اشکال و موانع کا بڑا دروازہ تفسیر بالرائے سے کھُل گیا جس کے اندیشے سے صحابہ و سلف کی روحیں لرزتی رہتی تھیں!

تفسیر بالرائے کا مطلب سمجھنے میں لوگوں کو لغزشیں ہوئی ہیں تفسیر بالرائے کی ممانعت سے مقصود یہ نہ تھا کہ قرآن کے مطالب میں عقل و بصیرت سے کام نہ لیا جائے۔ کیونکہ اگر یہ مطلب ہو تو پھر قرآن کا درس و مطالعہ ہی بےسود ہو جائے، حالانکہ خود قرآن کا یہ حال ہے کہ اوّل سے لے کر آخر تک تعقّل و تفکّر کی دعوت ہے، اور ہر جگہ مطالبہ کرتا ہے کہ افلا یتدبرون القرآن ام علی قلوب اقفالھا؟ (۴۷: ۲۴) دراصل تفسیر بالرائے میں "رائے" لغوی معنی میں نہیں ہے، بلکہ "رائے" مصطلحہ شارع ہے، اور اس سے مقصود ایسی تفسیر ہے جو اس لیے نہ کی جائے کہ خود قرآن کیا کہتا ہے، بلکہ اس لیے کی جائے کہ ہماری کوئی ٹھہرائی ہوئی رائے کیا چاہتی ہے، اور کس طرح قرآن کو کھینچ تان کر اُس کے مطابق کر دیا جا سکتا ہے۔

مثلاً جب باب عقائد میں ردّ و کد شروع ہوئی، تو مختلف مذاہب کلامیہ پیدا ہو گئے۔ ہر مذہب کے مناظر نے چاہا، اپنے مذہب پر نصوصِ قرآنیہ کو ڈھالے۔ وہ اس کی جستجو میں نہ تھے کہ قرآن کیا کہتا ہے؟ بلکہ ساری کاوش اس کی تھی کہ کسی طرح اُسے اپنے مذہب کا مؤید دکھلا دیں۔ اس طرح کی تفسیر، تفسیر بالرائے تھی!

یا مثلاً مذاہبِ فقہیہ کے مقلدوں میں جب تحزّب و تشیّع کے جذبات تیز ہوئے، تو اپنے اپنے مسائل کی ہم میں

آیات قرآنیہ کو کھینچنے تاننے لگے۔ اس کی کچھ فکر نہ تھی کہ لغت عربی کے صاف صاف معانی، اسلوبِ بیان کا قدرتی مقتضیٰ، عقل و بصیرت کا واضح فیصلہ کیا کہتا ہے؟ تمام تر کوشش یہ تھی کہ کسی نہ کسی طرح قرآن کو اپنے امام کے مذہب کے مطابق کر دکھایئے۔ یہ طریق تفسیر تفسیر بالرائے ہے!

یا مثلاً صوفیا کا ایک گروہ اسرار و بطون کی جستجو میں دور تک نکل گیا، اور پھر اپنے موضوعہ عقائد و مباحث پر قرآن کو ڈھالنے لگا۔ قرآن کا کوئی حکم، کوئی عقیدہ، کوئی بیان تحریفِ معنوی سے نہ بچا۔ یہ تفسیر تفسیر بالرائے تھی!

یا مثلاً قرآن کے طریقِ استدلال کو منطقی جامہ پہنانا، یا جہاں کہیں آسمان اور کواکب و نجوم کے الفاظ آگئے ہیں، یونانی علمِ ہیئت کے مسائل چپکانے لگنا، یقیناً تفسیر بالرائے ہے!

یا مثلاً، آج کل ہندوستان اور مصر کے بعض مدعیانِ اجتہاد و نظر نے یہ طریقہ اختیار کیا ہے کہ زمانۂ حال کے اصولِ علم و ترقی قرآن سے ثابت کیے جائیں۔ یا جدید تحقیقاتِ علمیہ کا اس سے استنباط کیا جائے۔ گویا قرآن صرف اسی لیے نازل ہوا ہے کہ جو بات کوپرنیکس اور نیوٹن نے یا ڈارون اور ویلس نے بغیر کسی الہامی کتاب کی فلسفۂ ندیشیوں کے دریافت کرلی، اُسے چند صدی پہلے معموں کی طرح دنیا کے کان میں پھونک دے، اور پھر وہ بھی صدیوں تک دنیا کی سمجھ میں نہ آئیں۔ یہاں تک کہ موجودہ زمانہ کے مفسر پیدا ہوں، اور تیرہ سو برس پیشتر کے معمے حل فرمائیں۔ یقیناً یہ طریق تفسیر بھی ٹھیک تفسیر بالرائے ہے!

جستجوئے حقیقت

یہ چند اشارات ہیں کہ اختصار کے تقاضے اور محل کی تنگنائی پر بھی حوالۂ قلم ہوئے، ورنہ شرح اس معاملہ کی بہت طولانی ہے:۔

تو خود حدیثِ مفصل بخواں ازیں مجمل!

کم از کم اِن مجمل اشارات سے اس بات کا اندازہ کرلیا جا سکتا ہے کہ راہ کی مشکلات و موانع کا کیا حال ہے، اور کس طرح قدم قدم پر پردوں کو ہٹانا، اور چپہ چپہ پر رکاوٹوں سے دوچار ہونا ہے۔ پھر رکاوٹیں کسی ایک گوشے ہی میں نہیں ہیں، اور مشکلات کسی ایک دروازے ہی سے نہیں آئی ہیں۔ بہ یک وقت ہر وادی کی پیمائش اور ہر گوشے میں نظر و کاوش ہونی چاہیے۔ تب کہیں جاکر حقیقتِ گم گشتہ کا سراغ مِل سکتا ہے۔ جہاں تک میرے امکان میں تھا میں نے کوشش کی ہے کہ اِن مرحلوں سے عُہدہ برآ ہوں۔ میں اس کوشش میں کہاں تک کامیاب ہوا ہوں؟ اس کا فیصلہ میں خود نہیں کرسکتا۔ البتہ یہ کہنے کی جرأت کرسکتا ہوں کہ قرآن کے مطالعۂ تدبر کی ایک نئی راہ ضرور کھل گئی ہے، اور اہلِ نظر اس راہ کو اُن تمام راہوں سے مختلف پائیں گے جن میں آج تک قدم فرسائی کرتے رہے تھے۔

ترجمان القرآن کا مقصد و نوعیت

قرآن کے درس و مطالعہ کی تین مختلف ضرورتیں ہیں، اور میں نے اُنھیں تین کتابوں میں منقسم کر دیا ہے: مقدمۂ تفسیر، تفسیر البیان، اور ترجمان القرآن۔ مقدمہ، تفسیر، قرآن کے مقاصد و مطالب پر

اصولی مباحث کا مجموعہ ہے اور کوشش کی گئی ہے کہ مطالبِ قرآنی کے جوامع وکلیات مدون ہو جائیں۔ تفسیر البیان نظر و مطالعہ کے لیے ہے، اور ترجمان القرآن قرآن کی عالمگیر تعلیم واشاعت کے لیے:

آخری کتاب سب سے پہلے شائع کی جاتی ہے، کیونکہ اپنے مقصد و نوعیت میں سب سے زیادہ اہم اور ضروری ہے، اور فی الحقیقت تفسیر و مقدمہ کے لیے بھی اصلی بنیاد یہی ہے:

اس کی ترتیب سے مقصود یہ ہے کہ مطالبِ قرآنی کے فہم و تدبر کے لیے ایک ایسی کتاب تیار ہو جائے، جس میں کتبِ تفسیر کی سی تفصیلات تو نہ ہوں، لیکن وہ سب کچھ ہو، جو قرآن کو ٹھیک ٹھیک سمجھ لینے کے لیے ضروری ہے۔ اس غرض سے جو اسلوب اختیار کیا گیا ہے، اُمید ہے کہ اہلِ نظر اُس کی موزونیت بہ یک نظر محسوس کرینگے۔ پہلے کوشش کی ہے کہ قرآن کا ترجمہ اُردو میں اس طرح مرتب ہو جائے کہ اپنی وضاحت میں کسی دوسری چیز کا محتاج نہ رہے۔ اپنی تشریحات خود اپنے ساتھ رکھتا ہو۔ پھر جا بجا نوٹوں کا اضافہ کیا ہے، جو سورت کے مطالب کی رفتار کے ساتھ ساتھ برابر چلے جاتے ہیں، اور جہاں کہیں ضرورت دیکھتے ہیں، مزید رہنمائی کے لیے نمودار ہو جاتے ہیں۔ یہ قدم قدم پر مطالب کی تفسیر کرتے ہیں، اجمال کو تفصیل کا رنگ دیتے ہیں، مقاصد و وجوہ سے پردے اُٹھاتے ہیں، دلائل و شواہد کو روشنی میں لاتے ہیں، احکام و نواہی کو مرتب و منضبط کرتے ہیں، اور زیادہ سے زیادہ مختصر لفظوں میں، زیادہ سے زیادہ معانی و معارف کا سرمایہ فراہم کرتے جاتے ہیں۔ یہ گویا قاریِ قرآن کے لیے تفکر و تدبر کی روشنی ہے، جو بحکم یسعیٰ نورھم بین ایدیھم وبایمانھم (۵۷: ۱۲) اس کے ساتھ ساتھ چلتی رہتی ہے، اور کہیں بھی اُس کا ساتھ نہیں چھوڑتی!

یہ حقیقت پیشِ نظر رہے کہ ترجمان القرآن کے نوٹ تشریح و وضاحت کا ایک مزید درجہ ہیں، ورنہ قرآن کا صاف صاف مطلب سمجھ لینے کے لیے متن کا ترجمہ پوری طرح کفایت کرتا ہے۔ میں نے تجربے کے لیے سورۂ بقرہ کا مجرد ترجمہ ایک پندرہ برس کے لڑکے کو دیا جو اُردو کی آسان کتابیں روانی کے ساتھ پڑھ لیتا تھا، پھر ہر موقع پر سوالات کر کے جانچا۔ جہاں تک مطلب سمجھ لینے کا تعلق ہے وہ ایک مقام پر بھی نہ اٹکا، اور تمام سوالوں کا جواب دیتا گیا۔ پھر ایک دوسرے شخص پر تجربہ کیا، جس نے بڑی عمر میں لکھنا پڑھنا سیکھا ہے، اور ابھی اُس کی استعداد اس سے زیادہ نہیں کہ اُردو کے تعلیمی رسائل بہ آسانی پڑھ لیتا تھا۔ یہ تین جگہ تین فارسی لفظوں پر اٹکا لیکن مطلب سمجھنے میں اسے بھی کوئی رکاوٹ پیش نہ آئی۔ میں نے وہ الفاظ بدل کر نسبۃً زیادہ سہل الفاظ رکھ دیے۔

نوٹوں کی ترتیب کا معاملہ نفسِ ترجمہ سے کم مشکل نہ تھا۔ یہ ظاہر ہے کہ ان کے لیے ایک محدود مقدار سے زیادہ جگہ نکل نہیں سکتی تھی، اور نوٹ، نوٹ نہ رہتے اگر ایک خاص مقدار سے کمیت یا تعداد میں زیادہ ہو جاتے لیکن ساتھ ہی ضروری تھا کہ کوئی اہم مقام تشنہ نہ رہ جائے، اور مقاصد و مطالبِ قرآنی کی تمام مہمات واضح ہو جائیں

پس پوری احتیاط کے ساتھ ایسا طریق بیان اختیار کیا گیا ہے کہ لفظ کم سے کم ہیں، لیکن اشارات زیادہ سے زیادہ سمیٹ لیے گئے ہیں۔ جس چیز کی لوگ کمی پائینگے، وہ صرف مطالب کا پھیلاؤ ہے۔ نفسِ مطالب میں کوئی کمی محسوس نہ ہوگی۔ اُن کے ہر لفظ اور ہر جملہ پر جس قدر غور کیا جائیگا، مطالب و مباحث کے نئے نئے دفتر کھلتے جائینگے۔

مثلاً سورۂ بقرہ کی آیت عدّۃ طلاق پر ایک نوٹ ہے "طلاق کی عدت کا ایک مناسب زمانہ مقرر کر کے نکاح کی اہمیت، نسب کے تحفظ، اور عورت کے نکاحِ ثانی کی سہولتوں کا انتظام کر دیا گیا" (۲۵۳) یہ نہایت مختصر جملہ ہے لیکن اسی میں عدتِ طلاق کے تعین کی وہ تینوں مصلحتیں واضح کر دی گئی ہیں، جن میں سے ہر مصلحت کی بحث تفسیر کے ایک پورے صفحے میں بمشکل آتی۔ نکاح کی اہمیت چاہتی تھی کہ یہ رشتہ ایسا بن کر نہ رہ جائے، کہ ادھر ختم ہوا اور اُدھر از سرِ نو شروع ہو گیا۔ ہر دو رشتوں کے درمیان کچھ نہ کچھ فصل اور انتظار کی حالت ضرور ہونی چاہیے۔ نسب کا تحفظ بھی چاہتا تھا کہ اتنا وقفہ ضرور گزر جائے کہ حمل کا شبہ باقی نہ رہے لیکن ساتھ ہی اس کی رعایت بھی ضروری تھی کہ عورت کے نکاحِ ثانی کے حقوق میں بیجا دست اندازی نہ ہو۔ پس قرآن نے ایک ایسی مدت ٹھہرا دی جس سے ایک طرف تو پہلی اور دوسری مصلحت پوری ہو گئی، دوسری طرف تیسری مصلحت میں بھی خلل نہیں پڑا۔ کیونکہ ابتدائی دو مصلحتوں کے لیے کم سے کم مدت ہے جو قرار دی گئی ہے۔ یہ تمام تشریحات نوٹ میں نہیں آسکتی تھیں، اور نہیں آئی ہیں، لیکن اصل مطلب پورا پورا آگیا ہے۔ ضرورت صرف اس کی ہے کہ مطالعہ کے وقت غور و فکر کا سر رشتہ ہاتھ سے نہ چھوٹے۔

تفسیر سورۂ فاتحہ

پہلی جلد کی ابتدا میں سورۂ فاتحہ کی تفسیر کا ملخص بھی شامل کر دیا گیا ہے، کیونکہ وہ سورۂ فاتحہ کی تفسیر، ترجمۂ قرآن کے لیے اُس کا قدرتی مقدمہ تھی، اور ضروری تھا کہ کم از کم یہ مقدمہ، تلاوتِ ترجمہ سے پہلے ذہن نشین ہو جائے۔

البتہ یہ تفسیر سورۂ فاتحہ کا خلاصہ ہے۔ اس میں مباحث کے پھیلاؤ سمیٹ دیے ہیں، تفصیلات کو جابجا مختصر کر دیا ہے۔ تمہید و توطیہ کی قسم کی تمام چیزیں نکال دی ہیں، لیکن نفسِ مطالب میں بجز ایک مقام کے کوئی کمی نہیں کی ہے۔ یہ مقام صفاتِ الٰہی کے تصور کے مباحث کا ہے۔ اس میں ایک بڑا حصہ صفاتِ الٰہی کے اُن مباحث کا تھا جن کا تعلق زیادہ تر فلسفہ و کلام کے قدیم مذاہب و مباحث سے ہے۔ نیز فرداً فرداً اُن تمام صفات پر نظر ڈالی گئی تھی جو قرآن حکیم میں آئے ہیں۔ چونکہ یہ حصہ عام مطالعہ اور دلچسپی کا نہ تھا، اس لیے ترجمان القرآن میں اس کی موجودگی ضرورت سے زیادہ محسوس ہوئی، اور اسے الگ کر دیا گیا۔

خاتمہ

آخر میں چند الفاظ اس پورے سلسلۂ ترجمہ و تفسیر کی نسبت کہہ دینا ضروری ہیں۔ کامل ستائیس برس سے قرآن میرے شب و روز کے فکر و نظر کا موضوع رہا ہے۔ اس کی ایک ایک سورت، ایک ایک مقام،

ایک ایک آیت، ایک ایک لفظ پر میں نے وادیاں قطع کی ہیں، اور مرحلوں پر مرحلے طے کیے ہیں۔ تفاسیر و کتب کا جتنا مطبوعہ و غیر مطبوعہ ذخیرہ موجود ہے، میں کہہ سکتا ہوں کہ اُس کا بڑا حصہ میری نظر سے گزر چکا ہے، اور علومِ قرآن کے مباحث و مقالات کا کوئی گوشہ نہیں جس کی طرف سے حتّی الوسع ذہن نے تغافل اور جستجو نے تساہل کیا ہو۔ علم و نظر کی راہوں میں آج کل قدیم و جدید کی تقسیمیں کی جاتی ہیں، لیکن میرے لیے یہ تقسیمیں بھی کوئی تقسیم نہیں۔ جو کچھ قدیم ہے، وہ مجھے ورثہ میں ملا، اور جو کچھ جدید ہے، اُس کے لیے اپنی راہیں آپ نکال لیں۔ میرے لیے وقت کی جدید راہیں بھی ویسی ہی دیکھی بھالی ہیں جس طرح قدیم راہوں میں گام فرسائی کرتا رہا ہوں:

رہا ہوں رند بھی میں اور پارسا بھی میں مری نظر میں ہیں رندان و پارسا اک ایک!

خاندان، تعلیم، اور سوسائٹی کے اثرات نے جو کچھ میرے حوالے کیا تھا، میں نے اوّل روز ہی اُس پر قناعت کرنے سے انکار کر دیا، اور تقلید کی بندشیں کسی گوشے میں بھی روک نہ ہو سکیں، اور تحقیق کی تشنگی نے کسی میدان میں بھی ساتھ نہ چھوڑا:

ہیچ گہ ذوقِ طلب از جستجو بازم نہ داشت دانہ می چیدم دراں روزے کہ خرمن داشتم!

میرے دل کا کوئی یقین ایسا نہیں ہے جس میں شک کے سارے کانٹے نہ چبھ چکے ہوں، اور میری روح کا کوئی اعتقاد ایسا نہیں ہے جو انکار کی ساری آزمائشوں میں سے نہ گزر چکا ہو۔ میں نے زہر کے گھونٹ بھی ہر جام سے پیے ہیں، اور تریاق کے نسخے بھی ہر دار الشفاء کے آزمائے ہیں۔ میں جب پیاسا تھا، تو میری لب تشنگیاں دوسروں کی طرح نہ تھیں، اور جب سیراب ہوا، تو میری سیرابی کا سرچشمہ بھی شاہراہِ عام پر نہ تھا:

راہے کہ خضر داشت، ز سرچشمہ دُور بود لب تشنگی ز راہِ دگر بردہ ایم ما!

اس تمام عرصے کی جستجو و طلب کے بعد، قرآن کو جیسا کچھ اور جتنا کچھ سمجھ سکا ہوں، میں نے اس کتاب کے صفحوں پر پھیلا دیا ہے:

شک زجائے نگیری، کہ بس گراں گہر ست متاعِ من کہ نصیبش مبادا ارزانی!

ماکان حدیثاً یفتری ولکن تصدیق الذی بین یدیہ وتفصیل کل شیٔ وھدی ورحمۃ لقوم یؤمنون: (۱۲:۱۱۱)

۱۶۔ نومبر سنہ ۱۹۳۰ء

ڈسٹرکٹ جیل میرٹھ

ابو الکلام

دیباچۂ طبعِ ثانی

آزمودیم، بزورِ مئے امسال نہ بود
قدحے داشت خم از بادۂ پارینۂ ما

انسان کے نقص و درماندگی کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ اُس کے کام کبھی جامۂ تکمیل سے آراستہ نہیں ہوسکتے۔ وہ آج ایک کام کرکے اُٹھتا ہے اور سمجھتا ہے، اُسے مکمل کرچکا، مگر پھر دوسرے دن دیکھتا ہے تو خود اُس کی نگاہ کی جانچ بدل جاتی ہے، اور معلوم ہوتا ہے کہ طرح طرح کی خامیاں رہ گئی تھیں۔ ہر اہلِ قلم جو اپنے پچھلے آثار پر نظر ڈالیگا، اس قول کی صداقت معلوم کریگا۔

میں نے ترجمان القرآن جلد اوّل پر اب کئی سال کے بعد نظر ڈالی، تو یہی معاملہ پیش آیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ از سرِ نو پوری تفسیر اور ترجمے کی نظرِ ثانی کرنی پڑی اور مطالعے نے ایک دوسرا ہی آب و رنگ پیدا کرلیا۔

اس سلسلے میں حسبِ ذیل تبدیلیاں خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہیں:

(۱) تفسیرِ سورۂ فاتحہ میں جا بجا نئے مطالب کا اضافہ کیا گیا جو طبعِ اوّل میں نظر انداز کردیے گئے تھے۔ اِن اضافوں سے اب تفسیر کی مقدار تقریباً ڈیوڑھی ہوگئی ہے۔

بڑا اضافہ قرآن کے "تصورِ الٰہی" کے مبحث میں کیا گیا ہے۔

صفاتِ الٰہی کا مسئلہ ایک نہایت دقیق اور پیچیدہ مسئلہ ہے۔ اس کے بحث و نظر کی سرحد ایک طرف مابعد الطبعیات (Metaphysics) سے جا ملی ہے، دوسری طرف مذہب سے، اور دونوں نے یکساں طور پر اُسے اپنے حلقۂ فکر کا موضوع تصور کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ علم و نظر کے ہر دور میں علماءِ مذاہب سے زیادہ فلسفیوں کی کاوشوں نے اس میں حصہ لیا، اور ہندوستان، یونان، اسکندریہ، اور قرونِ وسطیٰ کے فلسفیانہ مباحث کا ایک بڑا ذخیرہ فراہم ہوگیا۔ مسلمانوں میں جب علمِ توحید و کلام کی بحثوں نے سر اٹھایا تو اسی مسئلے میں سب سے زیادہ ردّ و کد ہوئی اور مختلف مذاہب پیدا ہوگئے۔ اصحابِ حدیث اور اشاعرہ کا سب سے بڑا اختلاف اسی دروازے سے آیا تھا۔

یہ مسئلہ بھی من جملہ اُن مسئلوں کے ہے جو طالب علمی کے زمانے میں میرے لیے سخت شکوک و خلجان کا باعث ہوچکے

تھے اور مدتوں حیران و سرگشتہ رہا تھا۔ بالآخر جب حقیقتِ حال منکشف ہوئی تو معلوم ہوا کہ متکلمین کی رہنمائی اس راہ میں کچھ سود مند نہیں ہو سکتی۔ بلکہ منزلِ مقصود سے اور زیادہ دور کر دیتی ہے یقین و طمانیت کی اگر راہ ہے تو وہی ہے جو ظواہرِ قرآن نے اختیار کی ہے اور جس سے متبعینِ سلف منحرف ہونا پسند نہیں کرتے تھے:۔

چندانکہ دست و پا زدم، آشفتہ تر شدم
ساکن شدم، میانۂ دریا کنار شد!

اس جستجو و طلب نے بالآخر جن نتیجوں تک پہنچایا تھا، وہ بالاختصار اس مقام میں واضح کر دیے گئے ہیں:

فلسفہ و کلام میں یہ مباحث نہایت پیچیدہ اور فنی مصطلحات کی گرہوں میں اُلجھے ہوئے ہیں۔ میں نے کوشش کی ہے کہ ان گرہوں کو کھول دوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اب یہ مبحث اس درجہ واضح ہو گیا ہے کہ جو حضرات اسلامی علوم کے فنی اور مصطلحاتی طریقہ سے آشنا نہیں ہیں، وہ بھی اس میں دلچسپی لے سکینگے۔ جہاں کہیں فلسفہ و کلام کی عربی مصطلحات آگئی ہیں، وہاں انگریزی مصطلحات بھی دے دی گئی ہیں تاکہ موجودہ زمانے کے فلسفیانہ مباحث سے ذوق رکھنے والوں کو فہمِ مطالب میں دشواری پیش نہ آئے:

(۲) "تصورِ الٰہی" کے مبحث میں مذاہبِ عالم کے اعتقادی تصوروں کا بھی ذکر آگیا تھا، لیکن طبعِ اوّل میں صرف اشارات سے کام لیا گیا، کیونکہ دائرۂ بحث کو زیادہ پھیلانا منظور نہ تھا۔ لیکن اب اس مقام پر دوبارہ نظر ڈالی گئی تو محسوس ہوا کہ مبحث تشنہ رہ گیا ہے، اور ضروری ہے کہ رشتۂ بیان کو ایک خاص حد تک بڑھنے دیا جائے چنانچہ یہ حصہ اب از سرِ نو لکھا گیا اور جس حد تک محل کا مقتضیٰ اجازت دیتا تھا، شرح و تفصیل کی باگ ڈھیلی چھوڑ دی گئی:

(۳) طبعِ اوّل میں صرف ابواب کی تقسیم کافی سمجھی گئی تھی۔ اب جا بجا حاشیے کے عنوان بھی بڑھا دیے ہیں۔ اس اضافے سے تمام مطالب اس طرح منضبط ہو گئے کہ بہ یک نظر ان کا خلاصہ معلوم کر لیا جا سکتا ہے:

(۴) پورے ترجمے پر نظرِ ثانی کی گئی، اور یہ اصل پیشِ نظر رہی کہ زیادہ سے زیادہ وضاحت کے ساتھ سررشتۂ ایجاز بھی ہاتھ سے نہ چھوٹے، نیز جہاں تک متن کا لفظی اتباع کیا جا سکتا ہے، اُسے قائم رکھا جائے جن حضرات کی نظر سے پچھلی طباعت کا ترجمہ گزر چکا ہے، وہ اب اس کا مطالعہ کرینگے تو ہر دوسری تیسری سطر میں کوئی نہ کوئی تبدیلی اُنہیں ضرور محسوس ہوگی:

(۵) ترجمے کے تشریحی نوٹوں میں بھی جا بجا اضافے کیے گئے ہیں:

بہ حیثیت مجموعی یہ طباعت پچھلی طباعت سے اپنی خصوصیات میں اس درجہ مختلف ہو گئی ہے کہ میں خیال کرتا ہوں، جن حضرات کی نظر سے پچھلی طباعت گزر چکی ہے، وہ بھی اس سے بے نیاز نہیں ہو سکتے:

وہ نقشِ اوّل تھا۔ یہ نقشِ ثانی ہے ٭

قید خانۂ قلعۂ احمد نگر

۷۔ فروری ۱۹۴۵ء ابوالکلام

اُمُّ القرآن

یعنی

تفسیر سُورۂ فاتحہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سُورۂ فاتحہ

(۱)

سُورت کی اہمیت اور خصوصیات

یہ قرآن کی سب سے پہلی سورت ہے۔ اس لیے فاتحۃ الکتاب کے نام سے پکاری جاتی ہے۔

جو بات زیادہ اہم ہوتی ہے، قدرتی طور پر پہلی اور نمایاں جگہ پاتی ہے۔ یہ سورت قرآن کی تمام سورتوں میں خاص اہمیت رکھتی تھی۔ اس لیے قدرتی طور پر اس کی موزوں جگہ قرآن کے پہلے صفحے ہی میں قرار پائی۔ چنانچہ خود قرآن نے اِس کا ذکر ایسے لفظوں میں کیا ہے جس سے اِس کی اہمیت کا پتہ چلتا ہے:۔

وَلَقَدۡ اٰتَیۡنٰکَ سَبۡعًا مِّنَ الۡمَثَانِیۡ وَالۡقُرۡاٰنَ الۡعَظِیۡمَ (۱۵: ۸۷)

اے پیغمبر! یہ واقعہ ہے کہ ہم نے تمہیں سات دُہرائی جانے والی چیزیں عطا فرمائیں اور قرآنِ عظیم۔

احادیث و آثار سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ اس آیت میں "سات دُہرائی جانے والی چیزوں" سے مقصود یہی سورت ہے، کیونکہ یہ سات آیتوں کا مجموعہ ہے اور ہمیشہ نماز میں دُہرائی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس سورت کو سبع المثانی بھی کہتے ہیں[1]۔

---

[1] امام بخاری اور اصحابِ سُنن نے ابو سعید بن المعلّٰی سے روایت کی ہے: الحمد للہ رب العٰلمین، ھی السبع المثانی والقرآن العظیم الذی اوتیتہ۔ اور امام مالک، ترمذی، اور حاکم نے ابو ہریرہؓ سے روایت کی ہے کہ آنحضرت صلعم نے ابی ابن کعبؓ کو سورۂ فاتحہ تلقین کی اور یہی الفاظ فرمائے۔ اسی طرح طبری نے حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ، حضرت ابن عباسؓ اور ابن مسعود وغیرہم سے روایت کی ہے کہ السبع المثانی فاتحۃ الکتاب۔ ابن مسعودؓ کی اسناد منقطع ہے۔ لیکن ابن عباس کی حسن ہے۔ ابو العالیہ سے بھی ایسا ہی مروی ہے۔ اس کے علاوہ ائمۂ تابعین کی ایک بڑی جماعت اسی طرف گئی ہے۔ حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں تمام روایات جمع کر دی ہیں۔
(شرح کتاب التفسیر جلد ۸۔ صفحہ ۱۲۰۔ طبع اولیٰ)

احادیث و آثار میں اس کے دوسرے نام بھی آئے ہیں جن سے اس کی خصوصیات کا پتہ چلتا ہے۔ مثلاً اُمّ القرآن، الکافیہ، الکنز، اساس القرآن ؏

عربی میں "اُمّ" کا اطلاق تمام ایسی چیزوں پر ہوتا ہے جو ایک طرح کی جامعیت رکھتی ہوں، یا بہت سی چیزوں میں مقدّم اور نمایاں ہوں، یا پھر کوئی ایسی اوپر کی چیز ہو جس کے نیچے اس کے بہت سے توابع ہوں۔ چنانچہ سر کے درمیانی حصّے کو اُمّ الراس کہتے ہیں کیونکہ وہ دماغ کا مرکز ہے۔ فوج کے جھنڈے کو اُمّ کہتے ہیں کیونکہ تمام فوج اُسی کے نیچے جمع ہوتی ہے۔ مکّہ کو اُمّ القریٰ کہتے تھے، کیونکہ خانۂ کعبہ اور حج کی وجہ سے عرب کی تمام آبادیوں کے جمع ہونے کی جگہ تھی۔ پس اِس سورت کو اُمّ القرآن کہنے کا مطلب یہ ہُوا کہ یہ ایک ایسی سورت ہے جس میں مطالبِ قرآنی کی جامعیت اور مرکزیت ہے، یا جو قرآن کی تمام سورتوں میں اپنی نمایاں اور مقدّم جگہ رکھتی ہے ؏

اساس القرآن کے معنی ہیں قرآن کی بنیاد۔ الکافیہ کے معنی ہیں ایسی چیز جو کفایت کرنے والی ہو۔ الکنز خزانہ کو کہتے ہیں ؏

علاوہ بریں ایک سے زیادہ حدیثیں موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سورت کے یہ اوصاف عہدِ نبوت میں عام طور پر مشہور تھے۔ ایک حدیث میں ہے کہ آنحضرت (صلّی اللہ علیہ وسلّم) نے اُبیّ بن کعب کو یہ سورت تلقین کی اور فرمایا "اس کے مثل کوئی سورت نہیں"[۱] ایک دوسری روایت میں اسے "سب سے بڑی سورت" اور "سب سے بہتر سورت" بھی فرمایا ہے[۲] ؏

> سورۂ فاتحہ میں دینِ حق کے تمام مقاصد کا خلاصہ موجود ہے

چنانچہ اس سورت کے مطالب پر نظر ڈالتے ہی یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اس میں اور قرآن کے بقیہ حصّے میں اجمال اور تفصیل کا سا تعلّق پیدا ہو گیا ہے، یعنی قرآن کی تمام سورتوں میں دینِ حق کے جو مقاصد بہ تفصیل بیان کیے گئے ہیں، سورۂ فاتحہ میں انہی کا بہ شکل اجمال بیان موجود ہے اگر ایک شخص قرآن میں سے اور کچھ نہ پڑھ سکے، صرف اس سورت کے مطالب ذہن نشین کر لے۔ جب بھی وہ دینِ حق اور خدا پرستی کے بنیادی مقاصد معلوم کر لیگا، اور یہی قرآن کی تمام تفصیلات کا ماحصل ہے ؏

علاوہ بریں جب اِس پہلو پر غور کیا جائے کہ سورت کا پیرایہ دعائیہ ہے اور اسے روزانہ عبادت کا ایک لازمی جزو قرار دیا گیا ہے، تو اس کی یہ خصوصیت اور زیادہ نمایاں ہو جاتی ہے، اور واضح ہو جاتا ہے کہ اِس اجمال و تفصیل میں بہت بڑی مصلحت پوشیدہ تھی۔ مقصود یہ تھا کہ قرآن کے مفصل بیانات کا ایک مختصر اور سیدھا سادہ خلاصہ بھی ہو جسے ہر انسان بہ آسانی ذہن نشین کر لے، اور پھر ہمیشہ اپنی دعاؤں اور عبادتوں میں دُہراتا رہے۔ یہ اُس کی دینی زندگی کا

---

[۱] صحیح بخاری، موطا، ابوداؤد، ابن ماجہ، اور مُسند میں بہ اختلافِ الفاظ اس مضمون کی روایات موجود ہیں ۱۲

[۲] ابوسعید بن معلّی کی روایت میں جس کی تخریج پچھلے حاشیہ میں گزر چکی ہے، اسے اعظم سورۃ فی القرآن فرمایا ہے، اور مسند کی روایت ابن جابر میں اخیر کا لفظ ہے ۲

دستور العمل، خدا پرستی کے عقائد کا خلاصہ، اور رُوحانی تصوّرات کا نصبُ العین ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے اس سورت کا ذکر کرتے ہوئے سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِیْ کہہ کر اس کی خصوصیت کی طرف اشارہ کر دیا۔ یعنی ہمیشہ دُہرائے جانے اور وِرد رکھنے ہی میں اس کے نزول کی حکمت پوشیدہ ہے۔ کوئی شخص کتنا ہی نادان اور اَن پڑھ ہو، لیکن ان چار سطروں کا یاد کر لینا اور اُن کا سیدھا سادہ مطلب سمجھ لینا اُس کے لیے کچھ دشوار نہیں ہو سکتا۔ اگر ایک انسان اس سے زیادہ قرآن میں سے کچھ نہ پڑھ سکا، جب بھی اُس نے دینِ حق کا بنیادی سبق حاصل کر لیا۔ یہی وجہ ہے کہ ہر مسلمان کے لیے اِس سورت کا سیکھنا اور پڑھنا ناگزیر ہوا۔ اور نماز کی دعا اس کے سوا کوئی نہ ہو سکی، کہ لَا صَلٰوۃَ اِلَّا بفاتحۃ الکتاب (صحیحین) اور اسی لیے صحابہؓ کرام اسے سُورۃُ الصلوٰۃ کے نام سے پکارتے تھے۔ یعنی وہ سورت جس کے بغیر نماز نہیں پڑھی جا سکتی۔ ایک انسان اس سے زیادہ قرآن میں سے جس قدر پڑھے اور سیکھے، مزید معرفت و بصیرت کا ذریعہ ہوگا، لیکن اس سے کم کوئی چیز نہیں ہو سکتی۔

دینِ حق کا ماحصل

دینِ حق کا تمام تر ماحصل کیا ہے؟ جس قدر غور کیا جائیگا اِن چار باتوں سے باہر کوئی بات دکھائی نہ دیگی:

(۱) خدا کی صفات کا ٹھیک ٹھیک تصوّر، اس لیے کہ انسان کو خدا پرستی کی راہ میں جس قدر ٹھوکریں لگی ہیں، صفات ہی کے تصوّر میں لگی ہیں۔

(۲) قانونِ مجازات کا اعتقاد یعنی جس طرح دنیا میں ہر چیز کا ایک خاصہ اور قدرتی تاثیر ہے، اُسی طرح انسانی اعمال کے بھی معنوی خواص اور نتائج ہیں۔ نیک عمل کا نتیجہ اچھائی ہے۔ بُرے کا بُرائی۔

(۳) معاد کا یقین۔ یعنی انسان کی زندگی اِسی دُنیا میں ختم نہیں ہو جاتی۔ اِس کے بعد بھی زندگی ہے، اور جزا کا معاملہ پیش آنے والا ہے۔

(۴) فلاح و سعادت کی راہ اور اُس کی پہچان۔

سورۂ فاتحہ کا اسلوبِ بیان

اب غور کرو، ان باتوں کا خلاصہ اس سورت میں کس خوبی کے ساتھ جمع کر دیا گیا ہے! ایک طرف زیادہ سے زیادہ مختصر حتّٰی کہ گنے ہوئے الفاظ ہیں، دوسری طرف ایسے جچے تُلے الفاظ کہ اُن کے معانی سے پوری وضاحت اور دلنشینی پیدا ہو گئی ہے۔ ساتھ ہی نہایت سیدھا سادہ بیان ہے۔ کسی طرح کا پیچ و خم نہیں۔ کسی طرح کا الجھاؤ نہیں۔

یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ دنیا میں جو چیز جتنی زیادہ حقیقت سے قریب ہوتی ہے، اُتنی ہی زیادہ سہل اور دلنشین بھی ہوتی ہے، اور خود فطرت کا یہ حال ہے کہ کسی گوشے میں بھی اُلجھی ہوئی نہیں ہے۔ اُلجھاؤ جس قدر بھی پیدا ہوتا ہے، بناوٹ اور تکلف سے پیدا ہوتا ہے۔ پس جو بات سچی اور حقیقی ہوگی، ضروری ہے کہ سیدھی سادی اور دلنشین بھی ہو۔

دل نشینی کی انتہا یہ ہے کہ جب کبھی کوئی ایسی بات تمہارے سامنے آجائے، تو ذہن کو کسی طرح کی اجنبیت محسوس نہ ہو۔ وہ اس طرح قبول کرلے، گویا پیشتر سے سمجھی بوجھی ہوئی بات تھی۔ اُردو کے ایک شاعر نے اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے:

دیکھنا تقریر کی لذت، کہ جو اُس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے!

اب غور کرو، جہاں تک انسان کی خداپرستی اور خداپرستی کے تصوّرات کا تعلق ہے، اس سے زیادہ سیدھی سادی باتیں اور کیا ہو سکتی ہیں جو اس سورت میں بیان کی گئی ہیں، اور پھر اس سے زیادہ سہل اور دلنشین اسلوبِ بیان کیا ہو سکتا ہے؟ سات چھوٹے چھوٹے بول ہیں۔ ہر بول چار پانچ لفظوں سے زیادہ کا نہیں، اور ہر لفظ صاف اور دل نشین معانی کا نگینہ ہے جو اس انگوٹھی میں جڑ دیا گیا ہے۔ اللہ کو مخاطب کرکے اُن صفتوں سے پکارا گیا ہے جن کا جلوہ شب و روز انسان کے مشاہدے میں آتا رہتا ہے، اگرچہ اپنی جہالت و غفلت سے اُن میں غور و تفکر نہیں کرتا۔ پھر اُس کی بندگی کا اقرار ہے، اُس کی مددگاریوں کا اعتراف ہے، اور زندگی کی لغزشوں سے بچ کر سیدھی راہ لگ چلنے کی طلبگاری ہے۔ کوئی مشکل خیال نہیں، کوئی انوکھی بات نہیں، کوئی عجیب و غریب راز نہیں۔ اب کہ ہم بار بار یہ سورت پڑھتے رہتے ہیں، اور صدیوں سے اس کے مطالب نوعِ انسانی کے سامنے ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے، گویا ہمارے دینی تصوّرات کی ایک بہت ہی معمولی سی بات ہے، لیکن یہی معمولی بات جس وقت تک دُنیا کے سامنے نہیں آئی تھی، اِس سے زیادہ کوئی غیر معلوم اور ناقابلِ حل بات بھی نہ تھی۔ دنیا میں حقیقت اور سچائی کی ہر بات کا یہی حال ہے جب تک سامنے نہیں آتی، معلوم ہوتا ہے، اُس سے زیادہ مشکل بات کوئی نہیں۔ جب سامنے آجاتی ہے تو معلوم ہوتا ہے، اس سے زیادہ، صاف اور سہل بات اور کیا ہو سکتی ہے؟ عرفی نے یہی حقیقت ایک دوسرے پیرایے میں بیان کی ہے:

ہر کس نشناسندۂ راز ست، وگرنہ
اینہا ہمہ راز ست کہ معلومِ عوام ست!

دنیا میں جب کبھی وحیِ الٰہی کی ہدایت نمودار ہوئی ہے اُس نے یہ نہیں کیا ہے کہ انسان کو نئی نئی باتیں سکھا دی ہوں، کیونکہ خداپرستی کے بارے میں کوئی انوکھی بات سکھائی ہی نہیں جا سکتی۔ اُس کا کام صرف یہ رہا ہے کہ انسان کے وجدانی عقائد کو علم و اعتراف کی ٹھیک ٹھیک تعبیر بتا دے، اور یہی سورۂ فاتحہ کی خصوصیت ہے۔ اس سورت نے نوعِ انسانی کے وجدانی تصوّرات ایک ایسی تعبیر سے سنوار دیے کہ ہر عقیدہ، ہر فکر، ہر جذبہ، اپنی حقیقی شکل و نوعیت میں نمودار ہو گیا، اور چونکہ یہ تعبیر حقیقتِ حال کی سچّی تعبیر ہے، اس لیے جب کبھی ایک انسان راست بازی کے ساتھ اس پر غور کریگا، بے اختیار پکار اُٹھیگا کہ اس کا ہر بول اور ہر لفظ اُس کے دل و دماغ کی قدرتی آواز ہے!

دینِ حق کی مہمات

پھر دیکھو، اگرچہ اپنی نوعیّت میں وہ اس سے زیادہ کچھ نہیں ہے کہ ایک خداپرست انسان کی سیدھی سادی

دعا ہے، لیکن کس طرح اس کے ہر لفظ اور ہر اسلوب سے دینِ حق کا کوئی نہ کوئی اہم مقصد واضح ہوگیا ہے، اور کس طرح اُس کے الفاظ نہایت اہم معانی و دقائق کی نگرانی کر رہے ہیں!

(۱) خدا کے تصور کے بارے میں انسان کی ایک بڑی غلطی یہ رہی ہے کہ اس تصور کو محبت کی جگہ خوف و دہشت کی چیز بنالیتا تھا۔ سورۂ فاتحہ کے سب سے پہلے لفظ نے اس گمراہی کا ازالہ کر دیا!

اُس کی ابتدا حمد کے اعتراف سے ہوتی ہے۔ حمد ثناءِ جمیل کو کہتے ہیں۔ یعنی اچھی صفتوں کی تعریف کرنے کو۔ ثناءِ جمیل اُسی کی کی جا سکتی ہے جس میں خوبی و جمال ہو۔ پس حمد کے ساتھ خوف و دہشت کا تصور جمع نہیں ہو سکتا۔ جو ذات محمود ہوگی، وہ خوفناک نہیں ہو سکتی۔

پھر حمد کے بعد خدا کی عالمگیر ربوبیت، رحمت اور عدالت کا ذکر کیا ہے، اور اس طرح صفاتِ الٰہی کی ایک ایسی مکمل شبیہ کھینچ دی ہے جو انسان کو وہ سب کچھ دے دیتی ہے جس کی انسانیت کے نشوونما و ارتقا کے لیے ضرورت ہے، اور اُن تمام گمراہیوں سے محفوظ کر دیتی ہے جو اس راہ میں اُسے پیش آسکتی ہیں۔

(۲) رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ میں خدا کی عالمگیر ربوبیت کا اعتراف ہے جو ہر فرد، ہر جماعت، ہر قوم، ہر ملک، ہر گوشۂ وجود کے لیے ہے، اور اس لیے یہ اعتراف ان تمام تنگ نظریوں کا خاتمہ کر دیتا ہے جو دنیا کی مختلف قوموں اور نسلوں میں پیدا ہوگئی تھیں، اور ہر قوم اپنی جگہ سمجھنے لگی تھی کہ خدا کی برکتیں اور سعادتیں صرف اُسی کے لیے ہیں۔ کسی دوسری قوم کا اُن میں حصہ نہیں۔

(۳) مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ میں "الدین" کا لفظ جزاء کے قانون کا اعتراف ہے، اور جزاء کو 'دین' کے لفظ سے تعبیر کر کے یہ حقیقت واضح کر دی ہے کہ جزاء انسانی اعمال کے قدرتی نتائج و خواص ہیں۔ یہ بات نہیں ہے کہ خدا کا غضب و انتقام بندوں کو عذاب دینا چاہتا ہو، کیونکہ "الدین" کے معنی بدلہ اور مکافات کے ہیں۔

(۴) ربوبیت اور رحمت کے بعد مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ کے وصف نے یہ حقیقت بھی آشکارا کر دی کہ اگر کائنات میں صفاتِ رحمت و جمال کے ساتھ قہر و جلال بھی اپنی نمود رکھتی ہیں، تو یہ اس لیے نہیں کہ پروردگارِ عالم میں غضب و انتقام ہے، بلکہ اس لیے ہے کہ وہ عادل ہے، اور اُس کی حکمت نے ہر چیز کے لیے اُس کا ایک خاصہ اور نتیجہ مقرر کر دیا ہے۔ عدل منافی رحمت نہیں، بلکہ عینِ رحمت ہے۔

(۵) عبادت کے لیے یہ نہیں کہا کہ نعبدك بلکہ کہا اِيَّاكَ نَعْبُدُ۔ یعنی یہ نہیں کہا کہ "تیری عبادت کرتے ہیں" بلکہ حصر کے ساتھ کہا "صرف تیری ہی عبادت کرتے ہیں"۔ اور پھر اس کے ساتھ اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ کہہ کر استعانت کا بھی اسی حصر کے ساتھ ذکر کر دیا۔ اس اسلوبِ بیان نے توحید کے تمام مقاصد پورے کر دیے اور شرک کی ساری راہیں بند ہوگئیں!

(۶) سعادت و فلاح کی راہ کو صِرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ یعنی سیدھی راہ سے تعبیر کیا جس سے زیادہ بہتر اور قدرتی

تعبیر نہیں ہوسکتی۔ کیونکہ کوئی نہیں جو سیدھی راہ اور ٹیڑھی راہ میں امتیاز نہ رکھتا ہو، اور پہلی راہ کا خواہشمند نہ ہو؛

(۷) پھر اُس کے لیے ایک ایسی سیدھی سادی اور جانی بوجھی ہوئی شناخت بتادی جس کا اِذعان قدرتی طور پر ہر انسان کے اندر موجود ہے، اور جو محض ایک ذہنی تعریف ہونے کی جگہ ایک موجود و مشہود حقیقت نمایاں کردیتی ہے۔ یعنی وہ راہ جو انعام یافتہ انسانوں کی راہ ہے۔ کوئی ملک، کوئی قوم، کوئی زمانہ، کوئی فرد ہو، لیکن انسان ہمیشہ دیکھتا ہے کہ زندگی کی دو راہیں یہاں صاف موجود ہیں۔ ایک راہ کامیاب انسانوں کی راہ ہے، ایک ناکام انسانوں کی پس ایک واضح اور آشکارا بات کے لیے سب سے بہتر علامت یہی ہوسکتی تھی کہ اُس کی طرف اُنگلی اُٹھادی جائے اس سے زیادہ کچھ کہنا، ایک معلوم بات کو مجہول بنا دینا تھا؛

چنانچہ یہی وجہ ہے کہ اس سورت کے لیے دُعا کا پیرایہ اختیار کیا گیا ہے۔ کیونکہ اگر تعلیم و امر کا پیرایہ اختیار کیا جاتا تو اس کی نوعیّت کی ساری تاثیر جاتی رہتی۔ دعائیہ اسلوب ہمیں بتاتا ہے کہ ہر راست باز انسان کی جو خدا پرستی کی راہ میں قدم اُٹھاتا ہے، صدائے حال کیا ہوتی ہے، اور کیا ہونی چاہیے؟ یہ گویا خدا پرستی کے فکر و وجدان کا سر جوش ہے جو ایک طالبِ صادق کی زبان پر بے اختیار اُبل پڑتا ہے!

(۲)

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ

حمد | عربی میں حَمْد کے معنی ثناءِ جمیل کے ہیں یعنی اچھی صفتیں بیان کرنے کے۔ اگر کسی کی بُری صفتیں بیان کی جائیں تو یہ حمد نہ ہوگی۔ حمد پر الف لام ہے۔ یہ استغراق کے لیے بھی ہوسکتا ہے، جنس کے لیے بھی۔ پس اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ کے معنی یہ ہوئے کہ حمد وثنا میں سے جو کچھ اور جیسا کچھ بھی کہا جاسکتا ہے وہ سب اللہ کے لیے ہے۔ کیونکہ خوبیوں اور کمالوں میں سے جو کچھ بھی ہے، سب اُسی سے ہے اور اُسی میں ہے۔ اور اگر حُسن موجود ہے تو نگاہِ عشق کیوں نہ ہو، اور اگر محمودیت جلوہ افروز ہے تو زبانِ حمد وستائش کیوں خاموش رہے؟

آئینۂ ماروے تُرا عکس پذیرست
گر تو نہ نمائی گنہ از جانبِ مانیست

حَمْد سے سُورت کی ابتدا کیوں کی گئی؟ اس لیے کہ معرفتِ الٰہی کی راہ میں انسان کا پہلا تاثر یہی ہے یعنی جب کبھی ایک صادق انسان اس راہ میں قدم اُٹھائیگا، تو سب سے پہلی حالت جو اُس کے فکر و وجدان پر طاری ہوگی، وہ قدرتی طور پر وہی ہوگی جسے یہاں تَحمید وستائش سے تعبیر کیا گیا ہے۔

انسان کے لیے معرفتِ حق کی راہ کیا ہے؟ قرآن کہتا ہے، صرف ایک ہی راہ ہے، اور وہ یہ ہے کہ کائناتِ خلقت میں تفکّر و تدبّر کرے۔ مصنوعات کا مطالعہ اُسے صانع تک پہنچا دیگا: اَلَّذِیْنَ یَذْکُرُوْنَ اللّٰهَ قِیَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِهِمْ وَیَتَفَکَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (۳: ۱۸۸) اب فرض کرو، ایک طالبِ صادق اس راہ میں قدم اُٹھاتا ہے اور کائناتِ خلقت کے مظاہر و آثار کا مطالعہ کرتا ہے، تو سب سے پہلا اثر جو اُس کے دل و دماغ پر طاری ہوگا، وہ کیا ہوگا؟ وہ دیکھیگا کہ خود اُس کا وجود اور اُس کے وجود سے باہر کی ہر چیز ایک صانعِ حکیم اور مُدبّرِ قدیر کی کارفرمائیوں کی جلوہ گاہ ہے، اور اس کی ربوبیت اور رحمت کا ہاتھ ایک ایک ذرّۂ خلقت میں صاف نظر آرہا ہے۔ پس قدرتی طور پر اس کی رُوح جوشِ ستائش اور محویتِ جمال سے معمور ہو جائیگی۔ وہ بے اختیار پکار اُٹھیگا کہ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ! ساری حمد وستائش اسی کے لیے ہے جو اپنی کارفرمائی کے ہر گوشے میں سرچشمۂ رحمت وفیضان اور معنیٔ حسن وکمال ہے!

اس راہ میں فکرِ انسانی کی سب سے بڑی گمراہی یہ رہی ہے کہ اُس کی نظریں مصنوعات کے جلووں میں محو ہو کر رہ جاتیں۔ آگے بڑھنے کی کوشش نہ کرتیں۔ وہ پردوں کے نقش ونگار دیکھ کر بے خود ہو جاتا مگر اُس کی جستجو نہ کرتا جس نے

اپنے جمالِ صنعت پر یہ دل آویز پردے ڈال رکھے ہیں۔ دنیا میں مظاہرِ فطرت کی پرستش کی بنیاد اسی کوتاہ نظری سے پڑی پس اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ کا اعتراف اِس حقیقت کا اعتراف ہے کہ کائناتِ ہستی کا تمام فیضان و جمال خواہ کسی گوشے اور کسی شکل میں ہو، صرف ایک صانعِ حقیقی کی صفتوں ہی کا ظہور ہے، اس لیے حُسن و جمال کے لیے جتنی بھی شیفتگی ہوگی، خوبی و کمال کے لیے جتنی بھی مدحت طرازی ہوگی، بخشش و فیضان کا جتنا بھی اعتراف ہوگا، مصنوع و مخلوق کے لیے نہیں ہوگا صانع و خالق ہی کے لیے ہوگا:

عباراتُنا شتّٰی وحُسنُكَ واحد ۔ وکلٌ الٰی ذاك الجمالِ یشیر!

اللّٰہ نزولِ قرآن سے پہلے عربی میں اللہ کا لفظ خدا کے لیے بطورِ اسمِ ذات کے مستعمل تھا، جیسا کہ شعراءِ جاہلیت کے کلام سے ظاہر ہے۔ یعنی خدا کی تمام صفتیں اس کی طرف منسوب کی جاتی تھیں۔ یہ کسی خاص صفت کے لیے نہیں بولا جاتا تھا۔ قرآن نے بھی یہی لفظ بطورِ اسمِ ذات کے اختیار کیا اور تمام صفتوں کو اس کی طرف نسبت دی:

وَلِلّٰہِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی فَادْعُوْہُ بِہَا (۷: ۱۷۹) ۔ اور اللہ کے لیے حسن و خوبی کے نام ہیں (یعنی صفتیں ہیں) پس چاہیے کہ اُسے اُن صفتوں کے ساتھ پکارو!

قرآن نے یہ لفظ محض اس لیے اختیار کیا کہ لغت کی مطابقت کا مقتضا یہی تھا، یا اس سے بھی زیادہ کوئی معنوی موزونیت اس میں پوشیدہ ہے؟

جب ہم اس لفظ کی معنوی دلالت پر غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے، اس غرض کے لیے سب سے زیادہ موزوں لفظ یہی تھا۔

نوعِ انسانی کے دینی تصورات کا ایک قدیم عہد جو تاریخ کی روشنی میں آیا ہے، مظاہرِ فطرت کی پرستش کا عہد ہے۔ اسی پرستش نے بہ تدریج اصنام پرستی کی صورت اختیار کی۔ اصنام پرستی کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ مختلف زبانوں میں بہت سے الفاظ دیوتاؤں کے لیے پیدا ہو گئے، اور جوں جوں پرستش کی نوعیت میں وسعت ہوتی گئی، الفاظ کا تنوع بھی بڑھتا گیا۔ لیکن چونکہ یہ بات انسان کی فطرت کے خلاف تھی کہ ایک ایسی ہستی کے تصور سے خالی الذہن رہے جو سب سے اعلیٰ اور سب کی پیدا کرنے والی ہستی ہے، اس لیے دیوتاؤں کی پرستش کے ساتھ ایک سب سے بڑی اور سب پر حکمراں ہستی کا تصور بھی کم و بیش ہمیشہ موجود رہا، اور اس لیے جہاں بے شمار الفاظ دیوتاؤں اور اُن کی معبودانہ صفتوں کے لیے پیدا ہو گئے، وہاں کوئی نہ کوئی لفظ ایسا بھی ضرور مستعمل رہا، جس کے ذریعہ اُس اَن دیکھی اور اعلیٰ ترین ہستی کی طرف اشارہ کیا جاتا تھا۔

چنانچہ سامی زبانوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حروف و اصوات کی ایک خاص ترکیب ہے جو معبودیت کے معنی میں مستعمل رہی ہے، اور عبرانی، سریانی، آرامی، کلدانی، حمیری، عربی، وغیرہ تمام زبانوں میں اُس کا یہ لغوی

خاصہ پایا جاتا ہے۔ یہ الف، لام اور ہ کا مادہ ہے، اور مختلف شکلوں میں مشتق ہوا ہے۔ کلدانی وسریانی کا "الاہیا" عبرانی کا "الوہ" اور عربی کا "اِلٰہ" اسی سے ہے، اور بلاشبہ یہی "اِلٰہ" ہے جو حرف تعریف کے اضافہ کے بعد اللہ ہوگیا ہے، اور تعریف نے اسے صرف خالق کائنات کے لیے مخصوص کردیا ہے؛

لیکن اگر اللہ "اِلٰہ" سے ہے، تو "اِلٰہ" کے معنی کیا ہیں؟ علمائے لغت و اشتقاق کے مختلف اقوال ہیں، مگر سب سے زیادہ قوی قول یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کی اصل "اَلَہ" ہے اور "اَلَہ" کے معنی تحیّر اور درماندگی کے ہیں۔ بعضوں نے اسے "وَلَہ" سے ماخوذ بتایا ہے اور اس کے معنی بھی یہی ہیں۔ پس خالق کائنات کے لیے یہ لفظ اس لیے اسم قرار پایا کہ اس بارے میں انسان جو کچھ جانتا اور جان سکتا ہے، وہ عقل کے تحیّر اور ادراک کی درماندگی کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ وہ جس قدر بھی اس ذاتِ مطلق کی ہستی میں غور وخوض کریگا، اس کی عقل کی حیرانی اور درماندگی بڑھتی ہی جائیگی۔ یہاں تک کہ وہ معلوم کرلیگا کہ اس راہ کی ابتدا بھی عجز وحیرت سے ہوتی ہے، اور انتہا بھی عجز وحیرت ہی ہے!

اے بروں از وہم و قال و قیلِ من   خاک بر فرقِ من و تمثیلِ من!

اب غور کرو، خدا کی ذات کے لیے انسان کی زبان سے نکلے ہوئے لفظوں میں اس سے زیادہ موزوں لفظ اور کونسا ہوسکتا ہے؟ اگر خدا کو اس کی صفتوں سے پکارتا ہے، تو بلاشبہ اس کی صفتیں بے شمار ہیں لیکن اگر صفات سے الگ ہوکر اس کی ذات کی طرف اشارہ کرتا ہے، تو وہ اس کے سوا کیا ہوسکتا ہے کہ ایک متحیّر کردینے والی ذات ہے، اور جو کچھ اس کی نسبت کہا جاسکتا ہے، وہ عجز و درماندگی کے اعتراف کے سوا کچھ نہیں ہے؟ فرض کرو، نوعِ انسانی نے اس وقت تک خدا کی ہستی یا خلقتِ کائنات کی اصلیت کے بارے میں جو کچھ سوچا اور سمجھا ہے، وہ سب کچھ سامنے رکھ کر ہم ایک موزوں سے موزوں لفظ تجویز کرنا چاہیں تو وہ کیا ہوگا؟ اس سے زیادہ اور اس سے بہتر کوئی لفظ تجویز کیا جاسکتا ہے؟

یہی وجہ ہے کہ جب کبھی اس راہ میں عرفان وبصیرت کی کوئی بڑی سے بڑی بات کہی گئی وہ یہی تھی کہ زیادہ سے زیادہ خود رفتگیوں کا اعتراف کیا گیا، اور ادراک کا منتہیٰ مرتبہ ہمیشہ یہی قرار پایا کہ ادراک کی نارسائی کا ادراک حاصل ہوجائے۔ عُرفا کے دل وزبان کی صدا ہمیشہ یہی رہی کہ رب زدنی فیک تحیراً![1] اور حکما کی حکمت ودانش کا فیصلہ بھی ہمیشہ یہی ہوا کہ:

معلوم شد کہ ہیچ معلوم نہ شد!

چونکہ یہ اسم خدا کے لیے بطور اسم ذات کے استعمال ہیں آیا، اس لیے قدرتی طور پر اُن تمام صفتوں پر حاوی،

---

[1] یعنی خدایا، ایسا کر کہ تیری ہستی میں ہمارا تحیر بڑھتا رہے" کیونکہ یہاں تحیر جہل کا نہیں بلکہ معرفت کا نتیجہ ہے ۱۲

ہو گیا جن کا خدا کی ذات کے لیے تصوّر کیا جا سکتا ہے ۔ اگر ہم خدا کا تصوّر اُس کی کسی صفت کے ساتھ کریں، مثلاً الرّبّ یا الرّحیم کہیں، تو یہ تصوّر صرف ایک خاص صفت ہی میں محدود ہو گا۔ یعنی ہمارے ذہن میں ایک ایسی ہستی کا تصوّر پیدا ہو جائیگا جس میں ربوبیت یا رحمت ہے لیکن جب ہم اللہ کا لفظ بولتے ہیں تو فوراً ہمارا ذہن ایک ایسی ہستی کی طرف منتقل ہو جاتا ہے جو اُن تمام صفاتِ حُسن و کمال سے متصف ہے جو اُس کی نسبت بیان کیے گئے ہیں، اور جو اُس میں ہونے چاہئیں ۔

(۳)

رَبُّ العٰلَمِین

رُبُوبیّت

حمد کے بعد بالتّرتیب چار صفتیں بیان کی گئی ہیں: ربّ العٰلمین، الرّحمٰن، الرّحیم، ملٰک یوم الدّین چونکہ الرّحمٰن اور الرّحیم کا تعلق ایک ہی صفت کے دو مختلف پہلوؤں سے ہے، اس لیے دوسرے لفظوں میں انہیں یوں تعبیر کیا جاسکتا ہے کہ ربوبیت، رحمت، عدالت، تین صفتوں کا ذکر کیا گیا ہے +

اِلٰہ کی طرح "رب" بھی سامی زبانوں کا ایک کثیر الاستعمال مادہ ہے۔ عبرانی، سریانی، اور عربی تینوں زبانوں میں اِس کے معنی پالنے کے ہیں، اور چونکہ پرورش کی ضرورت کا احساس انسانی زندگی کے بنیادی احساسات میں سے ہے، اس لیے اسے بھی قدیم ترین سامی تعبیرات میں سے سمجھنا چاہیے۔ پھر چونکہ مُعلِّم، اُستاد اور آقا کسی نہ کسی اعتبار سے پرورش کرنے والے ہی ہوتے ہیں، اس لیے اس کا اطلاق ان معنوں میں بھی ہونے لگا۔ چنانچہ عبرانی اور آرامی کا "رَبّی" اور "ربّاہ" پرورش کنندہ، معلّم، اور آقا تینوں معنی رکھتا تھا، اور قدیم مصری اور خالدی زبان کا ایک لفظ "رابو" بھی انہی معنوں میں مستعمل ہؤا ہے۔ اور ان ملکوں کی قدیم ترین سامی وحدت کی خبر دیتا ہے +

بہرحال عربی میں "ربوبیت" کے معنی پالنے کے ہیں۔ لیکن پالنے کو اُس کے وسیع اور کامل معنوں میں لینا چاہیے۔ اِسی لیے بعض ائمۂ لغت نے اس کی تعریف اِن لفظوں میں کی ہے: ھو انشاء الشئ حالاً فحالاً الی حدّ التمام[۱]۔ یعنی کسی چیز کو یکے بعد دیگرے، اُس کی مختلف حالتوں اور ضرورتوں کے مطابق، اس طرح نشوونما دیتے رہنا کہ اپنی حدِ کمال تک پہنچ جائے۔ اگر ایک شخص بھوکے کو کھانا کھلادے، یا محتاج کو روپیہ دیدے، تو یہ اُس کا کرم ہوگا، جُود ہوگا، احسان ہوگا، لیکن وہ بات نہ ہوگی جسے ربوبیت کہتے ہیں۔ ربوبیت کے لیے ضروری ہے کہ پرورش اور نگہداشت کا ایک جاری اور مسلسل اہتمام ہو، اور ایک وجود کو اُس کی تکمیل و بلوغ کے لیے وقتاً فوقتاً جیسی کچھ ضرورتیں پیش آتی رہیں، اُن سب کا سروسامان ہوتا رہے۔ نیز ضروری ہے کہ یہ سب کچھ محبت و شفقت کے ساتھ ہو۔ کیونکہ جو عمل محبت و شفقت کے عاطفہ سے خالی ہوگا، ربوبیت نہیں ہوسکتا +

ربوبیت کا ایک ناقص نمونہ ہم اُس پرورش میں دیکھ سکتے ہیں جس کا جوش ماں کی فطرت میں ودیعت کیا گیا ہے۔ بچہ جب پیدا ہوتا ہے تو محض گوشت پوست کا ایک متحرک لوتھڑا ہوتا ہے، اور زندگی اور نمو کی جتنی قوتیں بھی

---

[۱] مفرداتِ راغب اصفہانی ۱۲

رکھتا ہے، سب کی سب پرورش و تربیت کی محتاج ہوتی ہیں۔ یہ پرورش محبت و شفقت، حفاظت و نگہداشت، اور بخشش و اعانت کا ایک طول طویل سلسلہ ہے، اور اُسے اُس وقت تک جاری رہنا چاہیے جب تک بچہ اپنے جسم و ذہن کے حدِ بلوغ تک نہ پہنچ جائے۔ پھر پرورش کی ضرورتیں ایک دو نہیں بے شمار ہیں۔ اُن کی نوعیت ہمیشہ بدلتی رہتی ہے، اور ضروری ہے کہ ہر عُمر اور ہر حالت کے مطابق محبت کا جوش، نگرانی کی نگاہ، اور زندگی کا سروسامان ملتا رہے۔ حکمتِ الٰہی نے ماں کی محبت میں ربوبیت کے یہ تمام خدوخال پیدا کردیے ہیں۔ یہ ماں کی ربوبیت ہے جو پیدائش کے دن سے لے کر بلوغ تک، بچّہ کو پالتی، بچاتی، سنبھالتی، اور ہر وقت اور ہر حالت کے مطابق اُس کی ضروریاتِ پرورش کا سروسامان مہیّا کرتی رہتی ہے۔

جب بچے کا معدہ دودھ کے سوا کسی غذا کا متحمل نہ تھا تو اُسے دودھ ہی پلایا جاتا تھا۔ جب دودھ سے زیادہ قوی غذا کی ضرورت ہوئی تو ویسی ہی غذا دی جانے لگی۔ جب اُس کے پاؤں میں کھڑے ہونے کی سکت نہ تھی تو ماں اُسے گود میں اُٹھائے پھرتی تھی۔ جب کھڑے ہونے کے قابل ہُوا تو انگلی پکڑلی اور ایک ایک قدم چلانے لگی۔ پس یہ بات کہ ہر حالت اور ضرورت کے مطابق ضروریات مہیّا ہوتی رہیں، اور نگرانی و حفاظت کا ایک مسلسل اہتمام جاری رہا، وہ صورتِ حال ہے جس سے ربوبیت کے مفہوم کا تصوّر کیا جاسکتا ہے۔

مجازی ربوبیت کی یہ ناقص اور محدود مثال سامنے لاؤ، اور ربوبیتِ الٰہی کی غیر محدود حقیقت کا تصوّر کرو۔ اُس کے ربُّ العٰلمین ہونے کے معنی یہ ہوئے کہ جس طرح اُس کی خالقیت نے کائناتِ ہستی اور اُس کی ہر چیز پیدا کی ہے، اُسی طرح اُس کی ربوبیت نے ہر مخلوق کی پرورش کا سروسامان بھی کردیا ہے، اور یہ پرورش کا سروسامان ایک ایسے عجیب و غریب نظام کے ساتھ ہے کہ ہر وجود کو زندگی اور بقا کے لیے جو کچھ مطلوب تھا، وہ سب کچھ مل رہا ہے، اور اس طرح مِل رہا ہے کہ ہر حالت کی رعایت ہے، ہر ضرورت کا لحاظ ہے، ہر تبدیلی کی نگرانی ہے، اور ہر کمی بیشی ضبط میں آچکی ہے۔ چیونٹی اپنے بِل میں رینگ رہی ہے، کیڑے مکوڑے کوڑے کرکٹ میں ملے ہوئے ہیں، مچھلیاں دریا میں تیر رہی ہیں، پرند ہوا میں اُڑ رہے ہیں، پھول باغ میں کھِل رہے ہیں، ہاتھی جنگل میں دوڑ رہا ہے، اور ستارے فضا میں گردش کر رہے ہیں لیکن فطرت کے پاس سب کے لیے یکساں طور پر پرورش کی گود اور نگرانی کی آنکھ ہے، اور کوئی نہیں جو فیضانِ ربوبیت سے محروم ہو۔ اگر مثالوں کی جستجو میں تھوڑی سی کاوش جائز رکھی جائے، تو مخلوقات کی بے شمار قسمیں ایسی ملینگی جو اتنی حقیر اور بے مقدار ہیں کہ غیر مسلّح[۱] آنکھ سے ہم اُنہیں دیکھ بھی نہیں سکتے۔ تاہم ربوبیتِ الٰہی نے جس طرح اور جس نظام کے ساتھ ہاتھی جیسی جسیم اور انسان جیسی عقیل مخلوق کے لیے سامانِ پرورش مہیا کردیا ہے، ٹھیک ٹھیک اُسی طرح اور ویسے ہی نظام کے ساتھ اُن کے لیے بھی زندگی اور بقا کی ہر چیز مہیّا کر رکھی ہے۔ اور پھر

۱۔ غیر مسلّح آنکھ یعنی ایسی آنکھ جو اپنی قدرتی نگاہ سے دیکھ رہی ہو، زیادہ قوت کے ساتھ دیکھنے کا کوئی آلہ مثلاً خوردبین اس کے ساتھ نہ ہو۔ (Naked Eye)

یہ جو کچھ بھی ہے، انسان کے وجود سے باہر ہے، اگر انسان اپنے وجود کو دیکھے، تو خود اُس کی زندگی اور زندگی کا ہر لمحہ ربوبیت الٰہی کی کرشمہ سازیوں کی ایک پوری کائنات ہے:

وَفِی الْاَرْضِ اٰیٰتٌ لِّلْمُوْقِنِیْنَ وَفِیْٓ اَنْفُسِکُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ (۵۱: ۲۰-۲۱) — اُن لوگوں کے لیے جو (سچائی پر) یقین رکھنے والے ہیں، زمین میں (خدا کی کارفرمائیوں کی) کتنی ہی نشانیاں ہیں اور خود تمہارے وجود میں بھی۔ پھر کیا تم (دیکھتے نہیں؟)

نظامِ رُبوبیت

لیکن سامانِ زندگی کی بخشائش میں اور ربوبیت کے عمل میں جو فرق ہے اُسے نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ اگر دنیا میں ایسے عناصر، عناصر کی ایسی ترکیب، اور اشیاء کی ایسی بناوٹ موجود ہے جو زندگی اور نشوونما کے لیے سُودمند ہے، تو محض اس کی موجودگی ربوبیت سے تعبیر نہیں کی جا سکتی۔ ایسا ہونا قدرتِ الٰہی کی رحمت ہے، بخشش ہے، احسان ہے، مگر وہ بات نہیں ہے جسے ربوبیت کہتے ہیں۔ ربوبیت یہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں، دنیا میں سودمند اشیاء کی موجودگی کے ساتھ اُن کی بخشش و تقسیم کا بھی ایک نظام موجود ہے، اور فطرت صرف بخشتی ہی نہیں، بلکہ جو کچھ بخشتی ہے ایک مقررہ انتظام اور ایک منضبط ترتیب و مناسبت کے ساتھ بخشتی ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں، ہر وجود کو زندگی اور بقاء کے لیے جس جس چیز کی ضرورت تھی اور جس جس وقت، اور جیسی جیسی مقدار میں ضرورت تھی، ٹھیک ٹھیک اُسی طرح، اُنہی وقتوں میں اور اُسی مقدار میں اُسے مِل رہی ہے، اور اس نظم و انضباط سے تمام کارخانۂ حیات چل رہا ہے۔

پانی کی بخشش و تقسیم کا نظام

زندگی کے لیے پانی اور رطوبت کی ضرورت ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ پانی کے وافر ذخیرے ہر طرف موجود ہیں لیکن اگر صرف اتنا ہی ہوتا، تو یہ زندگی کے لیے کافی نہ تھا۔ کیونکہ زندگی کے لیے صرف یہی ضروری نہیں ہے کہ پانی موجود ہو، بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ ایک خاص انتظام، ایک خاص ترتیب، اور ایک خاص مقررہ مقدار کے ساتھ موجود ہو۔ پس یہ جو دنیا میں پانی کے بننے اور تقسیم ہونے کا ایک خاص انتظام پایا جاتا ہے، اور فطرت صرف پانی بناتی ہی نہیں، بلکہ ایک خاص ترتیب و مناسبت کے ساتھ بناتی اور ایک خاص اندازہ کے ساتھ بانٹتی رہتی ہے، تو یہی ربوبیت ہے، اور اسی سے ربوبیت کے تمام اعمال کا تصوّر کرنا چاہیے۔ قرآن کہتا ہے، یہ اللہ کی رحمت ہے جس نے پانی جیسا جوہرِ حیات پیدا کر دیا، لیکن یہ اُس کی ربوبیت ہے جو پانی کو ایک ایک بُوند کرکے ٹپکاتی، زمین کے ایک ایک گوشے تک پہنچاتی، ایک خاص مقدار اور حالت میں تقسیم کرتی، ایک خاص موسم اور محل میں برساتی، اور پھر زمین کے ایک ایک تشنہ ذرّے کو ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر سیراب کر دیتی ہے:

وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءًۢ بِقَدَرٍ فَاَسْکَنّٰهُ — اور (دیکھو) ہم نے آسمان سے ایک خاص اندازے کے ساتھ، پانی

فِی الْاَرْضِ ۖ وَ اِنَّا عَلٰی ذَهَابٍ بِهٖ لَقٰدِرُوْنَ ۚ فَاَنْشَاْنَا لَكُمْ بِهٖ جَنّٰتٍ مِّنْ نَّخِیْلٍ وَّ اَعْنَابٍ ۘ لَكُمْ فِیْهَا فَوَاكِهُ كَثِیْرَةٌ وَّ مِنْهَا تَاْكُلُوْنَ ۙ (۲۳: ۱۸-۱۹)

برسایا، پھر اُسے زمین میں ٹھہرائے رکھا، اور ہم اس پر بھی قادر ہیں کہ (جس طرح برسایا تھا اُسی طرح) اُسے واپس لے جائیں، پھر (دیکھو) اُسی پانی سے ہم نے کھجوروں اور انگوروں کے باغ پیدا کر دیے جن میں بے شمار پھل لگتے ہیں، اور انہی سے تم اپنی غذا بھی حاصل کرتے ہو

تقدیرِ اشیاء

یہی وجہ ہے کہ قرآن نے جابجا اشیاء کے قدر اور مقدار کا ذکر کیا ہے یعنی اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے کہ فطرتِ کائنات جو کچھ بخشتی ہے ایک خاص اندازے کے ساتھ بخشتی ہے، اور یہ اندازہ ایک خاص قانون کے ماتحت ٹھہرایا ہوا ہے۔

وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَآئِنُهٗ وَ مَا نُنَزِّلُهٗۤ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ ۝ (۱۵: ۲۱)

اور کوئی شے نہیں جس کے ہمارے پاس ذخیرے موجود نہ ہوں، لیکن ہمارا طریق کار یہ ہے کہ جو کچھ نازل کرتے ہیں، ایک مقررہ مقدار میں نازل کرتے ہیں۔

وَكُلُّ شَیْءٍ عِنْدَهٗ بِمِقْدَارٍ (۱۳: ۸) اور اللہ کے نزدیک ہر چیز کا ایک اندازہ مقرر ہے۔

اِنَّا كُلَّ شَیْءٍ خَلَقْنٰهُ بِقَدَرٍ (۵۴: ۴۹) ہم نے جتنی چیزیں بھی پیدا کی ہیں ایک اندازے کے ساتھ پیدا کی ہیں۔

یہ کیا بات ہے کہ دُنیا میں صرف یہی نہیں ہے کہ پانی موجود ہو، بلکہ ایک خاص نظم و ترتیب کے ساتھ موجود ہو؟ یہ کیوں ہو کہ پہلے سورج کی شعاعیں، سمندر سے ڈول بھر بھر کر، فضا میں پانی کی چادریں بچھا دیں، پھر ہواؤں کے جھونکے انہیں حرکت میں لائیں، اور پانی کی بوندیں بنا کر ایک خاص وقت اور خاص محل میں برسا دیں؟ پھر یہ کیوں ہے کہ جب کبھی پانی برسے، تو ایک خاص ترتیب اور مقدار ہی سے برسے، اور اس طرح برسے کہ زمین کی بالائی سطح پر اس کی ایک خاص مقدار بہنے لگے اور اندرونی حصوں تک ایک خاص مقدار میں نمی پہنچے؟ کیوں ایسا ہوا کہ پہلے پہاڑوں کی چوٹیوں پر برف کے تودے جمتے ہیں، پھر موسم کی تبدیلی سے پگھلنے لگتے ہیں، پھر ان کے پگھلنے سے پانی کے سرچشمے اُبلنے لگتے ہیں، پھر چشموں سے دریا کی جدولیں بہنے لگتی ہیں، پھر یہ جدولیں پیچ و خم کھاتی ہوئی دُور دُور تک دوڑ جاتی ہیں، اور سینکڑوں ہزاروں میلوں تک اپنی وادیاں شاداب کر دیتی ہیں؟

کیوں یہ سب کچھ ایسا ہی ہوا؟ کیوں ایسا نہ ہوا کہ پانی موجود ہوتا مگر اس انتظام اور ترتیب کے ساتھ نہ ہوتا؟

قرآن کہتا ہے: اس لیے کہ کائناتِ ہستی میں ربوبیتِ الٰہی کارفرما ہے، اور ربوبیت کا مقتضا یہی تھا کہ پانی اسی ترتیب سے بنے اور اسی ترتیب و مقدار سے تقسیم ہو۔ یہ رحمت و حکمت تھی جس نے پانی پیدا کیا، مگر یہ ربوبیت ہے جو اُسے اس طرح کام میں لائی کہ پرورش اور رکھوالی کی تمام ضرورتیں پوری ہو گئیں۔

اَللّٰهُ الَّذِیْ یُرْسِلُ الرِّیٰحَ فَتُثِیْرُ سَحَابًا یہ اللہ ہی کی کارفرمائی ہے کہ پہلے ہوائیں چلتی ہیں، پھر ہوائیں بادلوں کو ابھار کر

فَيَبْسُطُهٗ فِي السَّمَآءِ كَيْفَ يَشَآءُ وَيَجْعَلُهٗ
كِسَفًا فَتَرَى الْوَدْقَ يَخْرُجُ مِنْ خِلٰلِهٖ ۚ
فَاِذَآ اَصَابَ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖٓ
اِذَا هُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ (۳۰: ۴۸)

حرکت میں لاتی ہیں، پھر وہ جس طرح چاہتا ہے، اُنہیں فضا میں پھیلا دیتا ہے، اور اُنہیں ٹکڑے ٹکڑے کر دیتا ہے، پھر تم دیکھتے ہو کہ بادلوں میں سے مینہ نکل رہا ہے۔ پھر جن لوگوں کو بارش کی یہ برکت ملنی تھی مل چکتی ہے تو وہ اچانک خوش وقت ہو جاتے ہیں +

عناصرِ حیات

پھر اس حقیقت پر بھی غور کرو کہ زندگی کے لیے جن چیزوں کی سب سے زیادہ ضرورت تھی، اُنہی کی بخشائش سب سے زیادہ اور عام ہے، اور جن کی ضرورت خاص خاص حالتوں اور گوشوں کے لیے تھی، اُنہی میں اختصاص اور مقامیت پائی جاتی ہے۔ ہوا سب سے زیادہ ضروری تھی، کیونکہ پانی اور غذا کے بغیر کچھ عرصہ تک زندگی ممکن ہے مگر ہوا کے بغیر ممکن نہیں۔ پس اس کا سامان اتنا وافر اور عام ہے کہ کوئی جگہ، کوئی گوشہ، کوئی وقت نہیں جو اس سے خالی ہو۔ فضا میں ہوا کا بے حد و کنار سمندر پھیلا ہوا ہے۔ جب کبھی اور جہاں کہیں سانس لو، زندگی کا یہ سب سے زیادہ ضروری جوہر تمہارے لیے خود بخود مہیا ہو جائیگا۔ ہوا کے بعد دوسرے درجے پر پانی ہے: وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ، اس لیے اس کی بخشایش کی فراوانی و عمومیت ہوا سے کم مگر ہر چیز سے زیادہ ہے۔ زمین کے نیچے آبِ شیریں کی سوتیں بہہ رہی ہیں۔ زمین کے اوپر بھی ہر طرف دریا رواں ہیں، پھر اِن دونوں ذخیروں کے علاوہ فضائے آسمانی کا بھی کارخانہ ہے جو شب و روز سرگرمِ کار رہتا ہے۔ وہ سمندر کا شورابہ کھینچتا ہے، اُسے صاف و شیریں بنا کر جمع کرتا رہتا ہے، پھر حسبِ ضرورت زمین کے حوالے کر دیتا ہے! پانی کے بعد غذا کی ضرورت تھی؛ لہٰذا ہوا اور پانی سے کم، مگر اور تمام چیزوں سے زیادہ اُس کا دسترخوانِ کرم بھی خشکی و تری میں بچھا ہوا ہے، اور کوئی مخلوق نہیں جس کے گرد و پیش اُس کی غذا کا ذخیرہ موجود نہ ہو +

نظامِ پرورش

پھر سامانِ پرورش کے اس عالمگیر نظام پر غور کرو، جو اپنے ہر گوشۂ عمل میں پروردگی کی گود اور بخششِ حیات کا سرچشمہ ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے، گویا یہ تمام کارخانہ صرف اسی لیے بنا ہے کہ زندگی بخشے اور زندگی کی ہر استعداد کی رکھوالی کرے۔ سورج اس لیے ہے کہ روشنی کے لیے چراغ کا اور گرمی کے لیے تنور کا کام دے، اور اپنی کرنوں کے ڈول بھر بھر کر سمندر سے پانی کھینچتا رہے۔ ہوائیں اس لیے ہیں کہ اپنی سردی اور گرمی سے مطلوبہ اثرات پیدا کرتی رہیں، اور کبھی پانی کے ذرات جما کر ابر کی چادریں بنا دیں، کبھی اَبر کو پانی بنا کر بارش برسا دیں۔ زمین اس لیے ہے کہ نشو و نما کے خزانوں سے ہمیشہ معمور رہے، اور ہر دانے کے لیے اپنی گود میں زندگی، اور ہر پودے کے لیے اپنے سینہ میں پروردگی رکھے۔ مختصر یہ کہ کارخانۂ ہستی کا ہر گوشہ صرف اسی کام میں لگا ہوا ہے۔ ہر قوت استعداد ڈھونڈ رہی ہے، اور ہر تاثیر اثر پزیری کے انتظار میں ہے۔ جونہی کسی وجود میں بڑھنے اور نشو و نما پانے کی استعداد پیدا ہوتی ہے، معاً تمام کارخانۂ ہستی اُس کی طرف متوجّہ ہو جاتا ہے۔ سورج کی تمام کارفرمائیاں، فضا کے تمام تغیرات، زمین کی تمام قوتیں،

عناصر کی تمام سرگرمیاں، صرف اس انتظار میں رہتی ہیں کہ کب چیونٹی کے انڈے سے ایک بچہ ہوتا ہے، اور کب دہقان کی جھولی سے زمین پر ایک دانہ گرتا ہے*

وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ؀ (۴۵: ۱۳)	اور آسمان و زمین میں جو کچھ بھی ہے، سب کو اللہ نے تمہارے لیے مسخر کر دیا ہے۔ بلاشبہ اُن لوگوں کے لیے جو غور و فکر کرنے والے ہیں اس بات میں (معرفتِ حقیقت کی) بڑی ہی نشانیاں ہیں!

نظامِ ربوبیت کی وحدت

سب سے زیادہ عجیب مگر سب سے زیادہ نمایاں حقیقت، نظامِ ربوبیت کی یکسانیت اور ہم آہنگی ہے۔ یعنی ہر وجود کی پرورش کا سرو سامان جس طرح اور جس اسلوب پر کیا گیا ہے، وہ ہر گوشے میں ایک ہی ہے، اور ایک ہی اصل و قاعدہ رکھتا ہے۔ پتھر کا ایک ٹکڑا تمہیں گلاب کے شاداب اور عطر بیز پھول سے کتنا ہی مختلف دکھائی دے، لیکن دونوں کی پرورش کے اصول و احوال پر نظر ڈالو گے تو صاف نظر آجائیگا کہ دونوں کو ایک ہی طریقے سے سامانِ پرورش ملتا ہے اور دونوں ایک ہی طرح پلے پوسے جا رہے ہیں۔ انسان کا بچہ اور درخت کا پودا تمہاری نظروں میں کتنی بے جوڑ چیزیں ہیں؟ لیکن اگر ان کی نشوونما کے طریقوں کا کھوج لگاؤ گے تو دیکھ لو گے کہ قانونِ پرورش کی یکسانیت نے دونوں کو ایک ہی رشتے میں منسلک کر دیا ہے۔ پتھر کی چٹان ہو یا پھول کی کلی، انسان کا بچہ ہو یا چیونٹی کا انڈا، سب کے لیے پیدائش ہے، اور قبل اس کے کہ پیدائش ظہور میں آئے سامانِ پرورش مہیا ہو جاتا ہے۔ پھر طفولیت کا دَور ہے، اور اس دور کی ضروریات ہیں۔ انسان کا بچہ بھی اپنی طفولیت رکھتا ہے، درخت کے مولود نباتی کے لیے بھی طفولیت ہے، اور تمہاری چشم ظاہر بیں کے لیے کتنا ہی عجیب کیوں نہ ہو، لیکن پتھر کی چٹان اور مٹی کا تودہ بھی اپنی اپنی طفولیت رکھتا ہے۔ پھر طفولیت رُشد و بلوغ کی طرف بڑھتی ہے، اور جوں جوں بڑھتی جاتی ہے، اُس کی روز افزوں حالت کے مطابق یکے بعد دیگرے، سامانِ پرورش میں بھی تبدیلیاں ہوتی جاتی ہیں۔ یہاں تک کہ ہر وجود اپنے سِنِ کمال تک پہنچ جاتا ہے، اور جب سِنِ کمال تک پہنچ گیا، تو از سرِ نو ضعف و انحطاط کا دَور شروع ہو جاتا ہے، پھر اس ضعف و انحطاط کا خاتمہ بھی سب کے لیے ایک ہی طرح ہے۔ کسی دائرے میں اُسے مرجانا کہتے ہیں، کسی میں مرجھا جانا، اور کسی میں پامال ہو جانا۔ الفاظ متعدد ہو گئے مگر حقیقت میں تعدد نہیں ہوا:

اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ ضُعْفٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنْۢ بَعْدِ ضُعْفٍ قُوَّةً ثُمَّ جَعَلَ مِنْۢ بَعْدِ قُوَّةٍ ضُعْفًا وَّشَيْبَةً ۭ يَخْلُقُ مَا يَشَاۗءُ ۚ وَهُوَ الْعَلِيْمُ الْقَدِيْرُ (۳۰: ۵۴)	یہ اللہ ہی کی کارفرمائی ہے کہ اُس نے تمہیں اس طرح پیدا کیا کہ پہلے ناتوانی کی حالت ہوتی ہے، پھر ناتوانی کے بعد قوت آتی ہے، پھر قوت کے بعد دوبارہ ناتوانی اور بڑھاپا ہوتا ہے۔ وہ جو کچھ چاہتا ہے پیدا کرتا ہے۔ وہ علم اور قدرت رکھنے والا ہے*
اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَاۗءِ مَاۗءً	کیا تم نہیں دیکھتے کہ اللہ نے آسمان سے پانی برسایا، پھر زمین میں

فَسَلَكَهٗ يَنَابِيْعَ فِي الْاَرْضِ ثُمَّ يُخْرِجُ بِهٖ زَرْعًا مُّخْتَلِفًا اَلْوَانُهٗ ثُمَّ يَهِيْجُ فَتَرٰىهُ مُصْفَرًّا ثُمَّ يَجْعَلُهٗ حُطَامًا ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَذِكْرٰى لِاُولِي الْاَلْبَابِ (۳۹ : ۲۱)

اُس کے چشمے رواں ہوگئے، پھر اُسی پانی سے رنگ برنگ کی کھیتیاں لہلہا اُٹھیں، پھر اُن کی نشوونما میں ترقی ہوئی اور پوری طرح پک کر تیار ہوگئیں، پھر (ترقی کے بعد زوال طاری ہوا اور) تم دیکھتے ہو کہ اُن پر زردی چھاگئی، پھر بالآخر خشک ہو کر چورا چورا ہوگئی۔ بلاشبہ دانشمندوں کے لیے اس صورتِ حال میں بڑی ہی عبرت ہے!

جہاں تک غذا کا تعلق ہے، حیوانات میں ایک قسم اُن جانوروں کی ہے جن کے بچے دودھ سے پرورش پاتے ہیں، اور ایک اُن کی ہے جو عام غذاؤں سے پرورش پاتے ہیں۔ غور کرو، نظامِ ربوبیت نے دونوں کی پرورش کے لیے کیسا عجیب سروسامان مہیا کردیا ہے؟ دودھ سے پرورش پانے والے حیوانات میں انسان بھی داخل ہے۔ سب سے پہلے انسان اپنی ہی ہستی کا مطالعہ کرے۔ جونہی وہ پیدا ہوتا ہے، اُس کی غذا اپنی ساری خاصیتوں، مناسبتوں، اور شرطوں کے ساتھ خود بخود مہیا ہوجاتی ہے، اور ایسی جگہ مہیا ہوتی ہے جو حالتِ طفولیت میں اُس کے لیے سب سے قریب تر اور سب سے موزوں جگہ ہے۔ ماں بچے کو جوشِ محبت میں سینے سے لگالیتی ہے، اور وہیں اُس کی غذا کا سرچشمہ بھی موجود ہوتا ہے! پھر دیکھو، اس غذا کی نوعیت اور مزاج میں اس کی حالت کا درجہ بدرجہ کس قدر لحاظ رکھا گیا ہے اور کس طرح یکے بعد دیگرے اُس میں تبدیلی ہوتی رہتی ہے؟ ابتدا میں بچے کا معدہ اتنا کمزور ہوتا ہے کہ اُسے بہت ہی ہلکے قوام کا دودھ ملنا چاہیے۔ چنانچہ نہ صرف انسان میں بلکہ تمام حیوانات میں ماں کا دودھ بہت ہی پتلے قوام کا ہوتا ہے، لیکن جوں جوں بچے کی عمر بڑھتی جاتی ہے، اور معدہ قوی ہوتا جاتا ہے، دودھ کا قوام بھی بدلتا جاتا ہے، اور مائیت کے مقابلہ میں دُہنیت بڑھتی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ بچے کا عہدِ رضاعت پورا ہوجاتا ہے، اور اُس کا معدہ عام غذاؤں کے ہضم کرنے کی استعداد پیدا کرلیتا ہے۔ جونہی اِس کا وقت آتا ہے، ماں کا دودھ خشک ہونا شروع ہوجاتا ہے۔ یہ گویا ربوبیتِ الٰہی کا اشارہ ہوتا ہے کہ اب اس کے لیے دودھ کی ضرورت نہیں رہی، ہر طرح کی غذا میں استعمال کرسکتا ہے:

وَحَمْلُهٗ وَفِصٰلُهٗ ثَلٰثُوْنَ شَهْرًا (۴۶ : ۱۵) اور حمل اور دودھ چھڑانے کی مدّت (کم از کم) تیس مہینوں کی۔

پھر ربوبیتِ الٰہی کی اس کارسازی پر غور کرو کہ کس طرح ماں کی فطرت میں بچے کی محبت ودیعت کردی گئی ہے، اور کس طرح اس جذبے کو طبیعت بشری کے تمام جذبات میں سب سے زیادہ پُرجوش اور سب سے زیادہ ناقابلِ تسخیر بنادیا گیا ہے! دنیا کی کونسی قوت ہے جو اُس جوش کا مقابلہ کرسکتی ہے جسے ماں کی ممتا کہتے ہیں؟ جس بچے کی پیدائش اُس کے لیے زندگی کی سب سے بڑی مصیبت تھی:

حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ كُرْهًا وَّوَضَعَتْهُ كُرْهًا (۴۶ : ۱۵)

اُس کی ماں نے اُسے تکلیف کے ساتھ پیٹ میں رکھا اور تکلیف کے ساتھ جنا۔

اُسی کی محبت اُس کے اندر زندگی کا سب سے بڑا جذبہ مشتعل کر دیتی ہے۔ جب تک بچّہ سنِ بلوغ تک نہیں پہنچ جاتا وہ اپنے لیے نہیں بلکہ بچّے کے لیے زندہ رہنا چاہتی ہے۔ زندگی کی کوئی خود فراموشی نہیں جو اُس پر طاری نہ ہوتی ہو، اور راحت و آسائش کی کوئی قربانی نہیں جس سے اُسے گریز ہو۔ حُبِّ ذات جو فطرتِ انسانی کا سب سے زیادہ طاقتور جذبہ ہے اور جس کے انفعالات کے بغیر کوئی مخلوق زندہ نہیں رہ سکتی، وہ بھی اس جذبۂ خود فراموشی کے مقابلہ میں مضمحل ہو کر رہ جاتا ہے۔ یہ بات کہ ایک ماں نے بچّے کے مجنونانہ عشق میں اپنی زندگی قربان کر دی، فطرتِ مادری کا ایسا معمولی واقعہ ہے جو ہمیشہ پیش آتا رہتا ہے اور ہم اس میں کسی طرح کی غرابت محسوس نہیں کرتے۔

لیکن پھر دیکھو، کارسازِ فطرت کی یہ کیسی کرشمہ سازی ہے کہ جوں جوں بچّے کی عمر بڑھتی جاتی ہے، محبتِ مادری کا یہ شعلہ خود بخود دھیما پڑتا جاتا ہے، اور پھر ایک وقت آتا ہے جب حیوانات میں تو بالکل ہی بجھ جاتا ہے، اور انسان میں بھی اِس کی گرمجوشیاں باقی نہیں رہتیں۔ یہ انقلاب کیوں ہوتا ہے؟ ایسا کیوں ہے کہ بچّے کے پیدا ہوتے ہی محبت کا ایک عظیم ترین جذبہ جنبش میں آجائے، اور پھر ایک خاص وقت تک قائم رہ کر خود بخود غائب ہو جائے؟ اس لیے، کہ یہ نظامِ ربوبیت کی کارفرمائی ہے، اور اس کا مقتضیٰ یہی تھا۔ ربوبیت چاہتی ہے کہ بچّے کی پرورش ہو۔ اُس نے پرورش کا ذریعہ ماں کے جذبۂ محبت میں رکھ دیا تھا۔ جب بچّے کی عمر اس حد تک پہنچ گئی کہ ماں کی پرورش کی احتیاج باقی نہ رہی، تو اس ذریعے کی بھی ضرورت باقی نہ رہی۔ اب اِس کا باقی رہنا ماں کے لیے بوجھ اور بچّے کے لیے رکاوٹ ہوتا۔ بچّے کی احتیاج کا سب سے نازک وقت اُس کی نئی نئی طفولیت تھی، اِس لیے ماں کی محبت میں بھی سب سے زیادہ جوش اُسی وقت تھا۔ پھر جوں جوں بچّہ بڑھتا گیا، احتیاج کم ہوتی گئی، اس لیے محبت کی گرمجوشیاں بھی گھٹتی گئیں۔ فطرت نے محبتِ مادری کا دامن بچّے کی احتیاجِ پرورش سے باندھ دیا تھا۔ جب احتیاج زیادہ تھی، تو محبت کی سرگرمی بھی زیادہ تھی۔ جب احتیاج کم ہوگئی تو محبت بھی تغافل کرنے لگی[1]۔

جن حیوانات کے بچّے انڈوں سے پیدا ہوتے ہیں، اُن کی جسمانی ساخت اور طبیعت دودھ والے حیوانات سے مختلف ہوتی ہے، اِس لیے وہ اوّل دن ہی سے معمولی غذائیں کھا سکتے ہیں بشرطیکہ کھلانے کے لیے کوئی شفیق نگرانی موجود ہو۔ چنانچہ تم دیکھتے ہو کہ بچّہ انڈے سے نکلتے ہی غذا ڈھونڈھنے لگتا ہے، اور ماں چُن چُن کر اُس کے سامنے ڈالتی اور منہ میں لے کر کھانے کی تلقین کرتی ہے۔ یا ایسا کرتی ہے کہ خود کھا لیتی ہے مگر ہضم نہیں کرتی، اپنے اندر نرم اور ہلکا بنا کر محفوظ رکھتی ہے، اور جب بچّہ غذا کے لیے مُنہ کھولتا ہے تو اُس کے اندر اُتار دیتی ہے۔

[1] انسان میں ماں کی محبت بلوغ کے بعد بھی بدستور باقی رہتی ہے، اور بعض حالتوں میں اس کے انفعالات اتنے شدید ہوتے ہیں کہ عہدِ طفولیت کی محبت میں اور بعد کی محبت میں کوئی فرق محسوس نہیں ہوتا، لیکن یہ صورتِ حال غالباً انسان کی مدنی و عقلی زندگی کے نشوونما کا نتیجہ ہے، نہ کہ فطرتِ حیوانی کا۔ ابتدائی انسان میں بھی یہ علاقہ فطرةً اِسی حد تک ہوگا کہ بچّہ سنِ تمیز تک پہنچ جائے۔ لیکن بعد کو نسل و خاندان کی تشکیل اور اجتماعی احساسات کی ترقی سے مادری رشتہ ایک دائمی رشتہ بن گیا ۱۲۔

رُبُوبیّتِ مَعنوی

پھر اس سے بھی عجیب تر نظامِ ربوبیت کا معنوی پہلو ہے۔ خارج میں زندگی اور پرورش کا کتنا ہی سروسامان کیا جاتا، لیکن وہ کچھ مفید نہیں ہو سکتا تھا اگر ہر وجود کے اندر اُس سے کام لینے کی ٹھیک ٹھیک استعداد نہ ہوتی اور اُس کے ظاہری و باطنی قویٰ اُس کا ساتھ نہ دیتے پس یہ ربوبیت ہی کا فیضان ہے کہ ہم دیکھتے ہیں، ہر مخلوق کی ظاہری و باطنی بناوٹ اس طرح کی واقع ہوئی ہے کہ اُس کی ہر قوت، اُس کے سامانِ پرورش کی نوعیت کے مطابق ہوتی ہے، اور اُس کی ہر چیز اُسے زندہ رہنے اور نشوونما پانے میں مدد دیتی ہے۔ ایسا نہیں ہو سکتا کہ کوئی مخلوق اپنے جسم و قویٰ کی ایسی نوعیت رکھتی ہو جو اُس کے حالاتِ پرورش کے مقتضیات کے خلاف ہو۔ اس سلسلے میں جو حقائق مشاہدہ و تفکر سے نمایاں ہوتے ہیں، اُن میں دو باتیں سب سے زیادہ نمایاں ہیں۔ اس لیے جابجا قرآنِ حکیم نے اُن پر توجہ دلائی ہے۔ ایک کو وہ تقدیر سے تعبیر کرتا ہے دوسری کو ہدایت سے۔

تقدیر تقدیر کے معنی اندازہ کر دینے کے ہیں یعنی کسی چیز کے لیے ایک خاص طرح کی حالت ٹھہرا دینے کے۔ خواہ یہ ٹھہراؤ کمیت میں ہو یا کیفیت میں۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ فطرت نے ہر وجود کی جسمانی ساخت اور معنوی قویٰ کے لیے ایک خاص طرح کا اندازہ ٹھہرا دیا ہے جس سے وہ باہر نہیں جا سکتا، اور یہ اندازہ ایسا ہے جو اُس کی زندگی اور نشوونما کے تمام احوال و ظروف سے ٹھیک ٹھیک مناسبت رکھتا ہے:

وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَقَدَّرَهُ تَقْدِيرًا ۝ (۲۵:۲)
اور اُس نے تمام چیزیں پیدا کیں، پھر ہر چیز کے لیے (اُس کی حالت اور ضرورت کے مطابق) ایک خاص اندازہ ٹھہرا دیا!

یہ کیا چیز ہے کہ ہر گردوپیش میں اور اُس کی پیداوار میں ہمیشہ مطابقت پائی جاتی ہے، اور یہ کیوں ایسا قانونِ خلقت ہے جو کبھی متغیر نہیں ہو سکتا؟ یہ کیوں ہے کہ ہر مخلوق اپنی ظاہری و باطنی بناوٹ میں ویسی ہی ہوتی ہے جیسا اُس کا گردوپیش ہے، اور ہر گردوپیش ویسا ہی ہوتا ہے جیسی اُس کی مخلوقات ہوتی ہے؟ یہ اُس حکیم و قدیر کی ٹھہرائی ہوئی تقدیر ہے اور اُس نے ہر چیز کی خلقت و زندگی کے لیے ایسا ہی اندازہ مقرر کر دیا ہے۔ اُس کا یہ قانونِ تقدیر صرف حیوانات و نباتات ہی کے لیے نہیں ہے بلکہ کائناتِ ہستی کی ہر چیز کے لیے ہے۔ ستاروں کا یہ پورا نظامِ گردش بھی اسی تقدیر کی حد بندیوں پر قائم ہے:

وَالشَّمْسُ تَجْرِي لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا ذَٰلِكَ تَقْدِيرُ الْعَزِيزِ الْعَلِيمِ (۳۶:۳۸)
اور (دیکھو) سورج کے لیے جو قرارگاہ ٹھہرا دی گئی ہے، وہ اُسی پر چلتا ہے۔ اور یہ عزیز و علیم خدا کی اُس کے لیے تقدیر ہے۔

مخلوقات اور اُس کے گردوپیش کی مطابقت کا یہی قانون ہے جس نے دونوں میں باہم دگر مناسبت پیدا کر دی ہے، اور ہر مخلوق اپنے چاروں طرف وہی پاتی ہے جس میں اُس کے لیے پرورش اور نشوونما کا سامان ہوتا ہے۔ پرند کا جسم اُڑنے والا

ہے مچھلی کا تیرنے والا، چارپایوں کا چلنے والا، حشرات کا رینگنے والا۔ اس لیے کہ ان میں سے ہر نوع کا گردوپیش ویسے ہی جسم کے لیے موزوں ہے، جیسا اُسے ملا ہے، اور اس لیے کہ اُن میں سے ہر نوع کی جسمانی ساخت ویسا ہی گردوپیش چاہتی ہے جیسا گردوپیش اُسے حاصل ہے۔ دریا میں پرند پیدا نہیں ہوتا، اس لیے کہ یہ گردوپیش اُس کے لیے مفید پرورش نہیں خشکی میں مچھلیاں پیدا نہیں ہوسکتیں، کیونکہ خشکی اُن کے لیے موزوں نہیں۔ اگر فطرت کی اس تقدیر کے خلاف، ایک خاص گردوپیش کی مخلوق دوسرے قسم کے گردوپیش میں چلی جاتی ہے، تو یا تو وہاں زندہ نہیں رہتی، یا رہتی ہے تو پھر بتدریج اُس کی جسمانی ساخت اور طبیعت بھی ویسی ہی ہوجاتی ہے، جیسی اُس گردوپیش میں ہونی چاہیے +

پھر ان میں سے ہر نوع کے لیے مقامی مؤثرات کے مختلف گردوپیش ہیں، اور ہر گردوپیش کا یہی حال ہے۔ سرد آب وہوا کی پیداوار، سرد آب وہوا ہی کے لیے ہے۔ گرم کی گرم کے لیے۔ قطبِ شمالی کے قرب وجوار کا ریچھ خطِ استواء کے قرب میں نظر نہیں آسکتا، اور منطقۂ حارّہ کے جانور منطقۂ باردہ میں معدوم ہیں +

ہدایت

ہدایت کے معنی راہ دکھلانے، راہ پر لگا دینے، رہنمائی کرنے کے ہیں، اور اس کے مختلف مراتب اور اقسام ہیں تفصیل آگے آئیگی۔ یہاں صرف اُس مرتبۂ ہدایت کا ذکر کرنا ہے جو تمام مخلوقات پر اُن کی پرورش کی راہیں کھولتا، اُنہیں زندگی کی راہ پر لگاتا، اور ضروریاتِ زندگی کی طلب وحصول میں رہنمائی کرتا ہے۔ فطرت کی یہ ہدایت، ربوبیت کی ہدایت ہے، اور اگر ہدایتِ ربوبیت کی دستگیری نہ ہوتی، تو ممکن نہ تھا کہ کوئی مخلوق بھی دنیا کے سامانِ حیات و پرورش سے فائدہ اُٹھا سکتی، اور زندگی کی سرگرمیاں ظہور میں آسکتیں +

لیکن ربوبیتِ الٰہی کی یہ ہدایت کیا ہے؟ قرآن کہتا ہے، یہ وجدان کا فطری الہام اور حواس و ادراک کی قدرتی استعداد ہے۔ وہ کہتا ہے، یہ فطرت کی وہ رہنمائی ہے جو ہر مخلوق کے اندر پہلے وجدان کا الہام بن کر نمودار ہوتی ہے، پھر حواس وادراک کا چراغ روشن کر دیتی ہے۔ یہ ہدایت کے مختلف مراتب میں سے وجدان اور ادراک کی ہدایت کے مراتب ہیں +

ہدایتِ وجدان

وجدان کی ہدایت یہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں، ہر مخلوق کی طبیعت میں کوئی ایسا اندرونی الہام موجود ہے جو اُسے زندگی اور پرورش کی راہوں پر خود بخود لگا دیتا ہے، اور وہ باہر کی رہنمائی وتعلیم کی محتاج نہیں ہوتی۔ انسان کا بچہ ہو یا حیوان کا، جونہی شکمِ مادر سے باہر آتا ہے، خود بخود معلوم کر لیتا ہے کہ اُس کی غذا ماں کے سینے میں ہے، اور جب پستان مُنہ میں لیتا ہے، تو جانتا ہے کہ اُسے زور زور سے چُوسنا چاہیے۔ بلّی کے بچوں کو ہم ہمیشہ دیکھتے ہیں کہ ابھی ابھی پیدا ہوئے ہیں، اُن کی آنکھیں بھی نہیں کُھلی ہیں، لیکن ماں جوشِ محبت میں اُنہیں چاٹ رہی ہے، وہ اُس کے سینے پر مُنہ مار رہے ہیں۔ یہ بچہ جس نے عالمِ ہستی میں ابھی ابھی قدم رکھا ہے، جسے خارج کے مؤثرات نے چھُوا تک نہیں کس طرح معلوم کر لیتا ہے کہ اُسے پستان مُنہ میں لے لینا چاہیے، اور اُس کی غذا کا سرچشمہ یہیں ہے؟ وہ کونسا فرشتہ ہے جو اُس وقت اُس

کے کان میں پھونک دیتا ہے کہ اس طرح اپنی غذا حاصل کرلے! یقیناً وہ وجدانی ہدایت کا فرشتہ ہے، اور یہی وجدانی ہدایت ہے جو قبل اِس کے کہ حواس و ادراک کی روشنی نمودار ہو، ہر مخلوق کو اُس کی پرورش و زندگی کی راہوں پر لگا دیتی ہے +

تمہارے گھر میں پلی ہوئی بلّی ضرور ہوگی۔ تم نے دیکھا ہوگا کہ بلّی اپنی عمر میں پہلی مرتبہ حاملہ ہوئی ہے۔ اِس حالت کا اُسے کوئی پچھلا تجربہ حاصل نہیں۔ تاہم اُس کے اندر کوئی چیز ہے جو اُسے بتا دیتی ہے کہ تیاری و حفاظت کی سرگرمیاں شروع کر دینی چاہئیں۔ جونہی وضعِ حمل کا وقت قریب آتا ہے، خود بخود اُس کی توجہ ہر چیز کی طرف سے ہٹ جاتی ہے اور کسی محفوظ گوشے کی جستجو شروع کر دیتی ہے۔ تم نے دیکھا ہوگا کہ مضطرب الحال بلّی مکان کا ایک ایک کونہ دیکھتی پھرتی ہے۔ پھر وہ خود بخود ایک سب سے محفوظ اور علٰحدہ گوشہ چھانٹ لیتی ہے، اور وہاں بچّہ دیتی ہے۔ پھر یکایک اُس کے اندر بچّے کی حفاظت کی طرف سے ایک مجہول خطرہ پیدا ہو جاتا ہے، اور وہ یکے بعد دیگرے اپنی جگہ بدلتی رہتی ہے۔ غور کرو، یہ کونسی قوّت ہے جو بلّی کے اندر یہ خیال پیدا کر دیتی ہے کہ محفوظ جگہ تلاش کرے کیونکہ عنقریب ایسی جگہ کی اُسے ضرورت ہوگی؟ یہ کونسا الہام ہے جو اُسے خبردار کر دیتا ہے کہ بلّا بچّوں کا دشمن اور اُن کی بُو سونگھتا پھرتا ہے، اس لیے جگہ بدلتے رہنا چاہیے؟ بلاشبہ یہ ربوبیتِ الٰہی کی وجدانی ہدایت ہے جس کا الہام ہر مخلوق کے اندر اپنی نمود رکھتا ہے، اور جو اُن پر زندگی اور پرورش کی تمام راہیں کھول دیتا ہے +

ہدایت حواس

ہدایت کا دُوسرا مرتبہ حواس اور مدرکاتِ ذہنی کی ہدایت ہے، اور وہ اس درجہ واضح و معلوم ہے کہ تشریح کی ضرورت نہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اگرچہ حیوانات اُس جوہرِ دماغ سے محروم ہیں جسے فکر و عقل سے تعبیر کیا جاتا ہے، تاہم فطرت نے اُنہیں احساس و ادراک کی وہ تمام قوّتیں دیدی ہیں جن کی زندگی و معیشت کے لیے ضرورت تھی، اور اُن کی مدد سے وہ اپنے رہنے سہنے، کھانے پینے، توالد و تناسل، اور حفاظت و نگرانی کے تمام وظائف حُسن و خوبی کے ساتھ انجام دیتے رہتے ہیں۔ پھر حواس و ادراک کی یہ ہدایت ہر حیوان کے لیے ایک ہی طرح کی نہیں ہے، بلکہ ہر وجود کو اُتنی ہی اور ویسی ہی استعداد دی گئی ہے جتنی اور جیسی استعداد اُس کے احوال و ظروف کے لیے ضروری تھی۔ چیونٹی کی قوّت شامّہ نہایت دور رس ہوتی ہے، اس لیے کہ اسی قوّت کے ذریعے وہ اپنی غذا حاصل کر سکتی ہے۔ چیل اور عقاب کی نگاہ تیز ہوتی ہے، کیونکہ اگر اُن کی نگاہ تیز نہ ہو تو بلندی میں اُڑتے ہوئے اپنا شکار دیکھ نہ سکیں۔ یہ سوال بالکل غیر ضروری ہے کہ حیوانات کے حواس و ادراک کی یہ حالت اوّل دن سے تھی، یا احوال و ظروف کی ضروریات اور قانون مطابقت کے مؤثرات سے بتدریج ظہور میں آئی۔ اس لیے کہ خواہ کوئی صورت ہو، بہرحال فطرت کی بخشی ہوئی استعداد ہے، اور نشو و ارتقا کا قانون بھی فطرت ہی کا ٹھہرایا ہوا قانون ہے +

چنانچہ یہی مرتبۂ ہدایت ہے جس کو قرآن نے ربوبیتِ الٰہی کی وحی سے تعبیر کیا ہے۔ عربی میں وحی کے معنی مخفی ایماء اور اشارے کے ہیں۔ یہ گویا فطرت کی وہ اندرونی سرگوشی ہے جو ہر مخلوق پر اُس کی راہِ عمل کھول دیتی ہے:

وَاَوْحٰی رَبُّكَ اِلَى النَّحْلِ اَنِ اتَّخِذِیْ مِنَ الْجِبَالِ بُیُوْتًا وَّمِنَ الشَّجَرِ وَمِمَّا یَعْرِشُوْنَ۝ (۶۸:۱۶)

اور (دیکھو) تمہارے پروردگار نے شہد کی مکھی کے دل میں یہ بات ڈال دی کہ پہاڑوں میں اور درختوں میں اور اُن ٹٹیوں میں جو اس غرض سے بلند کی جاتی ہیں اپنے لیے چھتے بنائے۔

اور یہی وہ ربوبیت الٰہی کی ہدایت ہے جس کی طرف حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کی زبانی اشارہ کیا گیا ہے۔ فرعون نے جب پوچھا: فَمَنْ رَّبُّكُمَا یٰمُوْسٰی؟ تمہارا پروردگار کون ہے؟ تو حضرت موسیٰ نے کہا:

رَبُّنَا الَّذِیْٓ اَعْطٰی كُلَّ شَیْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰی۝ (۵۰:۲۰)

ہمارا پروردگار وہ ہے جس نے ہر چیز کو اُس کی بناوٹ دی، پھر اس پر (زندگی و معیشت کی) راہ کھول دی!

اور پھر یہی وہ ہدایت ہے جسے دُوسری جگہ "راہِ عمل آسان کر دینے" سے بھی تعبیر کیا گیا ہے:

مِنْ اَیِّ شَیْءٍ خَلَقَهٗ۝ مِنْ نُّطْفَةٍ خَلَقَهٗ فَقَدَّرَهٗ۝ ثُمَّ السَّبِیْلَ یَسَّرَهٗ۝ (۸۰: ۱۸-۲۰)

اُس نے انسان کو کس چیز سے پیدا کیا؟ نطفہ سے پیدا کیا۔ پھر اس (کی تمام ظاہری و باطنی قوتوں) کے لیے ایک اندازہ ٹھہرا دیا، پھر اس پر (زندگی و عمل کی) راہ آسان کر دی۔

یہی "ثُمَّ السَّبِیْلَ یَسَّرَهٗ" یعنی "راہِ عمل آسان کر دینا" وجدان و ادراک کی ہدایت ہے جو تقدیر کے بعد ہے، کیونکہ اگر فطرت کی یہ رہنمائی نہ ہوتی تو ممکن نہ تھا کہ ہم اپنی ضروریاتِ زندگی حاصل کر سکتے۔

آگے چل کر تمہیں معلوم ہوگا کہ قرآن نے تکوینِ وجود کے جو چار مرتبے بیان کیے ہیں، اُن میں سے تیسرا اور چوتھا مرتبہ یہی تقدیر اور ہدایت کا مرتبہ ہے یعنی تخلیق، تسویہ، تقدیر، ہدایت:

الَّذِیْ خَلَقَ فَسَوّٰی۝ وَالَّذِیْ قَدَّرَ فَهَدٰی۝ (۸۷: ۲-۳)

وہ پروردگار عالم، جس نے پیدا کیا، پھر اُسے ٹھیک ٹھیک درست کر دیا، اور جس نے ہر وجود کے لیے ایک اندازہ ٹھہرا دیا، پھر اُس پر راہ (عمل) کھول دی۔

بُراہینِ قرآنیہ کا مبدءِ استدلال

چنانچہ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے خدا کی ہستی اور اُس کی توحید وصفات پر جابجا نظامِ ربوبیت سے استدلال کیاہے، اور یہ استدلال اُس کے مہماتِ دلائل میں سے ہے لیکن قبل اس کے کہ اس کی تشریح کی جائے، مناسب ہوگا کہ قرآن کے طریقِ استدلال کی بعض مبادیات واضح کردی جائیں۔ کیونکہ مختلف اسباب سے جن کی تشریح کا یہ موقع نہیں، مطالبِ قرآنی کا یہ گوشہ سب سے زیادہ مہجور ہوگیاہے، اور ضرورت ہے کہ از سرِنو حقیقت گم گشتہ کا سُراغ لگایا جائے۔

دعوتِ تعقل قرآن کے طریقِ استدلال کا اولین مبدأ، تعقل وتفکر کی دعوت ہے یعنی وہ جابجا اس بات پر زور دیتا ہے کہ انسان کے لیے حقیقت شناسی کی راہ یہی ہے کہ خدا کی دی ہوئی عقل وبصیرت سے کام لے اور اپنے وجود کے اندر اور اپنے وجود کے باہر، جو کچھ بھی محسوس کرسکتاہے، اُس میں تدبّر وتفکر کرے۔ چنانچہ قرآن کی کوئی سورت اور سورت کا کوئی حصّہ نہیں جو تفکر وتعقل کی دعوت سے خالی ہو:

وَفِی الْاَرْضِ اٰیٰتٌ لِّلْمُوْقِنِیْنَ ۙ وَفِیْٓ اَنْفُسِكُمْ ۭ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ۝ (۵۱ : ۲۰-۲۱)

اور یقین رکھنے والوں کے لیے زمین میں (معرفتِ حق کی) نشانیاں ہیں، اور خود تمہارے وجود میں بھی، پھر کیا تم دیکھتے نہیں؟

وہ کہتاہے، انسان کو عقل وبصیرت دی گئی ہے، اس لیے وہ اس قوت کے ٹھیک ٹھیک استعمال کرنے نہ کرنے کے لیے جواب دِہ ہے:

اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰۗىِٕكَ كَانَ عَنْهُ مَسْـُٔــوْلًا ۝ (۱۷ : ۳۶)

یقیناً (انسان کا) سُننا، دیکھنا، سوچنا، سب اپنی اپنی جگہ جواب دہی رکھتے ہیں!

وہ کہتاہے زمین کی ہر چیز میں، آسمان کے ہر منظر میں، زندگی کے ہر تغیر میں، فکرِ انسانی کے لیے معرفتِ حقیقت کی نشانیاں ہیں، بشرطیکہ وہ غفلت واعراض میں مبتلا نہ ہوجائے:

وَكَاَيِّنْ مِّنْ اٰيَةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ يَمُرُّوْنَ عَلَيْهَا وَهُمْ عَنْهَا مُعْرِضُوْنَ ۝ (۱۲ : ۱۰۵)

اور آسمان وزمین میں (معرفتِ حق کی) کتنی ہی نشانیاں ہیں لیکن (افسوس انسان کی غفلت پر!) لوگ اُن پر سے گزر جاتے ہیں اور نظر اُٹھا کر دیکھتے تک نہیں!

تخلیق بالحق اچھا، اگر انسان عقل وبصیرت سے کام لے اور کائناتِ خلقت میں تفکر کرے، تو اُس پر حقیقت شناسی کا کونسا دروازہ کھُلیگا؟ وہ کہتاہے، سب سے پہلی حقیقت جو اُس کے سامنے نمودار ہوگی، وہ تخلیق بالحق کا عالمگیر اور بنیادی قانون ہے یعنی وہ دیکھیگا کہ کائناتِ خلقت اور اُس کی ہر چیز کی بناوٹ کچھ اس طرح کی واقع ہوئی ہے کہ ہر چیز ضبط

ترتیب کے ساتھ ایک خاص نظام و قانون میں منسلک ہے، اور کوئی شے نہیں جو حکمت و مصلحت سے خالی ہو ایسا نہیں ہے کہ یہ سب کچھ تخلیق بالباطل ہو یعنی بغیر کسی معین اور ٹھہرائے ہوئے مقصد و نظم کے وجود میں آگیا ہو، کیونکہ اگر ایسا ہوتا، تو ممکن نہ تھا کہ اس نظم، اس یکسانیت، اس دقت کے ساتھ اس کی ہر بات کسی نہ کسی حکمت و مصلحت کے ساتھ بندھی ہوئی ہوتی:

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً لِّلْمُؤْمِنِیْنَ (۲۹:۴۴)	اللہ نے آسمانوں کو اور زمین کو حکمت اور مصلحت کے ساتھ پیدا کیا ہے اور بلاشبہ اس بات میں ارباب ایمان کے لیے (معرفت حق کی) ایک بڑی ہی نشانی ہے!

آل عمران کی مشہور آیت میں اُن اربابِ دانش کی جو آسمان و زمین کی خلقت میں تفکر کرتے ہیں صدائے حال یہ بتائی ہے:

رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا (۳: ۱۹۱)	اے ہمارے پروردگار! یہ سب کچھ تو نے اس لیے نہیں پیدا کیا ہے کہ محض ایک بیکار و عبث سا کام ہو!

دوسری جگہ "تخلیق بالباطل" کو تلعب سے تعبیر کیا ہے۔ "تلعب" یعنی کوئی کام کھیل کود کی طرح بغیر کسی معقول غرض و مدعا کے کرنا:

وَمَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَیْنَهُمَا لٰعِبِیْنَ ۝ مَا خَلَقْنٰهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ ۝ (۴۴: ۳۸-۳۹)	اور ہم نے آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ اُن کے درمیان ہے محض کھیل اور تماشہ کرتے ہوئے نہیں پیدا کیا ہے۔ ہم نے انہیں نہیں پیدا کیا مگر حکمت و مصلحت کے ساتھ۔ مگر اکثر انسان ایسے ہیں جو اس حقیقت کا علم نہیں رکھتے۔

پھر جا بجا اس "تخلیق بالحق" کی تشریح کی ہے۔ مثلاً ایک مقام پر "تخلیق بالحق" کے اس پہلو پر توجہ دلائی ہے کہ کائنات کی ہر چیز افادہ و فیضان کے لیے ہے، اور فطرت چاہتی ہے کہ جو کچھ بنائے، اس طرح بنائے کہ اُس میں وجود اور زندگی کے لیے نفع اور راحت ہو:

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ یُكَوِّرُ الَّیْلَ عَلَى النَّهَارِ وَیُكَوِّرُ النَّهَارَ عَلَى الَّیْلِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ كُلٌّ یَّجْرِیْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى اَلَا هُوَ الْعَزِیْزُ الْغَفَّارُ ۝ (۳۹: ۵)	اُس نے آسمانوں اور زمین کو حکمت و مصلحت کے ساتھ پیدا کیا ہے اُس نے رات اور دن کے اختلاف اور ظہور کا ایسا انتظام کر دیا کہ رات دن پر لپٹی جاتی ہے، اور دن رات پر لپٹا آتا ہے۔ اور سورج اور چاند دونوں کو اُس کی قدرت نے مسخر کر رکھا ہے۔ سب اپنی اپنی جگہ اپنے مقررہ وقت تک کے لیے گردش کر رہے ہیں۔

ایک دوسرے موقع پر خصوصیت کے ساتھ اجرام سماویہ کے افادہ و فیضان پر توجہ دلائی ہے، اور اُسے "تخلیق بالحق" سے تعبیر کیا ہے:

هُوَالَّذِیْ جَعَلَ الشَّمْسَ ضِیَآءً وَّالْقَمَرَ نُوْرًا وَّقَدَّرَهٗ مَنَازِلَ لِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِیْنَ وَالْحِسَابَ مَاخَلَقَ اللّٰهُ ذٰلِكَ اِلَّا بِالْحَقِّ یُفَصِّلُ الْاٰیٰتِ لِقَوْمٍ یَّعْلَمُوْنَ۔

وہ (کارفرمائے قدرت) جس نے سورج کو درخشندہ اور چاند کو روشن بنایا، اور پھر چاند کی گردش کے لیے منزلیں ٹھہرا دیں تاکہ تم برسوں کی گنتی اور اوقات کا حساب معلوم کرلو۔ بلاشبہ اللہ نے یہ سب کچھ پیدا نہیں کیا ہے مگر حکمت و مصلحت کے ساتھ۔ وہ ان لوگوں کے لیے جو جاننے والے ہیں، (علم و معرفت کی) نشانیاں الگ الگ کرکے واضح کردیتا ہے۔

ایک اور موقع پر فطرت کے جمال و زیبائی کی طرف اشارہ کیا ہے اور اُسے "تخلیق بالحق" سے تعبیر کیا ہے یعنی فطرتِ کائنات میں تحسین و آرائش کا قانون کام کر رہا ہے، جو چاہتا ہے، جو کچھ بنے، ایسا بنے کہ اُس میں حُسن و جمال اور خوبی و کمال ہو:

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ وَصَوَّرَكُمْ فَاَحْسَنَ صُوَرَكُمْ (۶۴:۳)

اُس نے آسمانوں کو اور زمین کو حکمت و مصلحت کے ساتھ پیدا کیا، اور تمہاری صورتیں بنائیں تو نہایت حسن و خوبی کے ساتھ بنائیں۔

اسی طرح وہ قانونِ مجازات پر (یعنی جزا و سزا کے قانون پر) بھی اُسی "تخلیق بالحق" سے استشہاد کرتا ہے۔ تم دیکھتے ہو کہ دنیا میں ہر چیز کوئی نہ کوئی خاصہ اور نتیجہ رکھتی ہے، اور یہ تمام خواص اور نتائج لازمی اور اٹل ہیں۔ پھر کیونکر ممکن ہے کہ انسان کے اعمال میں بھی اچھے اور بُرے خواص اور نتائج نہوں، اور وہ قطعی اور اٹل نہوں؟ جو قانونِ فطرت دنیا کی ہر چیز میں اچھے بُرے کا امتیاز رکھتا ہے، کیا انسان کے اعمال میں اس امتیاز سے غافل ہوجائے گا۔

اَمْ حَسِبَ الَّذِیْنَ اجْتَرَحُوا السَّیِّاٰتِ اَنْ نَّجْعَلَهُمْ كَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَوَآءً مَّحْیَاهُمْ وَمَمَاتُهُمْ سَآءَ مَا یَحْكُمُوْنَ۔ وَخَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ وَلِتُجْزٰی كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا یُظْلَمُوْنَ۔ (۴۵:۲۱-۲۲)

جو لوگ بُرائیاں کرتے ہیں، کیا وہ سمجھتے ہیں ہم اُنہیں اُن لوگوں جیسا کردینگے جو ایمان لائے اور جن کے اعمال اچھے ہیں؟ یعنے دونوں برابر ہوجائیں، زندگی میں بھی اور موت میں بھی؟ (اگر ان لوگوں کے فہم و دانش کا فیصلہ یہی ہے، تو) کیا ہی بُرا اُن کا فیصلہ ہے! اور حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے آسمانوں کو اور زمین کو حکمت و مصلحت کے ساتھ پیدا کیا ہے، اور اس لیے پیدا کیا ہے کہ ہر جان اپنی کمائی کے مطابق بدلہ پالے۔ اور ایسا نہیں ہوگا کہ اُن کے ساتھ ناانصافی ہو۔

معاد یعنی مرنے کے بعد کی زندگی پر بھی اس سے جابجا استشہاد کیا ہے۔ کائنات میں ہر چیز کوئی نہ کوئی مقصد اور منتہیٰ رکھتی ہے پس ضروری ہے کہ انسانی وجود کے لیے بھی کوئی نہ کوئی مقصد اور منتہیٰ ہو۔ یہی منتہیٰ آخرت کی زندگی ہے۔ کیونکہ یہ تو ہو نہیں سکتا کہ کائناتِ ارضی کی یہ بہترین مخلوق صرف اسی لیے پیدا کی گئی ہو، کہ پیدا ہو، اور چند دن جی کر فنا ہوجائے:

أَوَلَمْ يَتَفَكَّرُوا فِي أَنفُسِهِم مَّا خَلَقَ اللَّهُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا إِلَّا بِالْحَقِّ وَأَجَلٍ مُّسَمًّى وَإِنَّ كَثِيرًا مِّنَ النَّاسِ بِلِقَاءِ رَبِّهِمْ لَكَافِرُونَ ۝

(۳۰ : ۸)

کیا ان لوگوں نے کبھی اپنے دل میں اس بات پر غور نہیں کیا کہ اللہ نے آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ اُن کے درمیان ہے محض بیکار و عبث نہیں بنایا ہو۔ ضروری ہو کہ حکمت و مصلحت کے ساتھ بنایا ہو۔ اور اس کے لیے ایک مقررہ وقت ٹھہرا دیا ہو۔ اصل یہ ہے کہ انسانوں میں بہت سے لوگ ایسے ہیں جو اپنے پروردگار کی ملاقات سے یکقلم منکر ہیں

مبدأ استدلال غرضکہ قرآن کا مبدأ استدلال یہ ہے کہ:

(۱) اُس کے نزول کے وقت دین داری اور خدا پرستی کے جس قدر عام تصورات موجود تھے، وہ نہ صرف عقل کی آمیزش سے خالی تھے، بلکہ اُن کی تمام تر بنیاد غیر عقلی عقائد پر آ کر ٹھہر گئی تھی۔ لیکن اُس نے خدا پرستی کے لیے عقلی تصور پیدا کیا؛

(۲) اُس کی دعوت کی تمام تر بنیاد تعقل و تفکر پر ہے، اور وہ خصوصیت کے ساتھ کائناتِ خلقت کے مطالعہ و تفکر کی دعوت دیتا ہے؛

(۳) وہ کہتا ہے، کائناتِ خلقت کے مطالعہ و تفکر سے انسان پر "تخلیق بالحق" کی حقیقت واضح ہو جاتی ہے۔ یعنی وہ دیکھتا ہے کہ اس کارخانۂ ہستی کی کوئی چیز نہیں جو کسی ٹھہرائے ہوئے مقصد اور مصلحت سے خالی ہو، اور کسی بالاتر قانونِ خلقت کے ماتحت ظہور میں نہ آئی ہو۔ یہاں جو چیز بھی اپنا وجود رکھتی ہے، ایک خاص نظم و ترتیب کے ساتھ حکمتوں اور مصلحتوں کے عالمگیر سلسلہ میں بندھی ہوئی ہے؛

(۴) وہ کہتا ہے، جب انسان ان مقاصد و مصالح پر غور کریگا، تو عرفانِ حقیقت کی راہ خود بخود اُس پر کھل جائیگی، اور جہل و کوری کی گمراہیوں سے نجات پا جائیگا؛

بُرہانِ رُبوبیت

چنانچہ اس سلسلے میں اُس نے مظاہرِ کائنات کے جن مقاصد و مصالح سے استدلال کیا ہے، اُن میں سب سے زیادہ عام استدلال رُبوبیت کا استدلال ہے، اور اسی لیے ہم اُسے بُرہانِ ربوبیت سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ وہ کہتا ہے، کائنات کے تمام اعمال و مظاہر کا اس طرح واقع ہونا کہ ہر چیز پرورش کرنے والی اور ہر تاثیر زندگی بخشنے والی ہے، اور پھر ایک ایسے نظامِ ربوبیت کا موجود ہونا جو ہر حالت کی رعایت کرتا اور ہر طرح کی مناسبت ملحوظ رکھتا ہے، ہر انسان کو وجدانی طور پر یقین دلا دیتا ہے کہ ایک پروردگارِ عالم ہستی موجود ہے، اور وہ اُن تمام صفتوں سے متصف ہے جن کے بغیر نظامِ ربوبیت کا یہ کامل اور بے عیب کارخانہ وجود میں نہیں آ سکتا تھا؛

وہ کہتا ہے، کیا انسان کا وجدان یہ باور کر سکتا ہے کہ نظامِ ربوبیت کا یہ پورا کارخانہ خود بخود وجود میں آجائے، اور کوئی زندگی، کوئی ارادہ، کوئی حکمت، اس کے اندر کارفرما نہ ہو! کیا یہ ممکن ہے کہ اس کارخانۂ ہستی کی ہر چیز میں ایک بولتی ہوئی پروردگاری اور ایک اُبھری ہوئی کارسازی موجود ہو، مگر کوئی پروردگار، کوئی کارساز موجود نہ ہو؟ پھر کیا یہ محض ایک اندھی بہری فطرت، بے جان مادہ، اور بے حس الکٹرون کے خواص ہیں جن سے پروردگاری و کارسازی کا یہ پورا کارخانہ ظہور میں آگیا ہے؟ اور عقل اور ارادہ رکھنے والی کوئی ہستی موجود نہیں؟

پروردگاری موجود ہے، مگر کوئی پروردگار موجود نہیں! کارسازی موجود ہے، مگر کوئی کارساز موجود نہیں! رحمت موجود ہے، مگر کوئی رحیم موجود نہیں! حکمت موجود ہے، مگر کوئی حکیم موجود نہیں! سب کچھ موجود ہے، مگر کوئی موجود نہیں! عمل بغیر کسی عامل کے، نظم بغیر کسی ناظم کے، قیام بغیر کسی قیوم کے، عمارت بغیر کسی معمار کے، نقش بغیر نقاش کے، سب کچھ بغیر کسی موجود کے! نہیں، انسان کی فطرت کبھی یہ باور نہیں کر سکتی۔ اُس کا وجدان پکارتا ہے کہ ایسا ہونا ممکن نہیں اُس کی فطرت اپنی بناوٹ میں ایک ایسا سانچا لے کر آئی ہے جس میں یقین و ایمان ہی ڈھل سکتا ہے۔ شک و انکار کی اس میں سمائی نہیں!

قرآن کہتا ہے، یہ بات انسان کے وجدانی اذعان کے خلاف ہے کہ وہ نظامِ ربوبیت کا مطالعہ کرے اور ایک ربّ العالمین ہستی کا یقین اُس کے اندر جاگ نہ اُٹھے۔ وہ کہتا ہے، ایک انسان غفلت کی سرشاری اور سرکشی کے ہیجان میں ہر چیز سے انکار کر دے سکتا ہے، لیکن اپنی فطرت سے انکار نہیں کر سکتا۔ وہ ہر چیز کے خلاف جنگ کر سکتا ہے، لیکن اپنی فطرت کے خلاف ہتھیار نہیں اُٹھا سکتا۔ وہ جب اپنے چاروں طرف زندگی، اور پروردگاری کا ایک عالمگیر کارخانہ پھیلا ہوا دیکھتا ہے تو اُس کی فطرت کی صدا کیا ہوتی ہے؟ اُس کے دل کے ایک ایک ریشے میں کونسا اعتقاد سمایا ہوتا ہے؟ کیا یہی نہیں ہوتا کہ ایک پروردگار ہستی موجود ہے، اور یہ سب کچھ اُسی کی کرشمہ سازیاں ہیں؟

یہ یاد رکھنا چاہیے کہ قرآن کا اُسلوبِ بیان یہ نہیں ہے کہ نظری مقدمات اور ذہنی مسلّمات کی تشکیل و ترتیب دے، اور پھر اُس پر بحث و تقریر کر کے مخاطب کو ردّ و تسلیم پر مجبور کرے۔ اُس کا تمام تر خطاب انسان کے فطری وجدان و ذوق سے ہوتا ہے۔ وہ کہتا ہے، خدا پرستی کا جذبہ انسانی فطرت کا خمیر ہے۔ اگر ایک انسان اس سے انکار کرنے لگتا ہے، تو یہ اُس کی غفلت ہے، اور ضروری ہے کہ اُسے غفلت سے چونکا دینے کے لیے دلیلیں پیش کی جائیں۔ لیکن یہ دلیل ایسی نہیں ہونی چاہیے جو محض ذہن و دماغ میں کاوش پیدا کر دے، بلکہ ایسی ہونی چاہیے جو اُس کے نہاں خانۂ دل پر دستک دے دے، اور اُس کا فطری وجدان بیدار کر دے۔ اگر اُس کا وجدان بیدار ہو گیا، تو پھر اثباتِ مدّعا کے لیے بحث و تقریر کی ضرورت نہ ہو گی۔ خود اُس کا وجدان ہی اُسے مدّعا تک پہنچا دے گا۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن خودِ انسان کی فطرت ہی سے انسان پر حجت لاتا ہے:

بَلِ الْإِنسَانُ عَلَىٰ نَفْسِهِ بَصِيرَةٌ ۝ وَلَوْ أَلْقَىٰ مَعَاذِيرَهُ ۝ (۷۵: ۱۴)

بلکہ انسان کا وجود خود اُس کے خلاف (یعنی اُس کی کج اندیشیوں کے خلاف) حجت ہے، اگرچہ وہ (اپنے وجدان کے خلاف) کتنے ہی عذر بہانے تراش لیا کرے۔

اور اِسی لیے وہ جابجا فطرتِ انسانی کو مخاطب کرتا اور اُس کی گہرائیوں سے جواب طلب کرتا ہے:

قُلْ مَن يَرْزُقُكُم مِّنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ أَمَّن يَمْلِكُ السَّمْعَ وَالْأَبْصَارَ وَمَن يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَمَن يُدَبِّرُ الْأَمْرَ ۚ فَسَيَقُولُونَ اللَّهُ ۚ فَقُلْ أَفَلَا تَتَّقُونَ ۝ فَذَٰلِكُمُ اللَّهُ رَبُّكُمُ الْحَقُّ ۖ فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ إِلَّا الضَّلَالُ ۖ فَأَنَّىٰ تُصْرَفُونَ ۝ (۱۰: ۳۰)

وہ کون ہے جو آسمان (میں پھیلے ہوئے کارخانۂ حیات) سے اور زمین (کی وسعت میں پیدا ہونے والے سامانِ رزق) سے تمہیں روزی بخش رہا ہے؟ وہ کون ہے، جس کے قبضے میں تمہارا سُننا اور دیکھنا ہے؟ وہ کون ہے جو بے جان سے جاندار کو اور جاندار سے بے جان کو نکالتا ہے؟ اور پھر وہ کونسی ہستی ہے جو یہ تمام کارخانۂ خلقت اس نظم و نگرانی کے ساتھ چلا رہی ہے؟ (اے پیغمبر!) یقیناً وہ (بے اختیار) بول اُٹھیں گے اللہ ہے، (اُس کے سوا کون ہو سکتا ہے) اچھا تم اُن سے کہو، جب تمہیں اس بات سے انکار نہیں، تو پھر یہ کیوں ہے کہ غفلت و سرکشی سے نہیں بچتے! ہاں بیشک یہ اللہ ہی ہے جو تمہارا پروردگار برحق ہے، اور جب یہ حق ہے تو حق کے ظہور کے بعد اُسے نہ ماننا گمراہی نہیں تو اور کیا ہے؟! (افسوس تمہاری سمجھ پر! تم حقیقت سے منہ پھرا کے) کہاں جا رہے ہو!

ایک دوسرے موقع پر فرمایا:

أَمَّنْ خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ وَأَنزَلَ لَكُم مِّنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَنبَتْنَا بِهِ حَدَائِقَ ذَاتَ بَهْجَةٍ مَّا كَانَ لَكُمْ أَن تُنبِتُوا شَجَرَهَا ۗ أَإِلَٰهٌ مَّعَ اللَّهِ ۚ بَلْ هُمْ قَوْمٌ يَعْدِلُونَ ۝ أَمَّن جَعَلَ الْأَرْضَ قَرَارًا وَجَعَلَ خِلَالَهَا أَنْهَارًا وَجَعَلَ لَهَا رَوَاسِيَ وَجَعَلَ بَيْنَ الْبَحْرَيْنِ حَاجِزًا ۗ أَإِلَٰهٌ مَّعَ اللَّهِ ۚ بَلْ أَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ۝ أَمَّن يُجِيبُ الْمُضْطَرَّ إِذَا دَعَاهُ

وہ کون ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور جس نے آسمان سے تمہارے لیے پانی برسایا، پھر اس آب پاشی سے خوشنما باغ اُگا دیے، حالانکہ تمہارے بس کی یہ بات نہ تھی کہ اِن باغوں کے درخت اُگاتے؟ کیا (ان کاموں کا کرنے والا) اللہ کے ساتھ کوئی دوسرا معبود بھی ہے؟ (افسوس ان لوگوں کی سمجھ پر! حقیقت حال کتنی ہی ظاہر ہو) مگر یہ وہ لوگ ہیں جن کا شیوہ ہی کج روی ہے!

اچھا، بتلاؤ، وہ کون ہے جس نے زمین کو (زندگی و معیشت کا) ٹھکانا بنا دیا، اُس کے درمیان نہریں جاری کر دیں، اس (کی درستگی) کے لیے پہاڑ بلند کر دیے، دو دریاؤں میں (یعنی دریا اور سمندر میں ایسی) دیوار حائل کر دی (کہ دونوں اپنی اپنی جگہ محدود رہتے ہیں) کیا اللہ کے ساتھ کوئی دوسرا بھی ہے؟! (افسوس! کتنی واضح بات ہے) مگر ان لوگوں میں اکثر ایسے ہیں جو نہیں جانتے!

اچھا، بتلاؤ، وہ کون ہے جو بے قرار دلوں کی پکار سُنتا ہے جب وہ (ہر طرف سے

وَيَكْشِفُ السُّوْٓءَ وَيَجْعَلُكُمْ خُلَفَآءَ الْاَرْضِ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ ۝ اَمَّنْ يَّهْدِيْكُمْ فِيْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَمَنْ يُّرْسِلُ الرِّيٰحَ بُشْرًاۢ بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهٖ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ تَعٰلَى اللّٰهُ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ۝ اَمَّنْ يَّبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ وَمَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝ (٢٧: ٦١-٦٢)

مایوس ہو کر) اُسے پکارنے لگتے ہیں اور اُن کا درد دُکھ ٹال دیتا ہے؟ اور وہ، کہ اُس نے تمہیں زمین کا جانشین بنایا ہے؟ کیا اللہ کے ساتھ کوئی دوسرا بھی ہے؟ (افسوس تمہاری غفلت پر!) بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ تم نصیحت پذیر ہو! اچھا، بتلاؤ، وہ کون ہے جو صحراؤں اور سمندروں کی تاریکیوں میں تمہاری رہنمائی کرتا ہے، وہ کون ہے جو باران رحمت سے پہلے خوشخبری دینے والی ہوائیں چلا دیتا ہے؟ کیا اللہ کے ساتھ کوئی دوسرا بھی معبود ہے؟ (ہرگز نہیں!) اللہ کی ذات اُس ساجھے سے پاک و منزہ ہے جو یہ لوگ اُس کی معبودیت میں ٹھہرا رہے ہیں! اچھا، بتلاؤ، وہ کون ہے جو مخلوقات کی پیدایش شروع کرتا ہے اور پھر اُسے دُہراتا ہے، اور وہ کون ہے جو آسمان و زمین کے کارخانۂ رزق سے تمہیں روزی دے رہا ہے؟ کیا اللہ کے ساتھ کوئی دوسرا معبود بھی ہے؟ (اے پیغمبر!) ان سے کہو، اگر تم (اپنے رویّہ میں) سچے ہو، (اور انسانی عقل و بصیرت کی اس عالمگیر شہادت کے خلاف تمہارے پاس کوئی دلیل ہے) تو اپنی دلیل پیش کرو!

ان سوالات میں سے ہر سوال اپنی جگہ ایک مستقل دلیل ہے، کیونکہ ان میں سے ہر سوال کا صرف ایک ہی جواب ہو سکتا ہے، اور وہ فطرت انسانی کا عالمگیر اور مسلّمہ اذعان ہے۔ ہمارے متکلموں کی نظر اس پہلو پر نہ تھی، اس لیے قرآن کا اسلوبِ استدلال اُن پر واضح نہ ہو سکا اور دُور دراز گوشوں میں بھٹک گئے۔

بہر حال قرآن کے وہ بے شمار مقامات، جن میں کائناتِ ہستی کے سروسامانِ پرورش اور نظامِ ربوبیت کی کارسازیوں کا ذکر کیا گیا ہے، دراصل اسی استدلال پر مبنی ہیں:-

فَلْيَنْظُرِ الْاِنْسَانُ اِلٰى طَعَامِهٖٓ ۝ اَنَّا صَبَبْنَا الْمَآءَ صَبًّا ۝ ثُمَّ شَقَقْنَا الْاَرْضَ شَقًّا ۝ فَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا حَبًّا ۝ وَّعِنَبًا وَّقَضْبًا ۝ وَّزَيْتُوْنًا وَّنَخْلًا ۝ وَّحَدَآئِقَ غُلْبًا ۝ وَّفَاكِهَةً وَّاَبًّا ۝ مَّتَاعًا لَّكُمْ وَلِاَنْعَامِكُمْ ۝ (٨٠: ٢٤-٣٢)

انسان اپنی غذا پر نظر ڈالے (جو شب و روز اُس کے استعمال میں آتی رہتی ہے) ہم پہلے زمین پر پانی برساتے ہیں، پھر اُس کی سطح شق کر دیتے ہیں، پھر اُس کی روئیدگی سے طرح طرح کی چیزیں پیدا کر دیتے ہیں۔ اناج کے دانے، انگور کی بیلیں، کھجور کے خوشے، سبزی ترکاری، زیتون کا تیل، درختوں کے جھنڈ، قسم قسم کے میوے، طرح طرح کا چارہ، (اور یہ سب کچھ کس کے لیے؟) تمہارے فائدہ کے لیے اور تمہارے جانوروں کے لیے!

ان آیات میں فَلْيَنْظُرِ الْاِنْسَانُ کے زور پر غور کرو۔ انسان کتنا ہی غافل ہو جائے اور کتنا ہی اعراض کرے، لیکن دلائلِ حقیقت کی وسعت اور ہمہ گیری کا یہ حال ہے کہ کسی حال میں بھی اُس سے اوجھل نہیں ہو سکتیں۔ ایک

انسان تمام دُنیا کی طرف سے آنکھیں بند کرلے، لیکن بہرحال اپنی شب وروز کی غذا کی طرف سے تو آنکھیں بند نہیں کرلے سکتا؛ جو غذا اُس کے سامنے دھری ہے، اُسی پر نظر ڈالے۔ یہ کیا ہے؟ گیہوں کا دانہ ہے۔ اچھا، گیہوں کا ایک دانہ اپنی ہتیلی پر رکھ لو، اور اُس کی پیدائش سے لے کر اُس کی پختگی و تکمیل تک کے تمام احوال و ظروف پر غور کرو۔ کیا یہ حقیر سا ایک دانہ بھی وجود میں آسکتا تھا۔ اگر تمام کارخانہ ہستی ایک خاص نظم و ترتیب کے ساتھ اس کی بناوٹ میں سرگرم نہ رہتا؛ اور اگر دُنیا میں ایک ایسا نظامِ ربوبیت موجود ہے، تو کیا یہ ہوسکتا ہے کہ ربوبیت رکھنے والی ہستی موجود نہو؟

سورۂ نحل میں بھی استدلال ایک دُوسرے پیرایہ میں نمودار ہوا ہے:

وَاِنَّ لَكُمْ فِي الْاَنْعَامِ لَعِبْرَةً نُسْقِيكُمْ
مِمَّا فِي بُطُوْنِهٖ مِنْ بَيْنِ فَرْثٍ
وَّدَمٍ لَّبَنًا خَالِصًا سَآئِغًا لِّلشّٰرِبِيْنَ
وَمِنْ ثَمَرٰتِ النَّخِيْلِ وَالْاَعْنَابِ
تَتَّخِذُوْنَ مِنْهُ سَكَرًا وَّرِزْقًا
حَسَنًا اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ
يَّعْقِلُوْنَ وَاَوْحٰى رَبُّكَ اِلَى النَّحْلِ
اَنِ اتَّخِذِيْ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوْتًا وَّمِنَ
الشَّجَرِ وَمِمَّا يَعْرِشُوْنَ ثُمَّ كُلِيْ مِنْ
كُلِّ الثَّمَرٰتِ فَاسْلُكِيْ سُبُلَ رَبِّكِ
ذُلُلًا يَخْرُجُ مِنْ بُطُوْنِهَا شَرَابٌ
مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ فِيْهِ شِفَآءٌ لِّلنَّاسِ
اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ۱۶: ۶۶

اور (دیکھو یہ) چارپائے (جنہیں تم پالتے ہو) ان میں تمہارے لیے غور کرنے اور نتیجہ نکالنے کی کتنی بڑی عبرت ہے! ان کے جسم سے ہم خون و کثافت کے درمیان دودھ پیدا کردیتے ہیں جو پینے والوں کے لیے بے غل و غش مشروب ہوتا ہے (اسی طرح) کھجور اور انگور کے پھل ہیں جن سے نشہ کا عرق اور اچھی غذا، دونوں طرح کی چیزیں حاصل کرتے ہو۔ بلاشبہ اس بات میں ارباب عقل کے لیے (ربوبیت الٰہی کی) بڑی ہی نشانی ہے!

اور (پھر دیکھو) تمہارے پروردگار نے شہد کی مکھی کی طبیعت میں یہ بات ڈال دی کہ پہاڑوں میں اور درختوں میں اور اُن ٹٹیوں میں جو اس غرض سے بلند کردی جاتی ہیں، اپنے لیے گھر بنائے، پھر ہر طرح کے پھولوں سے رس چوسے، پھر اپنے پروردگار کے ٹھہرائے ہوئے طریقوں پر کامل فرمانبرداری کے ساتھ گامزن ہو۔ (چنانچہ تم دیکھتے ہو کہ) اُس کے شکم سے مختلف رنگتوں کا رس نکلتا ہے جس میں انسان کے لیے شفا ہے۔ بلاشبہ اس بات میں ان لوگوں کے لیے جو غور و فکر کرتے ہیں (ربوبیت الٰہی کی عجائب آفرینیوں کی) بڑی ہی نشانی ہے!

ؔ اس موقع پر یہ اصل پیشِ نظر رکھنی چاہیے کہ جس طرح کائنات کی ہر چیز نظر و اعتبار کے مختلف پہلو رکھتی ہے، اُسی طرح قرآن کا استشہاد بھی بیک وقت مختلف پہلوؤں سے تعلق رکھتا ہے۔ البتہ خصوصیّت کے ساتھ زور کسی ایک ہی پہلو کے لیے ہوتا ہے۔ مثلاً شہد کی پیدایش اور شہد کی مکھی کے اعمال کے مختلف پہلو ہیں۔ یہ بات کہ ایک نہایت مفید اور لذیذ غذا پیدا ہوجاتی ہے، ربوبیت ہے۔ یہ بات کہ ایک حقیر سا جانور اس دانشمندی و دقت کے ساتھ یہ کام انجام دیتا ہے، ذہن و ادراک کی بخشش کا عجیب و غریب منظر ہے، اور اس لیے حکمت و قدرت کا پہلو رکھتا ہے۔ اِن آیات کا سیاق و سباق بتلاتا ہے کہ یہاں زیادہ تر توجہ ربوبیت پر دلائی گئی ہے، لیکن ساتھ ہی حکمت و قدرت کے پہلوؤں پر بھی روشنی پڑ رہی ہے۔ اسی طرح اکثر مقامات میں ربوبیت، رحمت، حکمت، اور قدرت کے مشترک مظاہر بیان کیے گئے ہیں لیکن خصوصیّت کے ساتھ زور کسی ایک ہی پہلو پر ہے ۱۲

جس طرح اُس نے جابجا خلقت سے استدلال کیا ہے یعنی دنیا میں ہر چیز مخلوق ہے، اس لیے ضروری ہے کہ خالق بھی ہو، اسی طرح وہ ربوبیت سے بھی استدلال کرتا ہے۔ یعنی دنیا میں ہر چیز مربوب ہے اس لیے ضروری ہے کہ کوئی رب بھی ہو۔ اور دنیا میں ربوبیت کامل اور بے داغ ہے، اس لیے ضروری ہے کہ وہ رب کامل اور بے عیب ہو۔ زیادہ واضح لفظوں میں اسے یوں ادا کیا جا سکتا ہے کہ ہم دیکھتے ہیں، دنیا میں ہر چیز ایسی ہے کہ اُسے پرورش کی احتیاج ہے، اور اُسے پرورش مل رہی ہے۔ پس ضروری ہے کہ کوئی پرورش کرنے والا بھی موجود ہو۔ یہ پرورش کرنے والا کون ہے؟ یقیناً وہ نہیں ہو سکتا جو خود پروردہ اور محتاجِ پروردگاری ہو۔ قرآن میں جہاں کہیں اس طرح کے مخاطبات ہیں جیسا کہ سورۂ واقعہ کی مندرجۂ ذیل آیت میں ہے، وہ اسی استدلال پر مبنی ہیں:

اَفَرَءَیْتُمْ مَّا تَحْرُثُوْنَ ۝ ءَاَنْتُمْ تَزْرَعُوْنَهٗۤ اَمْ نَحْنُ الزّٰرِعُوْنَ ۝ لَوْ نَشَآءُ لَجَعَلْنٰهُ حُطٰمًا فَظَلْتُمْ تَفَكَّهُوْنَ ۝ اِنَّا لَمُغْرَمُوْنَ ۝ بَلْ نَحْنُ مَحْرُوْمُوْنَ ۝ اَفَرَءَیْتُمُ الْمَآءَ الَّذِیْ تَشْرَبُوْنَ ۝ ءَاَنْتُمْ اَنْزَلْتُمُوْهُ مِنَ الْمُزْنِ اَمْ نَحْنُ الْمُنْزِلُوْنَ ۝ لَوْ نَشَآءُ جَعَلْنٰهُ اُجَاجًا فَلَوْلَا تَشْكُرُوْنَ ۝ اَفَرَءَیْتُمُ النَّارَ الَّتِیْ تُوْرُوْنَ ۝ ءَاَنْتُمْ اَنْشَاْتُمْ شَجَرَتَهَاۤ اَمْ نَحْنُ الْمُنْشِـُٔوْنَ ۝ نَحْنُ جَعَلْنٰهَا تَذْكِرَةً وَّ مَتَاعًا لِّلْمُقْوِیْنَ ۝ (۵۶: ۶۳ تا ۷۳)

اچھا، تم نے اس بات پر غور کیا کہ جو کچھ تم کشت کاری کرتے ہو، اُسے تم اُگاتے ہو، یا ہم اُگاتے ہیں؟ اگر ہم چاہیں تو اُسے چورا چورا کر دیں اور تم صرف یہ کہنے کے لیے رہ جاؤ کہ "افسوس، ہمیں تو اس نقصان کا تاوان ہی دینا پڑے گا، بلکہ ہم تو اپنی محنت کے سارے فائدوں ہی سے محروم ہو گئے"

اچھا، تم نے یہ بات بھی دیکھی کہ یہ پانی جو تمہارے پینے میں آتا ہے، اسے کون برساتا ہے؟ تم برساتے ہو، یا ہم برساتے ہیں؟ اگر ہم چاہیں تو اسے (سمندر کے پانی کی طرح) کڑوا کر دیں۔ پھر کیا اُس نعمت کے لیے ضروری نہیں کہ تم شکر گزار ہو؟ اچھا، تم نے یہ بات بھی دیکھی کہ یہ آگ جو تم سُلگاتے ہو، تو اس کے لیے لکڑی تم نے پیدا کی ہے یا ہم پیدا کرتے ہیں؟

نظامِ ربوبیت سے توحید پر استدلال

اِسی طرح وہ نظامِ ربوبیت سے توحیدِ الٰہی پر استدلال کرتا ہے۔ جو رب العالمین تمام کائنات کی پرورش کر رہا ہے، اور جس کی ربوبیت کا اعتراف تمہارے دل کے ایک ایک ریشے میں موجود ہے، اُس کے سوا کون اِس کا مستحق ہو سکتا ہے کہ بندگی و نیاز کا سر اُس کے آگے جھکایا جائے؟

یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ وَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۝ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ

اے افرادِ نسلِ انسانی! اپنے پروردگار کی عبادت کرو، اُس پروردگار کی جس نے تمہیں پیدا کیا، اور اُن سب کو بھی پیدا کیا جو تم سے پہلے گزر چکے ہیں اور اس لیے پیدا کیا تاکہ تم بُرائیوں سے بچو۔ وہ پروردگارِ عالم جس نے تمہارے لیے

فِرَاشًا وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً وَّاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ۝ (۲:۲۱)	زمین فرش کی طرح بچھادی، اور آسمان چھت کی طرح بنادیا، اور آسمان سے پانی برسایا، پھر اس سے طرح طرح کے پھل پیدا کردیے تاکہ تمہارے لیے رزق کا سامان ہو۔ پس جب خالقیت اُسی کی خالقیت ہے، اور ربوبیت اُسی کی ربوبیت، تو ایسا نہ کرو کہ کسی دوسری ذات کو اُس کا ہم پلہ ٹھہرا دو، اور تم اس حقیقت سے بے خبر نہیں ہو!

یا مثلاً سورۂ فاطر میں ہے:

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ ؕ هَلْ مِنْ خَالِقٍ غَيْرُ اللّٰهِ يَرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ؕ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۫ فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ۝	اے افرادِ نسلِ انسانی! اللہ نے اپنی جن نعمتوں سے تمہیں فیض یاب کیا ہے اُن پر غور کرو، کیا اللہ کے سوا کوئی دوسرا بھی خالق ہے جو تمہیں زمین اور آسمان کی بخشایشوں سے رزق دے رہا ہے؟ نہیں، کوئی معبود نہیں ہے مگر اُسی کی ایک ذات!

نظامِ ربوبیت سے وحی و رسالت کی ضرورت پر استدلال

اسی طرح وہ نظامِ ربوبیت کے اعمال سے انسانی سعادت و شقاوت کے معنوی قوانین اور وحی و رسالت کی ضرورت پر بھی استدلال کرتا ہے جس ربّ العالمین نے تمہاری پرورش کے لیے ربوبیت کا ایسا نظام قائم کر رکھا ہے، کیا ممکن ہے کہ اُس نے تمہاری روحانی فلاح و سعادت کے لیے کوئی قانون، کوئی نظام، کوئی قاعدہ مقرر نہ کیا ہو؟ جس طرح تمہارے جسم کی ضرورتیں ہیں، اسی طرح تمہاری روح کی بھی ضرورتیں ہیں۔ پھر کیونکر ممکن ہے کہ جسم کی نشوونما کے لیے تو اس کے پاس سب کچھ ہو، لیکن روح کی نشوونما کے لیے اُس کے پاس کوئی پروردگاری نہ ہو؟

اگر وہ ربّ العالمین ہے، اور اُس کی ربوبیت کے فیضان کا یہ حال ہے کہ ہر ذرّہ کے لیے سیرابی، اور ہر چیونٹی کے لیے کارسازی رکھتی ہے، تو کیونکر باور کیا جا سکتا ہے کہ انسان کی روحانی سعادت کے لیے اُس کے پاس کوئی سرچشمگی نہ ہو؟ اُس کی پروردگاری اجسام کی پرورش کے لیے آسمان سے پانی برسائے، لیکن ارواح کی پرورش کے لیے ایک قطرۂ فیض بھی نہ رکھے؟ تم دیکھتے ہو کہ جب زمین شادابی سے محروم ہو کر مردہ ہو جاتی ہے، تو یہ اُس کا قانون ہے کہ بارانِ رحمت نمودار ہوتی اور زندگی کی برکتوں سے زمین کے ایک ایک ذرّہ کو مالامال کردیتی ہے۔ پھر کیا یہ ضروری نہیں کہ جب عالمِ انسانیت، ہدایت و سعادت کی شادابیوں سے محروم ہو جائے، تو اُس کی بارانِ رحمت نمودار ہو کر ایک ایک روح کو پیامِ زندگی پہنچا دے؟ روحانی سعادت کی یہ بارش کیا ہے؟ وہ کہتا ہے، وحیِ الٰہی ہے۔ تم اس منظر پر کبھی متعجب نہیں ہوتے کہ پانی برسا اور مردہ زمین زندہ ہوگئی۔ پھر اس بات پر کیوں چونک اٹھو کہ وحیِ الٰہی ظاہر ہوئی اور مردہ روحوں میں زندگی کی جنبش پیدا ہوگئی؟

حٰمٓ ۚ تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ ۝ اِنَّ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ۝ وَفِيْ خَلْقِكُمْ وَمَا يَبُثُّ مِنْ دَآبَّةٍ اٰيٰتٌ لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ۝ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ رِّزْقٍ فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَتَصْرِيْفِ الرِّيٰحِ اٰيٰتٌ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ۝ تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ ۚ فَبِاَيِّ حَدِيْثٍۭ بَعْدَ اللّٰهِ وَاٰيٰتِهٖ يُؤْمِنُوْنَ ۝ (۴۵: ۱-۶)

یہ اللہ کی طرف سے کتاب (ہدایت) نازل کی جاتی ہے جو عزیز اور حکیم ہے۔ بلاشبہ ایمان رکھنے والوں کے لیے آسمانوں اور زمین میں (معرفتِ حق کی) بے شمار نشانیاں ہیں۔ نیز تمہاری پیدائش میں اور اُن چار پایوں میں جنہیں اُس نے زمین میں پھیلا رکھا ہے، اربابِ یقین کے لیے بڑی ہی نشانیاں ہیں۔ اسی طرح رات اور دن کے یکے بعد دیگرے آتے رہنے میں، اور اس سرمایۂ رزق میں جسے وہ آسمان سے برساتا ہے اور زمین مرنے کے بعد پھر جی اُٹھتی ہے، اور ہواؤں کے ردّ و بدل میں اربابِ دانش کے لیے بڑی ہی نشانیاں ہیں (اے پیغمبر!) یہ اللہ کی آیتیں ہیں جو فی الحقیقت ہم تمہیں سُنا رہے ہیں، پھر اللہ اور اُس کی آیتوں کے بعد کونسی بات رہ گئی ہے جسے سُن کر یہ لوگ ایمان لائینگے؟

سورۂ انعام میں اُن لوگوں کا جو وحی الٰہی کے نزول پر متعجب ہوتے ہیں، اِن لفظوں میں ذکر کیا ہے:

وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖٓ اِذْ قَالُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰى بَشَرٍ مِّنْ شَيْءٍ ۭ (۶: ۹۱)

اور اللہ کے کاموں کی انہیں جو قدر شناسی کرنی تھی، یقیناً اُنہوں نے نہیں کی، جب اُنہوں نے یہ بات کہی کہ اللہ نے اپنے کسی بندے پر کوئی چیز نازل نہیں کی۔

تو پھر تورات اور قرآن کے نزول کے ذکر کے بعد حسبِ ذیل بیان شروع ہو جاتا ہے:

اِنَّ اللّٰهَ فٰلِقُ الْحَبِّ وَالنَّوٰى ۭ يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَمُخْرِجُ الْمَيِّتِ مِنَ الْحَيِّ ۭ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ ۝ فَالِقُ الْاِصْبَاحِ ۚ وَجَعَلَ الَّيْلَ سَكَنًا وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ حُسْبَانًا ۭ ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ ۝ وَهُوَ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ النُّجُوْمَ لِتَهْتَدُوْا بِهَا فِيْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ۭ قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ۝ الخ (۶: ۹۵-۹۹)

یقیناً یہ اللہ ہی کی کارفرمائی ہے کہ وہ دانے اور گٹھلی کو شق کرتا ہے (اور اُس سے ہر چیز کا درخت پیدا کر دیتا ہے) وہ زندہ کو مردہ چیز سے نکالتا اور مردہ کو زندہ اشیاء سے نکالنے والا ہے۔ ہاں، وہی تمہارا خدا ہے، پھر تم اُس سے روگردانی کر کے کدھر کو بہکے چلے جا رہے ہو؟ ہاں، وہی (پردۂ شب چاک کر کے) صبح کی روشنی نمودار کرنے والا ہے، وہی ہے جس نے رات کو راحت و سکون کا ذریعہ بنا دیا، اور وہی ہے کہ سورج اور چاند کی گردش اس درستگی کے ساتھ قائم کر دی کہ حساب کا معیار بن گئی۔ یہ اُس عزیز و علیم کا ٹھہرایا ہوا اندازہ ہے۔ اور (پھر دیکھو) وہی ہے جس نے تمہارے لیے ستارے پیدا کر دیے تاکہ خشکی و تری کی تاریکیوں میں اُن سے رہنمائی پاؤ۔ بلاشبہ اُن لوگوں کے لیے جو جاننے والے ہیں ہم نے دلیلیں کھول کھول کر بیان کر دی ہیں!

یعنی جس پروردگارِ عالم کی ربوبیت و رحمت کا یہ تمام فیضان شب و روز دیکھ رہے ہو، کیا ممکن ہے کہ وہ تمہاری جسمانی پرورش و ہدایت کے لیے تو یہ سب کچھ کرے، لیکن تمہاری روحانی پرورش و ہدایت کے لیے اُس کے پاس کوئی سروسامان نہ ہو؟ وہ زمین کی موت کو زندگی سے بدل دیتا ہے۔ پھر کیا تمہاری روح کی موت کو زندگی سے نہیں بدل دیگا؟ وہ ستاروں کی روشن علامتوں سے خشکی و تری کی ظلمتوں میں رہنمائی کرتا ہے۔ کیونکر ممکن ہے کہ تمہاری روحانی زندگی کی تاریکیوں میں رہنمائی کی کوئی روشنی نہ ہو؟ تم، جو کبھی اس پر متعجب نہیں ہوتے کہ زمین پر کھیت لہلہا رہے ہیں اور آسمان میں تارے چمک رہے ہیں، کیوں اس بات پر متعجب ہوتے ہو کہ خدا کی وحی نوعِ انسانی کی ہدایت کے لیے نازل ہو رہی ہے؟ اگر تمہیں تعجب ہوتا ہے، تو یہ اس بات کا نتیجہ ہے کہ تم نے خدا کو اُس کی صفتوں میں اُس طرح نہیں دیکھا ہے، جس طرح دیکھنا چاہیے۔ تمہاری سمجھ میں یہ بات تو آجاتی ہے کہ وہ ایک چیونٹی کی پرورش کے لیے یہ پورا کارخانۂ حیات سرگرم رکھے۔ مگر یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ نوعِ انسانی کی ہدایت کے لیے سلسلۂ وحی و تنزیل قائم ہو!

نظامِ ربوبیت سے وجودِ معاد پر استدلال

اسی طرح وہ اعمالِ ربوبیت سے معاد اور آخرت پر بھی استدلال کرتا ہے۔ جو چیز جتنی زیادہ نگرانی اور اہتمام سے بنائی جاتی ہے، اتنی ہی زیادہ قیمتی استعمال اور اہم مقصد بھی رکھتی ہے، اور بہتر صناع وہی ہے جو اپنی صنعت گری کا بہتر استعمال اور مقصد رکھتا ہو۔ پس انسان جو کرۂ ارضی کی بہترین مخلوق اور اُس کے تمام سلسلۂ خلقت کا خلاصہ ہے، اور جس کی جسمانی و معنوی نشو و نما کے لیے فطرتِ کائنات نے اس قدر اہتمام کیا ہے، کیونکر ممکن ہے کہ محض دنیا کی چند روزہ زندگی کے لیے ہی بنایا گیا ہو، اور کوئی بہتر استعمال اور بلند تر مقصد نہ رکھتا ہو؟ اور پھر اگر خالقِ کائنات ربّ ہے، اور کامل درجے کی ربوبیت رکھتا ہے، تو کیونکر باور کیا جاسکتا ہے کہ اُس نے اپنے ایک بہترین مربوب یعنی پروردہ ہستی کو محض اس لیے بنایا ہو کہ مہمل اور بے نتیجہ چھوڑ دے؟

اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّ اَنَّكُمْ اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ ۰ فَتَعٰلَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ رَبُّ الْعَرْشِ الْكَرِيْمِ (۲۳: ۱۱۵-۱۱۶)	کیا تم نے ایسا سمجھ رکھا ہے کہ ہم نے تمہیں بغیر کسی مقصد و نتیجہ کے پیدا کیا ہے، اور تم ہماری طرف لوٹنے والے نہیں؟ اللہ جو اس کائناتِ ہستی کا حقیقی حکمران ہے، اِس سے بہت بلند ہے کہ ایک بیکار و عبث فعل کرے، کوئی معبود نہیں ہے، مگر وہ جو جہانداری کے) عرشِ بزرگ کا پروردگار ہے!

ہم نے یہ مطلب اُسی سادہ طریقہ پر بیان کر دیا جو قرآن کے بیان و خطاب کا طریقہ ہے، لیکن یہی مطلب علمی بحث و تقریر کے پیرایہ میں یوں بیان کیا جاسکتا ہے کہ وجودِ انسانی کرۂ ارضی کے سلسلۂ خلقت کی آخری اور اعلیٰ ترین کڑی ہے، اور اگر پیدائشِ حیات سے لے کر انسانی وجود کی تکمیل تک کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے، تو یہ ایک ناقابلِ شمار مدت کے مسلسل نشو و ارتقا کی تاریخ ہوگی۔ گویا فطرت نے لاکھوں کروڑوں برس کی کارفرمائی و صناعی سے کرۂ ارضی پر جو

اعلیٰ ترین وجود تیار کیا ہے، وہ انسان ہے!

ماضی کے ایک نقطۂ بعید کا تصور کرو۔ جب ہمارا یہ کرہ سورج کے ملتہب کرے سے الگ ہوا تھا! نہیں معلوم کتنی مدت اس کے ٹھنڈے اور معتدل ہونے میں گزر گئی، اور یہ اس قابل ہوا کہ زندگی کے عناصر اس میں نشوونما پا سکیں۔ اس کے بعد وہ وقت آیا جب اس کی سطح پر نشوونما کی سب سے پہلی داغ بیل پڑی، اور پھر نہیں معلوم کتنی مدت کے بعد زندگی کا وہ اولین بیج وجود میں آسکا جسے پروٹوپلازم (Protoplasm) کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ پھر حیاتِ عضوی کے نشوونما کا دور شروع ہوا، اور نہیں معلوم کتنی مدت اس پر گزر گئی کہ اس دور نے بسیط سے مرکب تک اور ادنیٰ سے اعلیٰ درجے تک ترقی کی منزلیں طے کیں۔ یہاں تک کہ حیوانات کی ابتدائی کڑیاں ظہور میں آئیں، اور پھر لاکھوں برس اس میں نکل گئے کہ یہ سلسلۂ ارتقا وجودِ انسانی تک مرتفع ہو۔ پھر انسان کے جسمانی ظہور کے بعد اس کے ذہنی ارتقا کا سلسلہ شروع ہوا اور ایک طول طویل مدت اس پر گزر گئی۔ بالآخر ہزاروں برس کے اجتماعی اور ذہنی ارتقا کے بعد وہ انسان ظہور پذیر ہو سکا جو کرۂ ارضی کے تاریخی عہد کا متمدن و عقیل انسان ہے!

گویا زمین کی پیدائش سے لے کر ترقی یافتہ انسان کی تکمیل تک، جو کچھ گزر چکا ہے اور جو کچھ بنتا سنورتا رہا ہے، وہ تمام تر انسان کی پیدائش و تکمیل ہی کی سرگزشت ہے!

سوال یہ ہے کہ جس وجود کی پیدائش کے لیے فطرت نے اس درجہ اہتمام کیا ہے، کیا یہ سب کچھ صرف اس لیے تھا کہ وہ پیدا ہو، کھائے پیے اور مر کر فنا ہو جائے؟ فَتَعٰلَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْكَرِيْمِ!

قدرتی طور پر یہاں ایک دوسرا سوال بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ اگر وجودِ حیوانی نے ماضی میں ہمیشہ یکے بعد دیگرے متغیر ہوتا اور ترقی کرتا رہا ہے، تو مستقبل میں بھی یہ تغیر و ارتقا کیوں جاری نہ رہے؟ اگر اس بات پر ہمیں بالکل تعجب نہیں ہوتا کہ ماضی میں بیشمار صورتیں مٹیں اور نئی زندگیاں ظہور میں آئیں، تو اس بات پر کیوں تعجب ہو کہ موجودہ زندگی کا مٹنا بھی بالکل مٹ جانا نہیں ہے، اس کے بعد بھی ایک اعلیٰ تر صورت اور زندگی ہے؟

اَيَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَنْ يُّتْرَكَ سُدًى ۝ اَلَمْ يَكُ نُطْفَةً مِّنْ مَّنِيٍّ يُّمْنٰى ۝ ثُمَّ كَانَ عَلَقَةً فَخَلَقَ فَسَوّٰى ۝ (۷۵ : ۳۶)

کیا انسان خیال کرتا ہے کہ وہ مہمل چھوڑ دیا جائیگا اور اس زندگی کے بعد دوسری زندگی نہ ہوگی؟ کیا اس پر یہ حالت نہیں گزر چکی ہے کہ پیدائش سے پہلے نطفہ تھا، پھر نطفہ سے علقہ ہوا (یعنی جونک کی سی شکل ہو گئی)، پھر علقہ سے اس کا ڈیل ڈول پیدا کیا گیا، پھر (اس ڈیل ڈول کو) ٹھیک ٹھیک درست کر دیا گیا!

سورۂ ذاریات میں تمام تر دین یعنی جزا کا بیان ہے: اِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ لَصَادِقٌ ۝ وَّاِنَّ الدِّيْنَ لَوَاقِعٌ ۝ اور پھر اس پر اعمالِ ربوبیت سے یعنی ہواؤں کے چلنے اور پانی برسنے کے مؤثرات سے استشہاد کیا گیا ہے: وَالذّٰرِيٰتِ ذَرْوًا ۝

فَالْحٰمِلٰتِ وِقْرًا ۙ فَالْجٰرِيٰتِ يُسْرًا ۙ فَالْمُقَسِّمٰتِ اَمْرًا ۙ پھر آسمان اور زمین کی بخشایشوں پر اور خود وجودِ انسانی کی اندرونی شہادتوں پر توجہ دلائی ہے: وَفِي الْاَرْضِ اٰيٰتٌ لِّلْمُوْقِنِيْنَ ۙ وَفِيْٓ اَنْفُسِكُمْ ۭ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ۙ وَفِي السَّمَاۗءِ رِزْقُكُمْ وَمَا تُوْعَدُوْنَ ۔ اس کے بعد فرمایا:

فَوَرَبِّ السَّمَاۗءِ وَالْاَرْضِ اِنَّهٗ لَحَقٌّ مِّثْلَ مَآ اَنَّكُمْ تَنْطِقُوْنَ ۔ (۵۱: ۲۳)

آسمان و زمین کے رب کی قسم (یعنی آسمان و زمین کے پروردگار کی پروردگاری شہادت دے رہی ہے) کہ بلاشبہ وہ معاملہ (یعنی جزا و سزا کا معاملہ) حق ہے ٹھیک اسی طرح جس طرح یہ بات کہ تم گویائی رکھتے ہو۔

اس آیت میں اثباتِ جزا کے لیے خدا نے خود اپنے وجود کی قسم کھائی ہے، لیکن ربّ کے لفظ سے اپنے آپ کو تعبیر کیا ہے۔ عربی میں قسم کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ کسی بات پر کسی بات سے شہادت لائی جائے۔ پس مطلب یہ ہوا کہ پروردگارِ عالم کی پروردگاری شہادت دے رہی ہے کہ یہ بات حق ہے۔ یہ شہادت کیا ہے؟ وہی ربوبیت کی شہادت ہی اگر دنیا میں پرورش موجود ہے، پروردہ موجود ہے، اور اس لیے پروردگار بھی موجود ہے، تو ممکن نہیں کہ جزا کا معاملہ بھی موجود نہ ہو۔ اور وہ بغیر کسی نتیجہ کے انسان کو چھوڑ دے۔ چونکہ لوگوں کی نظر اس حقیقت پر نہ تھی۔ اس لیے اس آیت میں قسم اور مقسم بہ کا ربط صحیح طور پر متعین نہ کر سکے۔

قرآنِ حکیم کے دلائل و براہین پر غور کرتے ہوئے یہ اصل ہمیشہ پیشِ نظر رکھنی چاہیے کہ اُس کے استدلال کا طریقہ منطقی بحث و تقریر کا طریقہ نہیں ہے جس کے لیے چند در چند مقدمات کی ضرورت ہوتی ہے، اور پھر اثباتِ مدعا کی شکلیں ترتیب دینی پڑتی ہیں، بلکہ وہ ہمیشہ براہِ راست تلقین کا قدرتی اور سیدھا سادا طریقہ اختیار کرتا ہے۔ عموماً اس کے دلائل اُس کے اسلوبِ بیان و خطاب میں مضمر ہوتے ہیں۔ وہ یا تو کسی مطلب کے لیے اسلوبِ خطاب ایسا اختیار کرتا ہے کہ اُسی سے استدلال کی روشنی نمودار ہو جاتی ہے، یا پھر کسی مطلب پر زور دیتے ہوئے کوئی ایک لفظ ایسا بول جاتا ہے کہ اُس کی تعبیر ہی میں اُس کی دلیل بھی موجود ہوتی ہے، اور خود بخود مخاطب کا ذہن دلیل کی طرف پھر جاتا ہے۔ چنانچہ اُس کی ایک واضح مثال یہی صفتِ ربوبیت کا جابجا استعمال ہے۔ جب وہ خدا کی ہستی کا ذکر کرتا ہوا اُسے ربّ کے لفظ سے تعبیر کرتا ہے، تو یہ بات کہ وہ ربّ ہے، جس طرح اُس کی ایک صفت ظاہر کرتی ہے، اُسی طرح اُس کی دلیل بھی واضح کر دیتی ہے۔ وہ ربّ ہے، اور یہ واقعہ ہے کہ اُس کی ربوبیت تمہیں چاروں طرف سے گھیرے ہوئے، اور خود تمہارے دل کے اندر گھر بنائے ہوئے ہے۔ پھر کیونکر تم جرأت کر سکتے ہو کہ اُس کی ہستی سے انکار کرو؟ وہ ربّ ہے، اور ربّ کے سوا کون ہو سکتا ہے جو تمہاری بندگی و نیاز کا مستحق ہو؟

چنانچہ قرآن کے وہ تمام مقامات جہاں اس طرح کے مخاطبات ہیں کہ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ ؛ اُعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبَّكُمْ ؛ اِنَّ اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ؛ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ؛ اِنَّ هٰذِهٖٓ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً

وَاَنَا رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْنِ ، قُلْ اَتُحَآجُّوْنَنَا فِى اللّٰهِ؟ وَهُوَ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ ، وغیرہا، تو انہیں مجرد امر و خطاب ہی نہیں سمجھنا چاہیے، بلکہ وہ خطاب و دلیل دونوں ہیں، کیونکہ ربّ کے لفظ نے برہانِ ربوبیت کی طرف خود بخود رہنمائی کردی ہے۔ افسوس ہے کہ ہمارے مفسّروں کی نظر اس حقیقت پر نہ تھی، کیونکہ منطقی استدلال کے استغراق نے انہیں قرآن کے طریقِ استدلال سے بے پروا کر دیا تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ان مقامات کے ترجمہ و تفسیر میں قرآن کے اسلوبِ بیان کی حقیقی رُوح واضح نہ ہو سکی اور استدلال کا پہلو طرح طرح کی توجیہات میں گم ہو گیا ॰

---

(۴)

الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

الرّحمٰن اور الرّحیم

"الرَّحْمٰن" اور "الرَّحِيْم" دونوں رَحم سے ہیں۔ عربی میں رحمت عواطف کی ایسی رقّت و نرمی کو کہتے ہیں جس سے کسی دُوسری ہستی کے لیے احسان و شفقت کا ارادہ جوش میں آجائے۔ پس رَحمت میں مَحبّت، شفقت، فضل، احسان سب کا مفہوم داخل ہے، اور مجرد محبّت، لطف، اور فضل سے زیادہ وسیع اور عادی ہے۔

اگرچہ یہ دونوں اِسم رحمت سے ہیں، لیکن رحمت کے دو مختلف پہلوؤں کو نمایاں کرتے ہیں۔ عربی میں فَعْلَان کا باب عموماً ایسے صفات کے لیے استعمال کیا جاتا ہے جو محض صفات عارضہ ہوتے ہیں۔ جیسے پیاسے کے لیے عَطْشَان، غضبناک کے لیے غَضْبان۔ سراسیمہ کے لیے حَیْران، مست کے لیے سکران۔ لیکن فَعِیل کے وزن میں صفاتِ قائمہ کا خاصّہ ہے۔ یعنی عموماً ایسے صفات کے لیے بولا جاتا ہے جو جذبات و عوارض ہونے کی جگہ صفاتِ قائمہ ہوتے ہیں، مثلاً کَرِیم کرم کرنے والا، عَظِیم بڑائی رکھنے والا، علیم علم رکھنے والا، حَکِیم حکمت رکھنے والا۔ پس الرّحمٰن کے معنی یہ ہوئے کہ وہ ذات جس میں رحمت ہے، اور الرّحیم کے معنی یہ ہوئے کہ وہ ذات جس میں نہ صرف رحمت ہے بلکہ جس سے ہمیشہ رحمت کا ظہور ہوتا رہتا ہے، اور ہر آن و ہر لمحہ تمام کائناتِ خلقت اُس سے فیض یاب ہو رہی ہے۔

رحمت کو دو الگ الگ اسموں سے کیوں تعبیر کیا گیا؟ اس لیے کہ قرآن خدا کے تصوّر کا جو نقشہ ذہن نشین کرنا چاہتا ہے، اُس میں سب سے زیادہ نمایاں اور چھائی ہوئی صفت، رحمت ہی کی صفت ہے بلکہ کہنا چاہیے کہ تمام تر رحمت ہی ہے:

وَرَحْمَتِىْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ ط (۷: ۱۵۵) اور میری رحمت دنیا کی ہر چیز کو گھیرے ہوئے ہے!

پس ضروری تھا کہ خصوصیت کے ساتھ اُس کی صفتی اور فعلی، دونوں حیثیتیں واضح کر دی جائیں یعنی اُس میں رحمت ہے کیونکہ وہ الرّحمٰن ہے، اور صرف اتنا ہی نہیں، بلکہ ہمیشہ اس سے رحمت کا ظہور بھی ہو رہا ہے، کیونکہ الرّحمٰن کے ساتھ وہ الرّحیم بھی ہے!

رحمت

لیکن اللہ کی رحمت کیا ہے؟ قرآن کہتا ہے، کائناتِ ہستی میں جو کچھ بھی خوبی و کمال ہے، وہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ رحمتِ الٰہی کا ظہور ہے!

جب ہم کائناتِ ہستی کے اعمال و مظاہر پر غور کرتے ہیں تو سب سے پہلی حقیقت جو ہمارے سامنے نمایاں

ہوتی ہے، وہ اُس کا نظامِ ربوبیت ہے۔ کیونکہ فطرت سے ہماری پہلی شناسائی ربوبیت ہی کے ذریعہ ہوتی ہے۔ لیکن جب علم و ادراک کی راہ میں چند قدم آگے بڑھتے ہیں، تو دیکھتے ہیں کہ ربوبیت سے بھی ایک زیادہ وسیع اور عام حقیقت یہاں کارفرما ہے، اور خود ربوبیت بھی اُسی کے فیضان کا ایک گوشہ ہے۔

ربوبیت اور اُس کا نظام کیا ہے؟ کائناتِ ہستی کی پرورش ہے، لیکن کائناتِ ہستی میں صرف پرورش ہی نہیں ہے۔ پرورش سے بھی ایک زیادہ بنانے، سنوارنے، اور فائدہ پہنچانے کی حقیقت کام کر رہی ہے ہم دیکھتے ہیں کہ اُس کی فطرت میں بناؤ ہے، اُس کے بناؤ میں خوبی ہے، اس کے مزاج میں اعتدال ہے، اُس کے افعال میں خواص ہیں، اُس کی صورت میں حسن ہے، اُس کی صداؤں میں نغمہ ہے، اُس کی بُو میں عطر بیزی ہے، اور اُس کی کوئی بات نہیں جو اس کارخانہ کی تعمیر و درستگی کے لیے مفید نہ ہو۔ پس یہ حقیقت جو اپنے بناؤ اور فیضان میں ربوبیت سے بھی زیادہ وسیع اور عام ہے، قرآن کہتا ہے کہ رحمت ہے، اور خالق کائنات کی رحمانیت اور رحیمیت کا ظہور ہے!

تعمیر و تحسینِ کائنات رحمتِ الٰہی کا نتیجہ ہے

زندگی اور حرکت کا یہ عالمگیر کارخانہ وجود ہی میں نہ آتا، اگر اپنے ہر فعل میں بننے بنانے، سنورنے سنوارنے اور ہر طرح بہتر و اصلح ہونے کا خاصہ نہ رکھتا۔ فطرتِ کائنات میں یہ خاصہ کیوں ہے؟ اس لیے کہ بناؤ ہو، بگاڑ نہ ہو۔ درستگی ہو، ابتری نہ ہو۔ لیکن کیوں ایسا ہوا کہ فطرت بنائے اور سنوارے؛ بگاڑے اور اُلجھائے نہیں؟ یہ کیا ہے کہ جو کچھ ہوتا ہے، درست اور بہتر ہی ہوتا ہے۔ خراب اور بدتر نہیں ہوتا؟ انسان کے علم و دانش کی کاوشیں آج تک یہ عقدہ حل نہ کر سکیں۔ فلسفہ و نظر کا قدم جب کبھی اس حد تک پہنچا، دم بخود ہو کر رہ گیا، لیکن قرآن کہتا ہے یہ اس لیے ہے کہ فطرتِ کائنات میں رحمت ہے، اور رحمت کا مقتضیٰ یہی ہے کہ خوبی اور درستگی ہو، بگاڑ اور خرابی نہ ہو!

انسان کے علم و دانش کی کاوشیں بتلاتی ہیں کہ کائناتِ ہستی کا یہ بناؤ اور سنوار عناصرِ اولیہ کی ترکیب اور ترکیب کے اعتدال و تسویہ کا نتیجہ ہے۔ مادۂ عالم کی کمیت میں بھی اعتدال ہے کیفیت میں بھی اعتدال ہے۔ یہی اعتدال ہے جس سے سب کچھ بنتا ہے، اور جو کچھ بنتا ہے، خوبی اور کمال کے ساتھ بنتا ہے۔ یہی اعتدال و تناسب، دنیا کے تمام تعمیری اور ایجابی حقائق کی اصل ہے۔ وجود، زندگی، تندرستی، حُسن، خوشبو، نغمہ، بناؤ اور خوبی کے بہت سے نام ہیں مگر حقیقت ایک ہی ہے، اور وہ اعتدال ہی ہے۔

لیکن فطرتِ کائنات میں یہ اعتدال و تناسب کیوں ہے؟ کیوں ایسا ہوا کہ عناصر کے دقائق جب ملیں تو اعتدال و تناسب کے ساتھ ملیں، اور مادہ کا خاصہ یہی ٹھہرا کہ اعتدال و تناسب ہو، انحراف اور تجاوز نہ ہو؟ انسان کا علم دم بخود اور متحیر ہے لیکن قرآن کہتا ہے، یہ اس لیے ہوا کہ خالقِ کائنات میں رحمت ہے اور اس لیے کہ اُس کی رحمت اپنا ظہور بھی رکھتی ہے، اور جس میں رحمت ہو، اور اُس کی رحمت ظہور بھی رکھتی ہو، تو جو کچھ اُس سے صادر ہوگا، اُس میں خوبی و بہتری ہی ہوگی، حسن و جمال ہی ہوگا، اعتدال و تناسب ہی ہوگا، اس کے خلاف کچھ نہیں ہو سکتا!

فلسفہ ہمیں بتلاتا ہے کہ تعمیر اور تحسین فطرتِ کائنات کا خاصہ ہے۔ خاصۂ تعمیر چاہتا ہے کہ بناؤ ہو، خاصۂ تحسین چاہتا ہے کہ جو کچھ بنے خوبی و کمال کے ساتھ بنے، اور یہ دونوں خاصے "قانونِ ضرورت" کا نتیجہ ہیں۔ کائناتِ ہستی کے ظہور و تکمیل کے لیے ضرورت تھی کہ تعمیر ہو، اور ضرورت تھی کہ جو کچھ تعمیر ہو حُسن و خوبی کے ساتھ تعمیر ہو۔ یہی "ضرورت" بجائے خود ایک علّت ہوگئی، اور اس لیے فطرت سے جو کچھ بھی ظہور میں آتا ہے، ویسا ہی ہوتا ہے، جیسا ہونا ضروری تھا؛

لیکن اس تعلیل سے بھی تو یہ عقدہ حل نہیں ہوا؟ سوال جس منزل میں تھا، اُس سے صرف ایک منزل اور آگے بڑھ گیا۔ تم کہتے ہو، یہ جو کچھ ہو رہا ہے، اس لیے ہے کہ "ضرورت" کا قانون موجود ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ "ضرورت" کا قانون کیوں موجود ہے؟ کیوں یہ ضروری ہوا کہ جو کچھ ظہور میں آئے "ضرورت" کے مطابق ہو، اور "ضرورت" اسی بات کی مقتضی ہوئی کہ خوبی اور درستگی ہو، بگاڑ اور برہمی نہ ہو؟ انسانی علم کی کاوشیں اس کا کوئی جواب نہیں دے سکتیں۔ ایک مشہور فلسفی کے لفظوں میں "جس جگہ سے یہ 'کیوں' شروع ہو جائے سمجھ جاؤ کہ فلسفہ کے غور و خوض کی سرحد ختم ہوگئی"۔ لیکن قرآن اسی سوال کا جواب دیتا ہے، وہ کہتا ہے، یہ "ضرورت" رحمت اور فضل کی "ضرورت" ہے۔ رحمت چاہتی ہے کہ جو کچھ ظہور میں آئے بہتر ہو اور نافع ہو، اور اس لیے جو کچھ ظہور میں آتا ہے بہتر ہوتا ہے اور نافع ہوتا ہے!

پھر یہ حقیقت بھی واضح رہے کہ دنیا میں زندگی اور بقا کے لیے جن چیزوں کی ضرورت ہے، جمال و زیبائی اُن سے ایک زائد تر فیضان ہے، اور ہم دیکھ رہے ہیں کہ جمال و زیبائش بھی یہاں موجود ہے پس یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ سب کچھ قانونِ ضرورت ہی کا نتیجہ ہے۔ ضرورت، زندگی اور بقا کا سروسامان چاہتی ہے، لیکن زندہ اور باقی رہنے کے لیے جمال و زیبائش کی کیا ضرورت ہے؟ اگر جمال و زیبائش بھی یہاں موجود ہے تو یقیناً یہ فطرت کا ایک مزید لطف و احسان ہے، اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ فطرت صرف زندگی ہی نہیں بخشتی، بلکہ زندگی کو حسین و لطیف بھی بنانا چاہتی ہے۔ پس یہ محض زندگی کی ضرورت کا قانون نہیں ہو سکتا۔ یہ اس "ضرورت" سے بھی کوئی بالاتر "ضرورت" ہے جو چاہتی ہے کہ مرحمت اور فیضان ہو۔ قرآن کہتا ہے، یہ رحمت کی "ضرورت" ہے، اور رحمت کا مقتضیٰ یہی ہے کہ وہ سب کچھ ظہور میں آئے جو رحمت سے ظہور میں آنا چاہیے:

قُلْ لِّمَنْ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ قُلْ لِّلّٰهِ كَتَبَ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ ۚ (۶: ۱۲)
آسمان و زمین میں جو کچھ ہے، وہ کس کے لیے ہے؟ (اے پیغمبر!) کہہ دے اللہ کے لیے ہے جس نے اپنے لیے ضروری ٹھہرا لیا ہے کہ رحمت ہو۔

وَرَحْمَتِیْ وَسِعَتْ كُلَّ شَیْءٍ ۚ (۷: ۱۵۶)
اور میری رحمت دنیا کی ہر چیز کو گھیرے ہوئے ہے!

افادہ و فیضانِ فطرت

اس سلسلہ میں سب سے پہلی حقیقت جو ہمارے سامنے نمایاں ہوتی ہے، وہ کائناتِ ہستی اور اس کی تمام اشیاء کا افادہ و فیضان ہے۔ یعنی ہم دیکھتے ہیں کہ فطرت کے تمام کاموں میں، کامل نظم و یکسانیت کے ساتھ، مفید اور بکار آمد ہونے کی خاصیت پائی جاتی ہے، اور اگر بہ حیثیت مجموعی دیکھا جائے تو ایسا معلوم

ہوتا ہے، گویا یہ تمام کارگاہِ عالم صرف اِسی لیے بنا ہے کہ ہمیں فائدہ پہنچائے، اور ہماری حاجت روائیوں کا ذریعہ ہو:

وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ	اور آسمانوں اور زمین میں جو کچھ بھی ہے، وہ سب اللہ نے تمہارے لیے مسخر کر دیا ہے (یعنی
جَمِيْعًا مِّنْهُ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ	اُن کی قوتیں اور تاثیریں اس طرح تمہارے تصرف میں دیدی گئی ہیں کہ جس طرح
لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ۝	چاہو کام لے سکتے ہو) بلاشبہ ان لوگوں کے لیے جو غور و فکر کرنے والے ہیں
(۱۳:۴۵)	اس بات میں (معرفتِ حق کی) بڑی ہی نشانیاں ہیں[۱]!

ہم دیکھتے ہیں کہ کائناتِ ہستی میں جو کچھ بھی موجود ہے، اور جو کچھ بھی ظہور میں آتا ہے، اُس میں سے ہر چیز کوئی نہ کوئی خاصہ رکھتی ہے، اور ہر حادثہ کی کوئی نہ کوئی تاثیر ہے اور پھر ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ یہ تمام خواص و مؤثرات کچھ اس طرح واقع ہوئے ہیں کہ ہر خاصہ ہماری کوئی نہ کوئی ضرورت پوری کرتا، اور ہر تاثیر ہمارے لیے کوئی نہ کوئی فیضان رکھتی ہے۔ سورج، چاند، ستارے، ہوا، بارش، دریا، سمندر، پہاڑ سب کے خواص و فوائد ہیں، اور سب ہمارے لیے طرح طرح کی راحتوں اور آسائشوں کا سامان بہم پہنچا رہے ہیں:

اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَاَنْزَلَ	یہ اللہ ہی کی کارفرمائی ہے کہ اُس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور
مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ	آسمان سے پانی برسایا، پھر اُس کی تاثیر سے طرح طرح کے پھل
رِزْقًا لَّكُمْ ۚ وَسَخَّرَ لَكُمُ الْفُلْكَ لِتَجْرِيَ فِي	تمہاری غذا کے لیے پیدا کر دیے۔ اسی طرح اُس نے یہ بات بھی ٹھہرا
الْبَحْرِ بِاَمْرِهٖ ۚ وَسَخَّرَ لَكُمُ الْاَنْهٰرَ ۚ	دی کہ سمندر میں جہاز تمہارے زیر فرمان رہتے، اور حکمِ الٰہی سے چلتے
وَسَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ دَآئِبَيْنِ ۚ	رہتے ہیں، اور اسی طرح دریا بھی تمہاری کاربرآریوں کے لیے مسخر کر دیے گئے

[۱] اس آیت میں اور اس کی تمام ہم معنی آیات میں "سخّر" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے یعنی تمام چیزیں تمہارے لیے مسخر کر دی گئی ہیں۔ عربی میں تسخیر ٹھیک ٹھیک اُسی معنی میں بولا جاتا ہے، جس معنی میں ہم اُردو میں بولا کرتے ہیں یعنی کسی چیز کا قہراً وحکماً اس طرح مطیع ہو جانا کہ جس طرح چاہیں اُس سے کام لیں۔ غور کرو، انسانی قوا کی عظمت و سروری کے اظہار کے لیے اس سے زیادہ موزوں تعبیر اور کیا ہو سکتی تھی؟ قرآن کے نزول سے پہلے اقوامِ عالم کی دینی ذہنیت انسان کی عقلی اُمنگوں کے قطعاً خلاف تھی۔ لیکن قرآن نے صرف یہی نہیں کیا کہ اس کی عقلی اُمنگوں کی جرأت افزائی کر دی، بلکہ اس کی ہمتِ عقل اور اولوالعزمیِ علم کے لیے ایک ایسی بلند نظری کا نقشہ کھینچ دیا جس سے بہتر نقشہ آج بھی نہیں کھینچا جا سکتا۔ آسمان اور زمین میں جو کچھ ہے، سب اس لیے ہے کہ انسان کے آگے مسخر ہو کر رہے، اور انسان ان میں تصرف کرے، انسانی عقل و فکر کے لیے اس سے زیادہ بلند نصب العین اور کیا ہو سکتا ہے؟

پھر غور کرو "تسخیر" کا لفظ انسانی عقل کی حکمرانیوں کے لیے کس درجہ موزوں لفظ ہے؟ اس تسخیر کا قدیم منظر یہ تھا کہ انسان کا چھوٹا سا بچہ لکڑی کے دو گز تختے جوڑ کر سمندر کے سینے پر سوار ہو جاتا تھا، اور نیا منظر یہ ہے کہ آگ، پانی، ہوا، بجلی تمام عناصر پر حکمرانی کر رہا ہے!

البتہ یہ بات یاد رہے کہ قرآن نے جہاں کہیں اس تسخیر کا ذکر کیا ہے، اُس کا تعلق صرف کرۂ ارضی کی کائنات سے ہے، یا آسمان کے اُن مؤثرات سے ہے جنہیں ہم یہاں محسوس کر رہے ہیں۔ یہ نہیں کہا ہے کہ تمام موجوداتِ ہستی اُس کے لیے مسخر کر دی گئی ہیں، یا تمام موجوداتِ ہستی میں وہ اشرف و اعلیٰ مخلوق ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ ہماری دنیا کائناتِ ہستی کے بے کنار سمندر میں ایک قطرہ سے زیادہ نہیں، وَمَا يَعْلَمُ جُنُوْدَ رَبِّكَ اِلَّا هُوَ۔ اور انسان کو جو کچھ بھی برتری حاصل ہے وہ صرف اسی دنیا کی مخلوقات میں ہے ۱۲۔

وَسَخَّرَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ ۝ وَاٰتٰىكُمْ مِّنْ كُلِّ مَا سَاَلْتُمُوْهُ ؕ وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا ؕ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَظَلُوْمٌ كَفَّارٌ ۝ (۱۴ : ۳۴)

اور (پھر اتنا ہی نہیں بلکہ غور کرو تو) سورج اور چاند بھی تمہارے لیے مسخر کر دیے گئے ہیں کہ ایک خاص ڈھنگ پر گردش میں ہیں، اور رات اور دن کا اختلاف بھی (تمہارے فائدہ ہی کے لیے) مسخر ہے۔ غرضکہ جو کچھ تمہیں مطلوب تھا، وہ سب کچھ اُس نے عطا کر دیا۔ اگر تم اللہ کی نعمتیں شمار کرنی چاہو، تو وہ اتنی ہیں کہ ہرگز شمار نہ کر سکو گے۔ بلاشبہ انسان بڑا ہی نا انصاف، بڑا ہی ناشکرا ہے!

زمین کو دیکھو، اُس کی سطح پھلوں اور پھولوں سے لدی ہوئی ہے؛ تہ میں آبِ شیریں کی سوتیں بہہ رہی ہیں، گہرائی سے چاندی سونا نکل رہا ہے، وہ اپنی جسامت میں اگرچہ مدّوّر ہے، لیکن اس کا ہر حصّہ اس طرح واقع ہوا ہے کہ معلوم ہوتا ہے، ایک سطح فرش بچھا دیا گیا ہے!

اَلَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ مَهْدًا وَّجَعَلَ لَكُمْ فِيْهَا سُبُلًا لَّعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ۝ (۴۳ : ۱۰)

وہ پروردگار جس نے تمہارے لیے زمین اس طرح بنا دی کہ فرش کی طرح بچھی ہوئی ہے، اور اُس میں قطع مسافت کی (ہموار) راہیں پیدا کر دیں۔

وَهُوَ الَّذِيْ مَدَّ الْاَرْضَ وَجَعَلَ فِيْهَا رَوَاسِيَ وَاَنْهٰرًا ؕ وَمِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ جَعَلَ فِيْهَا زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ يُغْشِي الَّيْلَ النَّهَارَ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ۝ وَفِي الْاَرْضِ قِطَعٌ مُّتَجٰوِرٰتٌ وَّجَنّٰتٌ مِّنْ اَعْنَابٍ وَّزَرْعٌ وَّنَخِيْلٌ صِنْوَانٌ وَّغَيْرُ صِنْوَانٍ يُّسْقٰى بِمَآءٍ وَّاحِدٍ ۣ وَنُفَضِّلُ بَعْضَهَا عَلٰى بَعْضٍ فِي الْاُكُلِ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ۝

(۱۳ : ۳-۴)

اور یہ اُسی پروردگار کی پروردگاری ہے کہ اُس نے زمین (تمہاری سکونت کے لیے) پھیلا دی، اور اُس میں پہاڑوں کے لنگر ڈال دیے اور نہریں بہا دیں، نیز ہر طرح کے پھلوں کی دو دو قسمیں پیدا کر دیں، اور پھر یہ اُسی کی کارفرمائی ہے کہ رات اور دن یکے بعد دیگرے آتے رہتے ہیں اور رات کی تاریکی دن کی روشنی ڈھانپ لیتی ہے۔ بلاشبہ اُن لوگوں کے لیے جو غور و فکر کرنے والے ہیں اس میں (معرفت حقیقت کی) بڑی ہی نشانیاں ہیں!

اور (پھر دیکھو) زمین کی سطح اس طرح بنائی گئی ہے کہ اس میں ایک دوسرے سے قریب (آبادی کے) قطعات بن گئے، اور انگوروں کے باغ، غلّہ کی کھیتیاں، کھجوروں کے جھنڈ، پیدا ہو گئے۔ ان درختوں میں بعض درخت زیادہ ٹہنیوں والے ہیں، بعض اکہرے، اور اگرچہ سب کو ایک ہی طرح کے پانی سے سینچا جاتا ہے لیکن پھل ایک طرح کے نہیں۔ ہم نے بعض درختوں کو بعض درختوں پر پھلوں کے مزہ میں برتری دے دی۔ بلاشبہ اربابِ دانش کے لیے اس میں (معرفتِ حقیقت کی) بڑی ہی نشانیاں ہیں!

وَلَقَدْ مَكَّنّٰكُمْ فِي الْاَرْضِ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيْهَا مَعَايِشَ ؕ قَلِيْلًا

اور (دیکھو) ہم نے زمین میں تمہیں طاقت و تصرف کے ساتھ جگہ دی اور زندگی کے تمام سامان پیدا کر دیے (مگر افسوس) بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ تم

مَا تَشْكُرُوْنَ ٥ (٧: ٩) نعمتِ الٰہی کے شکر گزار رہو!

سمندر کی طرف نظر اُٹھاؤ، اُس کی سطح پر جہاز تیر رہے ہیں، تہہ میں مچھلیاں اُچھل رہی ہیں، قعر میں مرجان اور موتی نشوونما پا رہے ہیں،

وَهُوَ الَّذِیْ سَخَّرَ الْبَحْرَ لِتَاْكُلُوْا مِنْهُ لَحْمًا طَرِیًّا وَّ تَسْتَخْرِجُوْا مِنْهُ حِلْیَةً تَلْبَسُوْنَهَا ۚ وَ تَرَى الْفُلْكَ مَوَاخِرَ فِیْهِ وَ لِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ٥ (١٦: ١٣)

اور (دیکھو) یہ اُسی کی کارفرمائی ہے کہ اُس نے سمندر تمہارے لیے مسخر کر دیا تاکہ اپنی غذا کے لیے تر و تازہ گوشت حاصل کرو، اور زیور کی چیزیں نکالو جنہیں (خوشنمائی کے لیے) پہنتے ہو، نیز تم دیکھتے ہو کہ جہاز سمندر میں موجیں چیرتے ہوئے چلے جا رہے ہیں۔ اور سیر و سیاحت کے ذریعہ اللہ کا فضل تلاش کرو تاکہ اُس کی نعمت کے شکر گزار ہو۔

حیوانات کو دیکھو۔ زمین کے چارپائے، فضا کے پرند، پانی کی مچھلیاں، سب اسی لیے ہیں کہ اپنے اپنے وجود سے ہمیں فائدہ پہنچائیں۔ غذا کے لیے اُن کا دودھ اور گوشت، سواری کے لیے اُن کی بیٹھ، حفاظت کے لیے اُن کی پاسبانی، پہننے کے لیے اُن کی کھال اور اُون، برتنے کے لیے اُن کے جسم کی ہڈیاں تک مفید ہیں!

وَالْاَنْعَامَ خَلَقَهَا ۚ لَكُمْ فِیْهَا دِفْءٌ وَّ مَنَافِعُ وَ مِنْهَا تَاْكُلُوْنَ ۪ وَ لَكُمْ فِیْهَا جَمَالٌ حِیْنَ تُرِیْحُوْنَ وَ حِیْنَ تَسْرَحُوْنَ ٥ وَ تَحْمِلُ اَثْقَالَكُمْ اِلٰى بَلَدٍ لَّمْ تَكُوْنُوْا بٰلِغِیْهِ اِلَّا بِشِقِّ الْاَنْفُسِ ؕ اِنَّ رَبَّكُمْ لَرَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ ۙ وَّ الْخَیْلَ وَ الْبِغَالَ وَ الْحَمِیْرَ لِتَرْكَبُوْهَا وَ زِیْنَةً ؕ وَ یَخْلُقُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ٥ (١٦: ٥-٨)

اور چارپائے پیدا کر دیے جن میں تمہارے لیے جاڑے کا سامان اور طرح طرح کے منافع ہیں، اور اُن سے تم اپنی غذا بھی حاصل کرتے ہو جب اُن کے غول شام کو چر کر واپس آتے ہیں، اور جب چراگاہوں کے لیے نکلتے ہیں، تو (دیکھو) اُن کے منظر میں تمہارے لیے خوشنمائی رکھ دی ہے۔ اور اُنہی میں وہ جانور بھی ہیں جو تمہارا بوجھ اُٹھا کر اُن (دور دراز) شہروں تک پہنچا دیتے ہیں، جہاں تک تم بغیر سخت مشقت کے نہیں پہنچ سکتے تھے۔ بلاشبہ تمہارا پروردگار بڑا ہی شفقت رکھنے والا اور صاحبِ رحمت ہے۔ اور (دیکھو) گھوڑے، خچر، گدھے، پیدا کیے گئے تاکہ تم اُن سے سواری کا کام لو اور خوشنمائی کا بھی موجب ہوں۔ وہ اسی طرح (طرح طرح کی چیزیں) پیدا کرتا ہے جن کا تمہیں علم نہیں +

وَ اِنَّ لَكُمْ فِی الْاَنْعَامِ لَعِبْرَةً ؕ نُسْقِیْكُمْ مِّمَّا فِیْ بُطُوْنِهٖ مِنْۢ بَیْنِ فَرْثٍ وَّ دَمٍ لَّبَنًا خَالِصًا سَآئِغًا لِّلشّٰرِبِیْنَ ٥ (١٦: ٦٦)

اور چارپایوں کے وجود میں تمہارے لیے (فہم و بصیرت کی) بڑی ہی عبرت ہے۔ اُنہی جانوروں کے جسم سے ہم خون اور کثافتوں کے درمیان پاک صاف دودھ پیدا کر دیتے ہیں جو پینے والوں کے لیے بے خلل و غش مشروب ہوتا ہے +

وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ بُيُوْتِكُمْ سَكَنًا وَّجَعَلَ لَكُمْ مِّنْ جُلُوْدِ الْاَنْعَامِ بُيُوْتًا تَسْتَخِفُّوْنَهَا يَوْمَ ظَعْنِكُمْ وَيَوْمَ اِقَامَتِكُمْ وَمِنْ اَصْوَافِهَا وَاَوْبَارِهَا وَاَشْعَارِهَآ اَثَاثًا وَّمَتَاعًا اِلٰى حِيْنٍ (۱٦ : ۸۰)

اور (دیکھو) اللہ نے تمہارے گھروں کو تمہارے لیے سکونت کی جگہ بنایا، اور جو لوگ شہروں میں نہیں بستے اُن کے لیے ایسا سامان کر دیا کہ) چارپایوں کی کھال کے خیمے بنا دیے سفر اور اقامت، دونوں حالتوں میں اُنہیں ہلکا پاتے ہو۔ اسی طرح جانوروں کی اُون، رُوؤں، اور بالوں سے طرح طرح کی چیزیں پیدا کر دیں، جن سے ایک خاص وقت تک تمہیں فائدہ پہنچتا ہے۔

ایک انسان کتنی ہی محدود اور غیر متمدن زندگی رکھتا ہو، لیکن اس حقیقت سے بے خبر نہیں ہو سکتا کہ اُس کا گرد و پیش اُسے فائدہ پہنچا رہا ہے۔ ایک لکڑ ہارا بھی اپنے جھونپڑے میں بیٹھا ہوا نظر اُٹھاتا ہے، تو گو اپنے احساس کے لیے بہتر تعبیر نہ پائے، لیکن یہ حقیقت ضرور محسوس کر لیتا ہے۔ وہ جب بیمار ہوتا ہے تو جنگل کی جڑی بوٹیاں کھا لیتا ہے، دھوپ تیز ہوتی ہے تو درختوں کے سایے میں بیٹھ جاتا ہے، بیکار ہوتا ہے تو پتوں کی سر سبزی اور پھولوں کی خوشنمائی سے آنکھیں سینکنے لگتا ہے۔ پھر یہی درخت ہیں جو اپنی شادابی میں اُسے پھل بخشتے ہیں، پختگی میں لکڑی کے تختے بن جاتے ہیں، خشکی میں آگ کے شعلے بھڑکا دیتے ہیں۔ ایک ہی مخلوق بنائی ہے جو اپنے منظر سے نزہت و سرور بخشتی ہے، اپنی بُو سے ہوا کو معطر کرتی ہے، اپنے پھل میں طرح طرح کی غذائیں رکھتی ہے، اپنی لکڑی سے سامانِ تعمیر مہیا کرتی ہے، اور پھر خشک ہو جاتی ہے تو اُس کے جلانے سے آگ بھڑکتی، چولھے گرم کرتی، موسم کو معتدل بناتی، اور اپنی حرارت سے بے شمار اشیاء کے پکنے، پگھلنے اور تپنے کا ذریعہ بنتی ہے!

الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الشَّجَرِ الْاَخْضَرِ نَارًا فَاِذَآ اَنْتُمْ مِّنْهُ تُوْقِدُوْنَ (۳٦ : ۸۰)

(اور دیکھو) وہ کارفرمائے قدرت، جس نے سرسبز درخت سے تمہارے لیے آگ پیدا کر دی۔ اب تم اُسی سے (اپنے چولھوں کی) آگ سُلگا لیتے ہو۔

اور پھر یہ وہ فوائد ہیں، جو تمہیں اپنی جگہ محسوس ہو رہے ہیں، لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ فطرت نے یہ تمام چیزیں کن کن کاموں اور کن کن مصلحتوں کے لیے پیدا کی ہیں، اور کارفرمائے عالم کارگاہِ ہستی کے بنانے اور سنوارنے کے لیے ان سے کیا کیا کام نہیں لے رہا ہے؟

وَمَا يَعْلَمُ جُنُوْدَ رَبِّكَ اِلَّا هُوَ (۷۴ : ۳۱)

اور تمہارا پروردگار (اس کارزارِ ہستی کی کارفرمائیوں کے لیے) جو فوجیں رکھتا ہے، اُن کا حال اُس کے سوا کون جانتا ہے؟

پھر یہ حقیقت بھی پیشِ نظر رہے کہ فطرت نے کائناتِ ہستی کے افادہ و فیضان کا نظام کچھ اس طرح بنایا ہے کہ وہ بیک وقت، ہر مخلوق کو یکساں طور پر نفع پہنچاتا اور ہر مخلوق کی یکساں طور پر رعایت ملحوظ رکھتا ہے۔ اگر ایک انسان اپنے عالی شان محل میں بیٹھ کر محسوس کرتا ہے کہ تمام کارخانۂ ہستی صرف اُسی کی کاربراریوں کے لیے ہے، تو ٹھیک اسی طرح

ایک چیونٹی بھی اپنے بِل میں کہہ سکتی ہے کہ فطرت کی ساری کارفرمائیاں صرف اُسی کی کاربرآریوں کے لیے ہیں، اور کون ہے جو اُسے جھٹلانے کی جرأت کرسکتا ہے؟ کیا فی الحقیقت سورج اس لیے نہیں ہے کہ اُس کے لیے حرارت بہم پہنچائے؟ کیا بارش اِس لیے نہیں ہے کہ اُس کے لیے رطوبت مہیا کرے؟ کیا ہَوا اس لیے نہیں ہے کہ اُس کی ناک تک شکر کی بُو پہنچا دے؟ کیا زمین اس لیے نہیں ہے کہ ہر موسم اور ہر حالت کے مطابق، اُس کے لیے بمقام منزل بنے؟ دراصل فطرت کی بخشائشوں کا قانون کچھ ایسا عام اور ہمہ گیر واقع ہُوا ہے کہ وہ ایک ہی وقت میں ایک ہی طریقہ سے، ایک ہی نظام کے ماتحت، ہر مخلوق کی نگہداشت کرتا، اور ہر مخلوق کو یکساں طور پر فائدہ اُٹھانے کا موقع دیتا ہے۔ حتیٰ کہ ہر وجود اپنی جگہ محسوس کرسکتا ہے کہ یہ پورا کارخانۂ عالم صرف اُسی کی کام جوئیوں اور آسائشوں کے لیے سرگرم کار ہے!

وَمَا مِن دَآبَّةٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا طَائِرٍ يَطِيرُ بِجَنَاحَيْهِ إِلَّا أُمَمٌ أَمْثَالُكُم (٦: ٣٨)

اور زمین کے تمام جانور اور (پردار) بازوؤں سے اُڑنے والے تمام پرند دراصل تمہاری ہی طرح اُمتیں ہیں۔

کائنات کی تخریب بھی تعمیر کے لیے ہے

البتہ یہ حقیقت فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ دنیا عالمِ کون و فساد ہے۔ یہاں ہر بننے کے ساتھ بگڑنا ہے، اور ہر سمٹنے کے ساتھ بکھرنا۔ لیکن جس طرح سنگ تراش کا توڑنا پھوڑنا بھی اس لیے ہوتا ہے کہ خوبی و دل آویزی کا ایک پیکر تیار کردے، اسی طرح کائناتِ عالم کا تمام بگاڑ بھی اس لیے ہے کہ بناؤ اور خوبی کا فیضان ظہور میں آئے۔ تم ایک عمارت بناتے ہو، لیکن اس "بنانے" کا مطلب کیا ہوتا ہے؟ کیا یہی نہیں ہوتا کہ بہت سی بنی ہوئی چیزیں "بگڑ گئیں"؟ چٹانیں اگر نہ کاٹی جاتیں، بھٹے اگر نہ سُلگائے جاتے، درختوں پر آرہ اگر نہ چلتا تو ظاہر ہے، عمارت کا بناؤ بھی ظہور میں نہ آتا۔ پھر یہ راحت و سکون جو تمہیں ایک عمارت کی سکونت سے حاصل ہوتا ہے، کس صورتِ حال کا نتیجہ ہے؟ یقیناً اُسی شور و شر اور ہنگامۂ تخریب کا، جو سر و سامانِ تعمیر کی جِدّ و جُہد نے عرصہ تک جاری رکھا تھا۔ اگر تخریب کا یہ شور و شر نہ ہوتا، تو عمارت کا عیش و سکون بھی وجود میں نہ آتا۔ پس یہی حال فطرت کی تعمیری سرگرمیوں کا بھی سمجھو۔ وہ عمارتِ ہستی کا ایک ایک گوشہ تعمیر کرتی رہتی ہے، وہ اس کارخانہ کا ایک ایک کیل پرزہ ڈھالتی رہتی ہے، وہ اس کی درستگی و خوبی کی حفاظت کے لیے ہر نقصان کا دفعیہ اور ہر فساد کا ازالہ چاہتی ہے۔ تعمیر و درستگی کی یہی سرگرمیاں ہیں جو تمہیں بعض اوقات تخریب و نقصان کی ہولناکیاں دکھائی دیتی ہیں۔ حالانکہ یہاں تخریب کب ہے؟ جو کچھ ہے، تعمیر ہی تعمیر ہے۔ سمندر میں تلاطم، دریا میں طغیانی، پہاڑوں میں آتش فشانی، جاڑوں میں برف باری، گرمیوں میں سموم، بارش میں ہنگامۂ ابر و باد، تمہارے لیے خوش آیند مناظر نہیں ہوتے۔ لیکن تم نہیں جانتے کہ ان میں سے ہر حادثہ کائناتِ ہستی کی تعمیر و درستگی کے لیے اُتنا ہی ضروری ہے، جس قدر دنیا کی کوئی مفید سے مفید چیز تمہاری نگاہ میں ہوسکتی ہے۔ اگر سمندر میں طوفان نہ اُٹھتے، تو میدانوں کو زندگی و شادابی کے لیے ایک قطرۂ بارش میسر نہ آتا۔ اگر بادل کی گرج اور

بجلی کی کڑک نہ ہوتی، تو بارانِ رحمت کا فیضان بھی نہ ہوتا۔ اگر آتش فشاں پہاڑوں کی چوٹیاں نہ پھٹتیں، تو زمین کے اندر کا کھولتا ہوا مادہ اِس کُرہ کی تمام سطح پارہ پارہ کر دیتا۔ تم بول اُٹھوگے، یہ مادہ پیدا ہی کیوں کیا گیا؟ لیکن تمہیں جاننا چاہیے کہ اگر یہ مادہ نہ ہوتا تو زمین کی قوتِ نشوونما کا ایک ضروری عنصر مفقود ہو جاتا۔ یہی حقیقت ہے جس کی طرف قرآن نے جابجا اشارات کیے ہیں۔ مثلاً سورۂ روم میں ہے:

وَمِنْ اٰیٰتِہٖ یُرِیْکُمُ الْبَرْقَ خَوْفًا وَّ طَمَعًا وَّ یُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَیُحْیٖ بِہِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِھَا اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ (۳۰ : ۲۴)

اور (دیکھو) اُس کی (قدرت و حکمت کی) نشانیوں میں سے ایک نشانی یہ ہے کہ بجلی کی چمک اور کڑک نمودار کرتا ہے، اور اُس سے تم پر خوف اور اُمید دونوں کی حالتیں طاری ہو جاتی ہیں، اور آسمان سے پانی برساتا ہے، اور پانی کی تاثیر سے زمین مرنے کے بعد دوبارہ جی اُٹھتی ہے۔ بلاشبہ اس صورتِ حال میں اُن لوگوں کے لیے جو عقل و بینش رکھتے ہیں (حکمتِ الٰہی کی) بڑی ہی نشانیاں ہیں!

جمالِ فطرت

لیکن فطرت کے اِفادہ و فیضان کی سب سے بڑی بخشائش اُس کا عالمگیر حُسن و جمال ہے۔ فطرت صرف بناتی اور سنوارتی ہی نہیں، بلکہ اس طرح بناتی سنوارتی ہے کہ اُس کے ہر بناؤ میں حُسن و زیبائی کا جلوہ؛ اور اُس کے ہر ظہور میں نظر افروزی کی نمود پیدا ہو گئی ہے۔ کائناتِ ہستی کو اُس کی مجموعی حیثیت میں دیکھو، یا اُس کے ایک ایک گوشۂ خلقت پر نظر ڈالو، اُس کا کوئی رُخ نہیں جس پر حُسن و رعنائی نے ایک نقابِ زیبائش نہ ڈال دی ہو۔ ستاروں کا نظام اور اُن کی سیر و گردش، سورج کی روشنی اور اُس کی بوقلمونی، چاند کی گردش اور اُس کا اُتار چڑھاؤ، فضائے آسمانی کی وسعت اور اُس کی نیرنگیاں، بارش کا سماں اور اُس کے تغیرات، سمندر کا منظر اور دریاؤں کی روانی، پہاڑوں کی بلندیاں اور وادیوں کا نشیب، حیوانات کے اجسام اور اُن کا تنوع، نباتات کی صورت آرائیاں اور باغ و چمن کی رعنائیاں، پھولوں کی عطر بیزی اور پرندوں کی نغمہ سنجی، صبح کا چہرۂ خنداں اور شام کا جلوۂ محجوب؛ غرضکہ تمام تماشا گاہِ ہستی حُسن کی نمائش اور نظر افروزی کی جلوہ گاہ ہے، اور ایسا معلوم ہوتا ہے، گویا اس پردۂ ہستی کے پیچھے حُسن افروزی و جلوہ آرائی کی کوئی قوت کام کر رہی ہے جو چاہتی ہے، کہ جو کچھ بھی ظہور میں آئے، حُسن و زیبائش کے ساتھ ظہور میں آئے، اور کارخانۂ ہستی کا ہر گوشہ نگاہ کے لیے نشاط، سامعہ کے لیے سُرور، اور روح کے لیے بہشتِ راحت و سکون بن جائے!

دراصل کائناتِ ہستی کا مایۂ خمیر ہی حُسن و زیبائی ہے۔ فطرت نے جس طرح اُس کے بناؤ کے لیے مادی عناصر پیدا کیے، اُسی طرح اُس کی خوبروئی و رعنائی کے لیے معنوی عناصر کا بھی رنگ و روغن آراستہ کر دیا۔ روشنی، رنگ، خوشبو، اور نغمہ، حُسن و رعنائی کے وہ اجزا ہیں جن سے مشاطۂ فطرت چہرۂ وجود کی آرائش کر رہی ہے:

مشاطہ را بگو کہ براسبابِ حُسنِ یار
چیزے فزوں کند کہ تماشا بما رسد!

صُنۡعَ اللّٰہِ الَّذِیۡۤ اَتۡقَنَ کُلَّ شَیۡءٍ (۲۷: ۹۰) یہ اللہ کی کاریگری ہے جس نے ہر چیز خوبی اور درستگی کے ساتھ بنائی!

ذٰلِکَ عٰلِمُ الۡغَیۡبِ وَ الشَّہَادَۃِ الۡعَزِیۡزُ الرَّحِیۡمُ ۙ یہ اللہ ہے محسوسات اور غیر محسوسات کا جاننے والا، طاقت والا، رحمت والا

الَّذِیۡۤ اَحۡسَنَ کُلَّ شَیۡءٍ خَلَقَہٗ (۳۲: ۶-۷) جس نے جو چیز بنائی، حُسن و خوبی کے ساتھ بنائی!

بُلبل کی نغمہ سنجی اور زاغ و زغن کا شور و غوغا

بلاشبہ کاروبارِ فطرت کے بعض مظاہر ایسے بھی ہیں جن میں تمہیں حُسن و خوبی کی کوئی گیرائی محسوس نہیں ہوتی۔ تم کہتے ہو، قمری و بلبل کی نغمہ سنجیوں کے ساتھ زاغ و زغن کا شور و غوغا کیوں ہے؟ لیکن تم بھول جاتے ہو کہ ارغنونِ ہستی کا نغمہ کسی ایک آہنگ ہی سے نہیں بنا ہے، اور نہ بننا چاہیے تھا جس طرح تمہارے آلاتِ موسیقی کے پردوں میں زیر و بم کے تمام آہنگ موجود ہوتے ہیں، اُسی طرح سازِ فطرت کے تاروں میں بھی اُتار چڑھاؤ کے تمام آہنگ موجود ہیں۔ اُس میں ہلکے سے ہلکے سُر بھی ہیں، جن سے باریک اور سُریلی صدائیں نکلتی ہیں، موٹے سے موٹے سُر بھی ہیں جو بلند سے بلند اور بھاری سے بھاری صدائیں پیدا کرتے ہیں۔ ان تمام سُروں کے ملنے سے جو کیفیت پیدا ہوتی ہے، وہی موسیقی کی حلاوت ہے۔ کیونکہ دنیا کی تمام چیزوں کی طرح موسیقی کی حقیقت بھی مختلف اجزاء کے امتزاج و تالیف سے پیدا ہوتی ہے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ کسی ایک ہی سُر سے نغمے کی حلاوت پیدا ہو جائے۔ اگر تم بین یا ستار اُٹھا کر صرف اُس کے چڑھاؤ کا کوئی ایک پردہ چھیڑ دوگے، یا پیانو کی بھاری کُنجیوں میں سے کوئی ایک کنجی ہی بجانے لگوگے، تو یہ نغمہ نہ ہوگا، بھاں بھاں کی ایک کرخت آواز ہوگی۔ یہی حال موسیقیِ فطرت کے زیر و بم کا بھی ہے۔ تمہیں کوّے کی کائیں کائیں اور چیل کی چیخ میں کوئی دلکشی محسوس نہیں ہوتی، لیکن موسیقیِ فطرت کی تالیف کے لیے جس طرح قمری و بلبل کا ہلکا سُر ضروری تھا، اُسی طرح زاغ و زغن کا بھاری اور کرخت سُر بھی ناگزیر تھا۔ بلبل و قمری کو اس سرگم کا اُتار سمجھو، اور زاغ و زغن کو چڑھاؤ:

برا ہلِ ذوق درِ فیض درنمی بندد
نوائے بلبل اگر نیست صوتِ زاغ شنو!

تُسَبِّحُ لَہُ السَّمٰوٰتُ السَّبۡعُ وَ الۡاَرۡضُ وَ مَنۡ فِیۡہِنَّ ؕ وَ اِنۡ مِّنۡ شَیۡءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمۡدِہٖ وَ لٰکِنۡ لَّا تَفۡقَہُوۡنَ تَسۡبِیۡحَہُمۡ ؕ اِنَّہٗ کَانَ حَلِیۡمًا غَفُوۡرًا ۝

(۱۷: ۴۴)

ساتوں آسمان اور زمین، اور جو کوئی بھی اُن میں ہے سب (اپنی بناوٹ کی خوبی اور صنعت کے کمال میں) اللہ کی بڑائی اور پاکی کا زبانِ حال سے اعتراف کر رہے ہیں، اور (اتنا ہی نہیں بلکہ کائناتِ خلقت میں) کوئی چیز بھی ایسی نہیں جو (زبانِ حال سے) اُس کی تسبیح و تحمید نہ کر رہی ہو، مگر (افسوس کہ) تم (اپنے جہل و غفلت سے) اس ترانۂ تسبیح کو سمجھتے نہیں۔

فطرت کی حُسن افزائیاں اور رحمتِ الٰہی کی بخشش:

آؤ چند لمحوں کے لیے پھر اُن سوالات پر غور کر لیں جو پہلے گزر چکے ہیں۔ فطرتِ کائنات کی یہ تمام حُسن افروزیاں اور جلوہ آرائیاں کیوں ہیں؟ یہ کیوں ہے کہ فطرت حسین ہے، اور جو کچھ اُس

سے ظہور میں آتا ہے، وہ حُسن وجمال ہی ہوتا ہے؟ کیا یہ ممکن نہ تھا کہ کارخانۂ ہستی ہوتا لیکن رنگ کی نظر افروزیاں، بُو کی عطر بیزیاں، نغمہ کی جاں نوازیاں نہ ہوتیں؟ کیا ایسا نہیں ہو سکتا تھا کہ سب کچھ ہوتا لیکن سبزہ وگُل کی رعنائیاں اور قُمری وبُلبل کی نغمہ سنجیاں نہ ہوتیں؟ یقیناً دنیا اپنے بننے کے لیے اِس کی محتاج نہ تھی کہ تتلی کے پروں میں عجیب وغریب نقش ونگار ہوں اور رنگ برنگ کے دلفریب پرند درختوں کی شاخوں پر چہچہا رہے ہوں؟ ایسا بھی ہو سکتا تھا کہ درخت ہوتے مگر قامت کی بلندی، پھیلاؤ کی موزونیت، شاخوں کی ترتیب، پتّوں کی سبزی، پھولوں کی رنگا رنگی نہ ہوتی۔ پھر یہ کیوں ہے کہ تمام حیوانات اپنی اپنی حالت اور گردوپیش کے مطابق، ڈیل ڈول کی موزونیت اور اعضا کا تناسب ضرور ہی رکھیں۔ اور کوئی وجود نہ ہو جو اپنی شکل ومنظر میں ایک خاص طرح کا معتدل پیمانہ نہ رکھتا ہو!

انسانی علم ونظر کی کاوشیں آج تک یہ عُقدہ حل نہ کر سکیں کہ یہاں تعمیر کے ساتھ تحسین کیوں ہے؟ مگر قرآن کہتا ہے، یہ سب کچھ اس لیے ہے کہ خالقِ کائنات الرّحمٰن اور الرّحیم ہے یعنی اُس میں رحمت ہے، اور اُس کی رحمت اپنا ظہور وفعل بھی رکھتی ہے۔ رحمت کا مقتضا یہی تھا کہ بخشش ہو، فیضان ہو، جُود واحسان ہو، پس اُس نے ایک طرف تو ہمیں زندگی اور زندگی کے تمام احساس وعواطف بخش دیے، جو خوشنمائی اور بدنمائی میں امتیاز کرتے اور خوبی وجمال سے کیف وسُرور حاصل کرتے ہیں، دوسری طرف کارگاہِ ہستی کو اپنی حُسن آرائیوں اور جاں فزائیوں سے اس طرح آراستہ کر دیا کہ اُس کا ہر گوشہ نگاہ کے لیے جنّت، سامعہ کے لیے حلاوت، اور رُوح کے لیے سرمایۂ کیف وسرور بن گیا!

فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ ۝ پس کیا ہی بابرکت ذات ہے اللہ کی، بنانے والوں میں سب سے زیادہ حُسن وخوبی کے ساتھ بنانے والا! (۲۳ : ۱۴)

قدرت کا خود رَو سامانِ راحت وسُرور اور انسان کی ناشکری

ہم زندگی کی بناوٹی اور خود ساختہ آسائشوں میں اس درجہ منہمک ہو گئے ہیں کہ ہمیں قدرتی راحتوں پر غور کرنے کا موقع ہی نہیں ملتا، اور بسا اوقات تو ہم اُن کی قدر وقیمت کے اعتراف سے بھی انکار کر دیتے ہیں۔ لیکن اگر چند لمحوں کے لیے اپنے آپ کو اس غفلت سے بیدار کر لیں، تو معلوم ہو جائے کہ کائناتِ ہستی کا حُسن وجمال فطرت کی ایک عظیم اور بے پایاں بخشش ہے، اور اگر یہ نہ ہوتی، یا ہم میں اس کا احساس نہ ہوتا، تو زندگی، زندگی نہ ہوتی، نہیں معلوم کیا چیز ہو جاتی۔ ممکن ہے، موت کی بدحالیوں کا ایک تسلسل ہوتا!

ایک لمحہ کے لیے تصوّر کرو کہ دنیا موجود ہے، مگر حُسن وزیبائی کے تمام جلووں اور احساسات سے خالی ہے۔ آسمان ہے مگر فضا کی یہ نگاہ پرور نیلگونی نہیں ہے، ستارے ہیں مگر اُن کی درخشندگی وجہانتابی کی یہ جلوہ آرائی نہیں ہے، درخت ہیں مگر بغیر سبزی کے، پھول ہیں مگر بغیر رنگ وبو کے، اشیاء کا اعتدال، اجسام کا تناسب، صداؤں کا ترنّم، روشنی ورنگت کی بوقلمونی؛ ان میں سے کوئی چیز بھی وجود نہیں رکھتی، یا یوں کہا جائے کہ ہم میں ان کا احساس

نہیں ہے۔ غور کرو، ایک ایسی دُنیا کے ساتھ زندگی کا تصور کیسا بھیانک اور ہولناک منظر پیش کرتا ہے! ایسی زندگی جس میں نہ تو حُسن کا احساس ہو نہ حُسن کی جلوہ آرائی، نہ نگاہ کے لیے سرور ہو، نہ سامعہ کے لیے حلاوت، نہ جذبات کی رقّت ہو نہ محسوسات کی لطافت، یقیناً عذاب و جانکاہی کی ایک ایسی حالت ہوتی جس کا تصوّر بھی ہمارے لیے ناقابلِ برداشت ہے!

لیکن جس قدرت نے ہمیں زندگی دی، اُس نے یہ بھی ضروری سمجھا کہ زندگی کی سب سے بڑی نعمت یعنی حُسن و زیبائی کی بخشش سے بھی مالامال کر دے۔ اُس نے ایک ہاتھ سے ہمیں حُسن کا احساس دیا۔ دوسرے ہاتھ سے تمام دنیا کو جلوۂ حُسن بنا دیا۔ یہی حقیقت ہے جو ہمیں رحمت کی موجودگی کا یقین دلاتی ہے۔ اگر پردۂ ہستی کے پیچھے صرف خالقیت ہی ہوتی، رحمت نہ ہوتی یعنی پیدا کرنے یا پیدا ہو جانے کی قوت ہوتی مگر افادہ و فیضان، کا ارادہ نہ ہوتا، تو یقیناً کائناتِ ہستی میں فطرت کے فضل و احسان کا یہ عالمگیر مظاہرہ بھی نہ ہوتا!

اَلَمْ تَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ
وَمَا فِي الْاَرْضِ وَاَسْبَغَ عَلَيْكُمْ نِعَمَهٗ
ظَاهِرَةً وَّبَاطِنَةً ۭ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ
يُّجَادِلُ فِي اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّلَا هُدًى
وَّلَا كِتٰبٍ مُّنِيْرٍ (۳۱: ۲۰)

کیا تم نے کبھی اس بات پر غور نہیں کیا کہ جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے وہ سب تمہارے لیے خدا نے مسخر کر دیا ہے، اور اپنی تمام نعمتیں ظاہری طور پر بھی اور باطنی طور پر بھی، پوری کر دی ہیں؟ انسانوں میں کچھ لوگ ایسے ہیں جو اللہ کے بارے میں جھگڑتے ہیں، بغیر اس کے کہ اُن کے پاس کوئی علم ہو، یا ہدایت ہو، یا کوئی کتاب روشن؛

انسانی طبیعت کی یہ عالمگیر کمزوری ہے کہ جب تک وہ ایک نعمت سے محروم نہیں ہو جاتا، اُس کی قدر و قیمت کا ٹھیک ٹھیک اندازہ نہیں کر سکتا۔ تم گنگا کے کنارے بستے ہو، اس لیے تمہارے نزدیک زندگی کی سب سے زیادہ بے قدر چیز پانی ہے، لیکن اگر یہی پانی چوبیس گھنٹے تک میسر نہ آئے، تو تمہیں معلوم ہو جائے، اُس کی قدر و قیمت کا کیا حال ہے؟ یہی حال فطرت کے فیضانِ جمال کا بھی ہے۔ اُس کے عام اور بے پردہ جلوے شب و روز تمہاری نگاہوں کے سامنے سے گزرتے رہتے ہیں، اس لیے تمہیں ان کی قدر و قیمت محسوس نہیں ہوتی۔ صُبح اپنی ساری جلوہ آرائیوں کے ساتھ روز آتی ہے، اس لیے تم بستر سے سر اُٹھانے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔ چاندنی اپنی ساری حُسن افروزیوں کے ساتھ ہمیشہ نکھرتی رہتی ہے، اس لیے تم کھڑکیاں بند کر کے سو جاتے ہو۔ لیکن جب یہی شب و روز کے جلوہ ہائے فطرت، تمہاری نظر سے روپوش ہو جاتے ہیں، یا تم میں ان کے نظارہ و سماع کی استعداد باقی نہیں رہتی، تو غور کرو، اُس وقت تمہارے احساسات کا کیا حال ہوتا ہے؟ کیا تم محسوس نہیں کرتے کہ ان میں سے ہر چیز زندگی کی ایک بے بہا برکت اور معیشت کی ایک عظیم الشان نعمت تھی؟ سرد ملکوں کے باشندوں سے پوچھو، جہاں سال کا بڑا حصہ ابر آلود گزرتا ہے، کیا سورج کی کرنوں سے بڑھ کر بھی زندگی کی کوئی مسرت ہو سکتی ہے؟ ایک بیمار سے پوچھو جو نقل و حرکت سے محروم بسترِ مرض پر پڑا ہے۔ وہ

بتائے گا کہ آسمان کی صاف اور نیلگوں فضا کا ایک نظارہ، راحت وسکون کی کتنی بڑی دولت ہے؟ ایک اندھا جو پیدائشی اندھا نہ تھا، تمہیں بتا سکتا ہے کہ سورج کی روشنی اور باغ وچمن کی بہار دیکھے بغیر زندگی بسر کرنا کیسی ناقابلِ برداشت مصیبت ہے؟ تم بسا اوقات زندگی کی مصنوعی آسائشوں کے لیے ترستے ہو، اور خیال کرتے ہو کہ زندگی کی سب سے بڑی نعمت چاندی سونے کا ڈھیر اور جاہ وحشم کی نمائش ہے، لیکن تم بھول جاتے ہو کہ زندگی کی حقیقی مسرتوں کا جو خود رو سامان فطرت نے ہر مخلوق کے لیے پیدا کر رکھا ہے، اُس سے بڑھ کر دنیا کی دولت وحشمت کونسا سامان نشاط مہیا کر سکتی ہے، اور اگر ایک انسان کو وہ سب کچھ میسر ہو، تو پھر اُس کے بعد کیا باقی رہ جاتا ہے؟ جس دنیا میں سورج ہر روز چمکتا ہو، جس دنیا میں صبح ہر روز مسکراتی اور شام ہر روز پردۂ شب میں چھپ جاتی ہو، جس کی راتیں آسمان کی قندیلوں سے مزیّن، اور جس کی چاندنی حسن افروزیوں سے جہاں تاب رہتی ہو، جس کی بہار سبزہ وگل سے لدی ہوئی، اور جس کی فصلیں لہلہاتے ہوئے کھیتوں سے گرانبار ہوں، جس دنیا میں روشنی اپنی چمک، رنگ اپنی بوقلمونی، خوشبو اپنی عطر بیزی، اور موسیقی اپنا نغمہ وآہنگ رکھتی ہو، کیا اُس دنیا کا کوئی باشندہ آسائشِ حیات سے محروم اور نعمتِ معیشت سے مفلس ہو سکتا ہے؟ کیا کسی آنکھ کے لیے جو دیکھ سکتی ہو اور کسی دماغ کے لیے جو محسوس کر سکتا ہو، ایک ایسی دنیا میں نامرادی وبدبختی کا گلہ جائز ہے؟ قرآن نے جابجا انسان کو اُس کے اسی کفرانِ نعمت پر توجّہ دلائی ہے:

وَاٰتٰكُمْ مِّنْ كُلِّ مَا سَاَلْتُمُوْهُ ۭ وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا ۭ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَظَلُوْمٌ كَفَّارٌ (۱۴: ۳۴)

اور اُس نے تمہیں وہ تمام چیزیں دے دیں جو تمہیں مطلوب تھیں، اور اگر اللہ کی نعمتیں شمار کرنی چاہو تو وہ اتنی ہیں کہ کبھی شمار نہیں کر سکو گے۔ بلاشبہ انسان بڑا ہی ناانصاف بڑا ہی ناشکرا ہے!

جمالِ معنوی

پھر فطرت کی بخشائشِ جمال کے اس گوشہ پر بھی نظر ڈالو، کہ اُس نے جس طرح جسم وصورت کو حُسن وزیبائی بخشی، اُسی طرح اس کی معنویت کو بھی جمالِ معنوی سے آراستہ کر دیا۔ جسم وصورت کا جمال یہ ہے کہ ہر وجود کے ڈیل ڈول اور اعضا وجوارح میں تناسب ہے۔ معنویت کا جمال یہ ہے کہ ہر چیز کی کیفیت اور باطنی قویٰ میں اعتدال ہے۔ اسی کیفیت کے اعتدال سے خواص اور فوائد پیدا ہوئے ہیں، اور یہی اعتدال ہے جس نے حیوانات میں ادراک وحواس کی قوتیں بیدار کر دیں، اور پھر انسان کے درجہ میں پہنچ کر جوہرِ عقل وفکر کا چراغ روشن کر دیا!

وَاللّٰهُ اَخْرَجَكُمْ مِّنْۢ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ شَيْـــًٔا ۙ وَّجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ ۙ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝ (۱۶: ۷۸)

اور (دیکھو) یہ اللہ ہی کی کارفرمائی ہے کہ تم اپنی ماؤں کے شکم سے پیدا ہوتے ہو اور کسی طرح کی سمجھ بوجھ تم میں نہیں ہوتی، لیکن اُس نے تمہارے لیے دیکھنے سُننے کے حواس بنا دیے، اور سوچنے سمجھنے کے لیے عقل دے دی، تاکہ اُس کی نعمت کے شکرگزار رہو۔

کائناتِ ہستی کے اَسرار و غوامض بے شمار ہیں، لیکن روحِ حیوانی کا جوہرِ ادراک زندگی کا سب سے زیادہ لاینحل عُقدہ ہے۔ حیوانات میں کیڑے مکوڑے تک ہر طرح کا احساس و ادراک رکھتے ہیں، اور انسانی دماغ کے نہاں خانہ میں عقل و تفکّر کا چراغ روشن ہے۔ یہ قوّتِ احساس، یہ قوّتِ ادراک، یہ قوّتِ عقل کیونکر پیدا ہوئی؟ مادّی عناصر کی ترکیب و امتزاج سے ایک ماوراءِ مادّہ جوہر کس طرح ظہور میں آگیا؟ چیونٹی کو دیکھو، اُس کے دماغ کا حجم سوئی کی نوک سے شاید ہی کچھ زیادہ ہوگا لیکن مادّہ کے اس حقیر ترین عصبی ذرہ میں بھی احساس و ادراک، محنت و استقلال ترتیب و تناسُب، نظم و ضبط، اور صنعت و اختراع کی ساری قوتیں مخفی ہوتی ہیں، اور وہ اپنے اعمالِ حیات کی کرشمہ سازیوں سے ہم پر رُعب اور حیرت کا عالم طاری کر دیتی ہے؛ شہد کی مکھی کی کارفرمائیاں ہر روز تمہاری نظروں سے گزرتی رہتی ہیں۔ یہ کون ہے جس نے ایک چھوٹی سی مکھی میں تعمیر و تحسین کی ایسی منتظم قوّت پیدا کر دی ہے؟ قرآن کہتا ہے، یہ اس لیے ہے کہ رحمت کا مقتضا جمال تھا، اور ضروری تھا کہ جس طرح اُس نے جمالِ صوری سے دنیا آراستہ کر دی ہے، اُسی طرح جمالِ معنوی کی بخشائشوں سے بھی اُسے مالامال کر دیتی!

ذٰلِكَ عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ الْعَزِيزُ الرَّحِيمُ ۝ الَّذِي أَحْسَنَ كُلَّ شَيْءٍ خَلَقَهُ وَبَدَأَ خَلْقَ الْإِنْسَانِ مِنْ طِينٍ ۝ ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهُ مِنْ سُلَالَةٍ مِنْ مَاءٍ مَهِينٍ ۝ ثُمَّ سَوَّاهُ وَنَفَخَ فِيهِ مِنْ رُوحِهِ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْأَبْصَارَ وَالْأَفْئِدَةَ قَلِيلًا مَا تَشْكُرُونَ ۝ (۳۲: ۶-۹)

یہ محسوسات اور غیر محسوسات کا جاننے والا عزیز و رحیم ہے جس نے جو چیز بھی بنائی حُسن و خوبی کے ساتھ بنائی۔ چنانچہ یہ اُسی کی قدرت و حکمت ہے کہ انسان کی پیدائش مٹی سے شروع کی، پھر اُس کے توالد و تناسل کا سلسلہ (خون کے) خلاصہ سے جو پانی کا ایک حقیر سا قطرہ ہوتا ہے، قائم کر دیا۔ پھر اُس کی تمام قوتوں کی درستگی کی، اور اپنی روح (میں سے ایک قوت) پھونک دی اور اس طرح اُس کے لیے سننے، دیکھنے، اور فکر کرنے کی قوتیں پیدا کر دیں۔ لیکن افسوس انسان کی غفلت پر! بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ وہ (اللہ کی رحمت کا) شکر گزار ہو!

بقاءِ انفع

لیکن کائناتِ ہستی کا یہ بناؤ، یہ حُسن، یہ ارتقاء قائم نہیں رہ سکتا تھا اگر اُس میں خوبی کے بقاء اور خرابی کے ازالے کے لیے ایک اٹل قوت سرگرمِ کار نہ رہتی۔ یہ قوت کیا ہے؟ فطرت کا انتخاب ہے۔ فطرت ہمیشہ چھانٹتی رہتی ہے۔ وہ ہر گوشہ میں صرف خوبی اور بہتری ہی باقی رکھتی ہے۔ فساد اور نقص محو کر دیتی ہے۔ ہم فطرت کے اس انتخاب سے بے خبر نہیں ہیں۔ ہم اسے "بقاءِ اصلح" کے لفظ سے تعبیر کرتے ہیں۔ "اصلح" یعنی Fittest لیکن قرآن "بقاءِ اصلح" کی جگہ "بقاءِ انفع" کا ذکر کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے، اس کارگاہِ فیضان و جمال میں صرف وہی چیز باقی رکھی جاتی ہے جس میں نفع ہو۔ کیونکہ یہاں رحمت کارفرما ہے، اور رحمت چاہتی ہے کہ افادہ و فیضان ہو۔ وہ نقصان و برہمی گوارا نہیں کر سکتی۔ تم سونا کٹھالی میں ڈال کر آگ پر رکھتے ہو۔ کھوٹ جل جاتا ہے۔ خالص سونا باقی رہ جاتا ہے۔ یہی مثال فطرت کے انتخاب کی ہے۔ کھوٹ میں نفع نہ تھا، نابود کر دیا گیا۔ سونے میں نفع تھا، باقی رہ گیا:

اَنۡزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَسَالَتۡ اَوۡدِيَةٌۢ بِقَدَرِهَا فَاحۡتَمَلَ السَّيۡلُ زَبَدًا رَّابِيًا ؕ وَمِمَّا يُوۡقِدُوۡنَ عَلَيۡهِ فِى النَّارِ ابۡتِغَآءَ حِلۡيَةٍ اَوۡ مَتَاعٍ زَبَدٌ مِّثۡلُهٗ ؕ كَذٰلِكَ يَضۡرِبُ اللّٰهُ الۡحَـقَّ وَالۡبَاطِلَ ؕ فَاَمَّا الزَّبَدُ فَيَذۡهَبُ جُفَآءً ۚ وَاَمَّا مَا يَنۡفَعُ النَّاسَ فَيَمۡكُثُ فِى الۡاَرۡضِ ؕ (۱۷:۱۳)

خدا نے آسمان سے پانی برسایا تو ندی نالوں میں جس قدر سمائی تھی، اُس کے مطابق بہہ نکلے، اور جس قدر کوڑا کرکٹ جھاگ بن کر اوپر آگیا تھا، اُسے سیلاب اُٹھا کر بہا لے گیا۔ اسی طرح جب زیور یا اور کسی طرح کا سامان بنانے کے لیے (مختلف قسم کی دھاتیں) آگ میں تپاتے ہیں، تو اُس میں بھی جھاگ اُٹھتا ہے اور میل کچیل کٹ کر نکل جاتی ہے۔ اسی طرح اللہ حق اور باطل کی مثال بیان کر دیتا ہے۔ جھاگ رائگاں جائیگا کیونکہ اُس میں نفع نہ تھا، جس چیز میں انسان کے لیے نفع ہوگا، وہ زمین میں باقی رہ جائیگی۔

تدریج و امہال

پھر اگر دقتِ نظر سے کام لو، تو افادۂ فیضانِ فطرت کی حقیقت کچھ انہی مظاہر پر موقوف نہیں ہے، بلکہ کارخانۂ ہستی کے تمام اعمال و قوانین کا یہی حال ہے۔

تم دیکھتے ہو کہ فطرت کے تمام قوانین اپنی نوعیت میں کچھ اس طرح واقع ہوئے ہیں کہ اگر لفظوں میں اُسے تعبیر کرنا چاہو تو صرف فطرت کے فضل و رحمت ہی سے تعبیر کر سکتے ہو۔ تمہیں اَور کوئی تعبیر نہیں ملیگی۔ مثلاً اُس کے قوانین کا عمل کبھی فوری اور اچانک نہیں ہوتا۔ وہ جو کچھ کرتی ہے، آہستہ آہستہ بتدریج کرتی ہے، اور اس تدریجی طرزِ عمل نے دنیا کے لیے مہلت اور ڈھیل کا فائدہ پیدا کر دیا ہے۔ یعنی اُس کا ہر قانون فرصتوں پر فرصتیں دیتا ہے، اور اُس کا ہر فعل عفو و درگزر کا دروازہ آخر تک کھُلا رکھتا ہے۔ بلاشبہ اُس کے قوانین اپنے نفاذ میں اٹل ہیں۔ اُن میں ردّ و بدل کا امکان نہیں:

مَا يُبَدَّلُ الۡقَوۡلُ لَدَىَّ (۵۰:۲۸) ہمارے یہاں جو بات ایک مرتبہ ٹھہرا دی گئی اُس میں کبھی تبدیلی نہیں ہوتی،

اور اس لیے تم خیال کرنے لگتے ہو کہ اُن کی قطعیت بے رحمی سے خالی نہیں، لیکن تم نہیں سوچتے کہ جو قوانین اپنے نفاذ میں اس درجہ قطعی اور بے پروا ہیں، وہی اپنی نوعیت میں کس درجہ عفو و درگزر اور مہلت بخشی و اصلاح کوشی کی روح بھی رکھتے ہیں! اسی لیے آیت مندرجۂ صدر میں "مَا يُبَدَّلُ الۡقَوۡلُ" کے بعد ہی فرمایا:

وَمَاۤ اَنَا بِظَلَّامٍ لِّلۡعَبِيۡدِ (۵۰:۲۸) لیکن یہ بھی نہیں ہو کہ ہم بندوں کے لیے زیادتی کرنے والے ہوں!

فطرت اگر چاہتی تو ہر حالت بیک دفعہ ظہور میں آجاتی۔ یعنے اُس کے قوانین کا نفاذ فوری اور ناگہانی ہوتا، لیکن تُم دیکھ رہے ہو کہ ایسا نہیں ہوتا۔ ہر حالت، ہر تاثیر، ہر انفعال کے ظہور و بلوغ کے لیے ایک خاص مدت مقرر کر دی گئی ہے۔

اور ضروری ہے کہ بتدریج مختلف منزلیں پیش آئیں۔ پھر ہر منزل اپنے آثار و انداز رکھتی ہے، اور آنے والے نتائج سے خبردار کرتی رہتی ہے۔ زندگی اور موت کے قوانین پر غور کرو۔ کس طرح زندگی بتدریج نشوونما پاتی، اور کس طرح درجہ بدرجہ مختلف منزلوں سے گزرتی ہے۔ اور پھر کس طرح موت کمزوری و فساد کا ایک طول طویل سلسلہ ہے، جو اپنے ابتدائی نقطوں سے شروع ہوتا، اور یکے بعد دیگرے، مختلف منزلیں طے کرتا ہوا، آخری نقطۂ بلوغ تک پہنچا کرتا ہے؟ تم بدپرہیزی کرتے ہو، تو یہ نہیں ہوتا کہ فوراً ہی ہلاک ہو جاؤ، بلکہ بتدریج موت کی طرف بڑھنے لگتے ہو، اور بالآخر ایک خاص مدت کے اندر، جو ہر صورتِ حال کے لیے یکساں نہیں ہوتی، درجہ بدرجہ اترتے ہوئے، موت کے آغوش میں جا گرتے ہو۔ نباتات کو دیکھو۔ درخت اگر آبیاری سے محروم ہو جاتے ہیں، یا نقصان و فساد کا کوئی دوسرا سبب عارض ہو جاتا ہے، تو یہ نہیں ہوتا کہ ایک ہی دفعہ مرجھا کر رہ جائیں، یا کھڑے اچانک گر جائیں۔ بلکہ بتدریج شادابی کی جگہ پژمردگی کی حالت طاری ہونا شروع ہو جاتی ہے، اور پھر ایک خاص مدت کے اندر جو مقرر کر دی گئی ہے، یا تو بالکل مرجھا کر رہ جاتے ہیں، یا جڑ کھوکھلی ہو کر گر پڑتے ہیں۔

اصطلاحِ قرآنی میں "اجل"

یہی حال کائنات کے تمام تغیرات و انفعالات کا ہے۔ کوئی تغیر ایسا نہیں جو اپنا تدریجی دورنہ رکھتا ہو۔ ہر چیز بتدریج بنتی ہے، اور اُسی طرح بتدریج بگڑتی ہے۔ بناؤ ہو یا بگاڑ، ممکن نہیں کہ ایک خاص مدت گزرے بغیر، کوئی حالت بھی اپنی کامل صورت میں ظاہر ہو سکے۔ یہ مدت جو ہر حالت کے ظہور کے لیے اس کی "اجل" یعنی مقررہ وقت ہے، مختلف گوشوں اور مختلف حالتوں میں مختلف مقدار رکھتی ہے، اور بعض حالتوں میں اُس کی مقدار اتنی طویل ہوتی ہے کہ ہم اپنے نظامِ اوقات سے اُس کا حساب بھی نہیں لگا سکتے۔ قرآن نے اسے یوں تعبیر کیا ہے کہ جس مدت کو تم اپنے حساب میں ایک دن سمجھتے ہو اگر اُسے ایک ہزار برس یا پچاس ہزار برس تصور کر لو، تو ایسے دنوں سے جو مہینے اور برس بنیں گے اُن کی مقدار کتنی ہوگی؟

وَاِنَّ يَوۡمًا عِنۡدَ رَبِّكَ كَاَلۡفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوۡنَ ۝ (۲۲: ۴۷)	اور بلاشبہ تمہارے پروردگار کے حساب میں ایک دن ایسا ہے، جیسے تمہارے حساب میں ایک ہزار برس!

"تکویر"

فطرت کا یہی تدریجی طرزِ عمل ہے جسے قرآن نے "تکویر" سے بھی تعبیر کیا ہے۔ یعنی لپٹنے سے۔ وہ کہتا ہے، بجائے اس کے کہ اچانک دن کی روشنی نکل آتی اور ناگہاں رات کی اندھیری اُبل پڑتی، فطرت نے رات اور دن کے ظہور کو اس طرح تدریجی بنا دیا ہے کہ معلوم ہوتا ہے، رات آہستہ آہستہ دن پر لپٹتی جاتی ہے اور دن درجہ بدرجہ، رات پر لپٹتا آتا ہے:

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ بِالۡحَقِّ يُكَوِّرُ الَّيۡلَ عَلَى النَّهَارِ وَيُكَوِّرُ النَّهَارَ	اللہ نے آسمانوں اور زمین کو حکمت و مصلحت کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ اُس نے رات اور دن کے یکے بعد دیگرے آتے رہنے کا ایسا انتظام کر دیا کہ رات دن

عَلَى الَّيْلِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ كُلٌّ يَّجْرِىْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى ؕ (۳۹:۵)

پرلپٹتی جاتی ہے اور دن رات پر لپٹتا آتا ہے۔ اور سورج اور چاند دونوں کو اس کی قدرت نے (ایک خاص انتظام کے ماتحت) مسخر کر رکھا ہے۔ سب (اپنی اپنی جگہ) اپنے مقررہ وقت تک کے لیے حرکت میں ہیں!

قرآن اس تدریجی رفتارِ عمل کو فائدہ اُٹھانے کا موقع دینے، ڈھیل دینے، عفو و درگزر کرنے، اور ایک خاص مدت تک فرصتِ حیات بخشنے سے تعبیر کرتا ہے، اور کہتا ہے، یہ اس لیے ہے کہ کائناتِ ہستی میں فضل و رحمت کی مثبت کام کر رہی ہے اور وہ چاہتی ہے، ہر غلطی کو درستگی کے لیے، ہر نقصان کو تلافی کے لیے، ہر لغزش کو سنبھل جانے کے لیے، زیادہ سے زیادہ مہلتِ اصلاح ملتی رہے، اور اس کا دروازہ کسی پر بند نہ ہو:

تاخیرِ اجل

وہ کہتا ہے، اگر تدریج و امہال کی یہ فرصتیں اور بخششیں نہ ہوتیں تو دنیا میں ایک وجود بھی فرصتِ حیات سے فائدہ نہ اُٹھا سکتا۔ ہر غلطی، ہر کمزوری، ہر نقصان، ہر فساد، اچانک، بیک دفعہ بربادی و ہلاکت کا باعث ہو جاتا:

وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ بِمَا كَسَبُوْا مَا تَرَكَ عَلٰى ظَهْرِهَا مِنْ دَآبَّةٍ وَّلٰكِنْ يُّؤَخِّرُهُمْ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ۚ فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِعِبَادِهٖ بَصِيْرًا ۝ (۳۵:۴۵)

اور انسان جو کچھ اپنے اعمال سے کمائی کرتا ہے، اگر اللہ اُس پر (فوراً) مواخذہ کرتا، تو یقین کرو، زمین کی سطح پر ایک جاندار بھی باقی نہ رہتا، لیکن (یہ اس کی رحمت ہے کہ) اُس نے ایک مقررہ وقت تک فرصتِ حیات دے رکھی ہے۔ پھر جب وہ مقررہ وقت آ جائیگا تو پھر (یاد رہے کہ) اللہ اپنے بندوں کے اعمال سے بےخبر نہیں ہے۔ اُس کی آنکھیں ہر وقت اور ہر حال میں سب کچھ دیکھ رہی ہیں!

تدریج و امہال اچھائی اور بُرائی دونوں کے لیے ہے۔

قدرتی طور پر یہ ڈھیل اچھائی اور بُرائی دونوں کے لیے ہے۔ اچھائی کے لیے اس لیے تاکہ زیادہ نشوونما پائے۔ بُرائی کے لیے اس لیے، تاکہ متنبہ اور خبردار ہو کر اصلاح و تلافی کا سامان کر لے:

كُلًّا نُّمِدُّ هٰٓؤُلَآءِ وَهٰٓؤُلَآءِ مِنْ عَطَآءِ رَبِّكَ ؕ وَمَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّكَ مَحْظُوْرًا ۝ (۱۷:۲۱)

اِن لوگوں کو بھی اور اُن لوگوں کو بھی (یعنی اچھوں کو بھی اور بُروں کو بھی) سب کو تمہارے پروردگار کی بخشش میں سے حصہ مل رہا ہے، اور تمہارے پروردگار کی بخشش کسی پر بند نہیں!

اگر قوانینِ فطرت کی اِن مُہلت بخشیوں سے فائدہ اُٹھا کر نقصان و فساد کی اصلاح کر لی جائے۔ مثلاً تم نے بد پرہیزی کی تھی۔ اُسے ترک کر دو، تو پھر اُسی فطرت کا یہ بھی قانون ہے کہ اصلاح و تلافی کی ہر کوشش قبول کر لیتی ہے، اور نقصان و فساد کے جو نتائج نشوونما پانے لگے تھے، اُن کا مزید نشوونما فوراً رُک جاتا ہے۔ اتنا ہی نہیں، بلکہ اگر اصلاح بروقت اور ٹھیک ٹھیک کی گئی ہے، تو پچھلے مضر اثرات بھی محو ہو جائینگے، اور اس طرح محو ہو جائینگے، گویا کوئی

خرابی پیش ہی نہیں آئی تھی لیکن اگر فطرت کی تمام مہلت بخشیاں رائگاں گئیں۔ اُس کا بار بار اور درجہ بدرجہ انذار بھی کوئی نتیجہ پیدا نہ کر سکا، تو پھر بلاشبہ وہ آخری حد نمودار ہو جاتی ہے، جہاں پہنچ کر فطرت کا آخری فیصلہ صادر ہو جاتا ہے۔ اور پھر جب اُس کا فیصلہ صادر ہو جائے، تو نہ تو اُس میں چشم زدن کی تاخیر ہو سکتی ہے، نہ کسی حال میں بھی تزلزل اور تبدیلی:

فَإِذَا جَاءَ أَجَلُهُمْ لَا يَسْتَأْخِرُونَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُونَ ○ (۱۶: ۶۱)

پھر جب اُن کا مقررہ وقت آگیا، تو اُس سے نہ تو ایک گھڑی پیچھے رہ سکتے ہیں، اور نہ آگے بڑھ سکتے ہیں، (یعنی نہ تو اُس کے نفاذ میں تاخیر ہو سکتی ہے، نہ تقدیم۔ ٹھیک ٹھیک اپنے وقت میں اُسے ہو جانا ہے)

تسکینِ حیات

زندگی کی محنتیں اور کاوشیں

یا مثلاً ہم دیکھتے ہیں، انسان کی معیشت، قیام و بقا کی جدّوجہد اور کشاکش کا نام ہے، اس لیے قدرتی طور پر اُس کا ہر گوشہ طرح طرح کی محنتوں اور کاوشوں سے گھِرا ہوا ہے، اور بہ حیثیت مجموعی زندگی اضطراری ذمہ داریوں کا بوجھ اور مسلسل مشقتوں کی آزمائش ہے:

لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِي كَبَدٍ (۹۰: ۴) بلاشبہ ہم نے انسان کو اس طرح بنایا ہے کہ اُس کی زندگی مشقتوں سے گھری ہوئی ہے!

مشغولیت اور انہماک

لیکن بایں ہمہ، فطرت نے کارخانۂ معیشت کا ڈھنگ کچھ اس طرح کا بنا دیا ہے، اور طبیعتوں میں کچھ اس طرح کی خواہشیں، ولولے، اور انفعالات ودیعت کر دیے ہیں، کہ زندگی کے ہر گوشے میں ایک عجیب طرح کی دلبستگی، مشغولیت، ہماہمی، اور سرگرمی پیدا ہو گئی ہے، اور یہی زندگی کا انہماک ہے جس کی وجہ سے ہر ذی حیات نہ صرف زندگی کی مشقتیں برداشت کر رہا ہے، بلکہ انہی مشقتوں میں زندگی کی بڑی سے بڑی لذت و راحت محسوس کرتا ہے۔ یہ مشقتیں جس قدر زیادہ ہوتی ہیں، اُتنی ہی زیادہ زندگی کی دلچسپی اور محبوبیت بھی بڑھ جاتی ہے۔ اگر ایک انسان کی زندگی اِن مشقتوں سے خالی ہو جائے، تو وہ محسوس کرے گا کہ زندگی کی ساری لذّتوں سے محروم ہو گیا، اور اب زندہ رہنا اُس کے لیے ناقابلِ برداشت بوجھ ہے!

حالات متفاوت ہیں لیکن زندگی کی دل بستگی اور سرگرمی سب کے لیے ہے

پھر دیکھو، کارسازِ فطرت کی یہ کیسی کرشمہ سازی ہے کہ حالات متفاوت ہیں طبائع متنوع ہیں، اشغال مختلف ہیں، اغراض متضاد ہیں لیکن معیشت کی دلبستگی اور سرگرمی سب کے لیے یکساں ہے، اور سب ایک ہی طرح اُس کی مشغولیتوں کے لیے جوش و طلب رکھتے ہیں۔ مرد و عورت، طفل و جوان، امیر و فقیر، عالم و جاہل، قوی و ضعیف، تندرست و بیمار، مجرّد و متاہل، حاملہ و مرضعہ، سب اپنی اپنی حالتوں میں منہمک ہیں، اور کوئی نہیں جس کے لیے زندگی کی کاوشوں میں محویت نہ ہو۔ امیر اپنے محل کے

عیش و نشاط میں، اور فقیر اپنی بے سرو سامانیوں کی فاقہ مستی میں زندگی بسر کرتا ہے، لیکن دونوں کے لیے زندگی کی مشغولیتوں میں دل بستگی ہوتی ہے اور کوئی نہیں کہہ سکتا کہ کون زیادہ مشغول ہے۔ ایک تاجر جس انہماک کے ساتھ اپنی لاکھوں روپیہ کی آمدنی کا حساب کرتا ہے، اُسی طرح ایک مزدور بھی دن بھر کی محنت کے چند پیسے گِن لیا کرتا ہے، اور دونوں کے لیے یکساں طور پر زندگی محبوب ہوتی ہے۔ ایک حکیم کو دیکھو جو اپنے علم و دانش کی کاوشوں میں غرق ہے، اور ایک دہقان کو دیکھو جو دوپہر کی دھوپ میں برہنہ سر ہل جوت رہا ہے، اور پھر بتلاؤ، کس کے لیے زندگی کی مشغولیتوں میں زیادہ دل بستگی ہے؟

پھر دیکھو، بچّے کی پیدائش ماں کے لیے کیسی جانکاہی و مصیبت ہوتی ہے؟ اُس کی پرورش و نگرانی کس طرح خود فروشانہ مشقتوں کا ایک طول طویل سلسلہ ہے؟ تاہم یہ سارا معاملہ کچھ ایسی خواہشوں اور جذبوں کے ساتھ وابستہ کر دیا گیا ہے کہ ہر عورت میں ماں بننے کی قدرتی طلب ہے، اور ہر ماں پرورشِ اولاد کے لیے مجنونانہ خود فراموشی رکھتی ہے۔ وہ زندگی کا سب سے بڑا دُکھ سہیگی، اور پھر اُسی دُکھ میں زندگی کی سب سے بڑی مسرت محسوس کریگی! وہ جب اپنی معیشت کی ساری راحتیں قربان کر دیتی ہے، اور اپنی رگوں کے خون کا ایک ایک قطرہ دودھ بنا کر پلا دیتی ہے، تو اُس کے دل کا ایک ایک ریشہ زندگی کے سب سے بڑے احساسِ مسرت سے معمور ہو جاتا ہے!

پھر کاروبارِ فطرت کے یہ تصرفات دیکھو کہ کس طرح نوعِ انسانی کے منتشر افراد، اجتماعی زندگی کے بندھنوں سے باہم دگر مربوط کر دیے گئے ہیں؟ اور کس طرح صلۂ رحمی کے رشتہ نے ہر فرد کو سیکڑوں ہزاروں افراد کے ساتھ جوڑ رکھا ہے؟ فرض کرو، زندگی و معیشت اِن تمام موثرات سے خالی ہوتی۔ لیکن قرآن کہتا ہے کہ خالی نہیں ہو سکتی تھی، اس لیے کہ فطرتِ کائنات میں رحمت کارفرما ہے، اور رحمت کا تقضا یہی تھا کہ معیشت کی مشقتوں کو خوشگوار بنا دے، اور زندگی کے لیے تسکین و راحت کا سامان پیدا کر دے۔ یہ رحمت کی کرشمہ سازیاں ہیں جنھوں نے رنج میں راحت، الم میں لذّت، اور سختیوں میں دلپذیری کی کیفیت پیدا کر دی ہے!

اشیاء و مناظر کا اختلاف و تنوّع اور تسکینِ حیات

چنانچہ قرآن نے تسکینِ حیات کے مختلف پہلوؤں پر جابجا توجّہ دلائی ہے۔ ازاں جملہ کائناتِ خلقت کے مناظر و اشیاء کا اختلاف و تنوّع ہے۔ انسانی طبیعت کا خاصہ ہے کہ یکسانی سے اُکتاتی ہے اور تبدیلی و تنوّع میں خوشگواری و کیفیت محسوس کرتی ہے۔ پس اگر کائناتِ ہستی میں محض یکسانی و یک رنگی ہی ہوتی، تو یہ دلچسپی اور خوشگواری پیدا نہ ہو سکتی جو اُس کے ہر گوشہ میں ہمیں نظر آ رہی ہے۔ اوقات کا اختلاف، موسموں کا اختلاف، خشکی و تری کا اختلاف، مناظرِ طبیعت اور اشیاءِ خلقت کا اختلاف؛ جہاں بے شمار مصلحتیں اور فوائد رکھتا ہے، وہاں ایک بڑی مصلحت دنیا کی زیب و زینت اور معیشت کی تسکین و راحت بھی ہے:

گلہائے رنگ رنگ سے ہے زینتِ چمن
اے ذوقؔ اس جہاں میں ہے زیب اختلاف سے!

اختلافِ لیل ونہار

چنانچہ اِسی سلسلہ میں وہ رات اور دن کے اختلاف کا ذکر کرتا ہے، اور کہتا ہے، اگر غور کرو تو اس اختلاف میں حکمتِ الٰہی کی کتنی ہی نشانیاں پوشیدہ ہیں۔ یہ بات کہ شب و روز کی آمد و شد کی دو مختلف حالتیں ٹھہرادی گئی ہیں، اور وقت کی نوعیت ہر معین مقدار کے بعد بدلتی رہتی ہے، زندگی کے لیے بڑی ہی تسکین و دلبستگی کا ذریعہ ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا، اور وقت ہمیشہ ایک ہی حالت پر برقرار رہتا تو دنیا میں زندہ رہنا دشوار ہوجاتا۔ اگر تم قطبین کے اطراف میں جاؤ جہاں روز و شب کا اختلاف اپنی نمود نہیں رکھتا، تو تمہیں معلوم ہوجائے کہ یہ اختلاف گزرانِ حیات کے لیے کیسی عظیم الشّان نعمت ہے:

إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَ اخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰيٰتٍ لِّأُولِي الْأَلْبَابِ (۳: ۱۸۷)	بلاشبہ آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں اور رات اور دن کے ایک کے بعد ایک آتے رہنے میں اربابِ دانش کے لیے (حکمتِ الٰہی) کی بڑی ہی نشانیاں ہیں!

رات اور دن کے اختلاف نے معیشت کو دو مختلف حصّوں میں تقسیم کردیا ہے۔ دن کی روشنی جدّ وجہد کی سرگرمی پیدا کرتی ہے۔ رات کی تاریکی راحت و سکون کا بستر بچھادیتی ہے۔ ہر دن کی محنت کے بعد رات کا سکون ہوتا ہے، اور ہر رات کے سکون کے بعد نئے دن کی نئی سرگرمی!

وَمِنْ رَّحْمَتِهٖ جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ لِتَسْكُنُوْا فِيْهِ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ (۲۸: ۷۳)	اور (دیکھو) یہ اُس کی رحمت کی کارسازی ہے کہ تمہارے لیے رات اور دن (الگ الگ) ٹھہرادیے گئے تاکہ رات کے وقت راحت پاؤ، اور دن میں اُس کا فضل تلاش کرو (یعنی کاروبارِ معیشت میں سرگرم ہو)

دن کی مختلف حالتیں اور رات کی مختلف منزلیں

پھر رات اور دن کا اختلاف، صرف رات اور دن ہی کا اختلاف نہیں ہے، بلکہ ہر دن مختلف حالتوں سے گزرتا، اور ہر رات مختلف منزلیں طے کرتی ہے۔ اور ہر حالت ایک خاص طرح کی تاثیر رکھتی ہے، اور ہر منزل کے لیے ایک خاص طرح کا منظر ہوتا ہے۔ صبح طلوع ہوتی ہے، اور اُس کی ایک خاص تاثیر ہوتی ہے۔ دن ڈھلتا ہے، اور اُس کا ایک خاص منظر ہوتا ہے۔ اوقات کا یہ روزانہ اختلاف ہمارے احساسات کا ذائقہ بدلتا رہتا ہے، اور یکسانیت کی افسردگی کی جگہ تبدّل و تجدّد کی لذّت اور سرگرمی پیدا ہوتی رہتی ہے:

فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ حِيْنَ تُمْسُوْنَ وَحِيْنَ تُصْبِحُوْنَ ٥ وَلَهُ الْحَمْدُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَعَشِيًّا وَّحِيْنَ تُظْهِرُوْنَ (۳۰: ۱۷)	پس پاکی ہے اللہ کے لیے، اور آسمانوں اور زمین میں اُس کے لیے ستائش ہے جبکہ تم پر شام آتی ہے، جب تم پر صبح ہوتی ہے، جب دن کا آخری وقت ہوتا ہے، اور جب تم پر دوپہر آتی ہے:

حیوانات کا اختلاف

اِسی طرح انسان خود اپنے وجود کو دیکھے، اور تمام حیوانات کو دیکھے۔ فطرت نے کس طرح طرح طرح کے اختلافات سے اس میں تنوّع اور دلپذیری پیدا کر دی ہے؟

وَمِنَ النَّاسِ وَالدَّوَابِّ وَالْاَنْعَامِ مُخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ ! (۳۵: ۲۸)

اور انسان، جانور، چار پائے، طرح طرح کی رنگتوں کے!

نباتات

عالمِ نباتات کو دیکھو۔ درختوں کے مختلف ڈیل ڈول ہیں، مختلف رنگتیں ہیں، مختلف خوشبوئیں ہیں، مختلف خواص ہیں، اور پھر دانہ اور پھل کھاؤ تو مختلف قسم کے ذائقے ہیں!

اَوَلَمْ یَرَوْا اِلَی الْاَرْضِ کَمْ اَنْۢبَتْنَا فِیْهَا مِنْ کُلِّ زَوْجٍ کَرِیْمٍ (۲۶: ۷)

کیا اِن لوگوں نے کبھی زمین پر نظر نہیں ڈالی اور غور نہیں کیا کہ ہم نے نباتات کی ہر دو دو بہتر قسموں میں سے کتنے (بے شمار) درخت پیدا کر دیے ہیں!

وَمَا ذَرَاَ لَکُمْ فِی الْاَرْضِ مُخْتَلِفًا اَلْوَانُهٗ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیَةً لِّقَوْمٍ یَّذَّکَّرُوْنَ ۝ (۱۶: ۱۳)

اور (دیکھو) اللہ نے جو پیداوار مختلف رنگتوں کی تمہارے لیے زمین میں پھیلا دی ہے، سو اس میں بھی عبرت پذیر طبیعتوں کے لیے (حکمتِ الٰہی کی) بڑی ہی نشانی ہے!

وَهُوَ الَّذِیْۤ اَنْشَاَ جَنّٰتٍ مَّعْرُوْشٰتٍ وَّغَیْرَ مَعْرُوْشٰتٍ وَّالنَّخْلَ وَالزَّرْعَ مُخْتَلِفًا اُکُلُهٗ (۶: ۱۴۱)

اور وہ (حکیم و قدیر) جس نے (طرح طرح کے) باغ پیدا کر دیے ٹٹیوں پر چڑھائے ہوئے اور بغیر چڑھائے ہوئے اور کھجور کے درخت اور (طرح طرح کی) کھیتیاں، جن کے دانے اور پھل کھانے میں مختلف ذائقہ رکھتے ہیں+

جمادات

حیوانات اور نباتات ہی پر موقوف نہیں، جمادات میں بھی یہی قانونِ فطرت کام کر رہا ہے:

وَمِنَ الْجِبَالِ جُدَدٌۢ بِیْضٌ وَّحُمْرٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهَا وَغَرَابِیْبُ سُوْدٌ ۝ (۳۵: ۲۷)

اور پہاڑوں کو دیکھو۔ گوناگوں رنگتوں کے ہیں۔ کچھ سفید، کچھ سرخ کچھ کالے کلوٹے!

ہر چیز کے دو دو ہونے کا قانون

اِسی قانونِ اختلاف کا ایک گوشہ وہ بھی ہے جسے قرآن نے "تزویج" سے تعبیر کیا ہے، اور ہم اُسے قانونِ تثنیہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ یعنی ہر چیز کے دو دو ہونے، یا متقابل و متماثل ہونے کا قانون۔ کائنات خلقت کا کوئی گوشہ بھی دیکھو، تمہیں کوئی چیز یہاں اکہری اور طاق نظر نہیں آئیگی۔ ہر چیز میں جُفت اور دو دو ہونے کی حقیقت کام کر رہی ہے۔ یا یوں کہا جائے کہ ہر چیز اپنا کوئی نہ کوئی مثنیٰ بھی ضرور رکھتی ہے۔ رات کے لیے دن ہے، صبح کے لیے شام ہے، نر کے لیے مادہ ہے، مرد کے لیے عورت ہے، زندگی کے لیے موت ہے[۱]۔

---

[۱] قرآنِ حکیم نے آخرت کے وجود کا جن جن دلائل سے اذعان پیدا کیا ہے، اُن میں سے ایک یہ بھی ہے۔ وہ کہتا ہے، دنیا میں ہر چیز اپنا کوئی نہ کوئی متقابل وجود یا مثنیٰ ضرور رکھتی ہے پس ضروری ہے کہ دنیوی زندگی کے لیے بھی کوئی متقابل اور مثنیٰ زندگی ہو۔ دنیوی زندگی کی متقابل زندگی آخرت کی زندگی ہے۔ چنانچہ بعض سورتوں میں انہی متقابل مظاہرات سے استشہاد کیا ہے۔ مثلاً سورۂ والشمس میں فرمایا:

والشمس وضحٰها، والقمر اذا تلٰها، والنهار اذا جلّٰها، والیل اذا یغشٰها، والسماء وما بنٰها، والارض وما طحٰها، الخ (۹۱: ۱-۶)

وَمِنْ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ (۵۱: ۴۹)

اور ہر چیز میں ہم نے جوڑے پیدا کر دیے (یعنی دو دو اور متقابل اشیاء پیدا کیں)

سُبْحٰنَ الَّذِيْ خَلَقَ الْاَزْوَاجَ كُلَّهَا مِمَّا تُنْۢبِتُ الْاَرْضُ وَمِنْ اَنْفُسِهِمْ وَمِمَّا لَا يَعْلَمُوْنَ (۳۶: ۳۶)

پاکی اور بزرگی ہے اُس ذات کے لیے جس نے زمین کی پیداوار میں اور انسان میں، اور اُن تمام مخلوقات میں جن کا انسان کو علم نہیں، دو دو اور متقابل چیزیں پیدا کیں!

[مرد اور عورت] یہی قانونِ فطرت ہے جس نے انسان کو دو مختلف جنسوں یعنی مرد اور عورت میں تقسیم کر دیا، اور پھر ان میں فعل و انفعال اور جذب و انجذاب کے کچھ ایسے وجدانی احساسات ودیعت کر دیئے، کہ ہر جنس دوسری جنس سے ملنے کی قدرتی طلب رکھتی ہے، اور دونوں کے ملنے سے ازدواجی زندگی کی ایک کامل معیشت پیدا ہو جاتی ہے!

فَاطِرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا وَّمِنَ الْاَنْعَامِ اَزْوَاجًا (۴۲: ۱۱)

وہ آسمانوں اور زمین کا بنانے والا۔ اُس نے تمہارے لیے تمہاری ہی جنس میں سے جوڑے بنا دیے (یعنی مرد کے لیے عورت اور عورت کے لیے مرد) اسی طرح چارپایوں میں بھی جوڑے پیدا کر دیے۔

قرآن کہتا ہے، یہ اس لیے ہے تاکہ محبت اور سکون ہو، اور دو ہستیوں کی باہمی رفاقت اور اشتراک سے زندگی کی محنتیں اور مشقتیں سہل اور گوارا ہو جائیں:

وَمِنْ اٰيٰتِهٖۤ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْۤا اِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ (۳۰: ۲۱)

اور (دیکھو) اُس کی (رحمت کی) نشانیوں میں سے ایک نشانی یہ ہے کہ اُس نے تمہارے لیے تم ہی میں سے جوڑے پیدا کر دیے (یعنی مرد کے لیے عورت اور عورت کے لیے مرد) تاکہ اس کی وجہ سے تمہیں سکون حاصل ہو اور پھر اُس کی یہ کارفرمائی دیکھو کہ تمہارے درمیان (یعنی مرد اور عورت کے درمیان) محبت اور رحمت کا جذبہ پیدا کر دیا۔ بلاشبہ ان لوگوں کے لیے جو غور و فکر کرنے والے ہیں اس میں (حکمتِ الٰہی کی) بڑی ہی نشانیاں ہیں

[نسب اور صہر] پھر اسی ازدواجی زندگی سے توالد و تناسل کا ایک ایسا سلسلہ قائم ہو گیا ہے کہ ہر وجود پیدا ہوتا ہے اور ہر وجود پیدا کرتا ہے۔ ایک طرف وہ نسب کا رشتہ رکھتا ہے جو اُسے پچھلوں سے جوڑتا ہے۔ دوسری طرف صہر یعنی دامادی کا رشتہ رکھتا ہے جو اُسے آگے آنے والوں سے مربوط کر دیتا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ ہر وجود کی فردیت ایک وسیع دائرہ کی کثرت میں پھیل گئی ہے، اور رشتوں قرابتوں کا ایسا وسیع حلقہ پیدا ہو گیا ہے جس کی ہر کڑی دوسری کڑی کے ساتھ مربوط ہے!

وَهُوَ الَّذِيْ خَلَقَ مِنَ الْمَاۗءِ بَشَرًا فَجَعَلَهٗ نَسَبًا وَّصِهْرًا (۲۵: ۵۴)

اور وہی (حکیم و قدیر) ہے جس نے پانی سے (یعنی نطفہ سے) انسان کو پیدا کیا، پھر (اسی رشتۂ پیدائش کے ذریعہ) اُسے نسب اور صہر کا رشتہ رکھنے والا بنا دیا!

صلۂ رحمی اور خاندانی حلقہ کی تشکیل

اور پھر دیکھو، اِس نسب اور صِہر کے رشتے سے کس طرح خاندان اور قبیلہ کا نظام قائم ہو گیا ہے، اور کس عجیب و غریب طریقہ سے صلۂ رحمی یعنی قرابت داری کی گیرائیاں ایک وجود کو دوسرے وجود سے جوڑتیں اور معاشرتی زندگی کی باہمی اُلفتوں اور معاونتوں کے لیے محرّک ہوتی ہیں؟ دراصل انسان کی اجتماعی زندگی کا سارا کارخانہ اسی صلۂ رحمی کے سررشتہ نے قائم کر رکھا ہے:

يَآأَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُم مِّن نَّفْسٍ وَاحِدَةٍ وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيرًا وَنِسَاءً ۚ وَاتَّقُوا اللَّهَ الَّذِي تَسَاءَلُونَ بِهِ وَالْأَرْحَامَ ۚ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيبًا ○ (۴ : ۱)

اے افرادِ نسلِ انسانی! اپنے پروردگار کی نافرمانی سے بچو (اور اُس کے ٹھہرائے ہوئے رشتوں سے بے پروا نہ ہو جاؤ) وہ پروردگار جس نے تمہیں ایک فردِ واحد سے پیدا کیا (یعنی باپ سے پیدا کیا) اور اُسی سے اُس کا جوڑا بھی پیدا کر دیا (یعنی جس طرح مرد کی نسل سے لڑکا پیدا ہوا لڑکی بھی پیدا ہوئی) پھر اُن کی نسل سے ایک بڑی تعداد مرد اور عورت کی پیدا ہو کر پھیل گئی (اس طرح فردِ واحد کے رشتہ نے ایک بڑے خاندان اور قبیلہ کی صورت پیدا کر لی) پس اللہ کی نافرمانی سے بچو جس کے نام پر باہم دگر (مہر و شفقت کا) سوال کرتے ہو اور صلۂ رحمی کے توڑنے سے بھی بچو (جس کے نام پر باہم دگر ایک دوسرے سے چشمداشت اعانت رکھتے ہو) بلاشبہ اللہ تمہارا نگرانِ حال ہے!

وَاللَّهُ جَعَلَ لَكُم مِّنْ أَنفُسِكُمْ أَزْوَاجًا وَجَعَلَ لَكُم مِّنْ أَزْوَاجِكُم بَنِينَ وَحَفَدَةً (۱۶ : ۷۲)

اور (دیکھو) یہ اللہ ہے جس نے تمہاری ہی جنس سے تمہارے لیے جوڑا بنا دیا (یعنی مرد کے لیے عورت اور عورت کے لیے مرد) پھر تمہارے باہمی ازدواج سے بیٹوں اور پوتوں کا سلسلہ قائم کر دیا۔

ایامِ حیات کا تغیّر و تنوّع

اِسی طرح ایامِ حیات کے تغیّر و تنوّع میں بھی تسکینِ حیات کی ایک بہت بڑی مصلحت پوشیدہ ہے۔ ہر زندگی طفولیت، شباب، جوانی، کہولت، اور بڑھاپے کی مختلف منزلوں سے گزرتی ہے، اور ہر منزل اپنے نئے نئے احساسات اور نئی نئی مشغولیتیں اور نئی نئی کاوشیں رکھتی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ ہماری زندگی عالمِ ہستی کی ایک دلچسپ مسافرت بن گئی۔ ایک منزل کی کیفیتوں سے ابھی جی سیر نہیں ہو چکتا کہ دوسری منزل نمودار ہو جاتی ہے، اور اس طرح عرصۂ حیات کی طوالت محسوس ہی نہیں ہوتی:

هُوَ الَّذِي خَلَقَكُم مِّن تُرَابٍ ثُمَّ مِن نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ يُخْرِجُكُمْ طِفْلًا ثُمَّ لِتَبْلُغُوا أَشُدَّكُمْ ثُمَّ لِتَكُونُوا شُيُوخًا ۚ وَمِنكُم مَّن يُتَوَفَّىٰ مِن قَبْلُ ۖ وَلِتَبْلُغُوا أَجَلًا

"(پروردگار) جس نے تمہارا وجود مٹی سے پیدا کیا، پھر نطفہ سے، پھر "علقہ" سے (یعنی جونک کی شکل کی ایک چیز سے) پھر ایسا ہوتا ہے کہ تم طفولیت کی حالت میں ماں کے شکم سے نکلتے ہو، پھر بڑے ہوتے ہو اور سِنِ تمیز تک پہنچتے ہو۔ اس کے بعد تمہارا جینا اس لیے ہوتا ہے تاکہ بڑھاپے کی منزل تک پہنچو، پھر تم میں سے کوئی تو ان منزلوں سے پہلے ہی مر جاتا ہے، کوئی چھوڑ دیا جاتا ہے۔ تاکہ اپنے

مُّسَمًّى وَّلَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝ (۴۰ : ۶۷) مقررہ وقت تک زندگی بسر کرلے :

زینت و تفاخر، مال و متاع، آل و اولاد

اسی طرح، طرح طرح کی خواہشیں اور جذبے، زینت و تفاخر کے ولولے، مال و متاع کی محبت، آل اولاد کی دلبستگیاں، زندگی کی دلچسپی اور انہماک کے لیے پیدا کردی گئی ہیں:

زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَ الْبَنِيْنَ وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَ الْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ (۳ : ۱۲)

انسان کے لیے مرد و عورت کے تعلق میں، اولاد میں، چاندی سونے کے اندوختوں میں، چُنے ہوئے گھوڑوں میں، مویشیوں میں، اور کھیتی باڑی میں دلبستگی پیدا کردی گئی ہے، اور یہ جو کچھ بھی ہے، دنیوی زندگی کی پونجی ہے۔ بہتر ٹھکانا تو اللہ ہی کے پاس ہے:

اختلافِ معیشت اور تزاحمِ حیات

اسی طرح معیشت کا اختلاف اور اس کی وجہ سے مختلف درجوں اور حالتوں کا پیدا ہو جانا بھی انہماکِ حیات کا ایک بہت بڑا محرک ہے، کیونکہ اس کی وجہ سے زندگی میں مزاحمت اور مسابقت کی حالت پیدا ہوگئی ہے، اور اس میں لگے رہنے سے زندگی کی مشقتوں کا جھیلنا آسان ہوگیا ہے، بلکہ یہی مشقتیں سرتاسر راحتُ سرور کا سامان بن گئی ہیں:

وَهُوَ الَّذِيْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ الْاَرْضِ وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَبْلُوَكُمْ فِيْ مَآ اٰتٰىكُمْ ۭ اِنَّ رَبَّكَ سَرِيْعُ الْعِقَابِ ڮ وَاِنَّهٗ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ (۶ : ۱۶۵)

اور یہ اُسی (حکیم و قدیر) کی کارفرمائی ہے کہ اُس نے تمہیں زمین میں (پچھلوں کا) جانشین بنایا، اور تم میں سے بعض کو بعض پر، درجوں میں فوقیت دیدی، تاکہ جو کچھ تمہیں دیا گیا ہے اُس میں تمہارے عمل کی آزمائش کرے۔ بلاشبہ تمہارا پروردگار (پاداشِ عمل کی) سزا دینے میں تیز ہے (یعنی اُس کا قانونِ مکافات نتائجِ عمل میں سست رفتار نہیں) لیکن ساتھ ہی بخش دینے والا، رحمت رکھنے والا بھی ہے!

بُرہانِ فضل و رحمت

چنانچہ یہی وجہ ہے کہ جس طرح قرآن نے ربوبیت کے اعمال و مظاہر سے استدلال کیا ہے، اُسی طرح وہ رحمت کے آثار و حقائق سے بھی جابجا استدلال کرتا ہے، اور بُرہانِ ربوبیت کی طرح بُرہانِ فضل و رحمت بھی اُس کی دعوتُ ارشاد کا ایک عام اسلوبِ خطاب ہے۔ وہ کہتا ہے، کائناتِ خلقت کی ہر شے میں ایک مقررہ نظام کے ساتھ رحمت و فضل کے مظاہر کا موجود ہونا، قدرتی طور پر انسان کو یقین دلا دیتا ہے کہ ایک رحمت رکھنے والی ہستی کی کارفرمائیاں یہاں کام کر رہی ہیں۔ کیونکہ ممکن نہیں فضل و رحمت کی یہ پوری کائنات موجود ہو، اور فضل و رحمت کا کوئی زندہ ارادہ موجود نہ ہو۔ چنانچہ وہ تمام مقامات جن میں کائناتِ خلقت کے افادہ و فیضان، زینت و جمال، موزونیتُ اعتدال، تسویہ و

قوام، اور تکمیل و اتقان کا ذکر کیا گیا ہے، دراصل اسی استدلال پر مبنی ہیں؛

وَإِلَٰهُكُمْ إِلَٰهٌ وَاحِدٌ ۖ لَّا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ الرَّحْمَٰنُ الرَّحِيمُ ۝ إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِي تَجْرِي فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنفَعُ النَّاسَ وَمَا أَنزَلَ اللَّهُ مِنَ السَّمَاءِ مِن مَّاءٍ فَأَحْيَا بِهِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِيهَا مِن كُلِّ دَابَّةٍ وَتَصْرِيفِ الرِّيَاحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَعْقِلُونَ ۝ (۲: ۱۶۳-۱۶۴)

اور (دیکھو) تمہارا معبود وہی ایک معبود ہے۔ کوئی معبود نہیں مگر اُسی کی ایک ذات؛ رحمت والی، اور اپنی رحمت کی بخششوں سے ہمیشہ فیضیاب کرنے والی! بلاشبہ آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے میں، اور رات دن کے ایک کے بعد ایک آتے رہنے میں، اور کشتی میں جو انسان کی کاربراریوں کے لیے سمندر میں چلتی ہے، اور بارش میں جسے اللہ آسمان سے برساتا ہے اور اس (کی آبپاشی) سے زمین مرنے کے بعد پھر جی اُٹھتی ہے، اور اس بات میں کہ ہر قسم کے جانور زمین میں پھیلا دیے ہیں، نیز ہواؤں کے (مختلف جانب) پھیرنے میں، اور بادلوں میں جو آسمان اور زمین کے درمیان (اپنی مقررہ جگہ کے اندر) بندھے رُکے ہیں؛ عقل رکھنے والوں کے لیے (اللہ کی ہستی اور اُس کے قوانینِ فضل و رحمت کی) بڑی ہی نشانیاں ہیں!

اِسی طرح اُن مقامات کا مطالعہ کرو جہاں خصوصیت کے ساتھ جمالِ فطرت سے استدلال کیا ہے:

أَفَلَمْ يَنظُرُوا إِلَى السَّمَاءِ فَوْقَهُمْ كَيْفَ بَنَيْنَاهَا وَزَيَّنَّاهَا وَمَا لَهَا مِن فُرُوجٍ ۝ وَالْأَرْضَ مَدَدْنَاهَا وَأَلْقَيْنَا فِيهَا رَوَاسِيَ وَأَنبَتْنَا فِيهَا مِن كُلِّ زَوْجٍ بَهِيجٍ ۝ تَبْصِرَةً وَذِكْرَىٰ لِكُلِّ عَبْدٍ مُّنِيبٍ ۝ (۵۰: ۶-۸)

کیا کبھی ان لوگوں نے آسمان کی طرف نظر اُٹھا کر دیکھا نہیں کہ کس طرح ہم نے اُسے بنایا ہے، اور کس طرح اُس کے منظر میں خوشنمائی پیدا کر دی ہے، اور پھر یہ کہ کہیں بھی اس میں شگاف نہیں؟ اور اسی طرح زمین کو دیکھو، کس طرح ہم نے اُسے فرش کی طرح پھیلا دیا، اور پہاڑوں کے لنگر ڈال دیے، اور پھر کس طرح قسم قسم کی خوبصورت نباتات اُگا دیں! ہر اُس بندے کے لیے جو حق کی طرف رجوع کرنے والا ہے۔ اس میں غور کرنے کی بات اور نصیحت کی روشنی ہے!

وَلَقَدْ جَعَلْنَا فِي السَّمَاءِ بُرُوجًا وَزَيَّنَّاهَا لِلنَّاظِرِينَ ۝ (۱۵: ۱۶)

اور (دیکھو) ہم نے آسمان میں (ستاروں کی گردش کے لیے) برج بنائے، اور دیکھنے والوں کے لیے اُن میں خوشنمائی پیدا کر دی۔

وَلَقَدْ زَيَّنَّا السَّمَاءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيحَ (۶۷: ۵)

اور (دیکھو) ہم نے دنیا کے آسمان (یعنی کرۂ ارضی کی فضا) کو ستاروں کی قندیلوں سے خوش منظر بنا دیا!

وَلَكُمْ فِيهَا جَمَالٌ حِينَ تُرِيحُونَ وَحِينَ تَسْرَحُونَ ۝ (۱۶: ۶)

اور (دیکھو) تمہارے لیے چارپایوں کے منظر میں جب شام کے وقت چراگاہ سے واپس لاتے ہو اور جب صبح لے جاتے ہو، ایک طرح کا حُسن اور نظر افروزی ہے!

موزونیت و تناسب

جس چیز کو ہم "جمال" کہتے ہیں، اُس کی حقیقت کیا ہے؟ موزونیت اور تناسب۔ یہی موزونیت اور تناسب

ہے جو بناؤ اور خوبی کے تمام مظاہر کی اصل ہے:

وَاَنۡۢبَتۡنَا فِيۡهَا مِنۡ كُلِّ شَىۡءٍ مَّوۡزُوۡنٍ (۱۵:۱۹) اور (دیکھو) ہم نے زمین میں ہر ایک چیز موزونیت اور تناسب رکھنے والی اگائی!

تسویہ اِسی معنی میں قرآن "تسویہ" کا لفظ بھی استعمال کرتا ہے۔ "تسویہ" کے معنی یہ ہیں کہ کسی چیز کو اس طرح، ٹھیک ٹھیک درست کر دینا، کہ اُس کی ہر بات خوبی و مناسبت کے ساتھ ہو:

اَلَّذِىۡ خَلَقَ فَسَوّٰى ۙ وَالَّذِىۡ قَدَّرَ فَهَدٰى — وہ پروردگار، جس نے ہر چیز پیدا کی، پھر ٹھیک ٹھیک خوبی و مناسبت کے ساتھ درست کر دی۔ اور وہ، جس نے ہر وجود کے لیے ایک اندازہ ٹھہرا دیا، پھر اُس پر (زندگی و معیشت) کی راہ کھول دی! (۸۷:۲)

اَلَّذِىۡ خَلَقَكَ فَسَوّٰٮكَ فَعَدَلَكَ ۙ فِىۡۤ اَىِّ صُوۡرَةٍ مَّا شَآءَ رَكَّبَكَ — وہ پروردگار، جس نے تمہیں پیدا کیا، پھر ٹھیک ٹھیک درست کر دیا، پھر (تمہارے ظاہری و باطنی قوٰی میں) اعتدال و تناسب ملحوظ رکھا، پھر جیسی صورت بنانی چاہی اُسی کے مطابق ترکیب دے دی! (۸۲:۷)

اِتقان یہی حقیقت ہے جسے قرآن نے "اتقان" سے بھی تعبیر کیا ہے۔ یعنی کائناتِ ہستی کی ہر چیز کا درستگی و استواری کے ساتھ ہونا کہ کہیں بھی اُس میں خلل، نقصان، بے ڈھنگا پن، اونچ نیچ، ناہمواری، نظر نہیں آسکتی:

صُنۡعَ اللّٰهِ الَّذِىۡۤ اَتۡقَنَ كُلَّ شَىۡءٍ ؕ (۲۷:۹۰) یہ اللہ کی کاریگری ہے جس نے ہر چیز درستگی و استواری کے ساتھ بنائی!

مَا تَرٰى فِىۡ خَلۡقِ الرَّحۡمٰنِ مِنۡ تَفٰوُتٍ ؕ فَارۡجِعِ الۡبَصَرَ ۙ هَلۡ تَرٰى مِنۡ فُطُوۡرٍ ثُمَّ ارۡجِعِ الۡبَصَرَ كَرَّتَيۡنِ يَنۡقَلِبۡ اِلَيۡكَ الۡبَصَرُ خَاسِئًا وَّهُوَ حَسِيۡرٌ (۶۷:۳) — تم الرحمٰن کی بناوٹ میں (رحمٰن کی بناوٹ میں کیونکہ یہ اُس کی رحمت ہی کا ظہور ہے) کبھی کوئی اونچ نیچ نہیں پاؤ گے۔ (اچھا نظر اُٹھاؤ، اور اس نمائشگاہِ صنعت کا مطالعہ کرو) ایک بار نہیں بار بار دیکھو، کیا تمہیں کہیں کوئی دراڑ دکھائی دیتی ہے؟ تم اسی طرح یکے بعد دیگرے دیکھتے رہو، تمہاری نگاہ اُٹھیگی، اور عاجز درماندہ ہو کر واپس آجائیگی، لیکن کوئی نقص نہ نکال سکیگی!

"فِىۡ خَلۡقِ الرَّحۡمٰنِ" فرمایا۔ یعنی یہ خوبی و اتقان اس لیے ہے کہ رحمت رکھنے والے کی کاریگری ہے، اور رحمت کا مقتضا یہی تھا کہ حُسن و خوبی ہو، اتقان و کمال ہو، نقص اور ناہمواری نہ ہو!

رحمت سے معاد پر استدلال خدا کی ہستی اور اُس کی توحید و صفات کی طرح، آخرت کی زندگی پر بھی وہ رحمت سے استدلال کرتا ہے۔ اگر رحمت کا مقتضا یہ ہُوا کہ دنیا میں اس خوبی و کمال کے ساتھ زندگی کا ظہور ہو، تو کیونکر یہ بات باور کی جاسکتی ہے کہ دنیا کی چند روزہ زندگی کے بعد اُس کا فیضان ختم ہو جائے، اور خزانۂ رحمت میں انسان کی زندگی اور بناؤ کے لیے کچھ باقی نہ رہے؟

اَوَلَمۡ يَرَوۡا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِىۡ خَلَقَ — کیا اِن لوگوں نے کبھی اس بات پر غور نہیں کیا کہ اللہ جس نے آسمان و زمین پیدا کیے تھے؟

السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ قَادِرٌ عَلٰٓى اَنْ يَّخْلُقَ مِثْلَهُمْ وَجَعَلَ لَهُمْ اَجَلًا لَّا رَيْبَ فِيْهِ ؕ فَاَبَى الظّٰلِمُوْنَ اِلَّا كُفُوْرًا ۔ قُلْ لَّوْ اَنْتُمْ تَمْلِكُوْنَ خَزَآئِنَ رَحْمَةِ رَبِّيْٓ اِذًا لَّاَمْسَكْتُمْ خَشْيَةَ الْاِنْفَاقِ ؕ (۱۷ : ۹۹)

یقیناً اس بات سے عاجز نہیں ہوسکتا کہ اُن جیسے (آدمی دوبارہ) پیدا کردے، اور یہ کہ اُن کے لیے اُس نے ایک مقررہ وقت ٹھہرا دیا ہے جس میں کسی طرح کا شک و شبہ نہیں؟ (افسوس ان کی شقاوت پر!) اس پر بھی ان ظالموں نے اپنے لیے کوئی راہ پسند نہ کی مگر حقیقت سے انکار کرنے کی! (اے پیغمبر ان سے) کہہ دو، اگر میرے پروردگار کی رحمت کے خزانے تمہارے قبضہ میں ہوتے، تو اُس حالت میں یقیناً تم خرچ ہوجانے کے ڈر سے ہاتھ روکے رکھتے۔ (لیکن یہ اللہ ہی جس کے خزائن رحمت نہ تو کبھی ختم ہوسکتے ہیں نہ اُس کی بخشائش رحمت کی کوئی انتہا ہی)

رحمت سے وحی و تنزیل کی ضرورت پر استدلال

اس طرح وہ رحمت سے وحی و تنزیل کی ضرورت پر بھی استدلال کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے، جو رحمت کارخانۂ ہستی کے ہر گوشہ میں افادہ و فیضان کا سرچشمہ ہے، کیونکر ممکن تھا کہ انسان کی معنوی ہدایت کے لیے اُس کے پاس کوئی فیضان نہ ہوتا، اور وہ انسان کو نقصان و ہلاکت کے لیے چھوڑ دیتی؟ اگر تم دس گوشوں میں فیضانِ رحمت محسوس کر رہے ہو، تو کوئی وجہ نہیں کہ گیارہویں گوشے میں اُس سے انکار کردو۔ یہی وجہ ہے کہ اُس نے جابجا نزولِ وحی، ترسیلِ کتب، اور بعثتِ انبیاءؑ کو رحمت سے تعبیر کیا ہے:-

وَلَئِنْ شِئْنَا لَنَذْهَبَنَّ بِالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ بِهٖ عَلَيْنَا وَكِيْلًا ۔ اِلَّا رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ ؕ اِنَّ فَضْلَهٗ كَانَ عَلَيْكَ كَبِيْرًا (۱۷: ۸۶-۸۷)

اور (اے پیغمبر!) اگر ہم چاہیں تو جو کچھ تم پر وحی کے ذریعہ بھیجا گیا ہے اُسے اُٹھالے جائیں (یعنی سلسلۂ تنزیل و وحی باقی نہ رہے) اور پھر تمہیں کوئی بھی ایسا کارساز نہ ملے جو ہم پر زور ڈال سکے لیکن یہ جو سلسلۂ وحی جاری ہے تو یہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ تمہارے پروردگار کی رحمت ہے، اور یقین کرو، تم پر اُس کا بڑا ہی فضل ہے۔

تَنْزِيْلَ الْعَزِيْزِ الرَّحِيْمِ ۙ لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اُنْذِرَ اٰبَآؤُهُمْ فَهُمْ غٰفِلُوْنَ ۝ (۳۶: ۵-۶)

(یہ قرآن) عزیز و رحیم کی طرف سے نازل کیا گیا ہے، تاکہ اُن لوگوں کو، جن کے آباؤ اجداد (کسی پیغمبر کی زبانی) متنبہ نہیں کیے گئے ہیں اور اس لیے غفلت میں پڑے ہوئے ہیں، تم متنبہ کردو۔

تورات و انجیل اور قرآن کی نسبت جابجا تصریح کی کہ اِن کا نزول "رحمت" ہے:

وَمِنْ قَبْلِهٖ كِتٰبُ مُوْسٰٓى اِمَامًا وَّرَحْمَةً ؕ (۱۱: ۱۷)

اور اس سے پہلے (یعنی قرآن سے پہلے) موسیٰؑ کی کتاب (اُمت کے لیے) پیشوا اور رحمت!

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَشِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ ۙ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ۝ قُلْ

اے افرادِ نسلِ انسانی! یقیناً یہ تمہارے پروردگار کی طرف سے موعظت ہے جو تمہارے لیے آگئی ہے، اور اُن تمام بیماریوں کے لیے جو انسان کے دل کی بیماریاں ہیں، نسخۂ شفا ہے، اور رہنمائی اور رحمت ہے ایمان رکھنے والوں کے لیے (اے پیغمبر ان لوگوں

بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا ۭ هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ (۱۰: ۵۸)

سے، کہہ دو کہ یہ جو کچھ ہے اللہ کے فضل اور رحمت سے ہے۔ پس چاہیے کہ (اپنی فیضیابی پر) خوش ہو۔ یہ (اپنی برکتوں میں) اُن تمام چیزوں سے بہتر ہے جنہیں تم (زندگی کی کامرانیوں کے لیے) فراہم کرتے ہو!

هٰذَا بَصَآئِرُ لِلنَّاسِ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ (۴۵: ۲۰)

یہ (قرآن) لوگوں کے لیے واضح دلیلوں کی روشنی ہے، اور ہدایت و رحمت ہے یقین رکھنے والوں کے لیے!

اَوَلَمْ يَكْفِهِمْ اَنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ يُتْلٰى عَلَيْهِمْ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَرَحْمَةً وَّذِكْرٰى لِقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ (۲۹: ۵۰)

کیا اِن لوگوں کے لیے یہ نشانی کافی نہیں کہ ہم نے تم پر کتاب نازل کی ہے جو انہیں (راہنمائی) جا رہی ہے؟ جو لوگ یقین رکھنے والے ہیں، بلاشبہ اُن کے لیے اس نشانی میں سر تا سر رحمت اور فہم و بصیرت ہے۔

چنانچہ اسی بنا پر اُس نے داعیِ اسلام کے ظہور کو بھی فیضانِ رحمت سے تعبیر کیا ہے:

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ (۲۱: ۱۰۷)

(اے پیغمبر!) ہم نے تمہیں نہیں بھیجا ہے، مگر اس لیے کہ تمام جہان کے لیے ہماری رحمت کا ظہور ہے!

انسانی اعمال کے معنوی قوانین پر "رحمت" سے استدلال اور "بقاءِ انفع"

اِسی طرح وہ "رحمت" کے مادّی مظاہر سے انسانی اعمال کے معنوی قوانین پر بھی استدلال کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے جس "رحمت" کا مقتضا یہ ہوا کہ دنیا میں "بقاءِ انفع" کا قانون نافذ ہے، یعنی وہی چیز باقی رہتی ہے جو نافع ہوتی ہے، کیونکر ممکن تھا کہ وہ انسانی اعمال کی طرف سے غافل ہو جاتی، اور نافع اور غیر نافع اعمال میں امتیاز نہ کرتی؟ پس مادیات کی طرح معنویات میں بھی یہ قانون نافذ ہے، اور ٹھیک ٹھیک اُسی طرح اپنے احکام و نتائج رکھتا ہے، جس طرح مادیات میں تم دیکھ رہے ہو۔

حق اور باطل

اِس سلسلہ میں وہ دو لفظ استعمال کرتا ہے "حق" اور "باطل"۔ سورۂ رعد میں جہاں قانونِ "بقاءِ انفع" کا ذکر کیا ہے وہاں یہ بھی کہہ دیا ہے کہ اِس بیان سے مقصود "حق" اور "باطل" کی حقیقت واضح کرنی ہے:

كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْحَقَّ وَالْبَاطِلَ ۥ (۱۳: ۱۸) اس طرح اللہ "حق" اور "باطل" کی ایک مثال بیان کرتا ہے۔

ساتھ ہی مزید تصریح کر دی:

فَاَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَآءً ۚ وَاَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْاَرْضِ ۭ كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ ۭ لِلَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّهِمُ الْحُسْنٰى ۥ

پس (دیکھو) میل کچیل سے جو جھاگ اُٹھتا ہے، وہ رائگاں جاتا ہے، کیونکہ اس میں انسان کے لیے نفع نہ تھا، لیکن جس چیز میں انسان کے لیے نفع ہے، وہ زمین میں باقی رہ جاتی ہے۔ اسی طرح اللہ (اپنے قوانینِ عمل کی) مثالیں دیتا ہے۔ (سو) جن لوگوں نے اپنے پروردگار کا حکم قبول کیا، ان کے لیے خوبی و بہتری ہے اور جن

وَالَّذِیۡنَ لَمۡ یَسۡتَجِیۡبُوۡا لَہٗ لَوۡ اَنَّ لَہُمۡ مَّا فِی الۡاَرۡضِ جَمِیۡعًا وَّ مِثۡلَہٗ مَعَہٗ لَافۡتَدَوۡا بِہٖ ؕ اُولٰٓئِکَ لَہُمۡ سُوۡٓءُ الۡحِسَابِ ۙ (۱۸:۱۳)

لوگوں نے قبول نہ کیا، اُن کے لیے (اپنے اعمالِ بد کا) سختی کے ساتھ حساب دینا ہے، اور اگر ان لوگوں کے قبضے میں وہ سب کچھ ہو جو زمین میں ہے، اور اتنا ہی اُس پر اور بڑھا دیں، اور بدلا میں دے کر (نتائج عمل سے) بچنا چاہیں، جب بھی نہ بچ سکینگے!

عربی میں "حق" کا خاصہ ثبوت اور قیام ہے۔ یعنی جو بات ثابت ہو، اٹل ہو، امِٹ ہو، اُسے حق کہینگے۔ "باطل" ٹھیک ٹھیک اُس کا نقیض ہے۔ ایسی چیز جس میں ثبات و قیام نہ ہو۔ ٹل جانے والی، مِٹ جانے والی، باقی نہ رہنے والی۔ چنانچہ خود قرآن میں جابجا ہے۔ لِیُحِقَّ الۡحَقَّ وَیُبۡطِلَ الۡبَاطِلَ (۸:۸)

قانونِ "قضاء بالحق" وہ کہتا ہے، جس طرح تم مادّیات میں دیکھتے ہو کہ فطرت چھانٹتی رہتی ہے۔ جو چیز نافع ہوتی ہے، باقی رکھتی ہے، جو نافع نہیں ہوتی، اُسے محو کر دیتی ہے، ٹھیک ٹھیک ایسا ہی عمل معنویات میں بھی جاری ہے۔ جو عمل حق ہوگا، قائم اور ثابت رہیگا، جو باطل ہوگا، مِٹ جائیگا، اور جب کبھی حق اور باطل متقابل ہونگے، تو بقاء حق کے لیے ہوگی، نہ کہ باطل کے لیے۔ وہ اسے "قضاء بالحق" سے تعبیر کرتا ہے۔ یعنی فطرت کا فیصلۂ حق، جو باطل کے لیے نہیں ہو سکتا:

فَاِذَا جَآءَ اَمۡرُ اللّٰہِ قُضِیَ بِالۡحَقِّ وَ خَسِرَ ہُنَالِکَ الۡمُبۡطِلُوۡنَ ﴿۷۸:۴۰﴾

پھر جب وہ وقت آگیا کہ حکمِ الٰہی صادر ہو، تو (خدا کا) فیصلۂ حق نافذ ہوگیا، اور اُس وقت اُن لوگوں کے لیے جو برسرِ باطل تھے، تباہی ہوئی!

اُس نے اِس حقیقت کی تعبیر کے لیے "حق" اور "باطل" کا لفظ اختیار کر کے مجرد تعبیر ہی سے حقیقت کی نوعیت واضح کر دی۔ کیونکہ حق اُسی چیز کو کہتے ہیں جو ثابت و قائم ہو، اور باطل کے معنی ہی یہ ہیں کہ مٹ جانا، قائم و باقی نہ رہنا۔ پس جب وہ کسی بات کے لیے کہتا ہے کہ یہ "حق" ہے، تو یہ صرف دعویٰ ہی نہیں ہوتا، بلکہ دعوے کے ساتھ اُس کے جانچنے کا ایک معیار بھی پیش کر دیتا ہے۔ یہ بات حق ہے۔ یعنی نہ ٹلنے والی، نہ مٹنے والی بات ہے۔ یہ بات باطل ہے۔ یعنی نہ ٹِک سکنے والی، مٹ جانے والی بات ہے۔ پس جو بات اٹل ہوگی، اُس کا اٹل ہونا کسی نگاہ سے پوشیدہ نہیں رہ سکتا۔ جو بات مٹ جانے والی ہے، اُس کا مِٹنا ہر آنکھ دیکھ لیگی!

اللہ کی صفت بھی "الحق" ہے چنانچہ وہ اللہ کی نسبت بھی "الحق" کی صفت استعمال کرتا ہے۔ کیونکہ اُس کی ہستی سے بڑھ کر اور کونسی حقیقت ہے جو ثابت اور اٹل ہو سکتی ہے؟

فَذٰلِکُمُ اللّٰہُ رَبُّکُمُ الۡحَقُّ ۚ (۳۲:۱۰) پس یہ ہے تمہارا پروردگار "الحق"!

فَتَعٰلَی اللّٰہُ الۡمَلِکُ الۡحَقُّ ۚ (۱۱۳:۲۰) پس کیا ہی بلند درجہ ہے اللہ کا، الملک (یعنی فرمانروا) الحق (یعنی ثابت)

وحی و تنزیل بھی "الحق" ہے وحی و تنزیل کو بھی وہ "الحق" کہتا ہے، کیونکہ وہ دنیا کی ایک قائم و ثابت حقیقت ہے۔ جن قوتوں نے

اُسے مٹانا چاہا تھا، وہ خود مٹ گئیں، حتیٰ کہ آج اُن کا نام و نشان بھی باقی نہیں، لیکن وحی و تنزیل کی حقیقت ہمیشہ قائم رہی، اور آج تک قائم ہے:

قُلْ يَٰٓأَيُّهَا ٱلنَّاسُ قَدْ جَآءَكُمُ ٱلْحَقُّ مِن رَّبِّكُمْ ۖ فَمَنِ ٱهْتَدَىٰ فَإِنَّمَا يَهْتَدِى لِنَفْسِهِۦ ۖ وَمَن ضَلَّ فَإِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا ۖ وَمَآ أَنَا۠ عَلَيْكُم بِوَكِيلٍ ۝ وَٱتَّبِعْ مَا يُوحَىٰٓ إِلَيْكَ وَٱصْبِرْ حَتَّىٰ يَحْكُمَ ٱللَّهُ ۚ وَهُوَ خَيْرُ ٱلْحَٰكِمِينَ ۝ (۱۰: ۱۰۸-۱۰۹)

(اے پیغمبر! لوگوں سے) کہہ دو کہ اے افرادِ نسلِ انسانی! بلاشبہ تمہارے پروردگار کی طرف سے وہ چیز تمہارے لیے آگئی جو حق ہے پس اب جس کسی نے سیدھی راہ اختیار کی تو یہ راست روی اُسی کی بھلائی کے لیے ہے، اور جس نے گمراہی اختیار کی، تو اُس کی گمراہی کا نقصان بھی اُسی کے لیے ہے، اور میرا کام تو صرف راہِ حق دکھلا دینا ہے (میں تم پر نگہبان مقرر نہیں کیا گیا ہوں کہ تم کو پکڑ کے زبردستی راہ پر لگا دوں) اور (اے پیغمبر!) جو کچھ تم پر وحی کی گئی ہے، اُس کے مطابق چلو، اور صبر کرو۔ یہاں تک کہ اللہ فیصلہ کر دے، اور وہ فیصلہ کرنے والوں میں بہتر فیصلہ کرنے والا ہے!

وَبِٱلْحَقِّ أَنزَلْنَٰهُ وَبِٱلْحَقِّ نَزَلَ ۗ (۱۷: ۱۰۵)

اور (اے پیغمبر!) ہماری طرف سے اُس کا (یعنی قرآن کا) نازل ہونا حق ہے اور وہ حق ہی کے ساتھ نازل بھی ہوا ہے۔

قرآن کی اصطلاح میں "الحق" اسی طرح جب وہ علامتِ تعریف کے ساتھ کسی بات کو "الحق" کہتا ہے تو اس سے بھی مقصود یہی حقیقت ہوتی ہے، اور اسی لیے وہ اکثر حالتوں میں صرف "الحق" کہہ کر خاموش ہو جاتا ہے۔ اس سے زیادہ کچھ کہنا ضروری نہیں سمجھتا۔ کیونکہ اگر فطرتِ کائنات کا یہ قانون ہے کہ وہ حق و باطل کے نزاع میں "حق" ہی کو باقی رکھتی ہے، تو کسی بات کے امرِ حق ہونے کے لیے صرف اتنا ہی کہہ دینا کافی ہے کہ وہ "حق" ہے یعنی باقی و قائم رہنے والی حقیقت ہے۔ اُس کا بقا و قیام خود ہی اپنی حقیقت کا اعلان کر دے گا۔

نزاعِ حق و باطل یہ جو قرآن جابجا حق اور باطل کی نزاع کا ذکر کرتا ہے، اور پھر بطور اصل اور قاعدہ کے اس پر زور دیتا ہے کہ کامیابی حق کے لیے ہے اور ہزیمت و خسران باطل کے لیے، تو یہ تمام مقامات بھی اُسی قانون "قضاء بالحق" کی تصریحات ہیں، اور اسی حقیقت کی روشنی میں اُن کا مطالعہ کرنا چاہیے:

بَلْ نَقْذِفُ بِٱلْحَقِّ عَلَى ٱلْبَٰطِلِ فَيَدْمَغُهُۥ فَإِذَا هُوَ زَاهِقٌ ۚ (۲۱: ۱۸)

اور ہمارا قانون یہ ہے کہ حق باطل سے ٹکراتا ہے اور اُسے پاش پاش کر دیتا ہے، اور اچانک ایسا ہوتا ہے کہ وہ نابود ہو گیا!

وَقُلْ جَآءَ ٱلْحَقُّ وَزَهَقَ ٱلْبَٰطِلُ ۚ إِنَّ ٱلْبَٰطِلَ كَانَ زَهُوقًا ۝ (۱۷: ۸۱)

اور کہہ دو حق نمودار ہو گیا اور باطل نابود ہوا، اور یقیناً باطل نابود ہی ہونے والا تھا!

اللہ کی شہادت اور پھر حق و صداقت کے لیے یہی اللہ کی وہ شہادت ہے جو اپنے مقررہ وقت پر ظاہر ہوتی ہے اور بتا دیتی ہے کہ حق کس کے ساتھ تھا۔ اور باطل کا کون پرستار تھا۔ یعنی "قضاء بالحق" کا قانون حق کو ثابت و قائم

رکھ کر اور اس کے حریف کو محو و متلاشی کر کے حقیقتِ حال کا اعلان کر دیتا ہے:

قُلْ كَفٰى بِاللّٰهِ بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ شَهِيْدًا ۚ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۗ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْبَاطِلِ وَكَفَرُوْا بِاللّٰهِ ۙ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ۝ (۵۲:۲۹)	ان لوگوں سے کہہ دو، اب کسی اور رد و کد کی ضرورت نہیں۔ میرے اور تمہارے درمیان اللہ کی گواہی بس کرتی ہے۔ آسمان و زمین میں جو کچھ ہے، سب اس کے علم میں ہے۔ پس جو لوگ حق کی جگہ باطل پر ایمان لائے ہیں اور اللہ کی صداقت کے منکر ہیں، تو یقیناً وہی ہیں جو تباہ ہونے والے ہیں!

ایک دوسرے موقع پر فیصلۂ امر کے لیے اسے سب سے بڑی شہادت قرار دیا ہے:

قُلْ اَيُّ شَيْءٍ اَكْبَرُ شَهَادَةً ۖ قُلِ اللّٰهُ ۖ شَهِيْدٌۢ بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ ۚ (۱۹:۶)	کون سی بات سب سے بڑی گواہی ہے؟ (اے پیغمبر!) کہہ دو اللہ کی گواہی، وہی میرے اور تمہارے درمیان (فیصلۂ امر کے لیے) گواہی دینے والا ہے!

قضاء بالحق مادیات اور معنویات کا عالمگیر قانون ہے

وہ کہتا ہے، اس قانون سے تم کیونکر انکار کر سکتے ہو، جبکہ زمین و آسمان کا تمام کارخانہ اسی کی کارفرمائیوں پر قائم ہے؟ اگر فطرتِ کائنات نقصان اور برائی چھانٹتی نہ رہتی، اور بقاء و قیام صرف اچھائی اور خوبی ہی کے لیے نہ ہوتا، تو ظاہر ہے، تمام کارخانۂ ہستی درہم برہم ہو جاتا۔ جب تم جسمانیات میں اس قانونِ فطرت کا مشاہدہ کر رہے ہو، تو معنویات میں تمہیں کیوں انکار ہو؟

وَلَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ اَهْوَآءَهُمْ لَفَسَدَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ ۚ (۷۱:۲۳)	اور اگر حق ان کی خواہشوں کی پیروی کرے، تو یقین کرو، یہ آسمان و زمین اور جو کوئی اس میں ہے، سب درہم برہم ہو کر رہ جائے!

انتظار اور تربص

قرآن میں جہاں کہیں انتظار اور تربص پر زور دیا ہے، اور کہا ہے، جلدی نہ کرو، انتظار کرو، عنقریب حق و باطل کا فیصلہ ہو جائیگا۔ مثلاً قُلْ فَانْتَظِرُوْٓا اِنِّيْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِيْنَ ۝ (۱۰۲:۱۰) تو اس سے بھی مقصود یہی حقیقت ہے۔

"قضاء بالحق" اور تدریج و امہال

لیکن کیا "قضاء بالحق" کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہر باطل عمل فوراً نابود ہو جائے، اور ہر عملِ حق فوراً فتحمند ہو جائے؟ قرآن کہتا ہے کہ نہیں، ایسا نہیں ہو سکتا، اور "رحمت" کا مقتضا یہی ہے کہ ایسا نہ ہو۔ جس "رحمت" کا مقتضا یہ ہوا کہ مادیات میں "تدریج و امہال" کا قانون نافذ ہے، اسی رحمت کا مقتضا یہ ہوا کہ معنویات میں بھی تدریج و امہال کا قانون کام کر رہا ہے، اور عالم مادیات ہو یا معنویات، کائناتِ ہستی کے ہر گوشہ میں قانونِ فطرت ایک ہی ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو ممکن نہ تھا کہ دنیا میں کوئی انسانی جماعت اپنی بدعملیوں کے ساتھ مہلتِ حیات پا سکتی:

وَلَوْ يُعَجِّلُ اللّٰهُ لِلنَّاسِ الشَّرَّ اسْتِعْجَالَهُمْ بِالْخَيْرِ لَقُضِيَ	اور جس طرح انسان فائدے کے لیے جلد باز ہوتا ہے، اگر اسی طرح اللہ انسان کو سزا دینے میں جلد باز ہوتا، تو انسان کی لغزشوں، خطاؤں کا یہ حال ہے کہ کبھی کا فیصلہ ہو چکتا

اِلَيۡهِمۡ اَجَلُهُمۡ (۱۰ : ۱۲) اور اُن کا مقررہ وقت فوراً نمودار ہو جاتا:

"تاجیل" وہ کہتا ہے، جس طرح مادیات میں ہر حالت بہ تدریج نشوونما پاتی ہے، اور ہر نتیجہ کے ظہور کے لیے ایک خاص مقدار، ایک خاص مدت، اور ایک خاص وقت مقرر کر دیا گیا ہے، ٹھیک اُسی طرح اعمال کے نتائج کے لیے بھی مقدار و اوقات کے احکام مقرر ہیں۔ اور ضروری ہے کہ ہر نتیجہ ایک خاص مدت کے بعد اور ایک خاص مقدار کی نشوونما کے بعد ظہور میں آئے:

مثلاً فطرت کا یہ قانون ہے کہ اگر پانی آگ پر رکھا جائیگا، تو وہ گرم ہو کر کھولنے لگیگا، لیکن پانی کے گرم ہونے اور بالآخر کھولنے کے لیے حرارت کی ایک خاص مقدار ضروری ہے، اور اُس کے ظہور و تکمیل کے لیے ضروری ہے کہ ایک مقررہ وقت تک انتظار کیا جائے۔ ایسا نہیں ہو سکتا کہ تم پانی چولھے پر رکھو اور فوراً کھولنے لگے۔ وہ یقیناً کھولنے لگیگا، لیکن اُس وقت، جب حرارت کی مقررہ مقدار بہ تدریج تکمیل تک پہنچ جائیگی۔ ٹھیک اِسی طرح یہاں انسانی اعمال کے نتائج بھی اپنے مقررہ اوقات ہی میں ظہور پزیر ہوتے ہیں، اور ضروری ہے کہ جب تک اعمال کے اثرات ایک خاص مقررہ مقدار تک نہ پہنچ جائیں، نتائج کے ظہور کا انتظار کیا جائے:

اس صورتِ حال سے تدریج و امہال کی حالت پیدا ہو گئی، اور عملِ حق اور عملِ باطل، دونوں کے نتائج کے ظہور کے لیے "تاجیل" یعنی ایک معین وقت کا ٹھہراؤ ضروری ہو گیا۔ دونوں کے نتائج فوراً ظاہر نہیں ہو جائینگے اپنی مقررہ "اجل" یعنی مقررہ وقت ہی پر ظاہر ہونگے۔ البتہ حق کے لیے تاجیل اِس لیے ہوتی ہے تاکہ اُس کی فتحمند قوت نشوونما پائے، اور باطل کے لیے اس لیے ہوتی ہے، تاکہ اُس کی فنا پزیر کمزوری تکمیل تک پہنچ جائے۔ اس تاجیل کے لیے کوئی ایک ہی مقررہ مدت نہیں ہے۔ ہر حالت کا ایک خاصہ ہے، اور ہر گرد و پیش اپنا ایک خاص مقتضا رکھتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ایک خاص حالت کے لیے مقررہ مدت کی مقدار بہت تھوڑی ہو، اور ہو سکتا ہے کہ بہت زیادہ ہو:

فَاِنۡ تَوَلَّوۡا فَقُلۡ اٰذَنۡتُكُمۡ عَلٰى سَوَآءٍ ؕ وَاِنۡ اَدۡرِىۡۤ اَقَرِيۡبٌ اَمۡ بَعِيۡدٌ مَّا تُوۡعَدُوۡنَ ۞ اِنَّهٗ يَعۡلَمُ الۡجَهۡرَ مِنَ الۡقَوۡلِ وَيَعۡلَمُ مَا تَكۡتُمُوۡنَ ۞ وَاِنۡ اَدۡرِىۡ لَعَلَّهٗ فِتۡنَةٌ لَّكُمۡ وَمَتَاعٌ اِلٰى حِيۡنٍ ۞ (۲۱ : ۱۰۹)	پھر اگر یہ لوگ روگردانی کریں تو ان سے کہہ دو، میں نے تم سب کو یکساں طور پر (حقیقتِ حال کی) خبر دے دی، اور میں نہیں جانتا اعمال بد کے جس نتیجہ کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے، اُس کا وقت قریب ہے یا ابھی دیر ہے۔ جو کچھ علانیہ زبان سے کہا جاتا ہے، اور جو کچھ تم پوشیدہ رکھتے ہو، خدا کو سب کچھ معلوم ہے، اور مجھے کیا معلوم، ہو سکتا ہے، یہ تاخیر اس لیے ہو تاکہ تمہاری آزمائش کی جائے یا اس لیے کہ ایک خاص وقت تک تمہیں فائدہ اُٹھانے کا (مزید) موقع دیا جائے:

قوانینِ فطرت کا معیارِ اوقات قرآن کہتا ہے، تم اپنی اوقات شماری کے پیمانے سے قوانینِ فطرت کی رفتارِ عمل کا اندازہ

نہ لگاؤ۔ فطرت کا دائرۂ عمل تو اتنا وسیع ہے کہ تمہارے معیارِ حساب کی بڑی سے بڑی مدت اُس کے لیے ایک دِن کی مدت سے زیادہ نہیں:

وَيَسْتَعْجِلُونَكَ بِالْعَذَابِ وَلَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ وَعْدَهٗ ؕ وَاِنَّ يَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَاَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ ۝ وَكَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَمْلَيْتُ لَهَا وَهِيَ ظَالِمَةٌ ثُمَّ اَخَذْتُهَا ۚ وَاِلَيَّ الْمَصِيْرُ ۝

(۲۲: ۴۷-۸)

اور یہ لوگ عذاب کے لیے جلد بازی کر رہے ہیں (یعنی انکار و شرارت کی راہ سے کہتے ہیں، اگر سچ مچ کو عذاب آنے والا ہے تو وہ کہاں ہے؟) سو یقین کرو، خدا اپنے وعدہ میں کبھی خلاف کرنے والا نہیں، لیکن بات یہ ہے کہ تمہارے پروردگار کا ایک دن ایسا ہوتا ہے جیسا تمہارے حساب کا ہزار برس۔ چنانچہ کتنی ہی بستیاں ہیں جنہیں (عرصہ دراز تک) ڈھیل دی گئی حالانکہ وہ ظالم تھیں، پھر (جب ظہورِ نتائج کا وقت آگیا تو) ہمارا مواخذہ نمودار ہو گیا۔ اور ظاہر ہے سب کو لوٹ کر ہماری طرف آنا ہے۔

استعجال بالعذاب ان آیات میں فکرِ انسانی کی جس گمراہی کو "استعجال بالعذاب" سے تعبیر کیا گیا ہے، وہ صرف اُنہی منکرینِ حق کی گمراہی نہ تھی جو ظہورِ اسلام کے وقت اُس کی مخالفت پر کمربستہ ہو گئے تھے بلکہ ہر زمانہ میں انسان کی ایک عالمگیر کج اندیشی رہی ہے۔ وہ بسا اوقات فطرت کی اس مہلت بخشی سے فائدہ اُٹھانے کی جگہ شر و فساد میں اور زیادہ نڈر اور جری ہو جاتا ہے، اور کہتا ہے، اگر فی الحقیقت حق و باطل کے لیے اُن کے نتائج و عواقب ہیں، تو وہ نتائج کہاں ہیں؟ اور کیوں فوراً ظاہر نہیں ہو جاتے؟ قرآن جا بجا منکرینِ حق کا یہ خیال نقل کرتا ہے، اور کہتا ہے، اگر کائناتِ ہستی میں اس حقیقتِ اعلیٰ کا ظہور نہ ہوتا جسے "رحمت" کہتے ہیں، تو یقیناً یہ نتائج یکایک اور بہ یک دفعہ ظاہر ہو جاتے، اور انسان اپنی بدعملیوں کے ساتھ کبھی زندگی کا سانس نہ لے سکتا، لیکن یہاں سارے قانونوں اور حکموں سے بھی بالاتر "رحمت" کا قانون ہے، اور اس کا مقتضیٰ یہی ہے کہ حق کی طرح باطل کو بھی زندگی و معیشت کی مہلتیں دے، اور توبہ و رجوع اور عفو و درگزر کا دروازہ ہر حال میں باز رکھے۔ فطرتِ کائنات میں اگر یہ "رحمت" نہ ہوتی، تو یقیناً وہ جزاءِ عمل میں جلد باز ہوتی، لیکن اُس میں رحمت ہے، اس لیے نہ تو اُس کی مہلت بخشیوں کی کوئی حد ہے، نہ اُس کے عفو و درگزر کے لیے کوئی کنارہ!

وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝ قُلْ عَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنَ رَدِفَ لَكُمْ بَعْضُ الَّذِيْ تَسْتَعْجِلُوْنَ ۝ وَاِنَّ رَبَّكَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَشْكُرُوْنَ ۝

(۲۷: ۷۱-۷۳)

اور (اے پیغمبر! یہ (حقیقت فراموش) کہتے ہیں، اگر تم (نتائجِ ظلم و طغیان سے ڈرانے میں) سچے ہو تو وہ بات کب ہونے والی ہے؟ (اور کیوں نہیں ہو چکتی؟) ان سے کہہ دو (گھبراؤ نہیں) جس بات کے لیے تم جلدی مچا رہے ہو عجب نہیں اس کا ایک حصہ بالکل قریب آگیا ہو، اور (اے پیغمبر!) تمہارا پروردگار انسان کے لیے بڑا ہی فضل رکھنے والا ہے (کہ ہر حال میں اصلاح و تلافی کی مہلت دیتا ہے) لیکن (افسوس انسان کی غفلت پر) بیشتر ایسے ہیں کہ اُس کے فضل و رحمت سے فائدہ اُٹھانے کی جگہ اُس کی ناشکری کرتے ہیں!

وَيَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالْعَذَابِ وَلَوْلَآ اَجَلٌ مُّسَمًّى لَّجَآءَهُمُ الْعَذَابُ وَلَيَاْتِيَنَّهُمْ بَغْتَةً وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ۝ (۲۹: ۵۳)

اور یہ لوگ عذاب کے لیے جلدی کرتے ہیں (یعنی انکار و شرارت کی راہ سے کہتے ہیں اگر واقعی عذاب آنے والا ہے تو کیوں نہیں آچکتا؟) اور واقعہ یہ ہے کہ اگر ایک خاص وقت نہ ٹھہرا دیا گیا ہوتا تو کب کا عذاب آچکا ہوتا، اور (یقین رکھو جب وہ آئیگا تو اس طرح آئیگا کہ) یکایک اُن پر آگریگا اور اُنہیں اس کا وہم و گمان بھی نہ ہوگا!

وَمَا نُؤَخِّرُهٗٓ اِلَّا لِاَجَلٍ مَّعْدُوْدٍ ۝ (۱۱: ۱۰۴)

اور (یاد رکھو) اگر ہم اس معاملہ میں تاخیر کرتے ہیں تو صرف اس لیے کہ ایک حساب کی ہوئی مدت کے لیے اسے تاخیر میں ڈال دیں۔

العاقبة للمتقين

وہ کہتا ہے یہاں زندگی و عمل کی مہلتیں سب کے لیے ہیں، کیونکہ "رحمت" کا مقتضا یہی تھا پس اس بات سے دھوکا نہیں کھانا چاہیے، اور یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ نتائجِ اعمال کے قوانین موجود نہیں۔ دیکھنا یہ چاہیے کہ نتیجہ کی کامیابی کس کے حصے میں آتی ہے، اور آخرِ کار کون برومند ہوتا ہے:

قُلْ يٰقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ اِنِّىْ عَامِلٌ ۚ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۙ مَنْ تَكُوْنُ لَهٗ عَاقِبَةُ الدَّارِ ۭ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ ۝ (۶: ۱۳۵)

(اے پیغمبر! تم ان لوگوں سے) کہہ دو کہ دیکھو، (اب میرے اور تمہارے معاملہ کا فیصلہ اللہ کے ہاتھ ہے) تم جو کچھ کر رہے ہو، اپنی جگہ کیے جاؤ اور میں بھی اپنی جگہ کام میں لگا ہوں۔ عنقریب معلوم ہو جائیگا کہ کون ہے جس کے لیے آخرکار (کامیاب) ٹھکانا ہے۔ بلا شبہ (یہ اُس کا قانون ہے کہ) ظلم کرنے والے کبھی فلاح نہیں پا سکتے۔

قرآن کی وہ تمام آیات جن میں ظلم و کفر کے لیے فلاح و کامیابی کی نفی کی گئی ہے

اس موقع پر یہ قاعدہ بھی معلوم کر لینا چاہیے کہ قرآن نے جہاں کہیں ظلم و فساد اور فسق و کفر وغیرہ اعمالِ بد کے لیے کامیابی و فلاح کی نفی کی ہے، اور نیک عملی کے لیے فتحمندی و کامرانی کا اثبات کیا ہے، ان تمام مقامات میں بھی اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے۔ مثلاً اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ (۶: ۲۱) اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الْمُجْرِمُوْنَ (۱۰: ۱۷) اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الْكٰفِرُوْنَ (۲۳: ۱۱۸) لَا يُصْلِحُ عَمَلَ الْمُفْسِدِيْنَ (۱۰: ۸۱) اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ (۹: ۳۸) اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ (۳: ۸۶) وغیرہا۔ اللہ ظلم کرنے والوں کو فلاح نہیں دیتا۔ یعنی اُس کا قانون ہے کہ ظلم کے لیے کامیابی و فلاح نہیں ہوتی۔ اللہ ظلم کرنے والوں کو فلاح نہیں دیتا۔ یعنی اُس کا قانون یہی ہے کہ ظلم کرنے والوں پر کامیابی و سعادت کی راہ نہیں کھلتی۔ یہ مطلب نہیں ہے کہ اللہ ارشاد و ہدایت کا دروازہ اُن پر بند کر دیتا ہے۔ اور وہ گمراہی و کوری کی زندگی پر مجبور کر دیے جاتے ہیں۔ افسوس ہے کہ قرآن کے مفسروں نے اِن مقامات کا ترجمہ غور و فکر کے ساتھ نہیں کیا، اس لیے مطالب اپنی اصلی شکل میں واضح نہ ہو سکے۔

"تمتع"

اور پھر اصطلاحِ قرآنی میں یہی وہ "تمتع" ہے یعنی زندگی سے فائدہ اُٹھانے کی مہلت جس کا وہ بار بار ذکر کرتا ہے، اور جو یکساں طور پر سب کو دی گئی ہے:

بَلْ مَتَّعْنَا هٰٓؤُلَآءِ وَاٰبَآءَهُمْ حَتّٰى طَالَ عَلَيْهِمُ الْعُمُرُ (۲۱: ۴۵) بلکہ بات یہ ہے کہ ہم نے ان لوگوں کو اور اُن کے آباؤ اجداد کو مہلتِ حیات سے بہرہ مند ہونے کے موقعے دیے، یہاں تک کہ (خوشحالی کی) اُن پر بڑی بڑی عمریں گزر گئیں۔

اِسی طرح وہ جا بجا مَتَّعْنَاهُمْ اِلٰى حِيْنٍ (۱۰: ۹۸) مَتَاعًا اِلٰى حِيْنٍ (۳۶: ۴۴) فَتَمَتَّعُوْا فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ (۱۶: ۵۵) وغیرہ تعبیرات سے بھی اسی حقیقت پر زور دیتا ہے۔

"قضاء بالحق" اور اقوام وجماعات

اِسی طرح وہ قانونِ قضاء بالحق کو جماعتوں اور قوموں کے عروج و زوال پر بھی منطبق کرتا ہے، اور کہتا ہے، جس طرح فطرت کا قانونِ انتخاب، افراد و اجسام میں جاری ہے، اسی طرح اقوام و جماعات میں بھی جاری ہے۔ جس طرح فطرت، نافع اشیا کو باقی رکھتی، غیر نافع کو چھانٹ دیتی ہے، ٹھیک اسی طرح جماعتوں میں بھی صرف اُسی جماعت کے لیے بقا ہوتی ہے، جس میں دنیا کے لیے نفع ہو۔ جو جماعت غیر نافع ہو جاتی ہے، قدم چھانٹ دی جاتی ہے۔ وہ کہتا ہے، یہ اُس کی "رحمت" ہے۔ کیونکہ اگر ایسا نہ ہوتا تو دنیا میں انسانی ظلم و طغیان کے لیے کوئی روک تھام نظر نہ آتی:

وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ (۲: ۲۵۲) اور (دیکھو) اگر اللہ (نے جماعتوں اور قوموں میں باہم دگر تزاحم پیدا نہ کر دیا ہوتا اور وہ) بعض آدمیوں کے ذریعے بعض آدمیوں کو راہ سے ہٹاتا نہ رہتا تو یقیناً زمین میں خرابی پھیل جاتی۔ لیکن اللہ کائنات کے لیے فضل و رحمت رکھنے والا ہے۔

ایک دوسرے موقع پر یہی حقیقت اِن لفظوں میں بیان کی گئی ہے:

وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْرًا ؕ وَلَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِيٌّ عَزِيْزٌ (۲۲: ۴۰) اور اگر ایسا نہ ہوتا کہ اللہ بعض جماعتوں کے ذریعے بعض جماعتوں کو ہٹاتا رہتا، تو یقین کرو دنیا میں انسان کے ظلم و فساد کے لیے کوئی روک باقی نہ رہتی (اور) یہ تمام خانقاہیں، گرجے، عبادتگاہیں، اور مسجدیں، جن میں اس کثرت سے اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے، منہدم ہو کر رہ جاتیں۔

"قضاء بالحق" کے اجتماعی نفاذ میں بھی تدریج و امہال اور تاجیل ہے

لیکن وہ کہتا ہے، جس طرح فطرتِ کائنات کے تمام کاموں میں تدریج و امہال کا قانون کام کر رہا ہے، اسی طرح قوموں اور جماعتوں کے معاملہ میں بھی وہ جو کچھ کرتی ہے، بہ تدریج کرتی ہے، اور اصلاحِ حال اور رجوع و انابت کا دروازہ آخر وقت تک کھلا رکھتی ہے۔ کیونکہ "رحمت" کا مقتضا یہی ہے:

وَقَطَّعْنٰهُمْ فِى الْاَرْضِ اُمَمًا ۚ مِنْهُمُ الصّٰلِحُوْنَ وَمِنْهُمْ دُوْنَ ذٰلِكَ ؗ وَبَلَوْنٰهُمْ بِالْحَسَنٰتِ وَالسَّيِّاٰتِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ (۷: ۱۶۸) اور ہم نے ایسا کیا کہ اُن کے لیے الگ الگ گروہ زمین میں پھیل گئے۔ اُن میں سے بعض تو نیک عمل تھے، بعض دوسری طرح کے۔ پھر ہم نے انہیں اچھائیوں اور برائیوں دونوں طرح کی حالتوں سے آزمایا تاکہ نافرمانی سے باز آجائیں۔

جس طرح اجسام کے ہر تغیر کے لیے فطرت نے اسباب و علل کی ایک خاص مقدار اور مدت مقرر کر دی ہے اسی

طرح اقوام کے زوال و ہلاکت کے لیے بھی موجباتِ ہلاکت کی ایک خاص مقدار اور مدت مقرر ہے، اور یہ اُن کی "اجل" ہے جب تک یہ اجل نہیں آچکتی، قانونِ الٰہی یکے بعد دیگرے تنبّہ و اعتبار کی مہلتیں دیتا رہتا ہے:

أَوَلَا يَرَوْنَ أَنَّهُمْ يُفْتَنُونَ فِي كُلِّ عَامٍ مَّرَّةً أَوْ مَرَّتَيْنِ ثُمَّ لَا يَتُوبُونَ وَلَا هُمْ يَذَّكَّرُونَ ○ (۹: ۱۲۶)

کیا یہ لوگ نہیں دیکھتے کہ اُن پر کوئی برس ایسا نہیں گزرتا کہ ہم انہیں ایک مرتبہ یا دو مرتبہ آزمائشوں میں نہ ڈالتے ہوں (یعنی اُن کے اعمالِ بد کے نتائج پیش نہ آتے ہوں) پھر بھی نہ تو توبہ کرتے ہیں، نہ حالات سے نصیحت پکڑتے ہیں!

لیکن اگر تنبّہ و اعتبار کی یہ تمام مہلتیں رائگاں گئیں اور اُن سے فائدہ نہ اُٹھایا گیا، تو پھر فیصلۂ امر کا آخری وقت نمودار ہو جاتا ہے، اور جب وہ وقت آجائے، تو پھر یہ فطرت کا آخری، اٹل، اور بے پناہ فیصلہ ہے نہ تو اس میں ایک لمحہ کے لیے تاخیر ہو سکتی ہے۔ نہ یہ اپنے مقررہ وقت سے ایک لمحہ پہلے آسکتا ہے:

وَلِكُلِّ أُمَّةٍ أَجَلٌ فَإِذَا جَاءَ أَجَلُهُمْ لَا يَسْتَأْخِرُونَ سَاعَةً وَلَا يَسْتَقْدِمُونَ ○ (۷: ۳۴)

اور (دیکھو) ہر اُمت کے لیے ایک مقررہ وقت ہے، سو جب ان کا مقررہ وقت آچکتا ہے، تو اُس سے نہ تو ایک گھڑی پیچھے رہ سکتے ہیں، نہ ایک گھڑی آگے بڑھ سکتے ہیں۔

وَمَا أَهْلَكْنَا مِن قَرْيَةٍ إِلَّا وَلَهَا كِتَابٌ مَّعْلُومٌ ○ مَّا تَسْبِقُ مِنْ أُمَّةٍ أَجَلَهَا وَمَا يَسْتَأْخِرُونَ ○ (۱۵: ۴-۵)

اور ہم نے کسی بستی کو ہلاک نہیں کیا، مگر یہ کہ (ہمارے ٹھہرائے ہوئے قانون کے مطابق) ایک مقررہ میعاد اُس کے لیے موجود تھی۔ کوئی اُمت نہ تو اپنے مقررہ وقت سے آگے بڑھ سکتی ہے، نہ پیچھے رہ سکتی ہے:

اِس طرح "بقاء انفع" اور "قضاء بالحق" کا قانون پچھلی قوم کو چھانٹ دیتا ہے، اور اُس کی جگہ ایک دوسری قوم لاکھڑی کرتا ہے، اور یہ سب کچھ اس لیے ہوتا ہے کہ "رحمت" کا مقتضا یہی ہے:

ذَٰلِكَ أَن لَّمْ يَكُن رَّبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرَىٰ بِظُلْمٍ وَأَهْلُهَا غَافِلُونَ ○ وَلِكُلٍّ دَرَجَاتٌ مِّمَّا عَمِلُوا ۚ وَمَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا يَعْمَلُونَ ○ وَرَبُّكَ الْغَنِيُّ ذُو الرَّحْمَةِ ۚ إِن يَشَأْ يُذْهِبْكُمْ وَيَسْتَخْلِفْ مِن بَعْدِكُم مَّا يَشَاءُ كَمَا أَنشَأَكُم مِّن ذُرِّيَّةِ قَوْمٍ آخَرِينَ ○ (۶: ۱۳۱-۱۳۳)

یہ (تبلیغ و ہدایت کا تمام سلسلہ) اس لیے ہے کہ تمہارے پروردگار کا یہ شیوہ نہیں کہ بستیوں کو ظلم و ستم سے ہلاک کر ڈالے۔ اور اُن کے بسنے والے حقیقتِ حال سے بے خبر ہوں (اُس کا قانون تو یہ ہے کہ) جیسا کچھ جس کا عمل ہے اُسی کے مطابق اس کا ایک درجہ ہے، (اور اسی درجہ کے مطابق اچھے بُرے نتائج ظاہر ہوتے ہیں) اور یاد رکھو، جیسے کچھ لوگوں کے اعمال ہیں، تمہارا پروردگار اُن سے بے خبر نہیں ہے، تمہارا پروردگار رحمت والا، بے نیاز ہے۔ اگر وہ چاہے تو تمہیں راہ سے ہٹا دے، اور تمہارے بعد جسے چاہے، تمہارا جانشین بنا دے، اُسی طرح جس طرح ایک دوسری قوم کی نسل سے تمہیں اُٹھا کر جانشین بنا دیا ہے

انفرادی زندگی اور مجازاتِ دنیوی

اسی طرح وہ کہتا ہے، یہ بات کہ ا[illegible]ی زندگی کے اعمال کی جزاء دنیوی زندگی سے

تعلق نہیں رکھتی۔ آخرت پر اُٹھا رکھی گئی ہے، اور دُنیا میں نیک و بد، سب کے لیے یکساں طور پر مُہلتِ حیات اور فیضانِ معیشت ہے، اسی حقیقت کا نتیجہ ہے کہ یہاں "رحمت" کی کارفرمائی ہے۔ "رحمت" کا مقتضا یہی تھا کہ اُس کے فیضان و بخشش میں کسی طرح کا امتیاز نہ ہو، اور مہلتِ حیات سب کو پوری طرح ملے۔ اُس نے انسان کی انفرادی زندگی کے دو حصّے کر دیے۔ ایک حصّہ دنیوی زندگی کا ہے، اور سر تا سر مہلت ہے۔ دوسرا حصّہ مرنے کے بعد کا ہے، اور جزاء کا معاملہ اُسی سے تعلق رکھتا ہے:

وَرَبُّكَ الْغَفُوْرُ ذُو الرَّحْمَةِ ۖ لَوْ يُؤَاخِذُهُمْ بِمَا كَسَبُوْا لَعَجَّلَ لَهُمُ الْعَذَابَ ۚ بَلْ لَّهُمْ مَّوْعِدٌ لَّنْ يَّجِدُوْا مِنْ دُوْنِهٖ مَوْئِلًا (۱۸:۵۸)	اور (اے پیغمبر! یقین کرو) تمہارا پروردگار بڑا بخشنے والا صاحبِ رحمت ہے۔ اگر وہ ان لوگوں سے اُن کے اعمال کے مطابق مواخذہ کرتا، تو فوراً عذاب نازل ہو جاتا۔ لیکن اُن کے لیے ایک میعاد مقرر کر دی گئی ہے، اور جب وہ نمودار ہوگی تو اُس سے بچنے کے لیے کوئی پناہ کی جگہ اُنہیں نہیں ملیگی۔
هُوَ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ طِيْنٍ ثُمَّ قَضٰٓى اَجَلًا ۖ وَاَجَلٌ مُّسَمًّى عِنْدَهٗ (۶:۲)	وہی ہے جس نے تمہیں مٹّی سے پیدا کیا، پھر تمہاری زندگی کے لیے ایک وقت ٹھہرا دیا، اور اسی طرح اُس کے پاس ایک اور بھی ٹھہرائی ہوئی میعاد ہے (یعنی قیامت کا دن)

معنوی قوانین کی مہلت بخشی اور توبہ و انابت

وہ کہتا ہے: جس طرح عالمِ اجسام میں تم دیکھتے ہو کہ فطرت نے ہر کمزوری و فساد کے لیے ایک لازمی نتیجہ ٹھہرا دیا ہے، لیکن پھر بھی اصلاحِ حال کا دروازہ بند نہیں کرتی، اور مُہلتوں پر مُہلتیں دیتی رہتی ہے۔ نیز اگر بروقت اصلاح ظہور میں آجائے تو اُسے قبول کر لیتی ہے۔ ٹھیک ٹھیک اُسی طرح یہاں بھی توبہ و انابت کا دروازہ کُھلا رکھا ہے۔ کوئی بدعملی، کوئی گناہ، کوئی جرم، کوئی فساد ہو، اور نوعیت میں کتنا ہی سخت اور مقدار میں کتنا ہی عظیم ہو، لیکن جونہی توبہ و انابت کا احساس انسان کے اندر جنبش میں آتا ہے، رحمتِ الٰہی قبولیت کا دروازہ معاً کھول دیتی ہے، اور اشکِ ندامت کا ایک قطرہ، بدعملیوں، گناہوں کے بے شمار داغ دھبّے اس طرح دھو دیتا ہے، گویا اُس کے دامنِ عمل پر کوئی دھبّہ لگا ہی نہ تھا! التائب من الذنب کمن لاذنب لہ:

اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا فَاُولٰٓئِكَ يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا (۲۵:۷۰)	ہاں مگر جس کسی نے توبہ کی، ایمان لایا، اور آئندہ کے لیے نیک عملی اختیار کی، تو یہ لوگ ہیں جن کی برائیوں کو اللہ اچھائیوں سے بدل دیتا ہے، اور اللہ بڑا بخشنے والا، بڑا رحم کرنے والا ہے!

رحمتِ الٰہی اور مغفرت و بخشش کی وسعت و فراوانی!

اس بارے میں قرآن نے رحمتِ الٰہی کی وسعت اور اُس کی مغفرت و بخشش کی فراوانی کا جو نقشہ کھینچا ہے، اُس کی کوئی حد و انتہا نہیں ہے۔ کتنے ہی گناہ ہوں، کتنے ہی سخت گناہ ہوں، کتنی ہی مدت کے گناہ ہوں، لیکن ہر اُس انسان کے لیے جو اُس کے دروازۂ رحمت پر دستک دے، رحمت د

قبولیت کے سوا کوئی صدا نہیں ہو سکتی!

قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا ۭ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ۝ (۳۹:۵۴)

اے میرے بندو! جنہوں نے (بدعملیاں کرکے) اپنی جانوں پر زیادتی کی ہے، تمہاری بدعملیاں کتنی ہی سخت اور کتنی ہی زیادہ کیوں نہ ہوں، مگر اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو۔ یقیناً اللہ تمہارے تمام گناہ بخش دیگا۔ یقیناً وہ بڑا بخشنے والا، بڑی ہی رحمت رکھنے والا ہے!

اِسلامی عقائد کا دینی تصوّر اور "رحمت"

اور پھر یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں، قرآن نے انسان کے لیے دینی عقائد و اعمال کا جو تصور قائم کیا ہے، اُس کی بنیاد بھی تمام تر رحمت و محبت ہی پر رکھی ہے، کیونکہ وہ انسان کی روحانی زندگی کو کائناتِ فطرت کے عالمگیر کارخانہ سے کوئی الگ اور غیر متعلق چیز قرار نہیں دیتا۔ بلکہ اُسی کا ایک مربوط گوشہ قرار دیتا ہے۔ اور اس لیے کہتا ہے، جس کارسازِ فطرت نے تمام کارخانہ ہستی کی بنیاد "رحمت" پر رکھی ہے، ضروری تھا کہ اِس گوشہ میں بھی اُس کے تمام احکام سرتاسر "رحمت" کی تصویر ہوں!

خدا اور اس کے بندوں کا رشتہ محبت کا رشتہ ہے

چنانچہ قرآن نے جابجا یہ حقیقت واضح کی ہے کہ خدا اور اُس کے بندوں کا رشتہ محبت کا رشتہ ہے، اور سچی عبودیت اسی کی عبودیت ہے، جس کے لیے معبود، صرف معبود ہی نہ ہو بلکہ محبوب بھی ہو:

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ ۭ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ۭ (۲:۱۶۵)

اور (دیکھو) انسانوں میں سے کچھ انسان ایسے ہیں جو دوسری ہستیوں کو اللہ کا ہم پلہ بنا لیتے ہیں۔ وہ انہیں اس طرح چاہنے لگتے ہیں، جس طرح اللہ کو چاہنا ہوتا ہے۔ حالانکہ جو لوگ ایمان رکھنے والے ہیں، اُن کی زیادہ سے زیادہ محبت صرف اللہ ہی کے لیے ہوتی ہے۔

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ (۳:۳۱)

اے پیغمبر! ان لوگوں سے) کہہ دو، اگر واقعی تم اللہ سے محبت رکھنے والے ہو، تو چاہیے کہ میری پیروی کرو (میں تمہیں محبتِ الٰہی کی حقیقی راہ دکھا رہا ہوں) اگر تم نے ایسا کیا تو (صرف یہی نہیں ہوگا کہ تم اللہ سے محبت کرنے والے ہو جاؤ گے بلکہ خود) اللہ تم سے محبت کرنے لگیگا اور تمہارے گناہ بخش دیگا۔ اور اللہ بخشنے والا رحمت والا ہے!

وہ جابجا اس حقیقت پر زور دیتا ہے کہ ایمان باللہ کا نتیجہ اللہ کی محبت اور محبوبیت ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَنْ يَّرْتَدَّ

اے پیروانِ دعوتِ ایمانی! اگر تم میں سے کوئی شخص اپنے دین کی راہ سے پھر جائیگا

مِنكُمْ عَنْ دِينِهٖ فَسَوْفَ يَأْتِي اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُّحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗٓ (۵:۵۹)	تو (وہ یہ نہ سمجھے کہ دعوتِ حق کو اس سے کچھ نقصان پہنچیگا) عنقریب اللہ ایک گروہ ایسے لوگوں کا پیدا کر دیگا جنہیں اللہ کی محبت حاصل ہوگی اور وہ اللہ کو محبوب رکھنے والے ہونگے۔

جو خدا سے محبت کرنا چاہتا ہے اُسے چاہیے اُس کے بندوں سے محبت کرے

لیکن بندے کے لیے خدا کی محبت کی عملی راہ کیا ہے؟ وہ کہتا ہے، خدا کی محبت کی راہ اُس کے بندوں کی محبت میں سے ہو کر گزری ہے۔ جو انسان چاہتا ہے خدا اُسے محبت کرے، اُسے چاہیے کہ خدا کے بندوں سے محبت کرنا سیکھے:

وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ (۲:۱۷۷)	اور جو اپنا مال اللہ کی محبت میں نکالتے اور خرچ کرتے ہیں!
وَيُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّيَتِيْمًا وَّاَسِيْرًا ۝ اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا ۝ (۷۶:۸-۹)	اور اللہ کی محبت میں وہ مسکینوں، یتیموں، قیدیوں کو کھلاتے ہیں، (اور کہتے ہیں) ہمارا یہ کھلانا، اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ محض اللہ کے لیے ہے، ہم تم سے نہ تو کوئی بدلہ چاہتے ہیں نہ کسی طرح کی شکر گزاری!

ایک حدیثِ قدسی میں یہی حقیقت نہایت مؤثر پیرایے میں واضح کی گئی ہے:۔

یاابن آدم، مرضت فلم تعدنی۔ قال کیف اعودك وانت رب العلمین: قال اما علمت ان عبدی فلانا مرض فلم تعده؟ اما علمت انك لو عدته لوجدتنی عنده؟ یاابن آدم، استطعمتك فلم تطعمنی؛ قال یارب کیف اطعمك وانت رب العلمین؟ قال اما علمت انه استطعمك عبدی فلان فلم تطعمه اما علمت انك لو اطعمته لوجدت ذلك عندی؟ یاابن آدم، استسقیتك فلم تسقنی قال کیف اسقیتك وانت رب العلمین! قال استسقاك عبدی فلان فلم تسقه اما انك لو سقیته لوجدت ذلك عندی؟ (مسلم عن ابی ہریرۃ)	(قیامت کے دن ایسا ہوگا کہ خدا ایک انسان سے کہیگا) اے ابنِ آدم! میں بیمار ہو گیا تھا مگر تو نے میری بیمار پرسی نہ کی۔ بندہ متعجب ہو کر کہیگا، بھلا ایسا کیونکر ہو سکتا ہے اور تو تو رب العالمین ہے۔ خدا فرمائیگا کیا تجھے معلوم نہیں کہ میرا فلاں بندہ تیرے قریب بیمار ہو گیا تھا، اور تو نے اُس کی خبر نہیں لی تھی۔ اگر تو اُس کی بیمار پرسی کے لیے جاتا تو مجھے اُس کے پاس پاتا۔ اسی طرح خدا فرمائیگا اے ابنِ آدم! میں نے تجھ سے کھانا مانگا تھا، مگر تو نے نہیں کھلایا۔ بندہ عرض کریگا بھلا ایسا کیسے ہو سکتا ہے کہ تجھے کسی بات کی احتیاج ہو؟ خدا فرمائیگا، کیا تجھے یاد نہیں کہ میرے فلاں بھوکے بندے نے تجھ سے کھانا مانگا تھا اور تو نے انکار کر دیا تھا، اگر تو اُسے کھلاتا تو تو اُسے میرے پاس پاتا! ایسے ہی خدا فرمائیگا، اے ابنِ آدم! میں نے تجھ سے پانی مانگا، مگر تو نے مجھے پانی نہ پلایا۔ بندہ عرض کریگا بھلا ایسا کیسے ہو سکتا ہے کہ تجھے پیاس لگے تو تو خود پروردگار ہے! خدا فرمائیگا میرے فلاں پیاسے بندے نے تجھ سے پانی مانگا لیکن تو نے اُسے پانی نہ پلایا، اگر تو اُسے پانی پلا دیتا تو اُسے میرے پاس پاتا!

اعمال و عبادات اور اخلاق و خصائل

اسی طرح قرآن نے اعمال و عبادات کی جو شکل و نوعیت قرار دی ہے، اخلاق و خصائل میں سے جن جن باتوں پر زور دیا ہے، اوامر و نواہی میں جو جو اصول و مبادی ملحوظ رکھے ہیں، ان سب میں بھی یہی حقیقت کام کر رہی ہے۔ اور یہ چیز اس درجہ واضح و معلوم ہے کہ بحث و بیان کی ضرورت نہیں۔

قرآن سر تا سر رحمت الٰہی کا پیام ہے

اور پھر یہی وجہ ہے کہ قرآن نے خدا کی کسی صفت کو بھی اس کثرت کے ساتھ نہیں دہرایا ہے، اور نہ کوئی مطلب اس درجہ اُس کے صفحات میں نمایاں ہے، جس قدر رحمت ہے۔ اگر قرآن کے وہ تمام مقامات جمع کیے جائیں جہاں "رحمت" کا ذکر کیا گیا ہے، تو تین سو سے زیادہ مقامات ہونگے، اور اگر وہ تمام مقامات بھی شامل کر لیے جائیں، جہاں اگرچہ لفظ رحمت استعمال نہیں ہوا ہے، لیکن ان کا تعلق رحمت ہی سے ہے۔ مثلاً ربوبیت، مغفرت، رأفت، کرم، حلم، عفو، وغیرہا، تو پھر یہ تعداد اس حد تک پہنچ جاتی ہے کہ کہا جا سکتا ہے، قرآن اول سے لے کر آخر تک، اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ رحمتِ الٰہی کا پیام ہے!

بعض احادیثِ باب

ہم اس موقع پر وہ تمام تصریحات قصداً چھوڑ رہے ہیں، جن کا ذخیرہ احادیث میں موجود ہے، کیونکہ یہ مقام زیادہ تفصیل و بحث کا متحمل نہیں۔ پیغمبر اسلام (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اپنے قول و عمل سے اسلام کی جو حقیقت ہمیں بتلائی ہے وہ تمام تر یہی ہے کہ خدا کی موحدانہ پرستش اور اُس کے بندوں پر شفقت و رحمت۔ ایک مشہور حدیث، جو ہر مسلمان واعظ کی زبان پر ہے، ہمیں بتلاتی ہے کہ انما یرحم اللہ من عبادہ الرحماء[1]۔ خدا کی رحمت انہی بندوں کے لیے ہے، جو اس کے بندوں کے لیے رحمت رکھتے ہیں! حضرت مسیح (علیہ السلام) کا مشہور کلمۂ وعظ "زمین پر رحم کرو، تا کہ وہ، جو آسمان پر ہے، تم پر رحم کرے" بجنسہٖ پیغمبر اسلام (صلی اللہ علیہ وسلم) کی زبان پر بھی طاری ہوا ہے۔ الرحمٰن تبارك وتعالیٰ۔ ارحموا من فی الارض، یرحمکم من فی السماء[2]! اتنا ہی نہیں، بلکہ اسلام نے انسانی رحمت و شفقت کی جو ذہنیت پیدا کرنی چاہی ہے، وہ اس قدر وسیع ہے کہ بے زبان جانور بھی اس سے باہر نہیں ہیں۔ ایک سے زیادہ حدیثیں اس مضمون کی موجود ہیں کہ اللہ کی رحمت رحم کرنے والوں کے لیے ہے۔ اگرچہ یہ رحم ایک چڑیا ہی کے لیے کیوں نہ ہو۔ من رحم، ولو ذبیحة عصفور، رحمہ اللہ یوم القیٰمة[3]!

مقام انسانیت اور صفاتِ الٰہی سے تخلق و تشبہ

اصل یہ ہے کہ قرآن نے خدا پرستی کی بنیاد ہی اس جذبہ پر رکھی ہے کہ انسان خدا کی صفتوں کا پرتَو اپنے اندر پیدا کرے۔ وہ انسان کے وجود کو ایک ایسی سرحد قرار دیتا ہے جہاں حیوانیت کا درجہ ختم ہوتا اور ایک ما فوقِ حیوانیت درجہ شروع ہو جاتا ہے۔ وہ کہتا ہے، انسان کا جوہرِ انسانیت جو اُسے

---

[1] طبرانی و ابن جریر بسند صحیح ۱۲ [2] امام احمد نے مسند میں، ترمذی اور ابو داؤد نے صحیح میں، اور حاکم نے مستدرک میں ابن عمرو رض سے روایت کی ہے۔ و رویناہ سلسلاً من طریق الشیخ محمود شکری الالوسی العراقی، وایضاً عن والدی المرحوم عن الشیخ صدر الدین الدہلوی من طریق الشیخ احمد ولی اللہ رحمہم اللہ ۱۲ [3] رواہ البخاری فی الادب المفرد والطبرانی عن ابی امامة وصححه السیوطی فی الجامع الصغیر۔

حیوانات کی سطح سے بلند و ممتاز کرتا ہے، اس کے سوا کچھ نہیں کہ صفاتِ الٰہی کا پرتو ہے، اور اس لیے انسانیت کی تکمیل یہ ہے کہ اُس میں زیادہ سے زیادہ صفاتِ الٰہی سے تخلّق و تشبّہ پیدا ہو جائے۔ یہی وجہ ہے کہ اُس نے جہاں کہیں بھی انسان کی خاص صفات کا ذکر کیا ہے، اُنہیں براہِ راست خُدا کی طرف نسبت دی ہے حتّٰی کہ جوہرِ انسانیت کو خُدا کی رُوح پھونک دینے سے تعبیر کیا: ثُمَّ سَوّٰىهُ وَنَفَخَ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ (۳۲: ۸) یعنی خدا نے آدم میں اپنی روح میں سے کچھ پھونک دیا اور اسی کا نتیجہ یہ نکلا کہ اُس کے اندر عقل و حواس کا چراغ روشن ہو گیا:

در ازل پرتوِ حُسنت ز تجلی دم زد
عشق پیدا شد و آتش بہ ہمہ عالم زد!

پس اگر وہ خدا کی رحمت کا تصوّر ہم میں پیدا کرنا چاہتا ہے، تو یہ اس لیے ہے کہ وہ چاہتا ہے، ہم بھی سرتاپا رحمت و محبت ہو جائیں۔ اگر وہ اُس کی ربوبیت کا مرقع بار بار ہماری نگاہوں کے سامنے لاتا ہے، تو یہ اس لیے ہے کہ وہ چاہتا ہے، ہم بھی اپنے چہرۂ اخلاق میں ربوبیت کے سارے خال و خط پیدا کر لیں۔ اگر وہ اُس کی رافت و شفقت کا ذکر کرتا ہے، اُس کے لطف و کرم کا جلوہ دکھاتا ہے، اُس کے جود و احسان کا نقشہ کھینچتا ہے، تو اسی لیے، کہ وہ چاہتا ہے، ہم میں بھی اِن الٰہی صفتوں کا جلوہ نمودار ہو جائے۔ وہ بار بار ہمیں سُناتا ہے کہ خدا کی بخشش و درگزر کی کوئی انتہا نہیں، اور اس طرح ہمیں یاد دلاتا ہے کہ ہم میں بھی اُس کے بندوں کے لیے بخشش و درگزر کا غیر محدود جوش پیدا ہو جانا چاہیے۔ اگر ہم اُس کے بندوں کی خطائیں بخش نہیں سکتے، تو ہمیں کیا حق ہے کہ اپنی خطاؤں کے لیے اُس کی بخشائشوں کا انتظار کریں؟

احکام و شرائع جہاں تک احکام و شرائع کا تعلق ہے، بلا شبہ اُس نے یہ نہیں کہا کہ دشمنوں کو پیار کرو، کیونکہ ایسا کہنا حقیقت نہ ہوتی۔ مجاز ہوتا لیکن اُس نے کہا کہ دشمنوں کو بھی بخش دو، اور جو دشمن کو بخش دینا سیکھ لیگا، اس کا دل خود بخود انسانی بغض و نفرت کی آلودگیوں سے پاک ہو جائیگا:

اَلْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ ۭ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ (۳: ۱۳۴)

غصّہ ضبط کرنے والے، اور انسانوں کے قصور بخش دینے والے، اور اللہ کی محبت انہی کے لیے ہے جو احسان کرنے والے ہیں!

وَالَّذِيْنَ صَبَرُوا ابْتِغَاۗءَ وَجْهِ رَبِّهِمْ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً وَّيَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ اُولٰۗىِٕكَ لَهُمْ عُقْبَى الدَّارِ (۱۳: ۲۲)

اور جن لوگوں نے اللہ کی محبت میں (تلخی و ناگواری) برداشت کر لی، نماز قائم کی، خدا کی دی ہوئی روزی پوشیدہ و علانیہ (اُس کے بندوں کے لیے) خرچ کی، اور بُرائی کا جواب بُرائی سے نہیں، نیکی سے دیا، تو (یقین کرو) یہی لوگ ہیں جن کے لیے آخرت کا بہتر ٹھکانا ہے۔

وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ إِنَّ ذٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْأُمُورِ ٥ (۴۲:۴۳)

اور (دیکھو) جو کوئی بُرائی پر صبر کرے اور بخش دے، تو یقیناً یہ بڑی ہی اولوالعزمی کی بات ہے:

وَلَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ۚ ادْفَعْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ فَإِذَا الَّذِي بَيْنَكَ وَبَيْنَهُ عَدَاوَةٌ كَأَنَّهُ وَلِيٌّ حَمِيمٌ ۝ وَمَا يُلَقَّاهَا إِلَّا الَّذِينَ صَبَرُوا وَمَا يُلَقَّاهَا إِلَّا ذُو حَظٍّ عَظِيمٍ ۝ (۴۱: ۳۴-۳۵)

اور (دیکھو) نیکی اور بدی برابر نہیں ہو سکتی (اگر کوئی برائی کرے تو) بُرائی کا جواب ایسے طریقے سے دو جو اچھا طریقہ ہو۔ اگر تم نے ایسا کیا تو تم دیکھو گے کہ جس شخص سے تمہاری عداوت تھی، یکایک تمہارا دلی دوست ہو گیا ہے، البتہ یہ ایسا مقام ہے جو اسی کو مل سکتا ہے جو (بدسلوکی سہہ لینے کی) برداشت رکھتا ہو، اور جسے (نیکی و سعادت کا) حصّہ وافر ملا ہو۔

بلاشبہ اُس نے بدلہ لینے سے بالکل روک نہیں دیا، اور وہ کیونکر روک سکتا تھا جبکہ طبیعت حیوانی کا یہ فطری خاصہ ہے اور حفاظتِ نفس اس پر موقوف ہے، لیکن جہاں کہیں بھی اُس نے اس کی اجازت دی ہے، ساتھ ہی عفو و بخشش اور بدی کے بدلے نیکی کرنے کی مؤثر ترغیب بھی دے دی ہے، اور ایسی مؤثر ترغیب دی ہے کہ ممکن نہیں ایک خدا پرست انسان اُس سے متاثر نہ ہو:

وَإِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوا بِمِثْلِ مَا عُوقِبْتُمْ بِهِ ۖ وَلَئِنْ صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ لِلصَّابِرِينَ ۝ (۱۶: ۱۲۶)

اور (دیکھو) اگر تم بدلہ لو، تو چاہیے، جتنی اور جیسی کچھ بُرائی تمہارے ساتھ کی گئی ہے اسی کے مطابق ٹھیک ٹھیک بدلہ بھی لیا جائے (یہ نہ ہو کہ زیادتی کر بیٹھو)، لیکن اگر تم برداشت کر جاؤ اور بدلہ نہ لو تو (یاد رکھو) برداشت کرنے والوں کے لیے، برداشت کر جانا ہی بہتری ہے!

وَجَزَاءُ سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِثْلُهَا ۖ فَمَنْ عَفَا وَأَصْلَحَ فَأَجْرُهُ عَلَى اللَّهِ (۴۲: ۴۰)

اور بُرائی کے لیے ویسا ہی اور اُتنا ہی بدلہ ہے جیسی اور جتنی بُرائی کی گئی ہے، لیکن جس کسی نے درگزر کیا، اور معاملہ کو بگاڑنے کی جگہ سنوار لیا، تو اُس کا اجر اللہ پر ہے۔

انجیل اور قرآن

ہم نے قرآن کی آیاتِ عفو و بخشش نقل کرتے ہوئے ابھی کہا ہے کہ اُس نے یہ نہیں کہا کہ دشمنوں کو پیار کرو کیونکہ ایسا کہنا حقیقت نہ ہوتی۔ مجاز ہوتا۔" ضروری ہے کہ اس کی مختصر تشریح کر دی جائے۔

حضرت مسیح (علیہ السلام) نے یہودیوں کی ظاہر پرستیوں اور اخلاقی محرومیوں کی جگہ، رحم و محبت اور عفو و بخشش کی اخلاقی قربانیوں پر زور دیا تھا، اور اُن کی دعوت کی اصلی رُوح یہی ہے، چنانچہ ہم انجیل کے مواعظ میں جا بجا اس طرح کے خطابات پاتے ہیں۔ "تم نے سُنا ہو گا کہ اگلوں سے کہا گیا، دانت کے بدلے دانت اور آنکھ کے بدلے آنکھ، لیکن میں کہتا ہوں کہ شریر کا مقابلہ نہ کرنا"۔ یا "اپنے ہمسایوں ہی کو نہیں بلکہ دشمنوں کو بھی پیار کرو"۔ یا مثلاً "اگر کوئی تمہارے ایک گال پر طمانچہ مارے تو چاہیے، دوسرا گال بھی آگے کر دو"۔ سوال یہ ہے کہ ان خطابات کی نوعیت

کیا تھی؟ یہ اخلاقی فضائل و ایثار کا ایک مؤثر پیرایۂ بیان تھا، یا تشریع یعنی قوانین وضع کرنا تھا؟

دعوت مسیحؑ اور دنیا کی حقیقت فراموشی

افسوس ہے کہ انجیل کے معتقدوں اور نکتہ چینوں، دونوں نے یہاں ٹھوکر کھائی۔ دونوں اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے کہ یہ تشریع تھی، اور اس لیے دونوں کو تسلیم کر لینا پڑا کہ یہ ناقابلِ عمل احکام ہیں۔ معتقدوں نے خیال کیا کہ اگرچہ ان احکام پر عمل نہیں کیا جا سکتا، تاہم مسیحیت کے احکام یہی ہیں، اور عملی نقطۂ خیال سے اس قدر کافی ہے کہ اوائل عہد میں چند ولیوں اور شہیدوں نے اِن پر عمل کر لیا تھا۔ نکتہ چینوں نے کہا کہ یہ سرتاسر ایک نظری اور ناقابلِ عمل تعلیم ہے اور کہنے میں کتنی ہی خوشنما ہو لیکن عملی نقطۂ خیال سے اِس کی کوئی قدر و قیمت نہیں۔ یہ فطرتِ انسانی کے صریح خلاف ہے۔

فی الحقیقت نوعِ انسانی کی یہ بڑی ہی درد انگیز ناانصافی ہے جو تاریخِ انسانیت کے اس عظیم الشان معلم کے ساتھ جائز رکھی گئی۔ جس طرح بے درد نکتہ چینوں نے اُسے سمجھنے کی کوشش نہ کی، اُسی طرح نادان معتقدوں نے بھی فہم و بصیرت سے انکار کر دیا!

حضرت مسیحؑ کی تعلیم کو فطرتِ انسانی کے خلاف سمجھنا تفریق بین الرسل ہے

لیکن کیا کوئی انسان جو قرآن کی سچائی کا معترف ہو، ایسا خیال کر سکتا ہے کہ حضرت مسیح (علیہ السلام) کی تعلیم فطرت انسانی کے خلاف تھی اور اس لیے ناقابلِ عمل تھی؟ حقیقت یہ ہے کہ قرآن کی تصدیق کے ساتھ ایسا منکرانہ خیال جمع نہیں ہو سکتا۔ اگر ہم ایک لمحہ کے لیے بھی اسے تسلیم کر لیں تو اس کے معنی یہ ہونگے کہ ہم حضرت مسیحؑ کی تعلیم کی سچائی سے انکار کر دیں۔ کیونکہ جو تعلیم فطرتِ انسانی کے خلاف ہے، وہ کبھی انسان کے لیے سچی تعلیم نہیں ہو سکتی۔ لیکن ایسا اعتقاد نہ صرف قرآن کی تعلیم کے خلاف ہوگا، بلکہ اس کی دعوت کی اصلی بنیاد ہی متزلزل ہو جائیگی۔ اُس کی دعوت کی بنیادی اصل یہ ہے کہ وہ دنیا کے تمام رہنماؤں کی یکساں طور پر تصدیق کرتا، اور سب کو خدا کی ایک ہی سچائی کا پیامبر قرار دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے، پیروانِ مذہب کی سب سے بڑی گمراہی تفریق بین الرسل ہے۔ یعنی ایمان و تصدیق کے لحاظ سے خدا کے رسولوں میں تفریق کرنا کسی ایک کو ماننا، دوسروں کو جھٹلانا، یا سب کو ماننا، کسی ایک کا انکار کر دینا۔ اسی لیے اُس نے جا بجا اسلام کی راہ یہ بتلائی ہے کہ:

لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ۝

ہم خدا کے رسولوں میں سے کسی کو بھی دوسروں سے جدا نہیں کرتے (کہ کسی کو مانیں کسی کو نہ مانیں، ہم تو خدا کے آگے جھکے ہوئے ہیں (اُس کی سچائی کہیں بھی آئی ہو اور کسی کی زبانی آئی ہو، ہمارا اُس پر ایمان ہے) (۳: ۸۴)

علاوہ بریں خود قرآن نے حضرت مسیحؑ کی دعوت کا یہی پہلو جا بجا نمایاں کیا ہے کہ وہ رحمت و محبت کے پیامبر تھے، اور یہودیوں کی اخلاقی خشونت و قساوت کے مقابلہ میں مسیحی اخلاق کی رقّت و رافت کی بار بار مدح

کی ہے:

وَلِنَجْعَلَهٗٓ اٰيَةً لِّلنَّاسِ وَرَحْمَةً مِّنَّا ۚ وَكَانَ اَمْرًا مَّقْضِيًّا ۝ (۱۹: ۲۱)

اور تاکہ ہم اُس کو (یعنی مسیح کے ظہور کو) لوگوں کے لیے ایک الٰہی نشانی اور اپنی رحمت کا فیضان بنائیں، اور یہ بات (مشیت الٰہی میں) طے شدہ تھی۔

وَجَعَلْنَا فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ رَاْفَةً وَّرَحْمَةً ۭ (۵۷: ۲۷)

اور اُن لوگوں کے دلوں میں جنھوں نے (مسیح کی) پیروی کی، ہم نے شفقت اور رحمت ڈال دی۔

اس موقع پر یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ قرآن نے جس قدر اوصاف خود اپنی نسبت بیان کیے ہیں، پوری فراخ دلی کے ساتھ وہی اوصاف تورات و انجیل کے لیے بھی بیان کیے ہیں۔ مثلاً وہ جس طرح اپنے آپ کو ہدایت کرنے والا، روشنی رکھنے والا، نصیحت کرنے والا، قوموں کا امام، متقیوں کا راہنما، قرار دیتا ہے، ٹھیک اُسی طرح پچھلے صحیفوں کو بھی اِن تمام اوصاف سے متصف قرار دیتا ہے۔ چنانچہ انجیل کی نسبت ہم جا بجا پڑھتے ہیں: وَاٰتَيْنٰهُ الْاِنْجِيْلَ فِيْهِ هُدًى وَّنُوْرٌ ۙ وَّمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَهُدًى وَّمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝ (۵: ۴۶) یہ ظاہر ہے کہ جو تعلیم فطرتِ بشری کے خلاف اور ناقابلِ عمل ہو، وہ کبھی نور و ہدایت اور مَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ نہیں ہو سکتی۔

دعوتِ مسیحی کی حقیقت

اصل یہ ہے کہ حضرتِ مسیح (علیہ السلام) کی ان تمام تعلیمات کی وہ نوعیت ہی نہ تھی جو غلطی سے سمجھ لی گئی، اور دنیا میں ہمیشہ انسان کی سب سے بڑی گمراہی اُس کے انکار سے نہیں بلکہ کج اندیشانہ اعتراف ہی سے پیدا ہوئی ہے۔

حضرتِ مسیح کا ظہور ایک ایسے عہد میں ہوا تھا، جبکہ یہودیوں کا اخلاقی تنزل انتہائی حد تک پہنچ چکا تھا، اور دل کی نیکی اور اخلاق کی پاکیزگی کی جگہ محض ظاہری احکام و رسوم کی پرستش، دینداری و خداپرستی سمجھی جاتی تھی۔ یہودیوں کے علاوہ جس قدر متمدن قومیں قُرب و جوار میں موجود تھیں۔ مثلاً رومی، مصری، آشوری، وہ بھی انسانی رحم و محبت کی رُوح سے یکسر ناآشنا تھیں۔ لوگوں نے یہ بات تو معلوم کر لی تھی کہ مجرموں کو سزائیں دینی چاہییں، لیکن اس حقیقت سے بے بہرہ تھے کہ رحم و محبت اور عفو و بخشش کی چارہ سازیوں سے جرموں اور گناہوں کی پیدائش روک دینی چاہیے۔ انسانی قتل و ہلاکت کا تماشا دیکھنا، طرح طرح کے ہولناک طریقوں سے مجرموں کو ہلاک کرنا، زندہ انسانوں کو درندوں کے سامنے ڈال دینا، آباد شہروں کو بلاوجہ جلا کر خاکستر کر دینا، اپنی قوم کے علاوہ تمام انسانوں کو غلام سمجھنا اور غلام بنا کر رکھنا، رحم و محبت اور حلم و شفقت کی جگہ قلبی قساوت و بے رحمی پر فخر کرنا، رومی تمدن کا اخلاق اور مصری اور آشوری دیوتاؤں کا پسندیدہ طریقہ تھا!

ضرورت تھی کہ نوعِ انسانی کی ہدایت کے لیے ایک ایسی ہستی مبعوث ہو جو سرتاسر رحمت و محبت کا پیام

ہو، اور جو انسانی زندگی کے تمام گوشوں سے قطع نظر کرکے، صرف اُس کی قلبی و معنوی حالت کی اصلاح و تزکیہ پر اپنی تمام پیغمبرانہ ہمت مبذول کردے۔ چنانچہ حضرت مسیحؑ کی شخصیت میں وہ ہستی نمودار ہوگئی۔ اُس نے جسم کی جگہ روح پر، زبان کی جگہ دل پر، اور ظاہر کی جگہ باطن پر نوعِ انسانی کو توجہ دِلائی، اور انسانیتِ اعلیٰ کا فراموش شدہ سبق تازہ کردیا!

مواعظِ مسیحؑ کے مجازات کو تشریح و حقیقت سمجھ لینا سخت غلطی ہے

معمولی سے معمولی کلام بھی بشرطیکہ بلیغ ہو، اپنی بلاغت کے مجازات رکھتا ہے۔ قدرتی طور پر اس الہامی بلاغت کے بھی مجازات تھے جو اُس کی تاثیر کا زیور اور اُس کی دل نشینی کی خوبروئی ہیں، لیکن افسوس کہ وہ دنیا جو اقانیم ثلاثہ اور کفارہ جیسے دور از کار عقائد پیدا کرلینے والی تھی، اُن کے مواعظ کا مقصد و محل نہ سمجھ سکی، اور مجازات کو حقیقت سمجھ کر غلط فہمیوں کا شکار ہوگئی۔

اُنہوں نے جہاں کہیں یہ کہا ہے کہ "دشمنوں کو پیار کرو" تو یقیناً اُس کا یہ مطلب نہ تھا کہ ہر انسان کو چاہیے اپنے دشمنوں کا عاشقِ زار ہو جائے، بلکہ سیدھا سادہ مطلب یہ تھا کہ تم میں غیظ و غضب اور نفرت و انتقام کی جگہ رحم و محبت کا پرجوش جذبہ ہونا چاہیے، اور ایسا ہونا چاہیے کہ دوست تو دوست، دشمن تک کے ساتھ عفوُ و درگزر سے پیش آؤ۔ اس مطلب کے لیے کہ رحم کرو، بخش دو، انتقام کے پیچھے نہ پڑو، یہ ایک نہایت ہی بلیغ اور مؤثر پیرایۂ بیان ہے کہ "دشمنوں تک کو پیار کرو"۔ ایک ایسے گردوپیش میں جہاں اپنوں اور عزیزوں کے ساتھ بھی رحم و محبت کا برتاؤ نہ کیا جاتا ہو، یہ کہنا کہ اپنے دشمنوں سے بھی نفرت نہ کرو، رحم و محبت کی ضرورت کا ایک اعلیٰ اور کامل ترین تخیل پیدا کردیتا تھا:

شنیدم کہ مردانِ راہِ خدا — دلِ دشمناں ہم نہ کردند تنگ
ترا کے میسّر شود ایں مقام — کہ با دوستانت خلاف ست و جنگ

یا مثلاً اگر اُنہوں نے کہا "اگر کوئی تمہارے ایک گال پر طمانچہ مارے تو دوسرا گال بھی آگے کردو" تو یقیناً اِس کا مطلب یہ نہ تھا کہ سچ مچ کو تم اپنا گال آگے کردیا کرو، بلکہ صریح مطلب یہ تھا کہ انتقام کی جگہ عفوُ و درگزر کی راہ اختیار کرو۔ بلاغتِ کلام کے یہ وہ مجازات ہیں جو ہر زبان میں یکساں طور پر پائے جاتے ہیں، اور یہ ہمیشہ بڑی ہی جہالت کی بات سمجھی جاتی ہے کہ اُن کے مقصود و مفہوم کی جگہ اُن کے منطوق پر زور دیا جائے۔ اگر ہم اس طرح کے مجازات کو اُن کے ظواہر پر محمول کرنے لگیں گے، تو نہ صرف تمام الہامی تعلیمات ہی درہم برہم ہو جائینگی، بلکہ انسان کا وہ تمام کلام جو ادب و بلاغت کے ساتھ دنیا کی تمام زبانوں میں کہا گیا ہے، یک قلم مختل ہو جائیگا!

اعمالِ انسانی میں اصل رحم و محبت ہے، نہ کہ تعزیر و انتقام

باقی رہی یہ بات کہ حضرت مسیحؑ نے سزا کی جگہ محض رحم و درگزر ہی پر زور دیا، تو اُن کے مواعظ کی اصلی نوعیت سمجھ لینے کے بعد یہ بات بھی بالکل واضح ہو جاتی ہے۔ بلاشبہ شریعت نے

تعزیر وعقوبت کا حکم دیا تھا، لیکن اِس لیے نہیں کہ تعزیر وعقوبت فی نفسہ کوئی مُستحسن عمل ہے، بلکہ اس لیے کہ معیشتِ انسانی کی بعض ناگزیر حالتوں کے لیے یہ ایک ناگزیر علاج ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ ایک کم درجہ کی بُرائی تھی جو اس لیے گوارا کرلی گئی کہ بڑے درجے کی بُرائیاں روکی جا سکیں۔ لیکن دنیا نے اسے علاج کی جگہ ایک دل پسند مشغلہ بنالیا، اور رفتہ رفتہ انسان کی تعذیب و ہلاکت کا ایک خوفناک آلہ بن گئی۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ انسانی قتل وغارتگری کی کوئی ہولناکی ایسی نہیں ہے جو شریعت اور قانون کے نام سے نہ کی گئی ہو، اور جو فی الحقیقت اسی بدلہ لینے اور سزا دینے کے حکم کا ظالمانہ استعمال نہ ہو۔ اگر تاریخ سے پوچھا جائے کہ انسانی ہلاکت کی سب سے بڑی قوتیں، مبداءِ نہائے جنگ سے باہر، کون کون سی رہی ہیں؟ تو یقیناً اُس کی اُنگلیاں اُن عدالت گاہوں کی طرف اُٹھ جائینگی جو مذہب اور قانون کے ناموں سے قائم کی گئیں اور جنہوں نے ہمیشہ اپنے ہم جنسوں کی تعذیب و ہلاکت کا عمل اُس کی ساری دہشت انگیزیوں اور ہولناکیوں کے ساتھ جاری رکھا۔ پس اگر حضرتِ مسیحؑ نے تعزیر وعقوبت کی جگہ سرتاسر رحم و درگزر پر زور دیا، تو یہ اس لیے نہیں تھا کہ وہ نفسِ تعزیر و سزا کے خلاف کوئی نئی تشریع کرنی چاہتے تھے، بلکہ اُن کا مقصد یہ تھا کہ اُس ہولناک غلطی سے انسان کو نجات دلائیں جس میں تعزیر وعقوبت کے غُلو نے مُبتلا کر رکھا ہے۔ وہ دنیا کو بتلانا چاہتے تھے کہ اعمالِ انسانی میں اصل، رحم و محبت ہے۔ تعزیر و انتقام نہیں ہے، اور اگر تعزیر و سیاست جائز رکھی گئی ہے تو صرف اس لیے کہ بطور ایک ناگزیر علاج کے عمل میں لائی جائے۔ اس لیے نہیں کہ تمہارے دل رحم و محبت کی جگہ سرتاسر نفرت و انتقام کا آشیانہ بن جائیں!

شریعت موسوی کے پیروؤں نے شریعت کو صرف سزا دینے کا آلہ بنالیا تھا۔ حضرت مسیحؑ نے بتلایا کہ شریعت سزا دینے کے لیے نہیں بلکہ نجات کی راہ دکھلانے آتی ہے، اور نجات کی راہ سرتاسر رحمت و محبت کی راہ ہے!

"عمل" اور "عامل" میں امتیاز

دراصل اس بارے میں انسان کی بنیادی غلطی یہ رہی ہے کہ وہ "عمل" میں اور "عامل" میں امتیاز قائم نہیں رکھتا، حالانکہ جہاں تک مذہب کی تعلیم کا تعلق ہے، اس بات میں کہ ایک عمل کیسا ہے، اور اس میں کہ کرنے والا کیسا ہے، بہت بڑا فرق ہے، اور دونوں کا حکم ایک نہیں۔ بلاشبہ تمام مذاہب کا یہ عالمگیر مقصد رہا ہے کہ بدعملی اور گناہ کی طرف سے انسان کے دل میں نفرت پیدا کردیں، لیکن یہ انہوں نے کبھی گوارا نہیں کیا کہ خود انسان کی طرف سے انسان کے اندر نفرت پیدا ہو جائے۔ یقیناً اُنہوں نے اس بات پر زور دیا ہے کہ گناہ سے نفرت کرو، لیکن یہ کبھی نہیں کہا ہے کہ گنہگار سے نفرت کرو۔ اُس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک طبیب ہمیشہ

[1] شاید انسانی گمراہی کی بوالعجبیوں کی اس سے بہتر مثال نہیں مل سکتی کہ جس انجیل کی تعلیم کا یہ مطلب سمجھ لیا گیا تھا کہ وہ کسی حال میں بدلہ لینے اور سزا دینے کی اجازت نہیں دیتی، اُسی انجیل کے پیرؤں نے نوعِ انسانی کی تعذیب و ہلاکت کا عمل ایسی دہشت و بے رحمی کے ساتھ صدیوں تک جاری رکھا کہ آج ہم اُس کا تصور بھی بغیر دہشت و ہراس کے نہیں کرسکتے، اور پھر یہ جو کچھ کیا گیا، انجیل اور اُس کے مقدس معلم کے نام پر کیا گیا!

لوگوں کو بیماریوں سے ڈراتا رہتا ہے، اور بسا اوقات اُن کے مہلک نتائج کا ایسا ہولناک نقشہ کھینچ دیتا ہے کہ دیکھنے والے سہم کر رہ جاتے ہیں، لیکن یہ تو وہ کبھی نہیں کرتا کہ جو لوگ بیمار ہو جائیں اُن سے ڈرنے اور نفرت کرنے لگے، یا لوگوں سے کہے، ڈرو اور نفرت کرو؟ اتنا ہی نہیں، بلکہ اُس کی تو ساری توجہ اور شفقت کا مرکز بیمار ہی کا وجود ہوتا ہے۔ جو انسان جتنا زیادہ بیمار ہو گا، اُتنا ہی زیادہ اُس کی توجہ اور شفقت کا مستحق ہو جائیگا۔

مرض اور مریض: پس جس طرح جسم کا طبیب بیماریوں کے لیے نفرت لیکن بیمار کے لیے شفقت و ہمدردی کی تلقین کرتا ہے، ٹھیک اُسی طرح روح و دل کے طبیب بھی گناہوں کے لیے نفرت لیکن گنہگاروں کے لیے سرتاپا رحمت و شفقت کا پیام ہوتے ہیں۔ یقیناً وہ چاہتے ہیں کہ گناہوں سے (جو روح و دل کی بیماریاں ہیں) ہم میں دہشت و نفرت پیدا کر دیں، لیکن گناہوں سے پیدا کر دیں، گنہگار انسانوں سے نہیں، اور یہی وہ نازک مقام ہے جہاں ہمیشہ پیروانِ مذاہب نے ٹھوکر کھائی ہے۔ مذاہب نے چاہا تھا، اُنہیں بُرائی سے نفرت کرنا سکھلائیں۔ لیکن بُرائی سے نفرت کرنے کی جگہ اُنہوں نے اُن انسانوں سے نفرت کرنا سیکھ لیا جنہیں وہ اپنے خیال میں بُرائی کا مجرم تصوّر کرتے ہیں!

گناہوں سے نفرت کرو مگر گناہگاروں پر رحم کرو! حضرتِ مسیحؑ کی تعلیم سرتاسر اسی حقیقت کی دعوت تھی۔ گناہوں سے نفرت کرو مگر اُن انسانوں سے نفرت نہ کرو جو گناہوں میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ اگر ایک انسان گنہگار ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اُس کی روح و دل کی تندرستی باقی نہ رہی لیکن اگر اُس نے بدبختانہ اپنی تندرستی ضائع کر دی ہے تو تم اُس سے نفرت کیوں کرو؟ وہ تو اپنی تندرستی کھو کر اور زیادہ تمہارے رحم و شفقت کا مستحق ہو گیا ہے۔ تم اپنے بیمار بھائی کی تیمارداری کرو گے، یا اُسے جلّاد کے تازیانے کے حوالے کر دو گے؟ وہ موقع یاد کرو، جس کی تفصیل ہمیں سینٹ لوقا کی زبانی معلوم ہوئی ہے۔ جب ایک گناہگار عورت حضرت مسیحؑ کی خدمت میں آئی اور اُس نے اپنے بالوں کی لٹوں سے اُن کے پاؤں پونچھے، تو اُس پر ریاکار فریسیوں کو (اور اب فریسیت کے معنی ہی ریاکاری کے ہو گئے ہیں (Pharisaism) سخت تعجب ہوا، لیکن اُنہوں نے کہا، طبیب بیماروں کے لیے ہوتا ہے نہ کہ تندرستوں کے لیے۔ پھر خدا اور اُس کے گناہگار بندوں کا رشتۂ رحمت واضح کرنے کے لیے ایک نہایت ہی مؤثر اور دلنشین مثال بیان کی۔ فرض کرو، ایک ساہوکار کے دُو قرضدار تھے۔ ایک پچاسؔ روپیہ کا، ایک ہزار روپیہ کا۔ ساہوکار نے دونوں کا قرض معاف کر دیا۔ بتلاؤ، کس قرضدار پر اُس کا احسان زیادہ ہوا، اور کون اُس سے زیادہ محبت کریگا؟ وہ جسے پچاس معاف کر دیے، یا وہ جسے ہزار؟

نصیب ماست بہشت اے خداشناس برو   کہ مستحقِ کرامت گناہگارانند

یہی حقیقت ہے جس کی طرف بعض ائمۂ تابعین نے اشارہ کیا ہے: انکسار العاصیین احب الی اللہ من صولۃ المطیعین۔ خدا کو فرمانبردار بندوں کی تمکنت سے کہیں زیادہ گناہگار بندوں کا عجز و انکسار محبوب ہے!

گدایاں را ازیں معنی خبر نیست		کہ سلطانِ جہاں با ماست امروز

قرآن اور گناہگار بندوں کے لیے صدائے تشریف و رحمت!

اور پھر یہی حقیقت ہے کہ ہم قرآن میں دیکھتے ہیں، جہاں کہیں خدا نے گناہگار انسانوں کو مخاطب کیا ہے، یا اُن کا ذکر کیا ہے، تو عموماً یائے نسبت کے ساتھ کیا ہے جو تشریف و محبت پر دلالت کرتی ہے۔ قُلْ یٰعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓی اَنْفُسِهِمْ (۳۹ : ۵۴) ءَاَنْتُمْ اَضْلَلْتُمْ عِبَادِیْ (۲۵ : ۱۸) اس کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے ایک باپ جوشِ محبت میں اپنے بیٹے کو پکارتا ہے، تو خصوصیت کے ساتھ اپنے رشتۂ پدری پر زور دیتا ہے۔ "اے میرے بیٹے! اے میرے فرزند!" حضرت امام جعفر صادق نے سورۂ زمر کی آیۂ رحمت کی تفسیر کرتے ہوئے کیا خوب فرمایا ہے "جب ہم اپنی اولاد کو اپنی طرف نسبت دے کر مخاطب کرتے ہیں تو وہ بے خوف و خطر ہماری طرف دوڑنے لگتے ہیں، کیونکہ سمجھ جاتے ہیں، ہم اُن پر غضبناک نہیں۔ قرآن میں خدا نے بیس سے زیادہ موقعوں پر ہمیں عِبَادِیْ کہہ کر اپنی طرف نسبت دی ہے، اور سخت سے سخت گناہگار انسانوں کو بھی یٰعِبَادِیْ کہہ کر پکارا ہے۔ کیا اس سے بھی بڑھ کر اُس کی رحمت و آمرزش کا کوئی پیام ہو سکتا ہے؟"

صحیح مسلم کی مشہور حدیث کا مطلب کس طرح واضح ہو جاتا ہے۔ جب ہم اس روشنی میں اُس کا مطالعہ کرتے ہیں:

والذی نفسی بیدہ، لو لم تذنبوا	اُس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، اگر تم ایسے ہو جاؤ کہ گناہ تم
لذھب اللہ بکم ولجاء بقوم	سے سرزد ہی نہ ہو تو خدا تمہیں زمین سے ہٹا دے، اور تمہاری جگہ ایک دوسرا
یذنبون فیستغفرون۔	گروہ پیدا کر دے جس کا شیوہ یہ ہو کہ گناہوں میں مبتلا ہو، اور پھر خدا سے بخشش و
(مسلم عن ابی ھریرۃ رض)[1]	مغفرت کی طلبگاری کرے۔

فدائے شیوۂ رحمت کہ درلباسِ بہار		بعذر خواہیِ رندانِ بادہ نوش آمد!

اصلاً انجیل اور قرآن کی تعلیم میں کوئی اختلاف نہیں

پس فی الحقیقت حضرت مسیح (علیہ السلام) کی تعلیم میں اور قرآن کی تعلیم میں اصلاً کوئی فرق نہیں ہے۔ دونوں کا معیارِ احکام ایک ہی ہے۔ فرق صرف محلِ بیان اور پیرایۂ بیان کا ہے۔ حضرت مسیحؑ نے صرف اخلاق اور تزکیۂ قلب پر زور دیا، کیونکہ شریعتِ موسوی موجود تھی اور وہ اُس کا ایک نقطہ بھی بدلنا نہیں چاہتے تھے لیکن قرآن کو اخلاق اور قانون، دونوں کے احکام بہ یک وقت بیان

[1] وایضاً عن انس قال قال صلی اللہ علیہ وسلم والذی نفسی بیدہ، لو اخطأتم حتی تملأ خطایاکم ما بین السماء و الارض، ثم استغفرتم اللہ، یغفر لکم۔ والذی نفسی بیدہ، لو لم تخطئوا، لجاء اللہ بقوم یخطئون ثم یستغفرون فیغفر لھم۔ اخرجہ احمد وابو یعلی باسنادٍ رجالہ ثقات۔ وعن ابن عمر مرفوعاً۔ لو لم تذنبوا، لخلق اللہ خلقاً یذنبون ثم یغفر لھم۔ اخرجہ احمد والبزار و رجالھم ثقات۔ واخرج البزار من حدیث ابی سعید نحو حدیث ابی ھریرۃ فی الصحیح، وفی اسنادہ یحیی بن بکیر و ھو ضعیف۔

کرنے تھے، اس لیے قدرتی طور پر اُس نے پیرایۂ بیان ایسا اختیار کیا جو مجازات و متشابہات کی جگہ احکام و قوانین کا صاف صاف جچا تُلا پیرایۂ بیان تھا۔ اُس نے سب سے پہلے عفوُ و درگزر پر زور دیا، اور اُسے نیکی و فضیلت کی اصل قرار دیا۔ ساتھ ہی بدلہ لینے اور سزا دینے کا دروازہ بھی کھُلا رکھا کہ ناگزیر حالتوں میں اس کے بغیر چارہ نہیں لیکن نہایت قطعی اور واضح لفظوں میں بار بار کہہ دیا کہ بدلے اور سزا میں کسی طرح کی ناانصافی اور زیادتی نہیں ہونی چاہیے۔ یقیناً دنیا کے تمام نبیوںؑ اور شریعتوں کے احکام کا ماحصل یہی تین اصول رہے ہیں:

وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا ۚ فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ ۭ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ ۝ وَلَمَنِ انْتَصَرَ بَعْدَ ظُلْمِهٖ فَاُولٰۗىِٕكَ مَا عَلَيْهِمْ مِّنْ سَبِيْلٍ ۝ اِنَّمَا السَّبِيْلُ عَلَى الَّذِيْنَ يَظْلِمُوْنَ النَّاسَ وَيَبْغُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ۭ اُولٰۗىِٕكَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝ وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ اِنَّ ذٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ۝ (۴۲: ۴۳)

اور (دیکھو) بُرائی کے بدلے ویسی ہی اور اتنی ہی بُرائی ہے لیکن جو کوئی بخش دے اور بگاڑنے کی جگہ سنوار لے، تو (یقین کرو) اُس کا اجر اللہ کے ذمہ ہے۔ اللہ اُن لوگوں کو دوست نہیں رکھتا جو زیادتی کرنے والے ہیں۔ اور جس کسی پر ظلم کیا گیا ہو، اور وہ ظلم کے بعد اُس کا بدلہ لے، تو اُس پر کوئی الزام نہیں۔ الزام اُن لوگوں پر ہے جو انسانوں پر ظلم کرتے ہیں اور ناحق ملک میں فساد کا باعث ہوتے ہیں۔ سو یہی لوگ ہیں جن کے لیے عذاب الیم ہے! اور جو کوئی بدلہ لینے کی جگہ بُرائی برداشت کر جائے اور بخش دے، تو یقیناً یہ بڑی ہی اولوالعزمی کی بات ہے!

اسلوب بیان پر غور کرو، اگرچہ ابتدا میں صاف صاف کہہ دیا تھا کہ "فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ" اور بظاہر عفوُ و درگزر کے لیے اتنا کہہ دینا کافی تھا، لیکن آخر میں پھر دوبارہ اس پر زور دیا: "وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ، اِنَّ ذٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ" یہ تکرار اس لیے ہے کہ عفوُ و درگزر کی اہمیت واضح ہو جائے۔ یعنی یہ حقیقت اچھی طرح آشکارا ہو جائے کہ اگرچہ بدلے اور سزا کا دروازہ کھُلا رکھا گیا ہے لیکن نیکی و فضیلت کی راہ عفوُ و درگزر ہی کی راہ ہے!

پھر اس پہلو پر بھی نظر رہے کہ قرآن نے اُس سزا کو جو بُرائی کے بدلے میں دی جائے، بُرائی ہی کے لفظ سے تعبیر کیا۔ "جزاء سیئة، سیئة مثلها" یعنی "سیئة" کے بدلے میں جو کچھ کیا جائے گا، وہ بھی "سیئة" ہی ہوگا، عمل حسن نہیں ہوگا۔ لیکن اس کا دروازہ اس لیے باز رکھا گیا کہ اگر باز نہ رکھا جائے تو اس سے بھی زیادہ بُرائیاں ظہور میں آنے لگیں گی۔ پھر اس آدمی کی نسبت جو معاف کر دے "اَصْلَحَ" کا لفظ کہا۔ یعنی سنوارنے والا۔ اس سے معلوم ہوا کہ

یہاں بگاڑ کے اصلی سزاوار وہ لوگ ہوتے ہیں جو بدلے کی جگہ عفو و درگزر کی راہ اختیار کرتے ہیں۔

قرآن کے زواجر و قوارع

ممکن ہے، بعض طبیعتیں یہاں ایک خدشہ محسوس کریں۔ اگر فی الحقیقت قرآن کی تمام تعلیم کا اصل اصول رحمت ہی ہے، تو پھر اُس نے اپنے مخالفوں کی نسبت زجر و توبیخ کا سخت پیرایہ کیوں اختیار کیا؟

اس کا مفصل جواب تو اپنے محل میں آئے گا، لیکن تکمیلِ بحث کے لیے ضروری ہے کہ یہاں مختصراً اشارہ کر دیا جائے۔ بلاشبہ قرآن میں ایسے مقامات موجود ہیں جہاں اُس نے مخالفوں کے لیے شدت و غلظت کا اظہار کیا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ کن مخالفوں کے لیے؟ اُن کے لیے جن کی مخالفت محض اختلافِ فکر و اعتقاد کی مخالفت تھی؟ یعنی ایسی مخالفت جو معاندانہ اور جارحانہ نوعیت نہیں رکھتی تھی؟ ہمیں اس سے قطعاً انکار ہے۔ ہم پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ تمام قرآن میں شدت و غلظت کا ایک لفظ بھی نہیں مل سکتا جو اس طرح کے مخالفوں کے لیے استعمال کیا گیا ہو۔ اُس نے جہاں کہیں بھی مخالفوں کا ذکر کرتے ہوئے سختی کا اظہار کیا ہے، اُس کا تمام تر تعلق اُن مخالفوں سے ہے، جن کی مخالفت بغض و عناد اور ظلم و شرارت کی جارحانہ معاندت تھی، اور ظاہر ہے کہ اصلاح و ہدایت کی کوئی تعلیم بھی اس صورتِ حال سے گریز نہیں کر سکتی۔ اگر ایسے مخالفوں کے ساتھ بھی نرمی و شفقت ملحوظ رکھی جائے، تو بلاشبہ یہ رحمت کا سلوک تو ہوگا، مگر انسانیت کے لیے نہیں ہوگا۔ ظلم و شرارت کے لیے ہوگا، اور یقیناً سچی رحمت کا معیار یہ نہیں ہونا چاہیے کہ ظلم و فساد کی پرورش کرے۔ ابھی چند صفحوں کے بعد تمہیں معلوم ہوگا کہ قرآن نے صفاتِ الٰہی میں رحمت کے ساتھ عدالت کو بھی اُس کی جگہ دی ہے، اور سورۂ فاتحہ میں ربوبیت اور رحمت کے بعد عدالت ہی کی صفت جلوہ گر ہوئی ہے۔ یہ اسی لیے ہے کہ وہ رحمت سے عدالت کو الگ نہیں کرتا، بلکہ اُسے عین رحمت کا مقتضا قرار دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے، تم انسانیت کے ساتھ رحم و محبت کا برتاؤ کر ہی نہیں سکتے اگر ظلم و شرارت کے لیے تم میں سختی نہیں ہے۔ انجیل میں ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت مسیحؑ بھی اپنے زمانے کے مفسدوں کو "سانپ کے بچے" اور "ڈاکوؤں کا مجمع" کہنے پر مجبور ہوئے۔

کفرِ محض اور کفرِ جارحانہ قرآن نے "کفر" کا لفظ انکار کے معنی میں استعمال کیا ہے۔ انکار دو طرح کا ہوتا ہے۔ ایک یہ کہ انکارِ محض ہو، ایک یہ کہ جارحانہ ہو۔

انکارِ محض سے مقصود یہ ہے کہ ایک شخص تمہاری تعلیم قبول نہیں کرتا۔ اس لیے کہ اُس کی سمجھ میں نہیں آتی، یا اس لیے کہ اُس میں طلبِ صادق نہیں ہے، یا اس لیے کہ جو راہ چل رہا ہے، اُسی پر قانع ہے۔ بہر حال کوئی

وجہ ہو، لیکن وہ تم سے متفق نہیں ہے۔

جارحانہ انکار سے مقصود وہ حالت ہے جو صرف اتنے ہی پر قناعت نہیں کرتی، بلکہ اُس میں تمہارے خلاف ایک طرح کی کد اور ضد پیدا ہو جاتی ہے، اور پھر یہ ضد بڑھتے بڑھتے بغض و عناد اور ظلم و شرارت کی سخت سے سخت صورتیں اختیار کر لیتی ہے۔ اس طرح کا مخالف صرف یہی نہیں کرتا کہ تم سے اختلاف رکھتا ہے، بلکہ اس کے اندر تمہارے خلاف بغض و عناد کا ایک غیر محدود جوش پیدا ہو جاتا ہے۔ وہ اپنی زندگی اور زندگی کی ساری قوتوں کے ساتھ تمہاری بربادی و ہلاکت کے درپے ہو جائیگا۔ تم کتنی ہی اچھی بات کہو، وہ تمہیں جھٹلائیگا۔ تم کتنا ہی اچھا سلوک کرو، وہ تمہیں اذیت پہنچائے گا۔ تم کہو، روشنی تاریکی سے بہتر ہے، تو وہ کہے، تاریکی سے بہتر کوئی چیز نہیں۔ تم کہو، کڑواہٹ سے مٹھاس اچھی ہے، تو وہ کہے، نہیں، کڑواہٹ ہی ہیں دنیا کی سب سے بڑی لذت ہے۔

یہی حالت ہے جسے قرآن انسانی فکر و بصیرت کے تعطّل سے تعبیر کرتا ہے، اور اسی نوعیت کے مخالف ہیں جن کے لیے اُس کے تمام زواجر و قوارع ظہور میں آئے ہیں:

لَهُمْ قُلُوبٌ لَّا يَفْقَهُونَ بِهَا وَلَهُمْ أَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُونَ بِهَا وَلَهُمْ آذَانٌ لَّا يَسْمَعُونَ بِهَا ۚ أُولَٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ ۚ أُولَٰئِكَ هُمُ الْغَافِلُونَ (۷: ۱۷۹)	اُن کے پاس دل ہیں، مگر سوچتے نہیں، اُن کے پاس آنکھیں ہیں، مگر دیکھتے نہیں۔ اُن کے پاس کان ہیں، مگر سُنتے نہیں۔ وہ ایسے ہو گئے ہیں جیسے چار پائے، نہیں، بلکہ چار پایوں سے بھی زیادہ کھوئے ہوئے۔ بلاشبہ یہی لوگ ہیں جو غفلت میں ڈوب گئے!

ہمارے مفسر اسی دوسری حالت کو "کفرِ جحود" سے تعبیر کرتے ہیں۔

دنیا میں جب کبھی سچائی کی کوئی دعوت ظاہر ہوئی ہے، تو کچھ لوگوں نے اُسے قبول کر لیا ہے، کچھ نے انکار کیا ہے، لیکن کچھ لوگ ایسے ہوئے ہیں، جنہوں نے اُس کے خلاف طغیان و جحود اور ظلم و شرارت کی جتھابندی کر لی ہے۔ قرآن کا جب ظہور ہوا، تو اُس نے بھی یہ تینوں جماعتیں اپنے سامنے پائیں۔ اُس نے پہلی جماعت کو اپنی آغوشِ تربیت میں لے لیا، دوسری کو دعوت و تذکیر کا مخاطب بنایا، مگر تیسری کے ظلم و طغیان پر حسبِ حالت و ضرورت زجر و توبیخ کی۔ اگر ایسے گروہ کے لیے بھی اُس کے لب و لہجہ کی سختی "رحمت" کے خلاف ہے، تو بلاشبہ اس معنی میں قرآن رحمت کا معترف نہیں، اور یقیناً اس ترازو سے اُس کی رحمت نہیں تولی جا سکتی۔

تم بار بار سن چکے ہو کہ وہ دینِ حق کے معنوی قوانین کو کائناتِ فطرت کے عام قوانین سے الگ نہیں قرار دیتا، بلکہ انہی کا ایک گوشہ قرار دیتا ہے۔ فطرتِ کائنات کا اپنے فعل و ظہور کے ہر گوشے میں کیا حال ہے؟ یہ حال

ہے کہ وہ اگرچہ سرتاسر رحمت ہے، لیکن رحمت کے ساتھ عدالت، اور بخشش کے ساتھ جزا کا قانون بھی رکھتی ہے پس قرآن کہتا ہے، میں فطرت سے زیادہ کچھ نہیں دے سکتا۔ تمہاری جس مزعومہ رحمت سے فطرت کا خزانہ خالی ہے، یقیناً میرے آستین و دامن میں نہیں مِل سکتی:

فِطْرَتَ اللّٰہِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْہَا
لَا تَبْدِیْلَ لِخَلْقِ اللّٰہِ ذٰلِكَ الدِّیْنُ
الْقَیِّمُ وَلٰکِنَّ اَکْثَرَ النَّاسِ
لَا یَعْلَمُوْنَ ۝ (۳۰ : ۲۹)

اللہ کی فطرت، جس پر اللہ نے انسان کو پیدا کیا ہے۔ اللہ کی بناوٹ میں کبھی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ یہی (اللہ کی ٹھہرائی ہوئی فطرت) سچا اور ٹھیک ٹھیک دین ہے، لیکن اکثر انسان ایسے ہیں جو اس حقیقت سے بے خبر ہیں!

قرآن کے اُن تمام مقامات پر نظر ڈالو جہاں اُس نے سختی کے ساتھ منکروں کا ذکر کیا ہے یہ حقیقت بیک نظر واضح ہو جائے گی۔

---

(۵)

مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ

ربوبیت اور رحمت کے بعد جس صفت کا ذکر کیا گیا ہے، وہ عدالت ہے، اور اُس کے لیے "مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ" کی تعبیر اختیار کی گئی ہے۔

الدّین سامی زبانوں کا ایک قدیم مادہ "دان" اور "دین" ہے، جو بدلہ اور مکافات کے معنوں میں بولا جاتا تھا اور پھر آئین وقانون کے معنوں میں بھی بولا جانے لگا۔ چنانچہ عبرانی اور آرامی میں اس کے متعدد مشتقات ملتے ہیں۔ آرامی زبان ہی سے غالباً یہ لفظ قدیم ایران میں بھی پہنچا اور پہلوی میں "دینیہ" نے شریعت وقانون کا مفہوم پیدا کر لیا۔ خود اوستا میں ایک سے زیادہ موقع پر یہ لفظ مستعمل ہوا ہے، اور زردشتیوں کی قدیم ادبیات میں انشا، وکتابت کے آئین وقواعد کو بھی "دین دبیرہ" کے نام سے موسوم کیا ہے۔ علاوہ بریں زردشتیوں کی ایک مذہبی کتاب کا نام "دین کارت" ہے، جو غالباً نویں صدی مسیحی میں عراق کے ایک موبد نے مرتب کی تھی۔

بہرحال عربی میں "الدّین" کے معنی بدلہ اور مکافات کے ہیں۔ خواہ اچھائی کا ہو۔ خواہ بُرائی کا:

ستعلم لیلیٰ ایّ دین تداینت   وایّ غریم فی التقاضی غریمھا

پس "مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ" کے معنی ہوئے، وہ، جو جزا کے دن کا حکمراں ہے۔ یعنی روزِ قیامت کا۔

اس سلسلے میں کئی باتیں قابلِ غور ہیں:

"دین" کے لفظ نے جزا کی حقیقت واضح کردی

اوّلاً قرآن نے نہ صرف اس موقع پر بلکہ عام طور پر جزا کے لیے "الدّین" کا لفظ اختیار کیا ہے، اور اسی لیے وہ قیامت کو بھی عموماً "يَوْمِ الدِّيْنِ" سے تعبیر کرتا ہے۔ یہ تعبیر اس لیے اختیار کی گئی کہ جزا کے بارے میں جو اعتقاد پیدا کرنا چاہتا تھا، اُس کے لیے یہی تعبیر سب سے زیادہ موزوں اور واقعی تعبیر تھی۔ وہ جزا کو اعمال کا قدرتی نتیجہ اور مکافات قرار دیتا ہے۔

نزولِ قرآن کے وقت پیروانِ مذاہب کا عالمگیر اعتقاد یہ تھا کہ جزا محض خدا کی خوشنودی اور اُس کے قہر وغضب کا نتیجہ ہے: اعمال کے نتائج کو اس میں دخل نہیں۔ الوہیت اور شاہیت کا تشابہ، تمام مذہبی تصورات کی طرح، اس معاملے میں بھی گمراہیِ فکر کا موجب ہوا تھا۔ لوگ دیکھتے تھے کہ ایک مطلق العنان بادشاہ کبھی خوش ہو کر انعام واکرام دینے لگتا ہے، کبھی بگڑ کر سزائیں دینے لگتا ہے، اس لیے خیال کرتے تھے کہ خدا کا بھی ایسا ہی حال ہے۔ وہ کبھی ہم سے خوش ہو جاتا ہے، کبھی غیظ وغضب میں آجاتا ہے۔ طرح طرح کی قربانیوں اور چڑھاووں کی رسم اسی اعتقاد

سے پڑی تھی۔ لوگ دیوتاؤں کا جوشِ غضب ٹھنڈا کرنے کے لیے قربانیاں کرتے، اور اُن کی نظرِ التفات حاصل کرنے کے لیے نذریں چڑھاتے؛

یہودیوں اور عیسائیوں کا عام تصوّر دیوبانی تصورات سے بلند ہوگیا تھا، لیکن جہاں تک اس معاملے کا تعلق ہے، اُن کے تصوّر نے بھی کوئی وسیع ترقی نہیں کی تھی۔ یہودی بہت سے دیوتاؤں کی جگہ خاندانِ اسرائیل کا ایک خدا مانتے تھے، لیکن پُرانے دیوتاؤں کی طرح یہ خدا بھی شاہی اور مطلق العنانی کا خدا تھا۔ وہ کبھی خوش ہوکر انہیں اپنی چہیتی قوم بنا لیتا، کبھی جوشِ انتقام میں آکر بربادی و ہلاکت کے حوالے کر دیتا۔ عیسائیوں کا اعتقاد تھا کہ آدم کے گناہ کی وجہ سے اُس کی پوری نسل مغضوب ہوگئی، اور جب تک خدا نے اپنی صفتِ ابنیت کو بشکلِ مسیح قربان نہیں کر دیا، اُس کے نسلی گناہ اور مغضوبیت کا کفارہ نہ ہو سکا؛

مجازاتِ عمل کا معاملہ بھی دنیا کے عالمگیر قانونِ فطرت کا ایک گوشہ ہے

لیکن قرآن نے جزا و سزا کا اعتقاد ایک دوسری ہی شکل و نوعیت کا پیش کیا ہے۔ وہ اُسے خدا کا کوئی ایسا فعل نہیں قرار دیتا جو کائناتِ ہستی کے عام قوانین و نظام سے الگ ہو، بلکہ اُسی کا ایک قدرتی گوشہ قرار دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے، کائناتِ ہستی کا عالمگیر قانون یہ ہے کہ ہر حالت کوئی نہ کوئی اثر رکھتی ہے، اور ہر چیز کا کوئی نہ کوئی خاصہ ہے۔ ممکن نہیں، یہاں کوئی شئے اپنا وجود رکھتی ہو اور اثرات و نتائج کے سلسلہ سے باہر ہو۔ پس جس طرح خدا نے اجسام و مواد میں خواص و نتائج رکھے ہیں، اُسی طرح اعمال میں بھی خواص و نتائج ہیں، اور جس طرح جسمِ انسانی کے قدرتی انفعالات ہیں، اُسی طرح روحِ انسانی کے لیے بھی قدرتی انفعالات ہیں۔ جسمانی موثرات جسم پر مرتب ہوتے ہیں، معنوی موثرات سے روح متأثر ہوتی ہے۔ اعمال کے یہی قدرتی خواص و نتائج ہیں جنہیں جزا و سزا سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اچھّے عمل کا نتیجہ اچھائی ہے اور یہ ثواب ہے۔ بُرے عمل کا نتیجہ بُرائی ہے اور یہ عذاب ہے۔ ثواب اور عذاب کے ان اثرات کی نوعیت کیا ہوگی؟ وحیِ الٰہی نے ہماری فہم و استعداد کے مطابق اُس کا نقشہ کھینچا ہے۔ اس نقشہ میں ایک مرقع بہشت کا ہے۔ ایک دوزخ کا۔ بہشت کے نعائم اُن کے لیے ہیں جن کے اعمال بہشتی ہونگے۔ دوزخ کی عقوبتیں اُن کے لیے ہیں جن کے اعمال دوزخی ہوں گے؛

لَا یَسْتَوِیٓ اَصْحٰبُ النَّارِ وَاَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۭ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ هُمُ الْفَاۗىِٕزُوْنَ ○ (۵۹: ۲۰)

اصحابِ جنت اور اصحابِ دوزخ (اپنے اعمال و نتائج میں) یکساں نہیں ہو سکتے۔ کامیاب انسان وہی ہیں جو اصحابِ جنت ہیں!

جس طرح مادیات میں خواص و نتائج ہیں، اُسی طرح معنویات میں بھی ہیں

وہ کہتا ہے، تم دیکھتے ہو کہ فطرت ہر گوشۂ وجود میں اپنا قانونِ مکافات رکھتی ہے۔ ممکن نہیں کہ اس میں تغیّر یا تساہل ہو۔ فطرت نے آگ میں یہ خاصہ رکھا ہے کہ جلائے۔ اب سوزش و تپش فطرت کی وہ مکافات ہوگئی جو ہر اُس انسان کے لیے ہے جو آگ کے شعلوں میں ہاتھ ڈال دیگا۔ ممکن نہیں کہ تم آگ میں کودو اور اُس فعل کے مکافات سے بچ جاؤ۔ پانی کا خاصّہ ٹھنڈک اور رطوبت ہے۔ یعنی

ٹھنڈک اور رطوبت وہ مکافات ہے جو فطرت نے پانی میں ودیعت کر دی ہے۔ اب ممکن نہیں کہ تم دریا میں اُترو، اور اِس مکافات سے بچ جاؤ۔ پھر جو فطرت، کائناتِ ہستی کی ہر چیز اور ہر حالت میں مکافات رکھتی ہے، کیونکر ممکن ہے کہ انسان کے اعمال کے لیے مکافات نہ رکھے! یہی مکافات جزا و سزا ہے۔

آگ جلاتی ہے، پانی ٹھنڈک پیدا کرتا ہے، سنکھیا کھانے سے موت، دودھ سے طاقت آتی ہے۔ کُنین سے بُخار رُک جاتا ہے۔ جب اشیاء کی اِن تمام مکافات پر تمہیں تعجب نہیں ہوتا کیونکہ یہ تمہاری زندگی کی یقینیات ہیں، تو پھر اعمال کے مکافات پر کیوں تعجب ہوتا ہے؟ افسوس تم پر، تم اپنے فیصلوں میں کتنے ناہموار ہو!

تم گیہوں بوتے ہو، اور تمہارے دل میں کبھی یہ خدشہ نہیں گزرتا کہ گیہوں پیدا نہیں ہوگا۔ اگر کوئی تم سے کہے کہ ممکن ہے، گیہوں کی جگہ جوار پیدا ہو جائے، تو تم اُسے پاگل سمجھو گے۔ کیوں؟ اس لیے کہ فطرت کے قانونِ مکافات کا یقین تمہاری طبیعت میں راسخ ہو گیا ہے۔ تمہارے وہم و گمان میں بھی یہ خطرہ نہیں گزر سکتا کہ فطرت گیہوں لے کر اس کے بدلے میں جوار دے دے گی۔ اتنا ہی نہیں، بلکہ تم یہ بھی نہیں مان سکتے کہ اچھے قسم کا گیہوں لے کر بُرے قسم کا گیہوں دے گی۔ تم جانتے ہو کہ وہ بدلہ دینے میں قطعی اور شک و شبہ سے بالاتر ہے۔ پھر بتلاؤ، جو فطرت گیہوں کے بدلے گیہوں اور جوار کے بدلے جوار دے رہی ہے، کیونکر ممکن ہے کہ اچھے عمل کے بدلے اچھا اور بُرے عمل کے بدلے بُرا نتیجہ نہ رکھتی ہو؟

اَمْ حَسِبَ الَّذِيْنَ اجْتَرَحُوا السَّيِّاٰتِ اَنْ نَّجْعَلَهُمْ كَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَوَآءً مَّحْيَاهُمْ وَمَمَاتُهُمْ سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ۝ وَخَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ وَلِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ۝ (۴۵: ۲۱-۲۲)

جو لوگ بُرائیاں کرتے ہیں، کیا وہ سمجھتے ہیں، ہم اُنہیں اُن لوگوں جیسا کر دیں گے جو ایمان رکھتے ہیں اور جن کے اعمال اچھے ہیں؟ دونوں برابر ہو جائیں۔ زندگی میں بھی اور موت میں بھی؟ (اگر ان لوگوں کی فہم و دانش کا یہی فیصلہ ہے، تو) افسوس اُن کے فیصلے پر! اور اللہ نے آسمان و زمین کو بیکار و عبث نہیں بنایا ہے، بلکہ حکمت و مصلحت کے ساتھ بنایا ہے اور اس لیے بنایا ہے کہ ہر جان کو اُس کی کمائی کے مطابق بدلہ ملے، اور یہ بدلہ ٹھیک ٹھیک ملے گا۔ کسی پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔

چنانچہ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے جزا و سزا کے لیے "الدین" کا لفظ اختیار کیا، کیونکہ مکافاتِ عمل کا مفہوم ادا کرنے کے لیے سب سے زیادہ موزوں لفظ یہی تھا۔

اصطلاحِ قرآنی میں "کسب"

اور پھر یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں، اُس نے اچھے بُرے کام کرنے کو جا بجا "کسب" کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔ "کسب" کے معنی عربی میں ٹھیک ٹھیک وہی ہیں جو اُردو میں کمائی کے ہیں یعنی ایسا کام جس کے نتیجے سے تم کوئی فائدہ حاصل کرنا چاہو، اگرچہ فائدہ کی جگہ نقصان بھی ہو جائے۔ مطلب یہ ہُوا کہ انسان کے لیے جزا، اور سزا، خود انسان ہی کی کمائی ہے۔ جیسی کسی کی کمائی ہوگی ویسا ہی نتیجہ پیش آئیگا۔ اگر ایک انسان نے اچھے کام کر کے اچھی کمائی کرلی ہے، تو اُس کے لیے اچھائی ہے۔ اگر کسی نے بُرائی کر کے بُرائی کمائی ہے، تو اُس کے لیے بُرائی ہے۔

کُلُّ امْرِئٍۭ بِمَا کَسَبَ رَہِیۡنٌ ۝ (۵۲ : ۲۱) ہر انسان اُس نتیجے کے ساتھ جو اُس کی کمائی ہے بندھا ہُوا ہے!

سورۂ بقرہ میں جزاؤ سزا کا قاعدۂ کلیہ بتلا دیا:

لَہَا مَا کَسَبَتۡ وَ عَلَیۡہَا مَا اکۡتَسَبَتۡ ؕ (۲ : ۲۸۶) ہر انسان کے لیے وہی ہے جیسی کچھ اُس کی کمائی ہوگی۔ جو کچھ اُسے پانا ہے وہ بھی اُس کی کمائی سے ہے، اور جس کے لیے اُسے جواب دہ ہونا ہے، وہ بھی اُس کی کمائی ہے!

اسی طرح قوموں اور جماعتوں کی نسبت بھی ایک عام قاعدہ بتلا دیا:

تِلۡکَ اُمَّۃٌ قَدۡ خَلَتۡ ۚ لَہَا مَا کَسَبَتۡ وَ لَکُمۡ مَّا کَسَبۡتُمۡ ۚ وَ لَا تُسۡـَٔلُوۡنَ عَمَّا کَانُوۡا یَعۡمَلُوۡنَ ۝ (۲ : ۱۳۴) یہ ایک اُمت تھی جو گزر چکی۔ اُس کے لیے وہ نتیجہ تھا جو اُس نے کمایا، اور تمہارے لیے وہ نتیجہ ہے جو تم کماؤگے۔

من عمل صالحاً فلنفسہ ومن اساء فعلیہا

علاوہ بریں، صاف صاف لفظوں میں جابجا یہ حقیقت واضح کر دی کہ اگر دینِ الٰہی نیک عملی کی ترغیب دیتا ہے، اور بدعملی سے روکتا ہے، تو یہ صرف اِس لیے ہے کہ انسان نقصان و ہلاکت سے بچے، اور نجات و سعادت حاصل کرے۔ یہ بات نہیں ہے کہ خدا کا غضب و قہر اُسے عذاب دینا چاہتا ہو، اور اُس سے بچنے کے لیے مذہبی ریاضتوں اور عبادتوں کی ضرورت ہو:

مَنۡ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفۡسِہٖ وَ مَنۡ اَسَآءَ فَعَلَیۡہَا ؕ وَ مَا رَبُّکَ بِظَلَّامٍ لِّلۡعَبِیۡدِ ۝ (۴۱ : ۴۶) جس کسی نے نیک کام کیا، تو اپنے لیے کیا، اور جس کسی نے برائی کی تو خود اُسی کے آگے آئیگی، اور ایسا نہیں ہے کہ تمہارا پروردگار اپنے بندوں کے لیے ظلم کرنے والا ہو!

ایک مشہور حدیثِ قدسی میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے:

یا عبادی، لو ان اولکم و آخرکم و انسکم و جنکم کانوا علی اتقی قلب رجل واحد منکم، ما زاد فی ملکی شیئاً۔ یا عبادی، لو ان اولکم و آخرکم و انسکم و جنکم کانوا علی افجر قلب رجل واحد منکم، ما نقص ذلک من ملکی شیئاً۔ یا عبادی، لو ان اولکم و آخرکم و انسکم و جنکم قاموا فی صعید واحد فسألونی فاعطیت کل انسان مسئلتہ، ما نقص ذلک مما عندی الا کما

اے میرے بندو! اگر تم میں سے سب انسان جو پہلے گزر چکے اور وہ سب جو بعد کو پیدا ہونگے، اور تمام انس اور تمام جن، اُس شخص کی طرح نیک ہو جاتے جو تم میں سب سے زیادہ متقی ہے، تو یاد رکھو، اس سے میری خداوندی میں کچھ بھی اضافہ نہ ہوتا۔ اے میرے بندو! اگر وہ سب جو پہلے گزر چکے، اور وہ سب جو بعد کو پیدا ہونگے، اور تمام انس اور تمام جن، اس شخص کی طرح بدکار ہو جاتے جو تم میں سب سے زیادہ بدکار ہے، تو اس سے میری خداوندی میں کچھ بھی نقصان نہ ہوتا۔ اے میرے بندو! اگر وہ سب جو پہلے گزر چکے، اور وہ سب جو بعد کو پیدا ہونگے، ایک مقام پر جمع ہو کر مجھ سے سوال کرتے، اور میں ہر انسان کو اُس کی مُنہ مانگی مُراد بخش دیتا، تو میری رحمت و بخشش کے خزانہ میں اس سے زیادہ کمی ہوتی جتنی کی سوئی

ينقص المخيط اذا ادخل البحر. يا عبادى انما هى اعمالكم احصيها لكم ثم اوفيكم اياها. فمن وجد خيرا فليحمد الله، ومن وجد غير ذلك فلا يلومن الا نفسه (مسلم عن ابی ذرؓ)

کے ناکے جتنا پانی نکل جانے سے سمندر میں ہو سکتی ہے۔ اے میرے بندو! یاد رکھو، یہ تمہارے اعمال ہی ہیں، جنہیں میں تمہارے لیے انضباط اور نگرانی میں رکھتا ہوں، اور پھر اُنہی کے نتائج بغیر کسی کمی بیشی کے تمہیں واپس دے دیتا ہوں پس جو کوئی تم میں اچھائی پائے، چاہیے کہ اللہ کی حمد و ثنا کرے، اور جس کسی کو بُرائی پیش آئے تو چاہیے کہ خود اپنے وجود کے سوا اور کسی کو ملامت نہ کرے؛

یہاں یہ خدشہ کسی کے دل میں واقع نہ ہو کہ خود قرآن نے بھی تو جابجا خدا کی خوشنودی اور نارضامندی کا ذکر کیا ہے؟ بلاشبہ کیا ہے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ وہ انسان کی نیک عملی کا اعلیٰ درجہ بھی قرار دیتا ہے کہ جو کچھ کرے، صرف اللہ کی خوشنودی ہی کے لیے کرے لیکن خدا کے جس رضا و غضب کا وہ اثبات کرتا ہے، وہ جزا و سزا کی علت نہیں بلکہ جزا و سزا کا قدرتی نتیجہ ہے۔ یعنی یہ نہیں کہتا کہ جزا و سزا محض خدا کی خوشنودی اور ناراضی کا نتیجہ ہے۔ نیک و بد اعمال کا نتیجہ نہیں ہے۔ بلکہ وہ کہتا ہے، جزا و سزا تمام تر انسان کے اعمال کا نتیجہ ہے، اور خدا نیک عملی سے خوشنود ہوتا ہے۔ بدعملی ناپسند کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ تعلیم قدیم اعتقاد سے نہ صرف مختلف ہے، بلکہ یکسر متضاد ہے؛

بہرحال، جزا و سزا کی اس حقیقت کے لیے "الدِّین" کا لفظ نہایت موزوں لفظ ہے، اور ان تمام گمراہیوں کی راہ بند کر دیتا ہے جو اس بارے میں پھیلی ہوئی تھیں۔ سورۂ فاتحہ میں مجرد اس لفظ کے استعمال نے جزا و سزا کی اصلی حقیقت آشکارا کر دی؛

الدین بمعنی قانون و مذہب

ثانیاً، یہی وجہ ہے کہ مذہب اور قانون کے لیے بھی "اَلدِّین" کا لفظ استعمال کیا گیا۔ کیونکہ مذہب کا بنیادی اعتقاد مکافاتِ عمل کا اعتقاد ہے، اور قانون کی بنیاد بھی تعزیر و سیاست پر ہے۔ سورۂ یوسف میں جہاں یہ واقعہ بیان کیا ہے کہ حضرت یوسف (علیہ السلام) نے اپنے چھوٹے بھائی کو اپنے پاس روک لیا تھا، وہاں فرمایا: مَا كَانَ لِيَأْخُذَ أَخَاهُ فِي دِينِ الْمَلِكِ إِلَّا أَنْ يَشَاءَ اللَّهُ (۱۲: ۷۶) یہاں بادشاہ مصر کے دین سے مقصود اُس کا قانون ہے۔

"مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ" میں عدالتِ الٰہی کا اعلان ہے

ثالثاً، یہاں ربوبیت اور رحمت کے بعد صفاتِ قہر و جلال میں سے کسی صفت کا ذکر نہیں کیا گیا، بلکہ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ کی صفت بیان کی گئی جس سے عدالتِ الٰہی کا تصور ہمارے ذہن میں پیدا ہو جاتا ہے۔ اِس سے معلوم ہوا کہ قرآن نے خدا کی صفات کا جو تصور قائم کیا ہے، اُس میں قہر و غضب کے لیے کوئی جگہ نہیں۔ البتہ عدالت ضرور ہے، اور صفاتِ قہریہ جس قدر بیان کی گئی ہیں، دراصل اِسی کے مظاہر ہیں؛

فی الحقیقت صفاتِ الٰہی کے تصور کا یہی مقام ہے جہاں فکرِ انسانی نے ہمیشہ ٹھوکر کھائی، یہ ظاہر ہے کہ فطرتِ کائنات، ربوبیت و رحمت کے ساتھ، اپنے مجازات بھی رکھتی ہے، اور اگر ایک طرف اِس میں پرورش و بخشش ہے تو دوسری طرف مواخذہ و مکافات بھی ہے۔ فکرِ انسانی کے لیے فیصلہ طلب سوال یہ تھا کہ فطرت کے مجازات اُس کے

قہر و غضب کا نتیجہ ہیں یا عدل و قسط کے؟ اُس کا فکرِ نارسا عدل و قسط کی حقیقت معلوم نہ کرسکا۔ اُس نے مجازات کو قہر و غضب پر محمول کرلیا، اور یہیں سے خدا کی صفات میں خوف و دہشت کا تصوّر پیدا ہوگیا۔ حالانکہ اگر وہ فطرتِ کائنات کو زیادہ قریب ہو کر دیکھ سکتا، تو معلوم کرلیتا کہ جن مظاہر کو قہر و غضب پر محمول کر رہا ہے، وہ قہر و غضب کا نتیجہ نہیں ہیں بلکہ عینِ مقتضاءِ رحمت ہیں۔ اگر فطرتِ کائنات میں مکافات کا مواخذہ نہ ہوتا، یا تعمیر کی تحسین و تکمیل کے لیے تخریب نہ ہوتی، تو میزانِ عدل قائم نہ رہتا، اور تمام نظامِ ہستی درہم و برہم ہوجاتا۔

کارخانۂ ہستی کے تین معنوی عناصر: ربوبیت، رحمت، عدالت

رابعاً جس طرح کارخانۂ خلقت اپنے وجود و بقا کے لیے ربوبیت اور رحمت کا محتاج ہے، اسی طرح عدالت کا بھی محتاج ہے۔ یہی تین معنوی عنصر ہیں جن سے خلقت و ہستی کا قوام ظہور میں آیا ہے۔ ربوبیت پرورش کرتی ہے، رحمت افادہ و فیضان کا سرچشمہ ہے، اور عدالت سے بناؤ اور خوبی ظہور میں آتی اور نقصان و فساد کا ازالہ ہوتا ہے۔

تعمیر و تحسین کے تمام حقائق دراصل عدل و توازن کا نتیجہ ہیں

تم نے ابھی ربوبیت اور رحمت کے مقامات کا مشاہدہ کیا ہے۔ اگر ایک قدم آگے بڑھو تو اسی طرح عدالت کا مقام بھی نمودار ہوجائے۔ تم دیکھو گے کہ اس کارخانۂ ہستی میں بناؤ، سلجھاؤ، خوبی، اور جمال میں سے جو کچھ بھی ہے، اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ عدل و توازن کی حقیقت کا ظہور ہے۔ ایجاب و تعمیر کو تم اُس کی بے شمار شکلوں میں دیکھتے ہو، اور اس لیے بے شمار ناموں سے پکارتے ہو، لیکن اگر حقیقت کا سُراغ لگاؤ تو دیکھ لو کہ ایجابی حقیقت یہاں صرف ایک ہی ہے، اور وہ عدل و اعتدال ہے!

عدل کے معنیٰ ہیں برابر ہونا، کم زیادہ نہ ہونا۔ اسی لیے معاملات اور قضایا میں فیصلہ کردینے کو عدالت کہتے ہیں کہ حاکم دو فریقوں کی باہم دگر زیادتیاں دُور کردیتا ہے۔ ترازو کی تول کو بھی معادلت کہتے ہیں۔ کیونکہ وہ دونوں پلّوں کا وزن برابر کردیتا ہے۔ یہی عدالت جب اشیا میں نمودار ہوتی ہے تو اُن کی کمیّت اور کیفیت میں تناسُب پیدا کردیتی ہے۔ ایک جزو کا دوسرے جزو سے کمیت یا کیفیت میں مناسب و موزوں ہونا عدالت ہے۔

اب غور کرو، کارخانۂ ہستی میں بناؤ اور خوبی کے جس قدر مظاہر ہیں، کس طرح اسی حقیقت سے ظہور میں آئے ہیں۔ وجود کیا ہے؟ حکیم بتلاتا ہے کہ عناصر کی ترکیب کا اعتدال ہے۔ اگر اس اعتدالی حالت میں ذرا بھی فتور واقع ہوجائے، وجود کی نمود معدوم ہوجائے۔ جسم کیا ہے؟ جسمانی مواد کی ایک خاص اعتدالی حالت ہے۔ اگر اُس کا کوئی ایک جزو بھی غیر معتدل ہوجائے، جسم کی ہیئت ترکیبی بگڑ جائے۔ صحت و تندرستی کیا ہے؟ اخلاط کا اعتدال ہے۔ جہاں اس کا قوام بگڑا، صحت انحراف ہوگیا۔ حسن و جمال کیا ہے؟ تناسب و اعتدال کی ایک کیفیت ہے۔ اگر انسان میں ہے، تو خوبصورت انسان ہے۔ نباتات میں ہے تو پھول ہے۔ عمارت میں ہے تو تاج محل ہے۔ نغمہ کی حلاوت کیا ہے؟ سُروں کی ترکیب کا تناسب و اعتدال۔ اگر ایک سُر بھی بے میل ہُوا، نغمے

کی کیفیت جاتی رہی!

پھر کچھ اشیاء و اجسام ہی پر موقوف نہیں۔ کارخانۂ ہستی کا تمام نظام ہی عدل و توازن پر قائم ہے۔ اگر ایک لمحہ کے لیے یہ حقیقت غیر موجود ہو جائے، تو تمام نظامِ عالم درہم برہم ہو جائے۔ یہ کیا بات ہے کہ نظامِ شمسی کا ہر کُرہ اپنی اپنی جگہ معلق ہے، اپنے اپنے دائروں میں حرکت کر رہا ہے، اور ایسا کبھی نہیں ہوتا کہ ذرا بھی انحراف و میلان واقع ہو؟ یہی عدالت کا قانون ہے جس نے سب کو ایک خاص نظم کے ساتھ جکڑ بند کر رکھا ہے۔ تمام کُرے اپنی اپنی کشش رکھتے ہیں، اور اُن کے مجموعی جذب و انجذاب کے توازُن سے ایسی حالت پیدا ہو گئی ہے کہ ہر کُرہ اپنی جگہ قائم و معلق ہے۔ اگر کوئی کُرہ اس قانونِ عدالت سے باہر ہو جائے، تو معاً دوسرے کُروں سے ٹکرا جائے اور تمام نظامِ شمسی مختل ہو جائے:

اَعداد کے تناسب کی عظیم الشان صداقت جس پر ریاضی اور حساب کے تمام حقائق کا دار و مدار ہے، کیا ہے؟ یہی عدل و تعادل کی حقیقت ہے جس دن یہ حقیقت ذہنِ انسانی پر کھلی تھی، علوم و معارف کے تمام دروازے باز ہو گئے تھے:

وضعِ میزان | چنانچہ قرآن نے اس حقیقت کی طرف جا بجا اِشارات کیے ہیں:

وَالسَّمَآءَ رَفَعَهَا وَوَضَعَ الْمِيزَانَ ۙ أَلَّا تَطْغَوْا فِي الْمِيزَانِ (۵۵: ۷: ۸)

اور اُس نے آسمان کو بلند کر دیا، اور (اجرامِ سماویہ کے قیام کے لیے قانونِ عدالت کا) میزان بنا دیا:

یہ "المیزان" یعنی ترازو کیا ہے؟ تعادُل و توازُن کا قانون ہے، جو تمام اجرامِ سماویّہ کو اُن کی مقررہ جگہوں میں تھامے ہوئے ہے، اور کبھی ایسا نہیں ہو سکتا کہ اُس کے توازن کا پلّہ کسی ایک طرف کو جھک پڑے۔ اجرامِ سماویّہ کا یہی وہ غیر مرئی ستون ہے جس کی نسبت سورۂ رعد میں فرمایا:

اَللّٰهُ الَّذِىْ رَفَعَ السَّمٰوٰتِ بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا (۱۳: ۲)

اللہ جس نے آسمانوں کو (یعنی اجرامِ سماویّہ کو) بغیر کسی ستون کے بلند کر دیا ہے اور تم (اُس کی یہ حکمت) دیکھ رہے ہو!

اور سورۂ لقمان میں بھی اسی کی طرف اشارہ کیا ہے:

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا (۳۱: ۱۰)

اُس نے آسمانوں کو (یعنی اجرامِ سماویّہ کو) پیدا کر دیا، اور تم دیکھ رہے ہو کہ کوئی ستون انہیں تھامے ہوئے نہیں ہے!

یہ کہنا ضروری نہیں کہ عدل و تعادُل کی حقیقت سمجھانے کے لیے میزان یعنی ترازو سے بہتر کوئی عام فہم اور دل نشین تعبیر نہیں ہو سکتی تھی:

اسی طرح سورۂ آلِ عمران کی مشہور آیتِ شہادت میں قَآئِمًا بِالْقِسْطِ (۳: ۱۸) کہہ کر اسی حقیقت کی طرف

اشارہ کیا ہے۔ یعنی کائنات خلقت میں اس کے تمام کام عدالت کے ساتھ قائم ہیں، اور اُس نے قیامِ ہستی کے لیے یہی قانون ٹھہرا دیا ہے۔

اعمالِ انسانی کا عدل و قسط پر مبنی ہونا قرآن کی اصطلاح میں "عملِ صالح" ہے

قرآن کہتا ہے، جب عدالت کا یہ قانون کائنات خلقت کے ہر گوشہ میں نافذ ہے، تو کیونکر ممکن ہے کہ انسان کے افکار و اعمال کے لیے بے اثر ہو جائے؟ پس اس گوشہ میں بھی وہی عمل مقبول ہوتا ہے جو افراط و تفریط اور میل و انحراف کی جگہ فطرت کے عدل و قسط پر مبنی ہوتا ہے، اور اِسی کو وحیِ الٰہی عملِ صالح کے نام سے تعبیر کرتی ہے۔ اگر تعبیر و جمال کے سیکڑوں ناموں سے تمہیں مغالطہ نہیں ہوتا اور یہ بات پا لیتے ہو کہ اِن سب میں اصل حقیقت ایک ہی ہے اور وہ عدالت ہے، تو اس گوشہ میں ایمان و عمل کی اصطلاح سے تمہیں کیوں توحّش ہو؟ اور کیوں بے تحاشا انکار کر بیٹھو؟

اَفَغَیْرَ دِیْنِ اللّٰہِ یَبْغُوْنَ وَلَہٗٓ	کیا یہ لوگ چاہتے ہیں، اللہ کا ٹھہرایا ہوا دین چھوڑ کر کوئی دوسرا دین تلاش کریں؟
اَسْلَمَ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَ	حالانکہ آسمان اور زمین میں جو کوئی بھی ہے، سب اُسی کے حکم کی اطاعت کر رہے
الْاَرْضِ طَوْعًا وَّ کَرْھًا وَّ	ہیں۔ خوشی سے ہو یا ناخوشی سے (مگر سب کے لیے چلنا اُسی کے ٹھہرائے ہوئے
اِلَیْہِ یُرْجَعُوْنَ ○ (۳: ۸۳)	قانون پر ہے) اور بالآخر سب اُسی کی طرف لوٹنے والے ہیں!

بدعملی کے لیے قرآن کے اعتبارات لغویہ

یہی وجہ ہے کہ قرآن نے بدعملی اور بُرائی کے لیے جتنی تعبیرات اختیار کی ہیں، سب ایسی ہیں کہ اگر اُن کے معانی پر غور کیا جائے تو عدل و توازن کی ضد اور مخالف ثابت ہوں گی۔ گویا قرآن کے نزدیک بُرائی کی حقیقت اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ حقیقتِ عدل سے انحراف ہو۔ مثلاً ظلم، طغیان، اِسراف، تبذیر، اِفساد، اِعتدا، عدوان، وغیرہ ذٰلک۔

ظُلم کے معنی وضعُ الشیٔ فی غیرِ موضعہٖ کے ہیں یعنی جو بات جس جگہ ہونی چاہیے، وہاں نہ ہو، بے محل ہو، تو لغت میں اس حالت کو ظلم کہیں گے۔ اسی لیے قرآن نے شرک کو "ظُلمِ عظیم" کہا ہے۔ کیونکہ اس سے زیادہ کوئی بے محل بات نہیں ہو سکتی، اور یہ ظاہر ہے کہ کسی چیز کا اپنی صحیح جگہ میں نہ ہونا ایک ایسی حالت ہے، جو حقیقتِ عدل کے عین منافی ہے۔

طغیان کے معنی ہیں کسی چیز کا اپنی حد سے گزر جانا۔ دریا کا پانی اپنی حد سے بلند ہو جاتا ہے تو کہتے ہیں طغی الماء۔ ظاہر ہے کہ حد سے تجاوز عین عدالت کی ضد ہے۔

اِسراف "سَرَف" سے ہے۔ "سَرَف" کے معنی یہ ہیں کہ جو چیز جتنی مقدار میں جہاں خرچ کرنی چاہیے، اُس سے زیادہ خرچ کر دی جائے۔

تبذیر کے معنی کسی چیز کو ایسی جگہ خرچ کرنا ہے جہاں خرچ نہیں کرنا چاہیے۔ "اِسراف" اور "تبذیر" میں مقدار

اور محل کا فرق ہوا۔ کھانے میں خرچ کرنا، خرچ کا صحیح محل ہے، لیکن اگر ضرورت سے زیادہ خرچ کیا جائے، تو یہ اسراف ہوگا۔ دریا میں روپیہ پھینک دینا روپیہ خرچ کرنے کا صحیح محل نہیں ہے۔ اگر تم روپیہ پانی میں پھینک دو تو یہ فعل تبذیر ہوگا۔ دونوں صورتیں عدالت کے منافی ہیں۔ کیونکہ حقیقتِ عدل، مقدار اور محل، دونوں میں تناسب چاہتی ہے:

فساد کے معنی ہی خروج الشیٔ عن الاعتدال کے ہیں یعنی کسی چیز کا حالتِ اعتدال سے باہر ہو جانا:

اِعتداء، اور **عُدوان** ایک ہی مادہ سے ہیں، اور دونوں کے معنی حد سے گزر جانا ہے:

قرآن اور صفاتِ الٰہی کا تصوّر

قرآن نے خدا کی صفات کا جو تصوّر قائم کیا ہے، سورۂ فاتحہ اُس کی سب سے پہلی رُونمائی ہے۔ ہم اس مرقّع میں وہ شبیہ دیکھ لے سکتے ہیں جو قرآن نے نوعِ انسانی کے سامنے پیش کی ہے۔ یہ ربوبیت، رحمت، اور عدالت کی شبیہ ہے۔ انہی تین صفتوں کے تفکّر سے ہم اُس کے تصوّرِ الٰہی کی معرفت حاصل کر سکتے ہیں۔

خدا کا تصوّر ہمیشہ انسان کی روحانی و اخلاقی زندگی کا محور رہا ہے۔ یہ بات کہ ایک مذہب کا معنوی اور نفسیاتی مزاج کیسا ہے اور وہ اپنے پیرؤوں کے لیے کس طرح کے اثرات رکھتا ہے؟ صرف یہ بات دیکھ کر معلوم کرلی جاسکتی ہے کہ اُس کے تصوّرِ الٰہی کی نوعیت کیا ہے؟

انسان کا ابتدائی تصوّر

جب ہم انسان کے تصوّراتِ الوہیّت کا اُن کے مختلف عہدوں میں مطالعہ کرتے ہیں، تو ہمیں اُن کے تغیّرات کی رفتار کچھ عجیب طرح کی دکھائی دیتی ہے اور تعلیل و توجیہ کے عام اصول کام نہیں دیتے۔ موجوداتِ خلقت کے ہر گوشہ میں تدریجی ارتقا (Evolution) کا قانون کام کرتا رہا ہے اور انسان کا جسم و دماغ بھی اس سے باہر نہیں۔ جس طرح انسان کا جسم بہ تدریج ترقی کرتا ہوا نچلی کڑیوں سے اونچی کڑیوں تک پہنچا، اُسی طرح اُس کے دماغی تصوّرات بھی نچلے درجوں سے بلند ہوتے ہوئے بہ تدریج اونچے درجوں تک پہنچے، لیکن جہاں تک خُدا کی ہستی کے تصوّرات کا تعلّق ہے، معلوم ہوتا ہے کہ صورتِ حال اس سے بالکل برعکس رہی، اور ارتقاء کی جگہ ایک طرح کے تنزّل یا ارتجاع کا قانون یہاں کام کرتا رہا۔ ہم جب ابتدائی عہد کے انسانوں کا سُراغ لگاتے ہیں، تو ہمیں اُن کے قدم آگے بڑھنے کی جگہ پیچھے ہٹتے دکھائی دیتے ہیں!

انسانی دماغ کا سب سے زیادہ پُرانا تصوّر جو قدامت کی تاریکی میں چمکتا ہے، وہ توحید کا تصوّر ہے۔ یعنی صرف ایک اَن دیکھی اور اعلیٰ ہستی کا تصوّر جس نے انسان کو اور اُن تمام چیزوں کو جنہیں وہ اپنے چاروں طرف دیکھ رہا تھا، پیدا کیا۔ لیکن پھر اس کے بعد ایسا معلوم ہوتا ہے، جیسے اس جگہ سے اُس کے قدم بہ تدریج پیچھے ہٹنے لگے، اور توحید کی جگہ آہستہ آہستہ اشراک اور تعددِ اِلٰہ کا تصوّر پیدا ہونے لگا۔ یعنی اب اُس ایک ہستی کے ساتھ جو سب سے بالاتر ہے، دُوسری قوتیں بھی شریک ہونے لگیں، اور ایک معبود کی جگہ بہت سے معبودوں کی چوکھٹوں پر انسان کا سر جھک گیا۔

اگر خدا کے تصوّر میں وحدت کا تصوّر انسانی دماغ کا بلند تر تصوّر ہے، اور اشراک اور تعدد کے تصوّرات نچلے درجے کے تصوّرات ہیں، تو ہمیں اس نتیجہ تک پہنچنا پڑتا ہے کہ یہاں ابتدائی کڑی جو نمایاں ہوئی، وہ نچلے درجہ کی

نہ تھی۔ سادہ نیچے درجے کی تھی، اور اس کے بعد جو کڑیاں اُبھریں، اُنھوں نے بلندی کی جگہ پستی کی طرف رُخ کیا۔ گویا ارتقا کا عام قانون یہاں بے اثر ہو گیا۔ ترقّی کی جگہ رجعت کی اصل کام کرنے لگی ؛

اُنیسویں صدی کے نظریے اور ارتقائی مذہب

اُنیسویں صدی کے علماءِ اجتماعیّات کا عام نقطۂ خیال یہ تھا کہ انسان کے دینی عقائد کی ابتدا اُن اوہامی تصورات سے ہوئی جو اُس کی ابتدائی معیشت کے طبعی تقاضوں اور احوال وظروف کے قدرتی اثرات سے نشوونما پانے لگے تھے۔ یہ تصورات قانونِ ارتقا کے ماتحت، درجہ بدرجہ مختلف کڑیوں سے گزرتے رہے، اور بالآخر اُنھوں نے اپنی ترقی یافتہ صورت میں ایک اعلیٰ ہستی اور خالقِ کُل خدا کے عقیدے کی نوعیّت پیدا کر لی۔ گویا اس سلسلۂ ارتقا کی ابتدائی کڑی اوہامی تصورات تھے جن سے طرح طرح کی الٰہی قوتوں کا تصوّر پیدا ہوا اور پھر اسی تصوّر نے ترقی کرتے ہوئے خدا کے ایک توحیدی اعتقاد کی شکل اختیار کر لی۔ بے جا نہ ہو گا اگر اختصار کے ساتھ یہاں اُن تمام نظریوں پر ایک اجمالی نظر ڈال لی جائے جو اس سلسلے میں یکے بعد دیگرے نمایاں ہوئے اور وقت کے علمی حلقوں کو متاثر کیا ؛

دینی عقائد اور تصورات کی تاریخ بہ حیثیت ایک مستقل شاخِ علم کے انیسویں صدی کی پیداوار ہے۔ اٹھارہویں صدی کے اواخر میں جب انڈوجرمن قبائل (یعنی وسط ایشیا کے آریائی قبائل) اور ان کی زبانوں کی تاریخ روشنی میں آئی، تو ان کے دینی تصورات بھی نمایاں ہوئے، اور اس طرح بحث و تنقید کا ایک نیا میدان پیدا ہو گیا۔ یہی میدان تھا جس کے مباحث نے اُنیسویں صدی کے اوائل میں بحث و نظر کی ایک مستقل شاخ پیدا کر دی۔ یعنی دینی عقائد کی پیدائش اور ان کے نشوونما کی تاریخ کا علم مدوّن ہونے لگا۔ اسی دَور میں عام خیال یہ تھا کہ خدا پرستی کی ابتدا نیچر متھس (Nature-myths) کے تصورات سے ہوئی۔ یعنی اُن خرافاتی اساطیر سے ہوئی جو مظاہرِ فطرت کے متعلق بننا شروع ہو گئے تھے۔ مثلاً روشنی کی ایک مستقل ہستی کا تصور پیدا ہو گیا۔ بارش کی قوت نے ایک دیوتا کی شکل اختیار کر لی۔ قدیم آریائی تصورات سے جو مظاہرِ فطرت کی پرستش پر مبنی تھے، اس خیال کا مواد فراہم ہوا تھا ؛

لیکن انیسویں صدی کے نصف ابتدائی دور میں جب افریقہ اور امریکہ کے وحشی قبائل کے حالات روشنی میں آئے، تو اُن کے دینی تصورات کی تحقیقات نے ایک نئے نظریے کا سامان فراہم کر دیا۔ ۱۷۶۰ء میں دہ بروسے (De Brosses) نے انہی وحشی قبائل کے تصورات سے فیٹش ورشپ (Fetish-Worship) کا استنباط کیا تھا۔ یعنی ایسی اشیاء کی پرستش کا جن سے کسی جنی روح کی وابستگی یقین کی جاتی تھی۔ اب پھر ۱۸۵۱ء میں اے۔ کامٹ (Comete) نے اسی پرستش سے خدا پرستی کی پیدائش کا نظریہ اختیار کیا، اور سرجان لبک نے (جو آگے چل کر لارڈ اویبری کے لقب سے مشہور ہوا) اسے مزید بحث و نظر کا جامہ پہنایا۔ اس نظریّے کا اُس عہد میں عام طور

پر استقبال کیا گیا تھا اور وقت کے علمی حلقوں کی قبولیت اس نے حاصل کر لی تھی؛

تقریباً اسی عہد میں مَین اِزم (Manism) یعنی اجداد پرستی کے نظریے نے سر اُٹھایا۔ اس نظریے کی بنیاد اس قیاس پر رکھی گئی تھی کہ انسان کو آباؤ اجداد کی محبت و عظمت نے پہلے اُن کی پرستش کی راہ دکھائی۔ پھر اسی پرستش نے قانونِ ارتقا کے ماتحت ترقی کر کے خدا پرستی کی نوعیت پیدا کر لی۔ صحرانشین اور چراگاہوں کی جستجو کرنے والے قبیلوں کے ابتدائی تصوّرات میں اجداد پرستی کا ذہنی مواد موجود تھا۔ چین کی قدیم تاریخ میں بھی اس پرستش کا سُراغ بہت دور تک ملنے لگا تھا۔ اس لیے اس نئے نظریہ کے لیے ضروری مواد فراہم ہو گیا، اور ۱۸۷۰ء میں جب ہربرٹ اسپنسر نے اپنے آسیبی نظریے (Ghost-theory) کی بنیاد اسی تخیل پر اُستوار کی، تو وقت کے فلسفیوں اور اجتماعیات کے عالموں کے حلقے میں اُس نے فوراً مقبولیت پیدا کر لی؛

اسی عہد میں ایک دُوسرا نظریہ بھی بروئے کار آیا اور اُس نے غیر معمولی مقبولیت حاصل کر لی۔ یہ ای۔ بی ٹیلر کا اینیمِزم (Animism) کا نظریہ تھا۔ ۱۸۷۲ء میں اُس نے اپنی مشہور کتاب پری مے ٹیو کلچر شائع کی اور اس میں دینی عقائد کی کم از کم تعریف اَینیمِزم کے ذریعہ کی۔ اَینیمِزم سے مقصود یہ ہے کہ انسان کے تصوّرات میں اُس کی جسمانی زندگی کے علاوہ ایک مستقل روحانی زندگی کا تصوّر بھی پیدا ہو جائے۔ اس "مستقل روحانی زندگی" کا تصوّر، ٹیلر کے نزدیک خدا پرستی اور دینی عقائد کا بنیادی مادہ تھا۔ اسی مادہ نے نشوو نما پاکر خدا کی ہستی کے عقیدے کی نوعیت پیدا کر لی۔ غالباً دینی عقائد کی پیدائش کے تمام نظریوں میں یہ پہلا نظریہ ہے جو علمی طریقہ پر پوری طرح مرتّب کیا گیا اور بحث و نظر کے تمام اطراف و جوانب منظم اور آراستہ کیے گئے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ وقت کے تمام علمی حلقوں پر اس نظریے نے ایک خاص اثر ڈالا تھا، اور عام طور پر اُسے ایک مقررہ اور طے شدہ اصل کی شکل میں پیش کیا جانے لگا تھا۔ اُنیسویں صدی کے اختتام تک اس نظریے کا یہ اقتدار بلا استثنا قائم رہا؛

اسی اثنا میں مصر، بابل، اور اشوریا کے قدیم آثار و کتبات کے حل سے تاریخ قدیم کا ایک بالکل نیا میدان روشنی میں آنے لگا تھا، اور اِن آثار کے مباحث نے مستقل علوم کی حیثیت پیدا کر لی تھی۔ اس نئے مواد نے مظاہرِ فطرت کی پرستش کی اصل کو از سرِ نو اہمیت دے کر اُبھار دیا، کیونکہ وادی نیل اور وادی دجلہ و فرات کے یہ دونوں قدیم تمدن دینی عقائد کے یہی تصورات نمایاں کرتے تھے۔ چنانچہ اب پھر ایک نیا مذہب (اسکول) پیدا ہو گیا جو خدا پرستی کی پیدائش کی ابتدائی بنیاد مظاہرِ فطرت کے تاثرات کو قرار دیتا تھا اور خصوصیت کے ساتھ اجرام سماوی کے تاثرات پر زور دیتا تھا۔ اس نظریے کے حامیوں نے اَینیمِزم کی مخالفت کی اور ایسٹرل اینڈ نیچر میتھالوجسٹ (Astral and Nature mythologists) کے نام سے مشہور ہوئے؛

لیکن اُنیسویں صدی کے نصف آخری حصّے میں جبکہ یہ تمام نظریے سر اُٹھا رہے تھے، دوسری طرف ایک خاص علمی حلقہ ایک دُوسرے نظریے کی بنیادیں بھی چُن رہا تھا۔ اس نظریے کا مواد قدیم ترین تمدنی عہد کے شکار پیشہ قبائل کے تصورات نے بہم پہنچایا تھا جن کے حالات اب تاریخ کی دسترس سے باہر نہیں رہے تھے۔ یہ نظریہ ٹوٹمزم (Totemism) کے نام سے مشہور ہوا اور بہت جلد اُس نے وقت کے علمی حلقوں کی توجہ اپنی طرف کھینچ لی۔ ٹوٹمزم سے مقصود مختلف اشیا اور جانوروں کے وہ انتسابات ہیں جو جمعیت بشری کی ابتدائی قبائلی زندگی میں پیدا ہو گئے تھے اور پھر کچھ عرصے کے بعد ان اشیا، اور جانوروں کا غیر معمولی احترام کیا جانے لگا تھا۔ اس نظریے کی رو سے خیال کیا گیا کہ ہندوستان کی گائے، مصر کا مگرمچھ اور بیل، شمالی خطوں کا ریچھ، اور صحرانشین قبائل کا سفید بچھڑا، دراصل ٹوٹمزم ہی کے بقایا ہیں۔ سب سے پہلے ۱۸۸۵ء میں رابرٹسن سمتھ نے اس نظریے کا اعلان کیا تھا۔ پھر وقت کے دوسرے نظّاروں نے بھی اسی رُخ پر قدم اُٹھایا۔

لیکن کچھ عرصے کے بعد اس نظریے کی مقبولیت مجروح ہونا شروع ہو گئی۔ پروفیسر جے۔ جی۔ فریزر کا جمع کیا ہوا مواد جب منظر عام پر آیا تو معلوم ہوا کہ ٹوٹمزم کے تصورات نہ تو دینی تصورات کی نوعیت رکھتے تھے نہ دینی تصورات کا مبدء بننے کی اُن میں صلاحیت تھی۔ ان کی اصلی نوعیت زیادہ سے زیادہ ایک اجتماعی نظام کی تھی، جس کے ساتھ طرح طرح کے تصورات کا ایک سلسلہ وابستہ ہو گیا تھا۔ اس سے زیادہ انہیں اس سلسلہ میں اہمیت نہیں دی جا سکتی۔

مگر اس سلسلہ میں معاملہ کا ایک اَور گوشہ بھی نمایاں ہوا تھا۔ فریزر نے ٹوٹمزم کے تصورات میں ایک خاص قسم ایسی بھی پائی تھی جس میں دینی عقائد کا ابتدائی مواد بننے کی زیادہ صلاحیت دکھائی دیتی تھی یعنی وہ قسم جو جادو کے اعتقاد سے تعلق رکھتی ہے۔ بحث و نظر کے اس گوشے نے مفکروں کی ایک بڑی تعداد کو اپنی طرف متوجہ کر لیا، اور جادو کا نظریہ علمی حلقوں میں روشناس ہو گیا۔ ۱۸۹۲ء میں ایک امریکی عالم جے۔ ایچ کنیگ اس پہلو پر توجہ دلا چکا تھا۔ اب بیسویں صدی کی ابتدائی برسوں میں بہ یک وقت جرمنی، انگلینڈ، فرانس، اور امریکہ کے علمی حلقوں سے اُس کی بازگشت شروع ہو گئی اور اینیمزم کے خلاف ردِ فعل کام کرنے لگا۔ اب یہ خیال عام طور پر پھیل گیا کہ اینیمزم کے تصورات سے پیشتر بھی انسانی تصورات کا ایک دَور رہ چکا ہے، اور یہ ماقبل اینیمزم (Preanimism) دور، جادو کے تصورات کا دَور تھا۔ اسی جادو کے اعمال کے عقیدے نے آگے چل کر روحانی عقائد کی شکل اختیار کر لی، اور خدا پرستی اور دینی عقائد کے مبادیات پیدا ہو گئے۔

اب جادو کا نظریہ ایک عام مقبول نظریہ بن گیا اور پچھلے نظریے اپنی جگہ کھونے لگے۔ ۱۸۹۵ء میں آر۔ آر میرٹ نے، ۱۹۰۲ء میں ہیوٹ نے ۱۹۰۴ء میں کے۔ پریو نے ۱۹۰۷ء میں اے۔ وائر کنڈٹ نے، اور ۱۹۰۹ء میں ای۔ اِس۔ ہارٹ لینڈ نے اسی نظریے پر اپنے بحث و نظر کی تمام دیواریں اُٹھائیں اور اُسے دور تک پھیلاتے چلے

گئے۔ سب سے زیادہ حصّہ اس میں فرانس کے علماءِ اجتماعیات کے اُس طبقہ نے لیا جو دورکیم (Durkheim) کے مسلکِ نظر سے تعلق رکھتا تھا۔ اس طبقہ کا زعیم پہلے ایچ۔ ہیوبرٹ اور ام۔ ماس تھا۔ پھر ۱۹۱۲ء میں خود دورکیم آگے بڑھا اور اس نظریّے کا سب سے بڑا عَلَم بردار بن گیا۔ اس گروہ کی رائے میں ٹوٹم ازم اور جادو کے تصوّرات کا مرکّب مجموعہ جیسا کہ وسطِ آسٹریلیا کے قبائل کے اوہام میں پایا جاتا ہے جمعیتِ بشری کے دینی تصوّرات کا اصلی مبدء تھا۔ قانونِ ارتقاء کے ماتحت انہی تصورات نے خدا پرستی کے عقائد کی ترقی یافتہ شکل پیدا کرلی۔

اس زمانہ کے چند سال بعد بعض پروٹسٹنٹ علماء نے جو دینی عقائد کے نفسیّاتی مطالعہ میں مشغول تھے مسئلے پر نفسیّاتی نقطۂ نگاہ سے نظر ڈالی، اور اس نظریے کی حمایت شروع کردی۔ وہ اس طرف گئے کہ خدا پرستی کے عقیدے کا مبدء ہمیں مذہب اور سحرکاری، دونوں کے مرکّب تصورات میں ڈھونڈھنا چاہیے۔ اس جماعت کا پیشرو آرچ بشپ سوڈربلوم (Söderblom) تھا جس کے مباحث ۱۹۱۶ء میں شائع ہوئے۔

اس کے بعد کا زمانہ پہلی عالمگیر جنگ کا زمانہ تھا جو بیسویں صدی کا ایک دور ختم کرکے دوسرے دور کا دروازہ کھول رہی تھی۔ اس نئے دَور نے جہاں علم و نظر کے بہت سے گوشوں کو انقلابی تغیرات سے آشنا کیا، وہاں علم کی اس شاخ میں بھی ایک نیا انقلابی دور شروع ہوگیا۔

یہ تمام پچھلے نظریے مادّی مذہب ارتقا (Materialistic Evolutionism) کی اصل پر مبنی تھے۔ ان سب کے اندر یہ بنیادی اصل کام کررہی تھی کہ اجسام و موادکی طرح انسان کا دینی عقیدہ بھی بہ تدریج نچلی کڑیوں سے ترقی کرتا ہُوا اعلیٰ کڑیوں تک پہنچا ہے اور خدا پرستی کے عقیدہ میں توحید (Monotheism) کا تصوّر ایک طول طویل سلسلۂ ارتقا کا نتیجہ ہے۔ اُنیسویں صدی کا نصف آخر ڈارونزم کے شیوع و احاطہ کا زمانہ تھا، اور ہکسلے، ویلز، اسپنسر نے اسے اپنے فلسفیانہ مباحث سے انسانی فکر و عمل کے تمام دائروں میں پھیلا دیا تھا۔ قدرتی طور پر خُدا کے اعتقاد کی پیدائش کا مسئلہ بھی اس سے متاثر ہُوا، اور نظر و بحث کے جتنے قدم اُٹھے، وہ اسی راہ پر گامزن ہونے لگے۔

مذہب ارتقا کا خاتمہ اور زمانۂ حال کی تحقیقات

لیکن ابھی بیسویں صدی اپنے انقلاب انگیز انکشافوں میں بہت آگے نہیں بڑھی تھی کہ ان تمام نظریوں کی عمارتیں متزلزل ہونا شروع ہوگئیں، اور پہلی عالمگیر جنگ کے بعد کے عہد نے تو انہیں یک قلم منہدم کردیا۔ اب تمام اہلِ نظر بالاتفاق دیکھنے لگے کہ اس راہ میں جتنے قدم اُٹھائے گئے تھے، وہ سرے سے اپنی بنیاد ہی میں غلط تھے۔ کیونکہ ان سب کی بنیاد قانونِ ارتقاء کی اصل پر رکھی گئی تھی، اور ارتقائی اصل کی رہنمائی یہاں سودمند ہونے کی جگہ گمراہ کن ثابت ہوئی ہے۔ اب اُنہیں ٹھوس اور ناقابلِ انکار تاریخی شواہد کی روشنی میں صاف

صاف نظر آگیا کہ انسان کے دینی عقائد کی جس نوعیت کو اُنھوں نے اعلیٰ اور ترقی یافتہ قرار دیا تھا، وہ بعد کے زمانوں کی پیداوار نہیں ہے بلکہ جمعیت بشری کی سب سے زیادہ پُرانی متاع ہے۔ مظاہرِ فطرت کی پرستش، حیوانی انتسابات کے تصورات، اجداد پرستی کی رسوم، اور جادو کے توہمات کی اشاعت سے بھی بہت پہلے جو تصور انسانی دِل و دماغ کے اُفق پر طلوع ہوا تھا، وہ ایک اعلیٰ ترین ہستی کی موجودگی کا بے لاگ تصور تھا یعنی خدا کی ہستی کا توحیدی اعتقاد تھا!

چنانچہ اب بحث و نظر کے اس گوشہ میں ارتقائی مذہب کا یک قلم خاتمہ ہو چکا ہے۔

ڈبلیو شمٹ (Schmidt) پروفیسر وائنا یونیورسٹی جنھوں نے اس موضوع پر زمانۂ حال کی سب سے بہتر کتاب لکھی ہے، لکھتے ہیں:

"علمِ شعوب و قبائلِ انسانی کے پورے میدان میں اب پُرانا ارتقائی مذہب یکسر دیوالیہ ثابت ہو چکا ہے۔ نشو و نما کی مرتب کڑیوں کا وہ خوشنما سلسلہ جو اس مذہب نے پوری آمادگی کے ساتھ طیار کر دیا تھا، اب ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا اور نئے تاریخی رجحانوں نے اسے اُٹھا کر پھینک دیا ہے۔"[1]

ایک دُوسری جگہ لکھتے ہیں:

"اب یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ انسان کے ابتدائی عمران و تمدن کے تصور کی "اعلیٰ ترین ہستی" فی الحقیقت توحیدی اعتقاد کا خدائے واحد تھا، اور انسان کا دینی عقیدہ جو اس سے ظہور پذیر ہوا، وہ پوری طرح ایک توحیدی دین تھا۔ یہ حقیقت اب اس درجہ نمایاں ہو چکی ہے کہ ایک سرسری نظرِ تحقیق بھی اس کے لیے کفایت کرے گی۔ نسلِ انسانی کے قدیم پستہ قد قبائل میں سے اکثروں کی نسبت یہ بات وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے۔ اِسی طرح ابتدائی عہد کے جنگلی قبیلوں کے جو حالات روشنی میں آئے ہیں، اور کرنائی، کلین، اور جنوب مشرقی آسٹریلیا کے یائن قبیلوں کی نسبت جس قدر تاریکی دور ہو چکا ہے ان سب کی تحقیقات ہمیں اس نتیجہ تک پہنچاتی ہے۔ ارکٹنک تہذیب کے قبیلوں کے روایتی آثار اور شمالی امریکہ کے قبائل کے دینی تصورات کی چھان بین نے بھی بالآخر اسی نتیجہ کو نمایاں کیا۔"[2]

زمانۂ حال کے نظار نے اب اس مسئلہ کا موسوعاتی (Pantologic) طریقِ نظر سے مطالعہ کیا ہے اور قدیم معلومات و مباحث کی تمام شاخیں جمع کر کے مجموعی نتائج نکالے ہیں۔ ضروری ہے کہ اس سلسلہ کی بعض جدید تحقیقات پر ایک سرسری نظر ڈال لی جائے کیونکہ ابھی وہ اس درجہ شائع نہیں ہوئی ہیں کہ عام طور پر نظر و مطالعہ میں آ چکی ہوں۔

---

[1] دی اوریجین اینڈ گروتھ آف ریلیجن۔ صفحہ ۸

[2] ایضاً صفحہ ۲۶۲۔

آسٹریلیا اور جزائر کے وحشی قبائل اور مصر کے قدیم ترین آثار کی جدید تحقیقات

آسٹریلیا اور جزائر بحر محیط کے وحشی قبائل ایک غیر معیّن قدامت سے اپنی ابتدائی ذہنی طفولیت کی زندگی بسر کرتے رہے ہیں۔ زندگی و معیشت کی وہ تمام ترقی یافتہ کڑیاں جو عام طور پر انسانی جماعتوں کے ذہنی ارتقا کا سلسلہ مربوط کرتی ہیں، یہاں یکسر مفقود رہیں۔ ابتدائی عہد کی بشری جمعیت کے تمام جسمانی اور دماغی خصائص ان کی قبائلی زندگی میں دیکھ لیے جا سکتے تھے۔ ان کے تصور اس درجہ محدود تھے کہ اوہام و خرافات میں بھی کسی طرح کا ارتقائی نظم نہیں پایا جاتا۔ تاہم ان کا ایک اعتقادی تصور بالکل واضح تھا: ایک بالاتر ہستی ہے جس نے اُن کی زمین اور اُن کا آسمان پیدا کیا اور اُن کا مرنا اور جینا اُسی کے قبضہ و تصرف میں ہے۔
مصر کے قدیم باشندوں کی صدائیں آٹھ ہزار برس پیشتر تک کی ہمارے کانوں سے ٹکرا چکی ہیں۔ قدیم مصری تصورات کا پورا سلسلہ اپنی عہد بعہد کی تبدیلیوں کے ساتھ ہمارے سامنے اُبھر آیا ہے۔ ہمیں صاف نظر آ رہا ہے کہ ایک خدا کی پرستش کا تصور اس سلسلہ میں بعد کو نہیں اُبھرا، بلکہ سلسلہ کی سب سے زیادہ پُرانی کڑی ہے۔ مصر کے وہ تمام معبود جن کے مرقّعوں سے اُس کے مشہور عالم ہیکلوں اور مناروں کی دیواریں منقّش کی گئی ہیں، اُس قدیم ترین عہد میں اپنی کوئی نمود نہیں رکھتے تھے۔ جب صرف ایک "اوسیریز" کی ان دیکھی ہستی کا اعتقاد دریائے نیل کی تمام آباد وادیوں پر چھایا ہوا تھا! [1]

دجلہ و فرات کی وادیوں کی قدیم آبادیاں اور خدا کی ہستی کا توحیدی تصور

پہلی عالمگیر جنگ کے بعد عراق کے مختلف حصوں میں کھدائی کی جو نئی مہمیں شروع کی گئی تھیں اور جو موجودہ جنگ کی وجہ سے ناتمام رہ گئیں، اُن کے انکشافات نے اس مسئلہ کے لیے نئی روشنیاں بہم پہنچائی ہیں۔ اب اس بارے میں کوئی شبہ نہیں کیا جاتا کہ دریائے نیل کی طرح دجلہ اور فرات کی وادیوں میں بھی جب انسان نے پہلے پہل اپنے خدا کو پُکارا، تو وہ بہت سی ہستیوں میں بٹا ہوا نہیں تھا، بلکہ ایک ہی اَن دیکھی ہستی کی صورت میں نمایاں ہوا تھا۔ کالڈیا کے سومیری اور اکادی قبائل جن انسانی نسلوں کے وارث ہوئے تھے، وہ "شمس" یعنی سورج اور "نانغار" یعنی چاند کی پرستش نہیں کرتے تھے، بلکہ اُس ایک ہی لازوال ہستی کی "جس نے سورج اور چاند اور تمام چمکدار ستاروں کو بنایا ہے"

مہنجو دارو کا خدائے واحد "ادن"

ہندوستان میں "مہنجو دارو" کے آثار ہمیں آریاؤں کے عہد ورود سے بھی آگے لے جاتے ہیں۔ اُن کے مطالعہ و تحقیق کا کام ابھی پورا نہیں ہوا ہے۔ تاہم ایک حقیقت بالکل واضح ہو گئی ہے۔ اس قدیم ترین انسانی بستی کے باشندوں کا بنیادی تصور توحیدِ الٰہی کا تصور تھا۔ اصنام پرستانہ تصور نہ تھا۔ وہ اپنے یگانہ خدا کو "ادن"

[1] "مُردہ کی کتاب" قدیم مصری تصورات کا سب سے زیادہ مرتب اور منضبط نوشتہ ہے۔ مصریات کے مشہور محقق ڈاکٹر بج (Budge) کی رائے میں یہ سب سے زیادہ قدیم فکری مواد ہے جو مصری آثار نے ہمارے حوالہ کیا ہے۔ یہ خود اتنی ہی پُرانی ہے جتنا پُرانا مصری تمدن ہے، لیکن جو تصورات اس میں جمع کیے گئے ہیں، وہ مصری تمدن سے بھی زیادہ قدیم ہیں۔ وہ اتنے قدیم ہیں کہ ہم اُن کی قدامت کی کوئی تاریخ معین نہیں کر سکتے۔ اس نوشتہ میں "اوسیریز" کے یہ صفات ہمیں ملتے ہیں: معبودِ اعظم۔ الخیر۔ ازلی بادشاہ۔ آخرت کا مالک۔

کے نام سے پکارتے تھے جس کی مشابہت ہمیں سنسکرت کے لفظ "اندوان" میں مل جاتی ہے۔ اس یگانہ ہستی کی حکومت سب پر چھائی ہوئی ہے۔ طاقت کی تمام ہستیاں اسی کے ٹھہرائے ہوئے قانون کے ماتحت کام کر رہی ہیں اس کی صفت "ویدوکن" ہے۔ یعنی ایسی ہستی جس کی آنکھیں کبھی غافل نہیں ہو سکتیں۔ لا تاخذہٗ سنۃ ولا نوم!

اللہ کی یگانہ اور ان دیکھی ہستی کا قدیم سامی تصور

سامی قبائل کا اصلی سرچشمہ صحرائے عرب کے بعض شاداب علاقے تھے۔ جب اس چشمہ میں نسلِ انسانی کا پانی بہت بڑھ جاتا، تو اطراف میں پھیلنے لگتا۔ یعنی قبائل کے جتھے عرب سے نکل کر اطراف و جوانب کے ملکوں میں منتشر ہونے لگتے اور پھر چند صدیوں کے بعد نیا رنگ روپ اور نئے نام اختیار کر لیتے شاید انسانی قبائل کا انشعاب کرۂ ارضی کے دو مختلف حصوں میں بہ یک وقت جاری رہا اور زمانہ مابعد کی مختلف قوموں اور تمدنوں کا بنیادی مبدء رہا۔ صحرائے گوبی کے سرچشمے سے وہ قبائل نکلے جو ہندی۔ یورپی (انڈو یورپین) آریاؤں کے نام سے پکارے گئے۔ صحرائے عرب سے وہ قبائل نکلے جن کا پہلا نام سامی پڑا اور پھر یہ نام بے شمار ناموں کے ہجوم میں گم ہو گیا۔ تاریخ کی موجودہ معلومات اس حد تک پہنچ کر رک گئی ہے اور آگے کی خبر نہیں رکھتی +

عرب قبائل کا یہ انشعاب بہ تدریج مغربی ایشیا اور قریبی افریقہ کے تمام دور دراز حصوں تک پھیل گیا تھا۔ فلسطین (شام) مصر، نوبیا، عراق، اور سواحل خلیج فارس، سب اُن کے دائرۂ انشعاب میں آگئے تھے۔ عاد، ثمود، عمالقہ، ہکسوس، مرابی، آشوری، آکادی، سومیری، عیلامی، آرامی، اور عبرانی وغیرہم مختلف مقاموں اور مختلف عہدوں کی قوموں کے نام ہیں مگر دراصل سب ایک ہی قبائلی سرچشمہ سے نکلے ہوئے ہیں یعنی عرب سے +

اب جدید سامی اثریات کے مطالعہ سے جو ان تمام قوموں سے تعلق رکھتی ہیں، ایک حقیقت بالکل واضح ہو گئی ہے۔ یعنی ان تمام قوموں میں ایک ان دیکھے خدا کی ہستی کا اعتقاد موجود تھا۔ اور وہ "ال۔ اِلاہ" یا "اللہ" کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ یہی "اِلاہ" ہے جس نے کہیں "ایل" کی صورت اختیار کی، کہیں "الوہ" کی، اور کہیں "الاہیا" کی سرحدِ حجاز کی وادیِ عقبہ اور شمالی شام کے راس شمر کے جو آثار گزشتہ جنگ کے بعد منکشف ہوئے اُن سے یہ حقیقت اور زیادہ آشکارا ہو گئی ہے مگر یہ موقع تفصیل کا نہیں +

انسان کی پہلی راہ ہدایت کی تھی۔ گمراہی بعد کو آئی۔

بہرحال بیسویں صدی کی علمی جستجو اب ہمیں جس طرف لے جا رہی ہے، وہ انسان کا قدیم ترین توحیدی اور غیر اصنامی اعتقاد ہے۔ اس سے زیادہ اُس کے تصورات کی کوئی بات پرانی نہیں۔ اس نے اپنے عہدِ طفولیت میں ہوش و خرد کی آنکھیں جونہی کھولی تھیں، ایک یگانہ ہستی کا اعتقاد اپنے اندر موجود پایا تھا۔ پھر آہستہ آہستہ اُس کے قدم بھٹکنے لگے اور بیرونی اثرات کی جولانیاں اسے نئی نئی صورتوں اور نئے نئے ڈھنگوں سے آشنا کرنے لگیں۔ اب ایک سے زیادہ مافوق الفطرت طاقتوں کا تصور نشوونما پانے لگا، اور مظاہرِ فطرت کے بے شمار جلوے اسے اپنی طرف کھینچنے لگے۔ یہاں تک کہ پرستش کی ایسی چوکھٹیں بننا شروع ہو گئیں

جنہیں اُس کی جبینِ نیاز چھو سکتی تھی، اور تصورات کی ایسی صورتیں اُبھرنے لگیں جو اُس کے دیدۂ صورت پرست کے سامنے نمایاں ہو سکتی تھیں۔ یہیں اسے ٹھوکر لگی۔ لیکن راہ ایسی تھی کہ ٹھوکر سے بچ بھی نہیں سکتا تھا:

کمند کوتہ، و بازوئے سُست، و بامِ بلند

بمن حوالۂ دنومیدیم گنہ گیرند!

پس معلوم ہوا کہ اس راہ میں ٹھوکر بعد کو لگی۔ پہلی حالت ٹھوکر کی نہ تھی۔ راہِ راست پر گام فرسائیوں کی تھی:

من ملک بودم و فردوسِ بریں جائم بود

آدم آورد دریں خانہ خراب آبادم!

اگر اس صورتِ حال کو گمراہی سے تعبیر کیا جا سکتا ہے، تو ماننا پڑیگا کہ پہلی حالت جو انسان کو پیش آئی تھی، وہ گمراہی کی نہ تھی۔ ہدایت کی تھی۔ اُس نے آنکھیں روشنی میں کھولی تھیں۔ پھر آہستہ آہستہ تاریکی پھیلنے لگی!

دینی نوشتوں کی شہادت اور قرآن کا اعلان

زمانۂ حال کی علمی تحقیقات کا یہ نتیجہ ادیانِ عالَم کے مقدس نوشتوں کی تصریحات کے عین مطابق ہے۔ مصر، یونان، کالڈیا، ہندوستان، چین، ایران، سب کی مذہبی روایتیں ایک ایسے ابتدائی عہد کی خبر دیتی ہیں جب نوعِ انسانی گمراہی اور غمناکی سے آشنا نہیں ہوئی تھی، اور فطری ہدایت کی زندگی بسر کرتی تھی۔ افلاطون نے کریطیاس (Critias) میں آبادیٔ عالَم کی جو حکایت درج کی ہے، اس میں اس اعتقاد کی پوری جھلک موجود ہے اور طیماوس (Timaeus) کی حکایت جو ایک مصری پجاری کی زبانی ہے، مصری روایت کی خبر دیتی ہے۔ تورات کی کتاب پیدائش نے آدم کا قصہ بیان کیا ہے۔ اس قصہ میں آدم کی پہلی زندگی ہدایت کی بہشتی زندگی تھی۔ پھر لغزش ہوئی اور بہشتی زندگی مفقود ہو گئی۔ اس قصہ میں بھی یہی اصل کام کر رہی ہے کہ یہاں پہلا دور فطری ہدایت کا تھا۔ انحراف و گمراہی کی راہیں بعد کو کھلیں۔ قرآن نے تو صاف صاف اعلان کر دیا ہے کہ:

وَمَا كَانَ النَّاسُ إِلَّا أُمَّةً وَاحِدَةً فَاخْتَلَفُوا (۱۰: ۱۹)	ابتدا میں تمام انسان ایک ہی گروہ تھے (یعنی الگ الگ راہوں میں بھٹکے ہوئے نہ تھے) پھر اختلاف میں پڑ گئے۔

دوسری جگہ مزید تشریح کی:

كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً فَبَعَثَ اللَّهُ النَّبِيِّينَ مُبَشِّرِينَ وَمُنذِرِينَ وَأَنزَلَ مَعَهُمُ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيمَا اخْتَلَفُوا فِيهِ (۲: ۲۱۳)	ابتدا میں تمام انسانوں کا ایک ہی گروہ تھا (یعنی فطری ہدایت کی ایک ہی راہ پر تھے۔ پھر اس کے بعد اختلافات پیدا ہو گئے) پس اللہ نے ایک کے بعد ایک نبی مبعوث کیے۔ وہ نیک عملی کے نتیجوں کی خوشخبری دیتے تھے۔ بدعملی کے نتیجوں سے متنبہ کرتے تھے نیز ان کے ساتھ نوشتے نازل کیے۔ تاکہ جن باتوں میں لوگ اختلاف کرنے لگے ہیں، ان کا فیصلہ کر دیں۔

ارتقائی نظریہ خدا کی ہستی کے اعتقاد میں نہیں، مگر اس کی صفات کے تصورات کے مطالعہ میں مدد دیتا ہے

پس خدا کی ہستی کے عقیدے کے بارے میں انیسویں صدی کا ارتقائی نظریہ اب اپنی علمی اہمیت کھو چکا ہے، اور بحث و نظر میں بہت کم مدد دے سکتا ہے۔ البتہ جہاں تک انسان کے اُن تصوروں کا تعلق ہے، جو خدا کی صفات کی نقش آرائیاں کرتے رہے، ہمیں ارتقائی نقطۂ خیال سے ضرور مدد ملتی ہے۔ کیونکہ بلاشبہ یہاں تصورات کے نشوونما و ارتقاء کا ایک ایسا سلسلہ موجود ہے جس کی ارتقائی کڑیاں ایک دوسرے سے الگ کی جا سکتی ہیں، اور نچلے درجوں سے اونچے درجہ کی طرف ہم بڑھ سکتے ہیں۔

خدا کی ہستی کا اعتقاد انسان کے ذہن کی پیداوار نہ تھا کہ ذہنی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ وہ بھی بدلتا رہتا۔ وہ اُس کی فطرت کا ایک وجدانی احساس تھا، اور وجدانی احساسات میں نہ تو ذہن و فکر کے موثرات مداخلت کر سکتے ہیں، نہ باہر کے اثرات سے ان میں تبدیلی ہو سکتی ہے۔

لیکن انسان کی عقل، ذاتِ مطلق کے تصور سے عاجز ہے۔ وہ جب کسی چیز کا تصور کرنا چاہتی ہے، تو گو تصور ذات کا کرنا چاہے، لیکن تصور میں صفات و عوارض ہی آتے ہیں، اور صفات ہی کے جمع و تفرقہ سے وہ ہر چیز کا تصور آراستہ کرتی ہے۔ پس جب فطرت کے اندرونی جذبہ نے ایک بالاتر ہستی کے اعتراف کا ولولہ پیدا کیا، تو ذہن نے چاہا، اُس کا تصور آراستہ کرے، لیکن جب تصور کیا، تو یہ اُس کی ذات کا تصور نہ تھا۔ اُس کی صفات کا تصور تھا۔ اور صفات میں سے بھی اُنہی صفات کا، جن کا ذہن انسانی تخیل کر سکتا تھا۔ یہیں سے خدا پرستی کے فطری جذبہ میں ذہن و فکر کی مداخلت شروع ہو گئی۔

عقلِ انسانی کی درماندگی اور صفاتِ الٰہی کی صورت آرائی

عقلِ انسانی کا ادراک محسوسات کے دائرے میں محدود ہے۔ اس لیے اس کا تصور اس دائرے سے باہر قدم نہیں نکال سکتا۔ وہ جب کسی اَن دیکھی اور غیر محسوس چیز کا تصور کرے گی، تو ناگزیر ہے کہ تصور میں وہی صفات آئیں، جنہیں وہ دیکھتی اور سُنتی ہے، اور جو اُس کے حاسۂ ذوق و لمس کی دسترس سے باہر نہیں ہیں۔ پھر اُس کے ذہن و تفکر کی جتنی بھی رسائی ہے، یہ یک دفعہ ظہور میں نہیں آئی ہے، بلکہ ایک طولانی طویل عرصہ کے نشوونما و ارتقاء کا نتیجہ ہے۔ ابتدا میں اُس کا ذہن عہدِ طفولیت میں تھا۔ اس لیے اُس کے تصورات بھی اسی نوعیت کے ہوتے تھے۔ پھر جوں جوں اُس میں اور اُس کے احوال میں ترقی ہوتی گئی، اُس کا ذہن بھی ترقی کرتا گیا اور ذہن کی ترقی و تزکیہ کے ساتھ، اُس کے تصورات میں بھی شائستگی اور بلندی آتی گئی۔

اس صورتِ حال کا نتیجہ یہ تھا کہ جب کبھی ذہنِ انسانی نے خدا کی صورت بنانی چاہی، تو ہمیشہ ویسی ہی بنائی جیسی صورت خود اُس نے اور اُس کے احوال و ظروف نے پیدا کر لی تھی۔ جوں جوں اُس کا معیارِ فکر بدلتا گیا، وہ اپنے معبود کی شکل و شباہت بھی بدلتا گیا۔ اُسے اپنے آئینۂ تفکر میں ایک صورت نظر آتی تھی۔ وہ سمجھتا تھا، یہ اُس کے معبود کی صورت ہے۔ حالانکہ وہ اُس کے معبود کی صورت نہ تھی، خود اُسی کے ذہن و صفات کا عکس تھا!

فکرِ انسانی کی سب سے پہلی درماندگی یہی ہے جو اس راہ میں پیش آئی!

جرم جویاں درے رامی پرستند　　فقیہاں دفترے رامی پرستند

برافگن پردہ تا معلوم گردد　　کہ یاراں دیگرے رامی پرستند!

یہی درماندگی ہے جس سے نجات دلانے کے لیے وحیِ الٰہی کی ہدایت ہمیشہ نمودار ہوتی رہی۔

انبیاءِ کرام (علیہم السلام) کی دعوت کی ایک بنیادی اصل یہ رہی ہے کہ اُنہوں نے ہمیشہ خداپرستی کی تعلیم ویسی ہی شکل و اُسلوب میں دی، جیسی شکل و اُسلوب کے فہم و تحمل کی استعداد مخاطبوں میں پیدا ہو گئی تھی۔ وہ مجمع انسانی کے معلّم و مربّی تھے اور معلّم کا فرض ہے کہ متعلموں میں جس درجہ کی استعداد پائی جائے، اُسی درجہ کا سبق بھی دے پس انبیاءِ کرام نے بھی وقتاً فوقتاً خدا کی صفات کے لیے جو پیرایۂ تعلیم اختیار کیا، وہ اس سلسلۂ ارتقاء سے باہر نہ تھا۔ بلکہ اُسی کی مختلف کڑیاں مہیّا کرتا ہے۔

ارتقاءِ تصور کے نقاطِ ثلاثہ

اس سلسلہ کی تمام کڑیوں پر جب ہم نظر ڈالتے ہیں اور اُن کے فکری عناصر کی تحلیل کرتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ اُن کی بے شمار نوعیتیں قرار دی جا سکتی ہیں، لیکن ارتقائی نقطے ہمیشہ تین ہی رہے، اور انہی سے اس سلسلہ کی بدایت و نہایت معلوم کی جا سکتی ہے:

(۱) تجسّم[1] سے تنزیہہ کی طرف

(۲) تعدّد و اشراک (Polytheism) سے توحید (Monotheism) کی طرف۔

(۳) صفاتِ قہر و جلال سے صفاتِ رحمت و جمال کی طرف۔

یعنی تجسّم اور صفاتِ قہریہ کا تصوّر اس کا ابتدائی درجہ ہے، اور تنزّہ اور صفاتِ رحمت و جمال سے اتصاف اعلیٰ و کامل درجہ۔ جو تصوّر جس قدر ابتدائی اور ادنیٰ درجہ کا ہے، اُتنا ہی تجسّم اور صفاتِ قہریہ کا عنصر اس میں زیادہ ہے۔ جو تصوّر جس قدر زیادہ ترقی یافتہ ہے، اُتنا ہی زیادہ منزّہ اور صفاتِ رحمت و جلال سے متّصف ہے۔

انسان کا تصورِ صفات قہریہ کے تاثر سے کیوں شروع ہوا؟

انسان کا تصورِ صفاتِ قہریہ کے تخیّل سے کیوں شروع ہوا؟ اس کی علّت واضح ہے۔ فطرتِ کائنات کی تعمیر، تخریب کے نقاب میں پوشیدہ ہے۔ انسانی فکر کی طفولیّت تعمیر کا حُسن نہ دیکھ سکی۔ تخریب کی ہولناکیوں سے سہم گئی۔ تعمیر کا حسن و جمال دیکھنے کے لیے فہم و بصیرت کی دوررس نگاہ مطلوب تھی، اور وہ ابھی اُس کی آنکھوں نے پیدا نہیں کی تھی۔

---

[1] تجسّم سے مقصود یہ ہے کہ خدا کی نسبت ایسا تصوّر قائم کرنا کہ وہ مخلوق کی طرح جسم و صورت رکھتا ہے۔ تشبّہ سے مقصود یہ ہے کہ ایسی صفات تجویز کرنی جو مخلوقات کی صفات سے مشابہ ہوں۔ تنزیہہ سے مقصود یہ ہے کہ اُن تمام باتوں سے جو اُسے مخلوقات سے مشابہ کرتی ہوں، اُسے منزّہ و مبرّا یقین کرنا۔ انگریزی میں تجسّم کے لیے "انتھروپومارفزم" (Anthropomorphism) اور تشبّہ کے لیے "انتھراپو فیوازم" (Anthropophuism) کی مصطلحات استعمال کرتے ہیں۔ ۱۲

دنیا میں ہر چیز کی طرح ہر فعل کی نوعیت بھی اپنا مزاج رکھتی ہے۔ بناؤ ایک ایسی حالت ہے جس کا مزاج سرتاسر سکون اور خاموشی ہے، اور بگاڑ ایک ایسی حالت ہے کہ اُس کا مزاج سرتاسر شورش اور ہولناکی ہے۔ بناؤ، ایجاب ہے، نظم ہے، جمع و ترتیب ہے۔ بگاڑ، سلب ہے، برہمی ہے، تفرقہ و اختلال ہے۔ جمع و نظم کی حالت ہی سکون کی حالت ہوتی ہے، اور تفرقہ و برہمی کی حالت ہی شورش و انفجار کی حالت ہے۔ دیوار جب بنتی ہے، تو ہمیں کوئی شورش محسوس نہیں ہوتی لیکن جب گرتی ہے تو دھماکا ہوتا ہے، اور تم بے اختیار چونک اُٹھتے ہو۔ اس صورتِ حال کا قدرتی نتیجہ یہ ہے کہ حیوانی طبیعت سلبی افعال سے فوراً متاثر ہو جاتی ہے کیونکہ اُن کی نمود میں شورش اور ہولناکی ہے لیکن ایجابی افعال سے متاثر ہونے میں دیر لگاتی ہے، کیونکہ اُن کا حُسن و جمال یکایک مشاہدہ میں نہیں آجاتا، اور اُن کا مزاج شورش کی جگہ خاموشی اور سکون ہے۔

فطرت کے سلبی مظاہر کی قہرمانی اور ایجابی مظاہر کا حسن و جمال انسان پر شیفتگی سے پہلے دہشت طاری ہوئی۔

اِسی بنا پر عقل انسانی نے جب صفات الٰہی کی صورت آرائی کرنی چاہی، تو فطرتِ کائنات کے سلبی مظاہر کی دہشت سے فوراً متاثر ہو گئی، کیونکہ زیادہ نمایاں اور پرشور تھے، اور ایجابی و تعمیری حقیقت سے متاثر ہونے میں بہت دیر لگ گئی، کیونکہ اُن میں شورش اور ہنگامہ نہ تھا۔ بادلوں کی گرج، بجلی کی کڑک، آتش فشاں پہاڑوں کا انفجار، زمین کا زلزلہ، آسمان کی ژالہ باری، دریا کا سیلاب، سمندر کا تلاطم؛ ان تمام سلبی مظاہر میں اُس کے لیے رُعب و ہیبت تھی، اور اسی ہیبت کے اندر وہ ایک غضبناک خدا کی ڈراؤنی صورت دیکھنے لگا تھا۔ اُسے بجلی کی کڑک میں کوئی حُسن محسوس نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ بادلوں کی گرج میں کوئی شانِ محبوبیت نہیں پا سکتا تھا۔ وہ آتش فشاں پہاڑوں کی سنگ باری سے پیار نہیں کر سکتا تھا، اور اُس کی عقل ابھی خدا کے اِنہی کاموں سے آشنا ہوئی تھی!

خود اُس کی ابتدائی معیشت کی نوعیت بھی ایسی ہی تھی کہ اُنس و محبت کی جگہ خوف و وحشت کے جذبات برانگیختہ ہوتے۔ وہ کمزور اور نہتا تھا، اور دنیا کی ہر چیز اُسے دشمنی اور ہلاکت پر تُلی نظر آتی تھی۔ دلدل کے مچھروں کے جھنڈ چاروں طرف منڈلا رہے تھے، زہریلے جانور ہر طرف رینگ رہے تھے، درندوں کے حملوں سے ہر وقت مقابل رہنا پڑتا تھا۔ سر پر سورج کی تپش بے پناہ تھی، اور چاروں طرف موسم کے اثرات ہولناک تھے۔ غرضکہ اُس کی زندگی سرتاسر جنگ اور محنت تھی، اور اس ماحول کا قدرتی نتیجہ تھا کہ اُس کا ذہن، خدا کا تصور کرتے ہوئے، خدا کی ہلاکت آفرینیوں کی طرف جاتا، رحمت و فیضان کا ادراک نہ کر سکتا۔

بالآخر صفات رحمت و جمال کا اشتمال

لیکن جوں جوں اُس میں اور اُس کے ماحول میں تبدیلی ہوتی گئی، اُس کے تصوّر میں بھی یاس و دہشت کی جگہ اُمید و رحمت کا عنصر شامل ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ معبودیت کے تصوّر میں صفاتِ رحمت و

جمال نے بھی ویسی ہی جگہ پالی، جیسی صفاتِ قہر و جلال کے لیے تھی۔ چنانچہ اگر قدیم اقوام کے اصنام پرستانہ تصورات کا مطالعہ کریں، تو ہم دیکھیں گے کہ اُن کی ابتدا ہر جگہ صفاتِ قہر و غضب کے تصور ہی سے ہوئی ہے، اور پھر آہستہ آہستہ رحمت و جمال کی طرف قدم اٹھا ہے۔ آخری کڑیاں وہ نظر آئیں گی جن میں قہر و غضب کے ساتھ رحمت و جمال کا تصور بھی مساویانہ حیثیت سے قائم ہو گیا ہے۔ مثلاً قہر و ہلاکت کے دیوتاؤں اور قوتوں کے ساتھ زندگی، رزق، دولت اور حسن و علم کے دیوتاؤں کی بھی پرستش شروع ہو گئی ہے۔ یونان کا علم الاصنام اپنے لطافتِ تخیل کے لحاظ سے تمام اصنامی تخیلات میں اپنی خاص جگہ رکھتا ہے، لیکن اُس کی پرستش کے بھی قدیم معبود وہی تھے جو قہر و غضب کی خوفناک قوتیں سمجھی جاتی تھیں۔ ہندوستان میں اِس وقت تک زندگی اور بخشش کے دیوتاؤں سے کہیں زیادہ ہلاکت کے دیوتاؤں کی پرستش ہوتی ہے +

ظہورِ قرآن کے وقت دنیا کے عام تصورات
(۱) چینی تصور

بہر حال ہمیں غور کرنا چاہیے کہ قرآن کے ظہور کے وقت صفاتِ الٰہی کے عام تصورات کی نوعیت کیا تھی، اور قرآن نے جو تصور پیش کیا، اُس کی حیثیت کیا ہے؟

ظہورِ قرآن کے وقت پانچ دینی تصور فکرِ انسانی پر چھائے ہوئے تھے:

چینیؔ، ہندوستانیؔ، مجوسیؔ، یہودیؔ، اور مسیحیؔ +

دنیا کی تمام قدیم قوموں میں چینیوں کی یہ خصوصیت تسلیم کرنی پڑتی ہے کہ اُن کے تصورِ الوہیت نے ابتدا میں جو ایک سادہ اور مبہم نوعیت اختیار کرلی تھی، وہ بہت حد تک برابر قائم رہی اور زمانۂ مابعد کی ذہنی وسعت پذیریاں اس میں زیادہ مداخلت نہ کر سکیں۔ تاہم تصور کا کوئی مرقع بغیرِ رنگ و روغن کے بن نہیں سکتا، اس لیے آہستہ آہستہ اس سادہ خاکے میں بھی مختلف رنگتیں نمایاں ہونے لگیں، اور بالآخر ایک رنگین تصویر متشکل ہو گئی +

چین میں قدیم زمانے سے مقامی خداؤں کے ساتھ ایک "آسمانی" ہستی کا اعتقاد بھی موجود تھا۔ ایک ایسی بلند اور عظیم ہستی جس کی علویت کے تصور کے لیے ہم آسمان کے سوا اور کسی طرف نظر نہیں اُٹھا سکتے۔ آسمان حسن و بخشش کا بھی مظہر ہے۔ قہر و غضب کی بھی ہولناکی ہے۔ اُس کا سورج روشنی اور حرارت بخشتا ہے، اُس کے ستارے اندھیری راتوں میں قندیلیں روشن کر دیتے ہیں، اُس کی بارش زمین کو طرح طرح کی روئیدگیوں سے معمور کر دیتی ہے، لیکن اُس کی بجلیاں ہلاکت کا بھی پیام ہیں، اور اس کی گرج دلوں کو دہلا بھی دیتی ہے۔ اس لیے آسمانی خدا کے تصور میں بھی دونوں صفتیں نمودار ہوئیں۔ ایک طرف اُس کی جود و بخشائش ہے۔ دوسری طرف اُس کا قہر و غضب ہے۔ چینی شاعری کی قدیم کتاب میں ہم قدیم ترین چینی تصورات کی جھلک دیکھ لے سکتے ہیں۔ ان میں جابجا ہمیں ایسے مخاطبات ملتے ہیں جن میں آسمانی اعمال کی ان متضاد نمودوں پر حیرانی و سرگشتگی کا اظہار کیا گیا ہے "یہ کیا بات ہے کہ تیرے کاموں میں یکسانی اور ہم آہنگی نہیں؟ تو زندگی بھی بخشتا ہے اور تیرے پاس ہلاکت کی بجلیاں بھی ہیں"+

یہ "آسمان" چینی تصوّر کا ایک ایسا بنیادی عنصر بن گیا کہ چینی جمعیت آسمانی جمعیت اور چینی مملکت آسمانی مملکت کے نام سے پکاری جانے لگی۔ رومی جب پہلے پہل چین سے آشنا ہوئے تو اُنہیں "ایک آسمانی مملکت" ہی کی خبر ملی تھی۔ اُس وقت سے (Caelum) کے مشتقات کا چین کے لیے استعمال ہونے لگا۔ یعنی "آسمان والے" اور "آسمانی" اب بھی انگریزی میں چین کے باشندوں کے لیے مجازاً "سلسٹیل" (Celestial) کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ یعنی آسمانی ملک کے باشندے +

اس آسمانی ہستی کے علاوہ گزرے ہوئے انسانوں کی روحیں بھی تھیں جنہیں دوسرے عالم میں پہنچ کر تدبیر و تصرف کی طاقتیں حاصل ہوگئی تھیں اور اس لیے پرستش کی مستحق سمجھی گئی تھیں۔ ہر خاندان اپنی معبود روحیں رکھتا تھا، اور ہر علاقہ اپنا مقامی خدا +

لاؤ۔ تزو اور کنگ فوزی کی تعلیم

سنہ مسیحی سے پانچ سو برس پہلے لاؤ۔ تزو (Lao-Tzu) اور کنگ فوزی[1] (Kung-fu-Tse) کا ظہور ہوا۔ کنگ فوزی نے ملک کو عملی زندگی کی سعادتوں کی راہ دکھائی، اور معاشرتی حقوق و فرائض کی ادائگی کا ایک قانون مہیّا کر دیا، لیکن جہاں تک خدا کی ہستی کا تعلق ہے، "آسمان" کا قدیمی تصوّر بدستور قائم رہا اور اجداد پرستی کے عقائد نے اس کے ساتھ مل کر ایک ایسی نوعیّت پیدا کر لی، گویا آسمانی خدا تک پہنچنے کا ذریعہ گزری ہوئی روحوں کا وسیلہ اور تشفّع ہے۔ روحانی تصوّرات میں وسیلہ کا اعتقاد ہمیشہ عابدانہ پرستش کی نوعیت پیدا کر لیتا ہے، چنانچہ یہ توسّل بھی عملاً تعبّد تھا، اور ہر طرح کے دینی اعمال و رسوم کا مرکزی نقطہ بن گیا تھا +

ہندوستان اور یونان میں دیوتاؤں کے تصوّر نے نشوونما پائی تھی جو خدائی کی ایک بالاتر ہستی کے ساتھ کارخانۂ عالم کے تصرفات میں شرکت رکھتے تھے۔ چینی تصوّر میں یہ خانہ بزرگوں کی روحوں نے بھرا، اور اس طرح اشراک اور تعدّد کے تصوّر کی پوری نقش آرائی ہوگئی +

کنگ فوزی کے ظہور سے پہلے قربانیوں کی رسم عام طور پر رائج تھی۔ کنگ فوزی نے اگرچہ اُن پر زور نہیں دیا لیکن اُن سے تعرض بھی نہیں کیا۔ چنانچہ وہ چینی مندروں کا تقاضہ برابر پورا کرتی رہیں۔ قربانیوں کے عمل کے پیچھے طلبِ بخشش اور طلبِ تحفّظ، دونوں کے تصوّر کام کرتے تھے۔ قربانیوں کے ذریعہ ہم اپنے مقاصد بھی حاصل کر سکتے ہیں، اور خدا کے قہر و غضب سے محفوظ بھی ہو جا سکتے ہیں۔ پہلی غرض کے لیے وہ نذر ہیں۔ دوسری غرض کے لیے فدیہ!

لاؤ۔ تزو نے "تاؤ" یعنی طریقت کے مسلک کی بنیاد ڈالی۔ اسے چین کا تصوّف اور ویدانت سمجھنا چاہیے۔ تاؤ نے

---

[1] "کنگ فوزی" فارسی تلفظ ہے۔ صحیح چینی تلفظ "کونگ۔ فو۔ تسی" ہے۔ ایرانیوں نے اسے زیادہ صحت کے ساتھ نقل کیا۔ یعنی صرف اتنی تبدیلی کی کہ "فوتسی" کو "فوزی" کر دیا، لیکن یورپ کی زبانوں نے اسے یک قلم مسخ کر کے "کنفوشیس" (Confucius) بنا دیا، اور اُس کی آواز اصلی آواز سے اس درجہ مختلف ہوگئی کہ ایک چینی سُن کر حیران رہ جاتا ہے کہ یہ کس چیز کا نام ہے اور کس ملک کی بولی میں؟

چینی زندگی کو روحانی استغراق اور داخلی مراقبہ کی راہوں سے آشنا کیا اور مذہبی اور اخلاقی تصورات میں ایک طرف گہرائی اور دقت آفرینی پیدا ہوئی، دوسری طرف لطافتِ فکر اور رقتِ خیال کے نئے نئے دروازے کھلے لیکن تصوف ملک کا عام دینی تصور نہیں بن سکتا تھا۔ اس کی محدود جگہ چین میں بھی وہی رہی جو ویدانت کی ہندوؤں میں اور تصوف کی مسلمانوں میں رہی ہے +

چین کا شمنی تصور

اس کے بعد وہ زمانہ آیا جب ہندوستان کے شمنی[1] مذہب (یعنی بدھ مذہب) کی چین میں اشاعت ہوئی۔ یہ مہایانا بدھ مذہب تھا جو مذہب کے اصلی مبادیات سے بہت دور جا چکا تھا، اور جس نے تبدل پزیری کی ایسی بے روک لچک پیدا کرلی تھی کہ جس شکل و قطع کا خانہ ملتا تھا، ویسا ہی جسم بنا کر اُس میں سما جاتا تھا۔ جب چین، کوریا، اور جاپان میں پہنچا، تو اسے ہندوستان اور سیلون سے مختلف قسم کی فضا ملی اور اُس نے فوراً مقامی وضع و قطع اختیار کرلی +

بدھ مذہب کی نسبت یقین کیا جاتا ہے کہ خُدا کی ہستی کے تصور سے خالی ہے لیکن پیروانِ بدھ نے خود بدھ کو خدا کی جگہ دیدی، اور اُس کی پرستش کا ایک ایسا عالمگیر نظام قائم کر دیا جس کی کوئی دوسری نظیر اصنامی مذاہب کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ چنانچہ چین، کوریا، اور جاپان کی عبادتگاہیں بھی اب اس نئے معبود کے بتوں سے معمور ہوگئیں +

(۲) ہندوستانی تصور

ہندوستان کے تصورِ الوہیت کی تاریخ متضاد تصوروں کا ایک حیرت انگیز منظر ہے۔ ایک طرف اُس کا توحیدی فلسفہ ہے۔ دوسری طرف اس کا عملی مذہب ہے۔ توحیدی فلسفہ نے استغراقِ فکر و عمل کے نہایت گہرے اور دقیق مرحلے طے کیے اور معاملہ کو فکری بلندیوں کی ایک ایسی اونچی سطح تک پہنچا دیا جس کی کوئی

---

[1] سنسکرت میں "شمن" زاہد اور تارک الدنیا کو کہتے ہیں۔ بدھ مذہب کے تارک الدنیا بھکشو اس لقب سے پکارے جاتے تھے۔ رفتہ رفتہ تمام پیروانِ بدھ کو "شمنی" کہنے لگے۔ اسی "شمنی" کو عربوں نے "سمنی" بنا لیا اور وسط ایشیا کے باشندوں نے "شامانی"۔ چنانچہ زکریا رازی، البیرونی، اور ابن الندیم وغیرہم نے بدھ مذہب کا ذکر سمنیہ ہی کے نام سے کیا ہے۔ البیرونی بدھ مذہب کی عالمگیر اشاعت کی تاریخ کی بھی خبر رکھتا تھا چنانچہ کتاب الہند کی پہلی فصل میں اس طرف اشارات کیے ہیں +

چنگیز خاں کی نسبت یہ تصریح ملتی ہے کہ وہ شامانی مذہب کا پیرو تھا۔ یعنی بدھ مذہب کا۔ چونکہ شامانی اور بدھ مذہب کا ترادف واضح نہیں ہوا تھا، اس لیے انیسویں صدی کے بعض یورپی مؤرخوں کو طرح طرح کی غلط فہمیاں ہوئیں اور وہ اس کا صحیح مفہوم متعین نہ کرسکے۔ یہ غلط فہمی یورپ کے عام اہلِ قلم میں آج بھی موجود ہے۔ شمالی سائبریا اور چینی ترکستان کے ہم سایہ علاقوں کے تورانی قبائل اپنے مذہبی پیشواؤں کو (جو تبت کے لاماؤں کی طرح مُلکی پیشوائی بھی رکھتے ہیں) "شامان" کہتے ہیں۔ سوویٹ روس کی حکومت آج کل ان کی تعلیم و تربیت کا سرو سامان کر رہی ہے۔ یہ لوگ بھی بلا شبہ بدھ مذہب کے پیرو ہیں لیکن ان کا بدھ مذہب منگولیوں کے محرف مذہب کی بھی ایک مسخ شدہ صورت ہے، اس لیے اصلیت کی بہت کم جھلک باقی رہ گئی ہے، اور اسی لیے ان کی مذہبی اصلیت کے بارے میں آج کل کے مصنف حیرانی ظاہر کر رہے ہیں۔ انگریزی میں اب یہ تورانی قبائل کے مذہب کی نسبت شے مَنزم Shamanism کی ترکیب رائج ہوگئی ہے اور جادوگری کے اعمال و اثرات کو Shamanistic اور Shamanic وغیرہ سے تعبیر کرنے لگے ہیں۔ یہ شمن بھی وہی "شامانی" اور "شمنی" ہی کی ایک محرف صورت ہے۔ چونکہ ان قبائل میں جادوگری کا اعتقاد عام ہے اور وہ اپنے شامانوں سے بیماریوں میں جادو کے ٹوٹکے کرتے ہیں۔ اس لیے جادوگری کے لیے یہ لفظ مستعمل ہوگیا ہے +

دُوسری مثال ہمیں قدیم قوموں کے مذہبی تصوّرات میں نہیں ملتی۔ عملی مذہب نے اِشراک اور تعددِ الٰہ کی بے روک راہ اختیار کی اور اصنامی تصوروں کو اتنی دُور تک پھیلنے دیا کہ ہر پتھر معبود ہو گیا، ہر درخت خدائی کرنے لگا، اور ہر چوکھٹ سجدہ گاہ بن گئی۔ وہ بہ یک وقت زیادہ سے زیادہ بلندی کی طرف بھی اُڑا، اور زیادہ سے زیادہ پستی میں بھی گرا۔ اُس کے خواص نے اپنے لیے توحید کی جگہ پسند کی، اور عوام کے لیے اشراک اور اصنام پرستی کی راہ مناسب سمجھی!

اوپانی شد کا توحیدی اور وحدۃ الوجودی تصوّر

رگ وید کے زمزموں میں ہمیں ایک طرف مظاہرِ قدرت کی پرستش کا ابتدائی تصور بہ تدریج پھیلتا اور متجسّم ہوتا دکھائی دیتا ہے۔ دوسری طرف ایک بالاتر اور خالقِ کل ہستی کا توحیدی تصوّر بھی آہستہ آہستہ اُبھرتا نظر آتا ہے۔ خصوصاً دسویں حصّے کے زمزموں میں تو اُس کی نمود صاف صاف دکھائی دینے لگتی ہے۔ یہ توحیدی تصوّر کسی بہت پُرانے گزشتہ عہد کے بنیادی تصوّر کا بقیہ تھا، یا مظاہرِ قدرت کی کثرت آرائیوں کا تصوّر اب خود بخود کثرت سے وحدت کی طرف ارتقائی قدم اُٹھانے لگا تھا؟ اس کا فیصلہ مشکل ہے، لیکن بہرحال ایک ایسے قدیم عہد میں بھی جبکہ رگ وید کے تصوّروں نے نظم و سخن کا جامہ پہننا شروع کیا تھا، توحیدی تصوّر کی جھلک صاف صاف دیکھی جا سکتی ہے۔ خداؤں کا وہ ہجوم جس کی تعداد تین سو تینتیس یا اسی طرح کی ثلاثی کثرت تک پہنچ گئی تھی[1]۔ بالآخر تین دائروں میں سمٹنے لگا۔ یعنی زمین، فضا، اور آسمان میں، اور پھر اُس نے ایک ربّ الارباب[2] تصوّر (Henotheism) کی نوعیت پیدا کر لی۔ پھر یہ ربّ الاربابی تصوّر اور زیادہ سمٹنے لگتا ہے، اور ایک سب سے بڑی اور سب پر چھائی ہوئی ہستی نمایاں ہونے لگتی ہے۔ یہ ہستی کبھی "ورون" میں نظر آتی ہے، کبھی "اندر" میں، اور کبھی "اگنی" میں؛ لیکن بالآخر ایک خالقِ کل ہستی کا تصوّر پیدا ہو جاتا ہے جو "پرجاپتی" (پروردگارِ عالم) اور "وشواکرمن" (خالقِ کل) کے نام سے پُکاری جانے لگتی ہے، اور جو تمام کائنات کی اصل و حقیقت ہے۔ "وہ ایک ہے مگر علم والے اُسے مختلف ناموں سے پکارتے ہیں: اگنی، یم، ماتری شوان" (۱۶۴-۴۶) "وہ ایک نہ تو آسمان ہے نہ زمین ہے۔ نہ سورج کی روشنی ہے نہ ہوا کا طوفان ہے۔ وہ کائنات کی رُوح ہے۔ تمام قوتوں کا سرچشمہ، ہمیشگی۔ لازوالی۔ وہ کیا ہے؟ وہ شاید رتّ ہے جوہر کے روپ میں۔ ادیتی ہے روحانیت کے بھیس میں۔ وہ بغیر سانس کے سانس لینے والی ہستی!" (حصہ دہم۔ ۱۲۱-۲) "ہم اُسے دیکھ نہیں سکتے ہم کسے پوری طرح تبلا نہیں سکتے" (ایضاً۔ ۱۲۱) وہ "ایکم ست" ہے۔ یعنی حقیقت یگانہ۔ الحق۔ یہی وحدت ہے جو کائنات کی تمام کثرت کے اندر دیکھی جا سکتی ہے[3]۔

---

[1] رگ وید حصّہ سوم ۹-۹۔ [2] ربّ الاربابی تصوّر سے مقصود تصوّر کی وہ نوعیت ہے جب خیال کیا جاتا ہے کہ بہت سے خداؤں میں ایک خدا سب سے بڑا ہے، اور چھوٹے خداؤں کو اُس کے ماتحت رہنا پڑتا ہے۔ جیسا کہ یونانیوں اور رومیوں کا عقیدہ مشتری کی نسبت تھا
[3] رگ وید اور اوپانی شد کے مطالب کے لیے ہم نے حسبِ ذیل مصادر سے مدد لی ہے:

Maxmüller : دی ویدک ہمنز

Kaegi : دی رگ وید

Deussen : دی فلاسفی آف اوپانی شد

Bloomfield : دی ریلیجن آف دی وید

Ghate : لیکچرز آن دی رگ وید

Hume : دی تھرٹین پرنسپل اوپانی شد

یہی مبادیات ہیں جنہوں نے اوپانی شدوں میں توحید وجودی (Pantheism) کے تصور کی نوعیت پیدا کرلی، اور پھر ویدانت کے مابعد الطبیعیات (Metaphysics) نے اپنی بنیادوں پر استغراقِ فکر و نظر کی بڑی بڑی عمارتیں طیار کردیں +

وحدۃ الوجودی اعتقاد ذاتِ مطلق کے کشفی مشاہدات پر مبنی تھا۔ نظری عقائد کو اس میں دخل نہ تھا۔ اس لیے اصلاً یہاں صفات آرائیوں کی گنجائش ہی نہ تھی اور اگر تھی بھی تو صرف سلبی صفات (Negative Attributes) ہی اُبھر سکتی تھیں۔ ایجابی (Positive) صفات کی صورت آرائی نہیں کی جاسکتی تھی یعنی یہ تو کہا جاسکتا تھا کہ وہ ایسا نہیں ہے۔ ایسا نہیں ہے۔ لیکن یہ نہیں کہا جاسکتا تھا کہ وہ ایسا ہے اور ایسا ہے۔ کیونکہ ایجابی صفات کا جو نقشہ بھی بنایا جائے گا، وہ ہمارے ذہن و فکر ہی کا بنایا ہوا نقشہ ہوگا، اور ہمارا ذہن و فکر امکان و اضافت کی چار دیواری میں اس طرح مقید ہے کہ مطلق اور غیر محدود حقیقت کا تصور کر ہی نہیں سکتا۔ وہ جب تصور کریگا تو ناگزیر ہے کہ مطلق کو متشخص بنا کر سامنے لائے، اور جب تشخص آیا تو اطلاق باقی نہیں رہا۔ بابا فغانی نے دو مصرعوں کے اندر معاملہ کی پوری تصویر کھینچ دی تھی:

مشکل حکایتیست کہ ہر ذرّہ عینِ اوست
اما نمی تواں کہ اشارت بہ او کنند!

یہی وجہ ہے کہ اوپانی شد نے پہلے ذاتِ مطلق (برہمان) کو ذاتِ متشخص (ایشور) کے مرتبہ میں اُتار[۱]، اور جب اطلاق نے تشخص کا نقاب چہرہ پر ڈال لیا، تو پھر اس نقاب پوش چہرہ کی صفتوں کی نقش آرائیاں کی گئیں، اور اس طرح وحدۃ الوجودی عقیدہ نے ذاتِ متشخص و متصف (سا گون) کے تصور کا مقام بھی مہیا کردیا[۲] +

جب ان صفات کا ہم مطالعہ کرتے ہیں تو بلاشبہ ایک نہایت بلند تصور سامنے آجاتا ہے جس میں سلبی اور ایجابی، دونوں طرح کی صفتیں اپنی پوری نمود داریاں رکھتی ہیں۔ اُس کی ذات یگانہ ہے۔ اس ایک کے لیے دوسرا نہیں۔ وہ بے ہمتا ہے۔ بے مثال ہے۔ ظرف و زمان اور مکان کے قیود سے بالاتر۔ ازلی و ابدی۔ ناممکن الادراک۔ واجب الوجود۔ وہی پیدا کرنے والا ہے، وہی حفاظت کرنے والا، اور وہی فنا کردینے والا۔ وہ علۃ العلل اور علتِ مطلقہ ("اپادنا" اور "نیمتا کارنا") ہے۔ تمام موجودات اُسی سے بنیں، اُسی سے قائم رہتی ہیں اور پھر اسی کی طرف لوٹنے والی

(۱) ہمارے صوفیائے کرام نے اسی صورتِ حال کو یوں تعبیر کیا ہے کہ "احدیت" نے مرتبۂ "واحدیت" کی تجلی میں نزول کیا۔ "احدیت" یعنی یگانہ ہونا "واحدیت" یعنی اوّل ہونا۔ یگانہ ہستی کو ہم اوّل نہیں کہہ سکتے۔ کیونکہ اوّل جبھی ہوگا، جب دوسرا تیسرا، اور چوتھا بھی ہو، اور یگانگی بحت کے مرتبہ میں دوسرے اور تیسرے کی گنجائش ہی نہیں لیکن جب "احدیت" نے "واحدیت" کے مرتبہ میں نزول کیا، تو اب "ہوالاوّل" کا مرتبہ ظہور میں آگیا، اور جب اوّل ہوا تو دوسرے تیسرے اور چوتھے کے تعینات بھی ظہور میں آنے لگے۔ وما احلی قول الشاعر العارف:

دریائے کہن چو بر زند موجِ نو ۔۔۔ موجش خوانند، و فی الحقیقت دریاست

ہیں۔ وہ نور ہی نور ہے کمال ہی کمال ہے حُسن ہی حُسن ہے سرتاسر پاکی ہے سب سے زیادہ طاقتور سب سے زیادہ رحم و محبت والا، ساری عبادتوں اور عاشقیوں کا مقصود حقیقی!

لیکن ساتھ ہی دوسری طرف، یہ حقیقت بھی ہمیں صاف صاف دکھائی دیتی ہے کہ توحیدی تصوّر کی یہ بلندی بھی اِشراک اور تعدّد کی آمیزش سے خالی نہیں رہی، اور توحید فی الذّات کے ساتھ توحید فی الصّفات کا بے میل عقیدہ جلوہ گر نہ ہو سکا۔ زمانۂ حال کے ایک قابل ہندو مصنف کے لفظوں میں دراصل اشتراکی اور تعدّدی تصوّر (Polytheistic) ہندوستانی دل و دماغ میں اس درجہ جڑ پکڑ چکا تھا کہ اب اسے یک قلم اُکھاڑ کے پھینک دینا آسان نہ تھا۔ اس لیے ایک یگانہ ہستی کی جلوہ طرازی کے بعد بھی دوسرے خدا نابود نہیں ہو گئے۔ البتہ اُس یگانہ ہستی کا قبضہ و اقتدار اُن سب پر چھا گیا اور سب اُس کی ماتحتی میں آ گئے[1]۔

اب اس طرح کی تصریحات ہمیں ملنے لگتی ہیں کہ بغیر اس بالاتر ہستی (برہماں) کے "اگنی" دیبی کچھ نہیں کر سکتی "یہ اسی کا (برہماں کا) خوف ہے جو تمام دیوتاؤں سے اُن کے فرائض منصبی انجام دلاتا ہے" (تیتترا اوپانی شد) راجہ اشواپتی نے جب پانچ گھر والوں سے پوچھا "تم اپنے دھیان میں کس کی پرستش کرتے ہو؟" تو ان میں سے ہر ایک نے ایک ایک دیوتا کا نام لیا۔ اس پر اشواپتی نے کہا "تم میں سے ہر ایک نے حقیقت کے صرف ایک ہی حصّہ کی پرستش کی، حالانکہ وہ سب کے ملنے سے شکل پذیر ہوتی ہے۔ "اندر" اس کا سر ہے۔ "سوریہ" (سورج) اس کی آنکھیں ہیں۔ "وایو" سانس ہے۔ "آکاش" (ایتھر) جسم ہے۔ "دھرتی" (زمین) اُس کا پانوں ہے۔" (ایضاً)[2]

لیکن پھر ساتھ ہی یہ بھی ہے کہ جب حقیقت کی قیّومیت اور احاطہ پر زور دیا جاتا ہے تو تمام موجودات کے ساتھ دیوتاؤں کی ہستی بھی غائب ہو جاتی ہے، کیونکہ تمام موجودات اُسی پر موقوف ہیں۔ وہ کسی پر موقوف نہیں "جس طرح رتھ کے پہیے کی تمام شاخیں ایک ہی دائرہ کے اندر اپنا وجود رکھتی ہیں، اسی طرح تمام چیزیں، تمام دیوتا، تمام دنیائیں، اور تمام آلات اُسی ایک وجود کے اندر ہیں" (برہادرنیاک اوپانی شد باب ۲-۵) یہاں وہ درخت موجود ہے جس کی جڑ اوپر کی طرف چلی گئی ہے اور شاخیں نیچے کی طرف پھیلی ہوئی ہیں۔ یہ برہماں ہے لافانی۔ تمام کائنات اس میں ہے۔ کوئی اس سے باہر نہیں" (تیتترا-۱-۱۰)

یہاں ہم مصنف موصوف کے الفاظ پھر مستعار لیتے ہیں "یہ دراصل ایک سمجھوتا تھا جو چند خاص ماغول کے فلسفیانہ تصوّر نے انسانی بھیڑ کے وہم پرستانہ ولولوں کے ساتھ کر لیا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ خواص اور عوام

---

[1] پروفیسر اس۔ رادھا کرشناں: انڈین فلاسفی جلد اوّل صفحہ ۱۴۴۔ طبع ثانی۔

[2] اگر اوپانی شد کی اشتراکی لچک کے دوسرے صریح شواہد موجود نہ ہوتے تو اس طرح کی تصریحات بہ آسانی مجازات پر محمول کی جا سکتی تھیں۔ چنانچہ دارا شکوہ نے انہیں استعارات ہی پر محمول کیا ہے +

یہ بات پیش نظر رکھنی چاہیے کہ اوپانی شد ایک سو آٹھ ہیں اور مختلف عہدوں میں مرتب ہوئے ہیں ہر اوپانی شد اپنے عہد کے تدریجی تصوّرات و مباحث کے اثرات پیش کرتا ہے، اور یہاں جو کچھ لکھا گیا ہے وہ اُن نتائج پر مبنی ہے جو مجموعی حیثیت سے نکالے گئے ہیں +

کی فکری موافقت کی ایک آب وہوا پیدا ہوگئی اور وہ برابر قائم رہی"۔

آگے چل کر ویدانت کے فلسفہ نے بڑی وسعتیں اور گہرائیاں پیدا کیں، لیکن خواص کے توحیدی تصوّر میں عوام کے اشراکی تصوّر سے مفاہمت کا جو میلان پیدا ہوگیا تھا، وہ متزلزل نہ ہوسکا۔ بلکہ اور زیادہ مضبوط اور وسیع ہوتا گیا۔ یہ بات عام طور پر تسلیم کرلی گئی کہ سالک جب عرفانِ حقیقت کی منزلیں طے کرلیتا ہے تو پھر ماسوی کی تمام ہستیاں معدوم ہوجاتی ہیں، اور ماسوی میں دیوتاؤں کی ہستیاں بھی داخل ہیں۔ گویا دیوتاؤں کی ہستیاں مظاہرِ وجود کی ابتدائی تعیّنات ہوئیں۔ لیکن ساتھ ہی یہ بنیاد بھی برابر قائم رکھی گئی کہ جب تک اس آخری مقامِ عرفان تک رسائی حاصل نہ ہوجائے دیوتاؤں کی پرستش کے بغیر چارہ نہیں اور اُن کی پرستش کا جو نظام قائم ہوگیا ہے، اسے چھیڑنا نہیں چاہیے۔ اس طرح گویا ایک طرح کے توحیدی۔ اشراکی تصوّر (Monotheistic Polytheism) کا مخلوط مزاج پیدا ہوگیا جو بہ یک وقت فکر ونظر کا توحیدی تقاضہ بھی پورا کرنا چاہتا تھا اور ساتھ ہی اصنامی عقائد کا نظامِ عمل بھی سنبھالے رکھنا چاہتا تھا۔ ویدانت کے بعض مذہبوں میں تو یہ مخلوط نوعیت بنیادی تصوروں تک سرایت کرگئی۔ مثلاً نِمبارک اور اُس کا شاگرد سری نواس برہم سوتر کی شرح کرتے ہوئے ہمیں بتلاتے ہیں کہ "اگرچہ برہما یا کرشن کی طرح کوئی نہیں مگر اس سے ظہور میں آئی ہوئی دوسری قوتیں بھی ہیں جو اُس کے ساتھ اپنی نمود رکھتی ہیں اور اُسی کی طرح کارفرمائی میں شریک ہیں۔ چنانچہ کرشن کے بائیں طرف رادھا ہے۔ یہ بخشش ونوال کی ہستی ہے۔ تمام نتائج وثمرات بخشنے والی۔ ہمیں چاہیے کہ برہما کے ساتھ رادھا کی بھی پرستش کریں"۔[۱]

اس موقع پر یہ حقیقت بھی پیشِ نظر رکھنی چاہیے کہ فطرتِ کائنات کے جن قوائے مدبرہ کو سامی تصوّر نے "ملاک" اور "ملائکہ" سے تعبیر کیا تھا، اسی کو آریائی تصوّر نے "دیو" اور "یزتا" سے تعبیر کیا۔ یونانیوں کا "تھیوس" (Θεος) رومیوں کا ڈے یوس (Deus) پارسیوں کا "یزتا" (یزداں) سب کے اندر وہی ایک بنیادی مادّہ اور وہی ایک بنیادی تصوّر کام کرتا رہا۔ سنسکرت میں "دیو" ایک لچکدار لفظ ہے جو متعدد معنوں میں مستعمل ہوا ہے لیکن جب مافوق الفطرت ہستیوں کے لیے بولا جاتا ہے تو اس کے معنی ایک ایسی غیر مادّی اور روحانی ہستی کے ہوجاتے ہیں جو اپنے وجود میں روشن اور درخشاں ہو۔ سامی ادیان نے ان روحانی ہستیوں کی حیثیت اس سے زیادہ نہیں دیکھی کہ وہ خدا کی پیدا کی ہوئی کارکن ہستیاں ہیں۔ لیکن آریائی تصوّر نے ان میں تدبیر وتصرّف کی بالاستقلال طاقتیں دیکھیں، اور جب توحیدی تصوّر کے قیام سے وہ استقلال باقی نہیں رہا تو توسّل اور تزلف کا درمیانی مقام اُنہوں نے پیدا کرلیا۔ یعنی اگرچہ وہ خود خدا نہیں ہیں، لیکن خدا تک پہنچنے کے لیے ان کی پرستش ضروری ہوئی۔ ایک پرستار کی

---

[۱] ویدانت پاریجات سورابھ جلد سوم صفحہ ۲۵۔ اس کا انگریزی ترجمہ مسز رومابوس ڈاکٹر نے رائل ایشیاٹک سوسائٹی بنگال نے حال میں شائع کیا ہے۔

پرستش اگرچہ ہوگی معبودِ حقیقی کے لیے، مگر ہوگی اُنہی کے آستانوں پر۔ ہم براہِ راست خدا کے آستانے تک پہنچ نہیں سکتے ہیں پہلے دیوتاؤں کے آستانوں کا وسیلہ پکڑنا چاہیے۔ دراصل یہی توسّل و تزلّف کا عقیدہ ہے جس نے ہر جگہ توحیدی اعتقاد و عمل کی تکمیل میں خلل ڈالا۔ ورنہ ایک خدا کی یگانگی اور بالاتری سے تو کسی کو بھی انکار نہ تھا۔ عربِ جاہلیۃ کے بُت پرستوں کا بھی یہی عقیدہ قرآن نے نقل کیا ہے کہ مانعبدھم، الا لیقربونا الی اللہ زلفیٰ۔

بہرحال شرک فی الصفات اور شرک فی العبادت کا یہی وہ عنصری مادہ تھا جس نے ہندوستان کے عملی مذہب کو سرتاسر اشراک اور اصنام پرستی کے عقائد سے معمور کردیا، اور بالآخر یہ صورتِ حال اس درجہ گہری اور عام ہوگئی کہ جب تک ایک سُراغ رساں جستجو اور تفحّص کی دور دراز مسافتیں طے نہ کرلے، ہندو عقیدہ کے توحیدی تصوّر کا کوئی نشان نہیں پا سکتا۔ توحیدی تصوّر نے یہاں ایک ایسے راز کی نوعیت پیدا کرلی جس تک صرف خاص خاص عارفوں ہی کی رسائی ہوسکتی ہے۔ ہم اس کا سُراغ پہاڑوں کے غاروں میں پا سکتے ہیں لیکن کوچہ و بازار میں نہیں پا سکتے۔ گیارھویں صدی مسیحی میں جب ابوریحان بیرونی ہندوستان کے علوم و عقائد کے سُراغ میں نکلا تھا تو یہ متضاد صورتِ حال دیکھ کر حیران رہ گیا تھا۔ سولھویں صدی میں ویسی ہی حیرانی ابوالفضل کو پیش آئی، اور پھر اٹھارھویں صدی میں سر ولیم جونس کو۔

بہترین معذرت جو اس صورتِ حال کی کی جا سکتی ہے، وہ وہی ہے جس کا اشارہ گیتا کے شہرۂ آفاق ترانوں میں ہمیں ملتا ہے اور جس نے البیرونی کے فلسفیانہ دماغ کو بھی اپنی طرف متوجہ کرلیا تھا یعنی یہاں پہلے دن سے عقائد و عمل کی مختلف راہیں مصلحۃً کھلی رکھی گئیں تاکہ خواص اور عوام دونوں کی فہم و استعداد کی رعایت ملحوظ رہے۔ توحیدی تصوّر خواص کے لیے تھا۔ کیونکہ وہی اس بلند مقام کے متحمل ہو سکتے تھے۔ اصنامی تصوّر عوام کے لیے تھا۔ کیونکہ اُن کی طفلانہ عقول کے لیے یہی راہ موزوں تھی۔ اور پھر چونکہ خواص بھی جمعیت و معاشرت کے عام ضبط و نظم سے باہر نہیں رہ سکتے، اس لیے عملی زندگی میں انہیں بھی اصنام پرستی کے تقاضے پورے کرنے ہی پڑتے تھے۔ اور اس طرح ہندو زندگی کی بیرونی وضع و قطع بلا استثنا اشراک اور اصنام پرستی ہی کی رہتی آئی۔

البیرونی نے حکماءِ یونان کے اقوال نقل کر کے دکھایا ہے کہ اس بارے میں ہندوستان اور یونان، دونوں کا حال ایک ہی طرح کا رہا۔ پھر گیتا کا یہ قول نقل کیا ہے کہ "بہت سے لوگ مجھ تک (یعنی خدا تک) اس طرح پہنچنا چاہتے ہیں کہ میرے سوا دوسروں کی عبادت کرتے ہیں، لیکن میں اُن کی مرادیں بھی پوری کر دیتا ہوں۔ کیونکہ میں اُن سے اور اُن کی عبادت سے بے نیاز ہوں"[1]

---

[1] البیرونی نے کتاب الہند میں بعض سنسکرت کتابوں سے بتوں کے بنانے کے احکام و قواعد نقل کیے ہیں۔ اس کے بعد لکھتا ہے:
وکان الغرض فی حکایۃ ھذا الھذیان ان تعرف الصورۃ من صنمھا اذا شوھد، ویتحقق ما قلنا (باقی بر صفحہ ۱۴۳)

بے محل نہ ہوگا اگر اس موقعے پر زمانۂ حال کے ایک ہندو مصنف کی رائے پر بھی نظر ڈال لی جائے۔ گوتم بدھ کے ظہور سے پہلے ہندو مذہب کے تصورِ الوہیت نے جو عام شکل و صورت پیدا کر لی تھی، اس پر بحث کرتے ہوئے یہ قابل مصنف لکھتا ہے:

"گوتم بدھ کے عہد میں جو مذہب ملک پر چھایا ہوا تھا، اس کے نمایاں خط و خال یہ تھے کہ مین دین کا ایک سودا تھا جو خدا اور انسانوں کے درمیان ٹھہر گیا تھا۔ جبکہ ایک طرف اوپانی شد کا برہان تھا جو ذاتِ الوہیت کا ایک اعلیٰ اور شائستہ تصور پیش کرتا تھا، تو دوسری طرف اَن گنت خداؤں کا ہجوم تھا جن کے لیے کوئی حد بندی نہیں ٹھہرائی جا سکتی تھی۔ آسمان کے ستارے، مادہ کے عناصر، زمین کے درخت، جنگل کے حیوان، پہاڑوں کی چٹانیں، دریاؤں کی جدولیں، غرضکہ موجوداتِ خلقت کی کوئی قسم ایسی نہ تھی جو خدائی حکومت میں شریک نہ کر لی گئی ہو۔ گویا ایک بے لگام اور خود رو تخیل کو پروانہ مل گیا تھا کہ دنیا کی جتنی چیزوں کو خدائی مسند پر بٹھا سکتا ہے، بے روک ٹوک بٹھاتا رہے۔ پھر جیسے خداؤں کی یہ بے شمار بھیڑیں بھی اُس کے ذوقِ خدا سازی کے لیے کافی نہ ہوتی ہوں۔ طرح طرح کے عفریتوں اور عجیب الخلقت جسموں کی متخیلہ صورتوں کا بھی اُن پر اضافہ ہوتا رہا۔ اس میں شبہ نہیں کہ اوپانی شدوں نے فکر و نظر کی دنیا میں اِن خداؤں کی سلطانی برہم کر دی تھی لیکن عمل کی زندگی میں اُنہیں نہیں چھیڑا گیا۔ وہ بدستور اپنی خدائی مسندوں پر جمے رہے"۔[۱]

شمنی مذہب اور اُس کے تصورات

قدیم برہمنی مذہب کے بعد شمنی مذہب (یعنی بودھ مذہب) کا ظہور ہوا۔ اسلام کے ظہور سے پہلے ہندوستان کا عام مذہب یہی تھا۔ شمنی مذہب کی اعتقادی مبادیات کی مختلف تفسیریں کی گئی ہیں۔ انیسویں صدی کے مستشرقوں کے ایک گروہ نے اسے اوپانی شدوں کی تعلیم ہی کا ایک عملی استغراق قرار دیا تھا اور خیال کیا تھا کہ "نِروان" میں جذب و انفصال کی روحانی اصل پوشیدہ ہے یعنی جس سرچشمہ سے انسانی ہستی نکلی ہے، پھر اُسی میں واصل ہو جانا "نروان" یعنی نجاتِ کامل ہے لیکن اب عام طور پر تسلیم کر لیا گیا ہے کہ شمنی مذہب خُدا اور روح کی ہستی کا کوئی تصور نہیں رکھتا۔ اس کا دائرۂ اعتقاد و عمل صرف زندگی کی سعادت اور نجات کے مسئلہ میں محدود ہے۔ وہ صرف پرکرتی یعنی مادۂ ازلی کا حوالہ دیتا ہے جسے کائناتی طبیعت حرکت میں لاتی ہے۔ "نروان" سے مقصود یہ ہے کہ ہستی کی انانیت فنا ہو جائے اور زندگی کے چکر سے نجات مل جائے۔ اس میں شک نہیں کہ جہاں تک

(بقیہ صفحہ ۱۴۲) من ان ھذہ الاصنام للعوام الذین سفلت مراتبھم و قصرت معارفھم، فما عمل صنم قط باسم من علا المادۃ فضلا عن اللہ تعالیٰ، ولیعرف کیف یعبد السفل بالتمویھات، وکذلک قیل فی کتاب گیتا ان کثیرا من الناس یتقربون فیما یغیم الیّ بغیری، ویتوسلون بالصدقات والتسبیح والصلوٰۃ لسوای، فاقویھم علیھا، واوفقھم لھا، واوصلھم الیٰ اراداتھم، لاستغنائی عنھم (صفحہ ۵۹) آج کل کے تمام ہندو اہل نظر جو ہندو عقائد و تصورات کی فلسفیانہ تعبیر کرنی چاہتے ہیں، عموماً یہی توجیہ پیش کرتے ہیں جو البیرونی نے پیش کی تھی۔ ابوالفضل اور دارا شکوہ نے بھی یہی خیال ظاہر کیا ہے۔

[۱] پروفیسر ایس۔ رادھا کرشنان۔ انڈین فلاسفی، جلد اوّل صفحہ ۳۵۲۔ طبع ثانی۔

مابعد زمانے کے ضمنی مفکّروں کی تصریحات کا تعلق ہے، یہی تفسیر صحیح معلوم ہوتی ہے۔ اگر ان کا ایک گروہ لاادریت (Agnosticism) تک پہنچ کر رک گیا ہے، تو دوسرا گروہ اس سے بھی آگے نکل گیا ہے اور اس نے علانیہ انکار کی راہ اختیار کی ہے۔ موکشا آکر گپتا نے "ترکؔ بھاشا"[1] میں ان تمام دلائل کا رد کیا، جو نیائے[2] اور ویشیشک طریقِ نظر کے نظّار خدا کی ہستی کے اثبات میں پیش کرتے تھے۔ تاہم یہ بات بھی قطعی طور پر نہیں کہی جا سکتی کہ خود گوتم بدھ کا سکوت و توقف بھی انکار ہی پر مبنی تھا۔ اس کے سکوتی تحفظات متعدد مسئلوں میں ثابت ہیں، اور اس کے متعدد محمل قرار دیئے جا سکتے ہیں۔ اگر ان تمام اقوال پر جو براہِ راست اس کی طرف منسوب ہیں، غور کیا جائے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اُس کا مسلک نفیِ ذات کا نہ تھا نفیِ صفات کا تھا۔ اور نفیِ صفات کا مقام ایسا ہے کہ انسانی فکر و زبان کی تمام تعبیرات معطّل ہو جاتی ہیں اور سکوت کے سوا چارۂ کار باقی نہیں رہتا۔

علاوہ بریں یہ حقیقت بھی فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ اس کے ظہور کے وقت اصنامی خدا پرستی کے نقائص بہت گہرے ہو چکے تھے، اور اصنامی خدا پرستی بجائے خود راہِ حقیقت کی سب سے بڑی روک بن گئی تھی۔ اس نے اس روک سے راستہ صاف کر دینا چاہا، اور تمام توجہ زندگی کی عملی سعادت کے مسئلہ پر مرکوز کر دی۔ اس صورتِ حال کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ برہمنی خدا پرستی کے عقائد سے انکار کیا جائے اور اس پر زور دیا جائے کہ نجات کی راہ ان معبودوں کی پرستش میں نہیں ہے بلکہ علمِ حق اور عملِ حق میں ہے۔ یعنی "اشٹانگ مارگ"[3] میں ہے۔ آگے چل کر اس اضافی انکار نے مطلق انکار کی شکل پیدا کر لی، اور پھر برہمنی مذہب کی مخالفت کے غلو نے معاملہ کو دور تک پہنچا دیا[4]۔

بہرحال خود گوتم بدھ اور اُس کی تعلیم کے شارحوں کی تصریحات اس بارے میں کچھ ہی رہی ہوں، مگر یہ واقعہ ہے کہ اُس کے پیرؤوں نے خدا کے تصوّر کی خالی مسند بہت جلد بھر دی۔ انہوں نے اس مسند کو خالی دیکھا، تو خود گوتم بدھ کو وہاں لا کر بٹھا دیا، اور پھر اس نئے معبود کی پرستش اس جوش و خروش کے ساتھ شروع کر دی کہ

---

[1] یہ قدیم کتاب جس کا صرف تبتی نسخہ دنیا کے علم میں آیا تھا، اب اصل سنسکرت میں نکل آئی ہے اور گائیکواڑ اورینٹل سیریز کے ادارے نے حال میں شائع کر دی ہے۔ میسور کا مشرقی کتب خانہ بھی اس کا ایک دوسرا نسخہ اشاعت کے لیے مرتب کر رہا ہے ۱۲۔

[2] "نیائے" یعنی منطق "ویشیشک" طریقِ نظر سے مقصود منطقی نقد و تحلیل کا ایک خاص مسلک ہے ۱۲

[3] گوتم بدھ کی تعلیم میں "اشٹانگ مارگ" یعنی آٹھ باتوں کا طریقہ ایک بنیادی اصل ہے۔ آٹھ باتوں سے مقصود علم اور عمل کا تزکیہ و طہارت ہے۔ علمِ حق، رحم و شفقت، قربانی، ہوا و ہوس سے آزادی خودی کو مٹانا وغیرہ۔

[4] میں تسلیم کرتا ہوں کہ یہ میرا ذاتی استنباط ہے۔ اور مجھے حق نہیں کہ اپنی رائے کو وثوق کے ساتھ اُن محققوں کے مقابلہ میں پیش کروں جنہوں نے اس موضوع کے مطالعہ میں زندگیاں بسر کر دی ہیں۔ تاہم میں مجبور ہوں کہ اپنی محدود معلومات کی روشنی میں جن نتائج تک پہنچا ہوں، ان سے دست بردار نہ ہوں۔ یورپ کے محققوں نے بدھ مذہب کے مصادر کی جستجو و فراہمی میں بڑی کدوکاوش کی ہے اور پالی زبان کے تمام اہم مصادر فرنچ یا انگریزی میں منتقل کر لیے ہیں۔ میں نے حتی الامکان اس تمام مواد کے مطالعہ کی کوشش کی اور بالآخر اسی نتیجہ تک پہنچا۔

آدمی سے زیادہ دنیا اُس کے بتوں سے معمور ہو گئی!

آوارۂ غربت نتواں دید صنم را
وقتست کہ دِگر بتکدہ سازند حرم را!

گوتم بدھ کی وفات پر ابھی زیادہ زمانہ نہیں گزرا تھا کہ پیروانِ بدھ کی اکثریت نے اُس کی شخصیت کو عام انسانی سطح سے بالاتر دیکھنا شروع کر دیا تھا، اور اُس کے آثار و تبرکات کی پرستش کا میلان بڑھنے لگا تھا۔ اس کی وفات کے کچھ عرصہ بعد جب مذہب کی پہلی مجلس اعظم راج گیری میں منعقد ہوئی اور اُس کے شاگرد خاص آنند نے اُس کی آخری وصایا بیان کیں تو بیان کیا جاتا ہے کہ لوگ اُس کی روایت پر مطمئن نہ ہوئے اور اُس کے مخالف ہو گئے، کیونکہ اُس کی روایتوں میں انہیں وہ ماورائِ انسانیت عظمت نظر نہیں آئی جسے اب اُن کی طبیعت ڈھونڈھنے لگی تھی۔ تقریباً سو برس بعد جب دوسری مجلس ویسالی (مظفرپور حالی) میں منعقد ہوئی، تو اب مذہب کی بنیادی سادگی اپنی جگہ کھو چکی تھی اور اُس کی جگہ نئے نئے تصوروں اور مخلوط عقیدوں نے لے لی تھی۔ اب مسیحی مذہب کے اقانیم ثلاثہ کی طرح جو پانچ سو برس بعد ظہور میں آنے والا تھا، ایک ثمنی اقانیم کا عقیدہ بدھ کی شخصیت کے گردہالے کی طرح چمکنے لگا اور عام انسانی سطح سے وہ ماوراء تسلیم کر لی گئی۔ یعنی بدھ کی ایک شخصیت کے اندر تین وجودوں کی نمود ہو گئی، اس کی تعلیم کی شخصیت، اُس کے دُنیاوی وجود کی شخصیت، اُس کے حقیقی وجود کی شخصیت۔ یہ آخری شخصیت لوک (بہشت) میں رہتی ہے۔ دُنیا میں جب کبھی بدھ کا ظہور ہوتا ہے تو یہ اُس حقیقی وجود کا ایک پر تو ہوتا ہے۔ نجات پالنے کے معنی یہ ہوئے کہ آدمی حقیقی بدھ کے اسی ماورائِ عالم مسکن میں پہنچ جائے۔

پہلی صدی مسیحی میں بعد کوشان جب چوتھی مجلس پرشاور (پشاور حالی) میں منعقد ہوئی تو اب بنیادی مذہب کی جگہ ایک طرح کا کلیسائی مذہب قائم ہو چکا تھا۔ اور بدھ کے اشٹانگ مارگ (طریق ثمانیہ) کی عملی روح طرح طرح کی رسوم پرستیوں اور قواعد آرائیوں میں معدوم ہو چکی تھی۔

بالآخر پیروانِ بدھ دو بڑے فرقوں میں بٹ گئے۔ "ہینیان" اور "مہایان" پہلا فرقہ بدھ کی شخصیّت میں ایک رہنما اور معلّم کی انسانی شخصیّت دیکھنی چاہتا تھا، لیکن دوسرے نے سے پوری طرح ماورائِ انسانیت کی ربانی سطح پر متمکن کر دیا تھا، اور پیروانِ بدھ کی عام راہ وہی ہو گئی تھی۔ افغانستان، بامیان، وسط ایشیا، چین، کوریا، جاپان، تبت، سب میں مہایان مذہب ہی کی تبلیغ و اشاعت ہوئی۔ چینی سیاح فاہین جب چوتھی صدی مسیحی میں ہندوستان آیا تھا تو اُس نے پورب کے ہینیان شمنیوں سے مباحثہ کیا تھا اور مہایان طریقہ کی صداقت کے دلائل پیش کیے تھے۔ موجودہ زمانے میں سیلون کے سوا جہاں ہینیان طریقے کا ایک محرّف بقیہ "تھیراواد" کے نام سے پایا جاتا ہے، تمام پیروانِ بدھ کا مذہب مہایان ہے۔

موجودہ زمانے کے بعض محققینِ شمنیہ کا خیال ہے کہ اشوک کے زمانہ تک بدھ مذہب میں بُت پرستی کا عام رواج نہیں ہوا تھا۔ کیونکہ اُس عہد تک کے جو بدھ آثار ملتے ہیں، اُن میں بدھ کی شخصیت کسی بُت کے ذریعہ نہیں بلکہ صرف ایک کنول کے پھول یا ایک خالی کرسی کی شکل میں دِکھائی گئی ہے۔ پھر کنول اور خالی کرسی کی جگہ دو قدم نمودار ہونے لگے، اور پھر بتدریج قدموں کی جگہ خود بودھ کا پورا مجسمہ نمودار ہو گیا۔ اگر یہ استنباط صحیح تسلیم کر لیا جائے جب بھی ماننا پڑیگا کہ اشوک کے زمانے کے بعد سے بودھ کے بتوں کی عام پرستش جاری ہو گئی تھی۔ اشوک کا عہد ۲۵۰ قبل از مسیح تھا۔

(۳) ایرانی مجوسی تصور | زردشت کے ظہور سے پہلے ماد (میڈیا) اور پارس میں ایک قدیم ایرانی[1] طریق پرستش رائج تھا۔ ہندستان کے ویدیں میں دیوتاؤں کی پرستش اور قربانیوں کے اعمال و رسوم جس طرح کے پائے جاتے ہیں، قریب قریب ویسے ہی عقائد و رسوم پارس اور ماد میں بھی پھیلے ہوئے تھے۔ دیوتائی طاقتوں کو ان کے دو بڑے مظہروں میں تقسیم کر دیا تھا۔ ایک طاقت روشن ہستیوں کی تھی جو انسان کو زندگی کی تمام خوشیاں بخشتی تھی۔ دوسری بُرائی کے تاریک عفریتوں کی تھی جو ہر طرح کی مصیبتوں اور ہلاکتوں کا سرچشمہ تھی۔ آگ کی پرستش کے لیے قربان گاہیں بنائی جاتی تھیں اور ان کے پجاریوں کو "موگوش" کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ اوستا کے گاتھا میں اُنہیں "کارپان" اور "کادی" کے نام سے بھی پُکارا گیا ہے۔ آگے چل کر اسی "موگوش" نے آتش پرستی کا مفہوم پیدا کر لیا اور غیر قومیں ایرانیوں کو "مگ" اور "مگوش" کے نام سے پکارنے لگیں۔ عربوں نے اسی "موگوش" کو "مجوس" کر دیا۔

مزدیسنا | زردشت کا جب ظہور ہوا تو اُس نے ایرانیوں کو ان قدیم عقائد سے نجات دلائی اور "مزدیسنا" کی تعلیم دی۔ یعنی دیوتاؤں کی جگہ ایک خدائے واحد "اہورا مزدَ" کی پرستش کی۔ یہ اہورا مزد یگانہ ہے، بے ہمتا ہے، بے مثال ہے انور ہے، پاکی ہے۔ سرتاسر حکمت اور خیر ہے، اور تمام کائنات کا خالق ہے۔ اُس نے انسان کے لیے دو عالم بنائے ایک عالم دنیوی زندگی کا ہے۔ دوسرا مرنے کے بعد کی زندگی کا۔ مرنے کے بعد جسم فنا ہو جاتا ہے مگر روح باقی رہتی ہے اور اپنے اعمال کے مطابق جزا پاتی ہے۔

دیوتاؤں کی جگہ اس نے "امش سپند" اور "یزتا" کا تصوّر پیدا کیا یعنی فرشتوں کا۔ یہ فرشتے اہورا مزد کے احکام کی تعمیل کرتے ہیں۔ بُرائی اور تاریکی کی طاقتوں کی جگہ "انگرامے نیوش" کی ہستی کی خبر دی۔ یعنی شیطان کی یہی "انگرامے نیوش" پازندگی زبان میں "اہرمن" ہو گیا۔

---

[1] "ایرابان" وہی لفظ ہے جو ہندستان میں "آریا" ہو گیا۔ اوستا میں چوبیس ملکوں کی پیدایش کا ذکر کیا گیا ہے، جس میں سب سے پہلا اور سب سے بہتر "ایریانا ویج" ہے اور غالباً اس سے شمالی ایران مقصود ہے (وندیداد۔ فرگرد اول۔ فقرہ ۲) ہرمزد یشت کے فقرہ ۲۱ میں بھی "ایریانا ویج" کا ذکر کیا ہے اور اس پر درود بھیجا ہے۔ "ویج" جرمن مستشرق اسپیگل کی قرأت ہے۔ آنکتیل نے اسے "دیگو" پڑھا تھا۔ "ویج" یا "دیگو" کے معنی پہلوی میں مبارک کے ہیں۔ یعنی مبارک ایریانا کی سرزمین۔

زردشت کی تعلیم میں ہندوستانی آریاؤں کے ویدی عقائد کا رد صاف صاف نمایاں ہے۔ ایک ہی نام ایران اور ہندوستان دونوں جگہ ابھرتا ہے اور متضاد معنی پیدا کر لیتا ہے۔ اوستا کا "اہورا" سام اور یجروید میں "اسورا" ہے، اور اگرچہ رگ وید میں اس کا اطلاق اچھے معنوں پر ہوا تھا، مگر اب وہ برائی کی شیطانی روح بن گیا ہے۔ ویدوں کا "اندرا" اوستا کا "انگرا" ہو گیا۔ ویدوں میں وہ آسمان کا خدا تھا۔ اوستا میں زمین کا شیطان ہے۔ ہندوستان اور یورپ میں "دیو" اور "ڈے یوس" اور "تھیوس" خدا کے لیے بولا گیا، لیکن ایران میں "دیو" کے معنی عفریتوں کے ہو گئے۔ گویا دونوں عقیدے ایک دوسرے سے لڑ رہے تھے۔ ایک کا خدا دوسرے کا شیطان ہو جاتا تھا، اور دوسرے کا شیطان پہلے کے لیے خدا کا کام دیتا تھا۔ اسی طرح ہندوستان میں یم موت کی طاقت ہے۔ اوستا کی روایتوں میں "یم" زندگی اور انسانیت کی سب سے بڑی نمود ہوئی، اور پھر یہی یم، جم ہو کر جمشید ہو گیا!

فسانہا کہ بہ بازیچہ روزگار سرود

کنوں بر مسندِ جمشید و تاجِ کے بستند!

لیکن معلوم ہوتا ہے کہ چند صدیوں کے بعد ایران کے قدیم تصورات اور بیرونی اثرات پھر غالب آ گئے، اور ساسانی عہد میں جب "مزدیسنا" کی تعلیم کی از سر نو تدوین ہوئی تو بہ قدیم مجوسی، یونانی اور زردشتی عقائد کا ایک مخلوط مرکب تھا، اور اس کا بیرونی رنگ و روغن تو تمام تر مجوسی تصور ہی نے فراہم کیا تھا۔ اسلام کا جب ظہور ہوا تو یہی مخلوط تصور ایران کا قومی مذہبی تصور تھا۔ مغربی ہند کے پارسی مہاجر یہی تصور اپنے ساتھ ہندوستان لائے، اور پھر یہاں کے مقامی اثرات کی ایک تہ اس پر اور چڑھ گئی۔

مجوسی تصور کی بنیاد ثنویت (Dualism) کے عقیدہ پر تھی۔ یعنی خیر اور شر کی دو الگ الگ قوتیں ہیں۔ اہورا مزدا جو کچھ کرتا ہے، خیر اور روشنی ہے۔ انگرا نیوش یعنی اہرمن جو کچھ کرتا ہے شر اور تاریکی ہے۔ عبادت کی بنیاد سورج اور آگ کی پرستش پر رکھی گئی کہ روشنی یزدانی صفات کی سب سے بڑی مظہر ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ مجوسی تصور نے خیر اور شر کی گتھی یوں سلجھانی چاہی کہ کارخانۂ ہستی کی سربراہی دو متقابل اور متعارض قوتوں میں تقسیم کر دی +

(۴) یہودی تصور یہودی تصور ابتداء میں ایک محدود نسلی تصور تھا۔ یعنی کتاب پیدائش کا "یہوا" خاندانِ اسرائیل کے نسلی خدا کی حیثیت سے نمایاں ہوا تھا۔ لیکن پھر یہ تصور بہ تدریج وسیع ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ یشعیا دوم[1] کے صحیفہ میں "تمام قوموں کا خدا" اور "تمام قوموں کا ہیکل" نمایاں ہو گیا۔ تاہم "اسرائیلی خدا" کا نسلی اختصاص کسی نہ کسی شکل میں

[1] عہد عتیق میں یشعیا نبی کی طرف جو کتاب منسوب ہے، اُس کی زبان اور مطالب کا آیت ۴۰ تک ایک خاص انداز ہے، اور پھر اس کے بعد بالکل دوسرا ہو جاتا ہے۔ ابتدائی حصہ ایک ایسے شخص کا کلام معلوم ہوتا ہے جو قید بابل سے پہلے تھا۔ لیکن بعد کے حصہ میں قید بابل کے زمانے کے اثرات صاف صاف نمایاں ہیں۔ اس لیے انیسویں صدی کے نقادوں نے اسے دو شخصوں کے کلام میں تقسیم کر دیا۔ ایک کو یشعیا اول اور دوسرے کو دوم سے تعبیر کرتے ہیں۔

برابر کام کرتا ہی رہا، اور ظہورِ اسلام کے وقت اُس کے نمایاں خال و خط نسل اور جغرافیہ ہی کے خال و خط تھے۔
تجسم اور تنزیہہ کے اعتبار سے وہ ایک درمیانی درجہ رکھتا تھا، اور اس میں غالب عنصر قہر و غضب اور انتقام و تعذیب کا تھا۔ خدا کا بار بار متشکل ہو کر نمودار ہونا، مخاطبات کا تمام تر انسانی اوصاف و جذبات سے آلودہ ہونا، قہر و انتقام کی شدت، اور ابتدائی درجہ کا تمثیلی اسلوب، تورات کے صحیفوں کا عام تصور ہے۔

خدا کا انسان سے رشتہ اس نوعیت کا رشتہ ہوا، جیسے ایک شوہر کا اپنی بیوی سے ہوتا ہے۔ شوہر نہایت غیور ہوتا ہے۔ وہ اپنی بیوی کی ساری خطائیں معاف کر دیگا لیکن یہ جرم معاف نہیں کریگا کہ اُس کی محبت میں کسی دُوسرے مرد کو بھی شریک کرے۔ اسی طرح خاندانِ اسرائیل کا خدا بھی بہت غیور ہے، اُس نے اسرائیل کے گھرانے کو اپنی چہیتی بیوی بنایا، اور چونکہ چہیتی بیوی بنایا، اس لیے خاندان اسرائیل کی بے وفائی اور غیر قوموں سے آشنائی اُس پر بہت ہی شاق گزرتی ہے۔ اور ضروری ہے کہ وہ اس جُرم کے بدلے سخت سزائیں دے۔ چنانچہ احکامِ عشرہ (Ten Commandments) میں ایک حکم یہ بھی تھا "تو کسی چیز کی صورت نہ بنائیو اور نہ اُس کے آگے جھکیو۔ کیونکہ میں خداوند تیرا خدا رشک کرنے والا ایک بہت ہی غیور خدا ہوں" (خروج۔ ۲۱)
شوہر کے رشتہ کی یہ تمثیل جو مصر سے خروج کے بعد متشکل ہونا شروع ہو گئی تھی، آخر عہد تک کم و بیش قائم رہی۔ یہودیوں کی ہر گمراہی پر خدا کے غضب کا اظہار ایک غضبناک شوہر کا پرجوش اظہار ہوتا ہے جو اپنی چہیتی بیوی کو اس کی ایک ایک بے وفائی یاد دلا رہا ہو۔ یہ اسلوبِ تمثیل بظاہر کتنا ہی موثر اور شاعرانہ دکھائی دیتا ہو، لیکن اس میں شک نہیں کہ خدا کے تصور کے لیے ایک ابتدائی درجہ کا غیر ترقی یافتہ تصور تھا۔

(۵) مسیحی تصور لیکن یشعیاہ دوم کے زمانے سے اس صورتِ حال میں تبدیلی شروع ہوئی، اور یہودی تصور میں بہ یک وقت وسعت اور لطافت، دونوں طرح کے عناصر نمایاں ہونے لگے۔ گویا اب ایک نئی تصوری فضا کے لیے زمانے کا مزاج طیار ہونے لگا تھا۔ چنانچہ مسیحیت آئی تو رحم و محبت اور عفو و بخشش کا ایک نیا تصور لے کر آئی۔ اب خدا کا تصور نہ تو جابر بادشاہ کی طرح قہر آلود تھا۔ نہ رشک و غیرت میں ڈوبے ہوئے شوہر کی طرح سخت گیر تھا، بلکہ باپ کی محبت و شفقت کی مثال نمایاں کرتا تھا، اور اس میں شک نہیں کہ یہودی تصور کی شدت و غلظت کے مقابلے میں رحم و محبت کی رقت کا یہ ایک انقلابی تصور تھا۔ انسانی زندگی کے سارے رشتوں میں ماں اور باپ کا رشتہ سب سے بلند تر رشتہ ہے اس میں شوہر کے رشتہ کی طرح جذبوں اور خواہشوں کی غرضوں کو دخل نہیں ہوتا۔ یہ سر تا سر رحم و شفقت اور پرورش و چارہ سازی ہوتی ہے۔ اولاد بار بار قصور کریگی لیکن ماں کی محبت پھر بھی گردن نہیں موڑیگی اور باپ کی شفقت پھر بھی معافی سے انکار نہیں کریگی۔ پس اگر خدا کے تصور کے لیے انسانی رشتوں کی مشابہتوں سے کام لیے بغیر چارہ نہ ہو تو بلاشبہ شوہر کی تمثیل کے مقابلہ میں باپ کی

تمثیل کہیں زیادہ شائستہ اور ترقی یافتہ تمثیل ہے[1]۔

تجسّم اور تنزّہ کے لحاظ سے مسیحی تصوّر کی سطح اصلاً وہی تھی جہاں تک یہودی تصوّر پہنچ چکا تھا، مگر جب مسیحی عقائد کا رومی اصنام پرستی کے تصوّروں سے امتزاج ہوا، تو اقانیم ثلاثہ، کفارہ، اور مسیح پرستی کے تصوّرات چھا گئے، اور اسکندریہ کے فلسفہ آمیز اصنامی تصوّر سراپیز (Serapis) نے مسیحی اصنامی تصوّر کی شکل اختیار کرلی۔ اب مسیحیت کو بت پرستوں کی بت پرستی سے تو انکار تھا، لیکن خود اپنی بت پرستی پر کوئی اعتراض نہ تھا۔ میڈونا کے قدیم بت کی جگہ اب ایک نئی مسیحی میڈونا کا بت طیار ہوگیا۔ یہ خدا کے فرزند کو گود میں لیے ہوئے تھی، اور ہر راسخ الاعتقاد مسیحی کی جبینِ نیاز کا سجدہ طلب کرتی تھی!

غرضکہ قرآن کا جب نزول ہوا تو مسیحی تصوّر رحم و محبّت کی پدری تمثیل کے ساتھ اقانیم ثلاثہ، کفارہ، اور تجسّم کا ایک مخلوط اشراکی۔ توحیدی تصوّر تھا۔

فلاسفۂ یونان و اسکندریہ کا تصور

اِن تصوّروں کے علاوہ ایک تصوّر فلاسفۂ یونان کا بھی ہے جو اگرچہ مذاہب کے تصوّروں کی طرح اقوامِ عالم کا تصوّر نہ ہوسکا، تاہم انسان کی فکری نشوونما کی تاریخ میں اس نے بہت بڑا حصہ لیا، اور اس لیے اُسے نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔

تقریباً پانچ سو برس قبل از مسیح یونان میں توحید کا تصوّر نشوونما پانے لگا تھا۔ اس کی سب سے بڑی معلم شخصیّت سقراط (Socrates) کی حکمت میں نمایاں ہوئی، جسے افلاطون (Plato) نے تدوین و انضباط کے جامے سے آراستہ کیا۔

جس طرح ہندوستان میں رگ وید کے دیوبانی تصوّرات نے بالآخر ایک ربّ الاربابی تصوّر کی نوعیت پیدا کرلی تھی، اور پھر اسی ربّ الاربابی تصوّر نے بہ تدریج توحیدی تصوّر کی طرف قدم بڑھایا تھا، ٹھیک اُسی طرح یونان میں بھی اولمپس کے دیوتاؤں کو بالآخر ایک ربّ الارباب ہستی کے آگے جھکنا پڑا، اور پھر یہ ربّ الاربابی تصوّر بہ تدریج کثرت سے وحدت کی طرف قدم بڑھانے لگا۔ یونان کے قدیم ترین تصوّروں کے معلوم کرنے کا تنہا ذریعہ اُس کی پُرانی شاعری ہے۔ جب ہم اس کا مطالعہ کرتے ہیں تو دو عقیدے برابر پسِ پردہ کام کرتے دکھائی دیتے ہیں: مرنے کے بعد کی زندگی، اور ایک سب سے بڑی اور سب پر چھائی ہوئی الوہیت۔

آئیونی (Ionia) فلسفہ نے جو یونانی مذاہبِ فلسفہ میں سب سے زیادہ پُرانا ہے، اجرامِ سماوی کی اَن دیکھی روحوں کا اعتراف کیا تھا اور پھر ان روحوں کے اوپر کسی ایسی رُوح کا سُراغ لگانا چاہا تھا جسے اصل کائنات

[1] اسی لیے ہندو تصوّر نے ماں کی تشبیہ سے کام لیا، کیونکہ ماں کی تشبیہ میں اگرچہ نسائیت آجاتی ہے، لیکن تشبیہ باپ سے بھی زیادہ پُراثر ہوجاتی ہے۔ باپ کی شفقت کبھی کبھی جواب دے دیگی، لیکن ماں کی محبت کی گہرائیوں کے لیے کوئی تھاہ نہیں!

قرار دیا جا سکے۔ پانچویں صدی قبل از مسیح میں فیثا غورس (Pythagoras) کا ظہور ہوا اور اُس نے نئے فکری عنصروں سے فلسفہ کو آشنا کیا۔ فیثا غورس کے سفرِ ہند کی روایت صحیح ہو یا نہ ہو، لیکن اس میں شک نہیں کہ اس کے فلسفیانہ تصوروں میں ہندوستانی طریقِ فکر کی مشابہتیں پوری طرح نمایاں ہیں۔ تناسخ کا غیر مشتبہ عقیدہ، پانچویں آسمانی عنصر (Quintaessentia) کا اعتراف، نفسِ انسانی کی انفرادیت کا تصور، مکاشفاتی طریقِ ادراک کی جھلک؛ اور سب سے زیادہ یہ کہ ایک "طریقِ زندگی" کے ضابطہ کا اہتمام، ایسے مبادیات ہیں جو ہمیں اوپانی شد کے دائرۂ فکر و نظر سے بہت قریب کر دیتے ہیں۔ فیثا غورس کے بعد انکسا غورس (Anaxagoras) نے ان مبادیات کو کلیاتی (Abstracts) تصورات کی نوعیت کا جامہ پہنایا اور اس طرح یونانی فلسفے کی وہ بنیاد استوار ہو گئی جس پر آگے چل کر سقراط اور افلاطون اپنی کلیاتی تصوریت کی عمارتیں کھڑی کرنے والے تھے۔

سقراط کی شخصیت میں یونان کے توحیدی اور تنزیہی اعتقاد کی سب سے بڑی نمود ہوئی۔ سقراط سے پہلے جو فلسفی گزرے تھے، انہوں نے قومی پرستش گاہوں کے دیوتاؤں سے کوئی تعرض نہیں کیا تھا۔ کیونکہ خود ان کے دل و دماغ بھی ان کے اثرات سے خالی نہیں ہوئے تھے۔ نفوسِ فلکی کے تصورات کی اگر اصلی حقیقت معلوم کی جائے تو اس سے زیادہ نہیں نکلے گی کہ یونان کے کواکبی دیوتاؤں نے علم و نظر کے حلقوں سے روشناس ہونے کے لیے ایک نیا فلسفیانہ نقاب اپنے چہروں پر ڈال لیا تھا، اور اب ان کی ہستی صرف عوام ہی کو نہیں بلکہ فلسفیوں کو بھی تسکین دینے کے قابل بنا دی گئی تھی۔ یہ تقریباً ویسی ہی صورتِ حال تھی جو ابھی تھوڑی دیر ہوئی ہم ہندوستان کی قدیم تاریخ کے صفحوں پر دیکھ آئے تھے یعنی فکری غور و خوض کے نتائج ایک ایسی لچکدار صورت میں اُبھرنے لگے کہ ایک طرف فلسفیانہ دماغوں کے تقاضوں کا بھی جواب دیا جا سکے، دوسری طرف عوام کے قومی عقائد سے بھی تصادم نہ ہو۔ ہندوستان کی طرح یونان میں بھی خواص اور عوام کے فکر و عمل نے باہم دگر سمجھوتا کر لیا تھا یعنی توحیدی اور اصنامی عقیدے ساتھ ساتھ چلنے لگے تھے!

لیکن سقراط کا معنوی علوِ فکر اس عام سطح سے بہت بلند جا چکا تھا۔ وہ وقت کے اصنامی عقائد سے کوئی سمجھوتا نہیں کر سکا۔ اُس کا توحیدی تصور تجسم اور تشبہ کی تمام آلودگیوں سے پاک ہو کر اُبھرا۔ اُس کی بے لوث خدا پرستی کا تصور اس درجہ بلند تھا کہ وقت کے عام مذہبی تصورات اُسے سر اونچا کر کے بھی دیکھ نہیں سکتے تھے۔ اس کی حقیقت شناس نگاہ میں یونان کی اصنامی خدا پرستی اس سے زیادہ کوئی اخلاقی بنیاد نہیں رکھتی تھی کہ ایک طرح کا دُکاندارانہ لین دین تھا جو اپنے خود ساختہ معبودوں کے ساتھ چکایا جاتا تھا۔ افلاطون یوتھی فرا (Euthyphro) کے مکالمہ میں ہمیں صاف صاف بتلاتا ہے کہ یونان کے دینی تصورات و اعمال کی نسبت سقراط کے بے لاگ فیصلے کیا تھے؟ سقراط پر مذہبی بے احترامی کا الزام لگایا گیا تھا۔ وہ پوچھتا ہے کہ "مذہبی احترام" کی حقیقت

کیا ہے؟ پھر جو جواب ملتا ہے، وہ اُسے اس نتیجہ پر پہنچاتا ہے کہ "مذہبی احترام گویا مانگنے اور دینے کا ایک فن ہوا۔ دیوتاؤں سے وہ چیز مانگنی جس کی ہمیں خواہش ہے، اور اُنہیں وہ چیز دے دینی جس کی اُنہیں احتیاج ہے مختصراً یہ کہ تجارتی کاروبار کا ایک خاص ڈھنگ"

ایسی بے پردہ تعلیم وقت کے دار و گیر سے بچ نہیں سکتی تھی اور نہ بچی، لیکن سقراط کی اولوالعزم روح وقت کی کوتاہ اندیشیوں سے مغلوب نہیں ہوسکتی تھی۔ اس نے ایک ایسے صبر و استقامتِ حق کے ساتھ جو صرف نبیوں اور شہیدوں ہی کے اندر گھر بنا سکتا ہے، زہر کا جام اُٹھایا اور بغیر کسی تلخ کامی کے پی لیا:

تمنت سلیمی ان نموت بحبّھا　　واھون شیٔ عندنا ما تمنت!

اُس نے مرنے سے پہلے آخری بات جو کہی تھی وہ یہ تھی "وہ ایک کمتر دنیا سے ایک بہتر دنیا کی طرف جا رہا ہے!"

افلاطون نے سقراط کے باحثانہ (Dialectic) افکار کو جو ایک معلّم کے درس و املا کی نوعیت رکھتے تھے، ایک مکمل ضابطہ کی شکل دے دی اور منطقی تحلیل کے ذریعہ اُنہیں کلّیات و جوامع کی صورت میں مرتب کیا اُس نے اپنے تمام فلسفیانہ بحث و نظر کی بنیاد کلّیات (Abstracts) پر رکھی اور حکومت سے لے کر خدا کی ہستی تک، سب کو تصوّریت (Idea) کا جامہ پہنا دیا۔ اگر تصوّریت محسوسات سے الگ ہستی رکھتی ہے تو ناؤس[1] (Nause) یعنی نفس ناطقہ بھی مادہ سے الگ اپنی ہستی رکھتا ہے، اور اگر نفس مادے سے الگ ہستی رکھتا ہے، تو خدا کی ہستی بھی مادیات سے الگ اپنی نمود رکھتی ہے۔ اس نے انکساغورس کے مسلک کے خلاف دو نفسوں میں امتیاز کیا۔ ایک کو فانی قرار دیا۔ دوسرے کو لافانی۔ فانی نفس خواہشیں رکھتا ہے۔ اور وہی مجسّم ایجو (Ego) ہے۔ لیکن لافانی نفس کائنات کی اصل عاقلہ ہے اور جسمانی زندگی کی تمام آلائشوں سے یک قلم منزّہ یہی نفس کلّی کی وہ الٰہی چنگاری ہے جس نے انسان کے اندر قوّتِ مدرکہ کی روشنی کا چراغ روشن کر دیا ہے یہاں پہنچ کر نفس کلّی کا تصوّر بھی ایک طرح سے وحدۃ الوجودی تصوّر کی نوعیت پیدا کر لیتا ہے۔ دراصل ہندو فلسفے کا "آتما" اور یونانی فلسفے کا "نفس" ایک ہی مسمّٰی کے دو نام ہیں۔ یہاں "آتما" کے بعد "پرم آتما" نمودار ہوا تھا۔ وہاں

---

[1] "ناؤس" جس کا تلفظ "ناؤز" کیا جاتا ہے عربی کے "نفس" سے اس درجہ صوتی مشابہت رکھتا ہے کہ معلوم ہوتا ہے "ناؤز" تعریب کا جامہ پہن کر "نفس" ہو گیا۔ اسی طرح "نوئٹک" (Noetic) اور "ناطق" اس درجہ قریب ہیں کہ دوسرے کو پہلے کی تعریب سمجھا سکتا ہے۔ چنانچہ ریان اور دوزی نے نفس ناطقہ کو "نوئٹک ناؤز" کا معرب قرار دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں "ناطق" نطق سے نہیں ہے بلکہ "نوئٹک" کی تعریب ہے جس کے معنی ادراک کے ہیں۔ بعض عربی مصادر سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے کہ اصل یونانی الفاظ پیشِ نظر رکھے گئے تھے۔

"نفس" عربی لغت میں ذات اور خود کے معنی میں بولا جاتا تھا اور ارسطو نے عاقلانہ نطق کو انسان کی فصل قرار دیا تھا۔ اس لیے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عرب مترجموں نے یونانی تعبیر سامنے رکھ کر نفس ناطقہ کی ترکیب اختیار کر لی، اور یہ تعریب خود عربی الفاظ کے مدلول سے بھی ملتی جلتی ہوئی بن گئی۔

نفس کے بعد نفس کلی نمودار ہوا۔

سقراط نے خدا کی ہستی کے لیے "اگاتھوس" (αγαθος) یعنی "الخیر" کا تصوّر قائم کیا تھا۔ وہ سرتاسر اچھائی اور حُسن ہے۔ افلاطون وجود کی دنیاؤں سے بھی اوپر اُڑا اور اُس نے خیرِ بحت کا سُراغ لگانا چاہا، لیکن سقراط کے صفاتی تصور پر کوئی اضافہ نہ کرسکا

ارسطو (Aristotle) جس نے فلسفے کو روحانی تصوروں سے خالص کرکے صرف مشاہدہ و احساسات کے دائرہ میں دیکھنا چاہا تھا، اس سقراطی تصوّر کا ساتھ نہیں دے سکتا تھا۔ اُس نے عقلِ اول اور عقلِ فعّال کا تصور قائم کیا جو ایک ابدی، غیر متجزّی، اور بسیطِ بحت ہستی ہے۔ پس گویا سقراط اور افلاطون نے جس ذات کی صفت "الخیر" میں دیکھی تھی، ارسطو نے اسے "العقل" میں دیکھا، اور اس منزل پر پہنچ کر رُک گیا۔ اس سے زیادہ جو کچھ مشّائی فلسفے (Peripatetic) میں ہمیں ملتا ہے، وہ خود ارسطو کی تصریحات نہیں ہیں، اس کے یونانی اور عرب شارحوں کے اضافے ہیں۔

اس تمام تفصیل سے معلوم ہوا کہ "الخیر" اور "العقل" یونانی فلسفے کے تصورِ الوہیت کا ماحصل ہے۔

سقراط کے صفاتی تصوّر کو وضاحت کے ساتھ سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ افلاطون کی جمہوریت (Republic) کا حسب ذیل مکالمہ پیش نظر رکھا جائے۔ اس مکالمہ میں اُس نے تعلیم کے مسئلہ پر بحث کی ہے اور واضح کیا ہے کہ اس کے بنیادی اصول کیا ہونے چاہئیں:

"اِڈمنٹس[1] نے سوال کیا کہ شاعروں کو خدا کا ذکر کرتے ہوئے کیا پیرایۂ بیان اختیار کرنا چاہیے؟

سقراط: ہر حال میں خدا کی توصیف ایسی کرنی چاہیے جیسا کہ وہ اپنی ذات میں ہے۔ خواہ رزمی (Epic)، شعر ہو خواہ غنائی (Lyric) علاوہ بریں اس میں کوئی شبہ نہیں کہ خدا کی ذات صالح ہے۔ پس ضروری ہے کہ اُس کی صفات بھی صلاح پر مبنی ہوں۔

اڈمنٹس: درست ہے۔

سقراط: اور یہ بھی ظاہر ہے کہ جو وجود صالح ہوگا، اُس سے کوئی بات مُضر صادر نہیں ہوسکتی، اور جو ہستی غیر مضر ہوگی، وہ کبھی شر کی صانع نہیں ہوسکتی۔ اسی طرح یہ بات بھی ظاہر ہے کہ جو ذات صالح ہوگی، ضروری ہے

[1] جمہوریت کے اشخاص مکالمہ میں "اڈمنٹس" اور "گلوکن" افلاطون کے بھائی ہیں۔ چنانچہ افلاطون نے خود ایک جگہ اس کی تصریح کی ہے۔
افلاطون کی دوسری مصنفات کے ساتھ جمہوریت کا ترجمہ بھی عربی میں ہوگیا تھا۔ چنانچہ چھٹی صدی ہجری میں ابن رشد نے اس کی شرح لکھی۔ شرح کے دیباچہ میں لکھتا ہے کہ میں نے ارسطو کی کتاب السیاسہ کی شرح لکھنی چاہی تھی مگر اندلس میں اس کا کوئی نسخہ نہیں ملا۔ مجبوراً افلاطون کی کتاب اختیار کرنی پڑی۔ ابن رشد کی شرح کے عبرانی اور لاطینی تراجم یورپ میں موجود ہیں مگر اصل عربی ناپید ہے۔ یورپ کے موجودہ تراجم براہ راست یونانی سے ہوئے ہیں، ہمارے پیش نظر اے۔ ای۔ ٹیلر اور بی جوویٹ (Jowett) کے انگریزی تراجم ہیں۔

کر نافع بھی ہو۔ پس معلوم ہؤا کہ خدا صرف خیر کی علت ہے۔ شر کی علت نہیں ہو سکتا۔

اڈمنٹس: درست ہے۔

سقراط: اور یہیں سے یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ خدا کا تمام حوادث کی علت ہونا ممکن نہیں جیسا کہ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے۔ بلکہ وہ انسانی حالات کے بہت ہی تھوڑے حصے کی علت ہے۔ کیونکہ ہم دیکھتے ہیں، ہماری برائیاں بھلائیوں سے کہیں زیادہ ہیں، اور برائیوں کی علت خدا کی صالح اور نافع ذات نہیں ہو سکتی۔ پس چاہیے کہ صرف اچھائی ہی کو اس کی طرف نسبت دیں اور برائی کی علت کسی دوسری جگہ ڈھونڈھیں۔

اڈمنٹس: میں محسوس کرتا ہوں کہ یہ بات بالکل واضح ہے۔

سقراط: تو اب ضروری ہؤا کہ ہم شاعروں کے ایسے خیالات سے متفق نہ ہوں جیسے ہومر کے حسب ذیل شعروں میں ظاہر کیے گئے ہیں "مشتری[1] کی ڈیوڑھی میں دو پیالے رکھے ہیں۔ ایک خیر کا ہے۔ ایک شر کا، اور وہی انسان کی بھلائی اور برائی کی تمامتر علت ہیں۔ جس انسان کے حصے میں خیر کے پیالے کی شراب آگئی، اس کے لیے تمامتر خیر ہے۔ جس کے حصے میں شر کی آئی۔ اس کے لیے تمامتر شر ہے۔ اور پھر جس کسی کو دونوں پیالوں کا ملا جلا گھونٹ مل گیا، اس کے حصے میں اچھائی بھی آگئی اور برائی بھی" [2]

پھر اس کے بعد تجسّم کے عقیدہ پر بحث کی ہے اور اس سے انکار کیا ہے کہ "خدا ایک بازیگر اور بہروپیے کی طرح کبھی ایک بھیس میں نمودار ہوتا ہے کبھی دوسرے بھیس میں" [3]

اسکندریہ کا مذہب افلاطونِ جدید

تیسری صدی مسیحی میں اسکندریہ کے فلسفۂ تصوف نے "مذہب افلاطون جدید" (Neo-Platonic) کے نام سے ظہور کیا جس کا بانی امونیس سکاس (Ammonius Saccas) تھا۔ امونیس کا جانشین فلاطینس (Platinus) ہؤا اور فلاطینس کا شاگرد فور فوریوس (Porphyry) تھا جو اسکندر افرودیسی

---

[1] مشتری یعنی "زیوس" (Zeus) یونان کے اصنامی عقائد میں ربّ الارباب یعنی دیوتاؤں میں سب سے بڑا اور حکمران دیوتا تھا۔ ہومر نے ایلیڈ میں دیوتاؤں کی جو مجلس آراستہ کی ہے، اس میں تخت نشین ہستی مشتری ہی کی ہے۔

[2] یہ اشعار ایلیڈ کے ہیں۔ سلیمان بستانی نے اپنے بے نظیر ترجمۂ عربی میں ان کا ترجمہ حسب ذیل شعروں میں کیا ہے:

فبلعتاب زفس قارورتان ذی لخیر و ذی لشر الهوان

فیهما کل قسمة الانسان

فالذی منهما مزیجاً انالا زفس یلقی خیراً و یلقی بالا

والذی لاینال الا من الشر فتنتابه الخطوب انتیابا

بطواه یطوی البلاد کلیلا تائهاً فی عرض الفلاة ذلیلا

من بنی الخلد والوری مخذولا (الیاذہ۔ نشید ۲۴۔ صفحہ ۱۱۳۱)

ان اشعار میں "زفس" یونانی "زیوس" کی تعریب ہے۔

[3] ری پبلک ترجمہ ٹیلر۔ باب ۲

کے بعد ارسطو کا سب سے بڑا شارح تسلیم کیا گیا ہے، اور جس نے افلاطونیۂ جدیدہ کی مبادیات مشائی فلسفے میں مخلوط کردیں۔ فلاطینس اور فورفوریوس کی تعلیم سرتاسر اُسی اصل پر مبنی تھی جو ہندوستان میں اوپانی شد کے مذہب نے اختیار کی ہے یعنی علمِ حق کا اصلی ذریعہ کشف ہے۔ نہ کہ استدلال، اور معرفت کا کمال مرتبہ یہ ہے کہ جذب و فنا کا مقام حاصل ہو جائے خدا کی ہستی کے بارے میں فلاطینس بھی اسی نتیجہ پر پہنچا جس پر اوپانی شد کے مصنف اس سے بہت پہلے پہنچ چکے تھے یعنی نفیِ صفات کا مسلک اس نے بھی اختیار کیا۔ ذاتِ مطلق ہمارے تصوّر و ادراک کی تمام تعبیرات سے ماورا ہے۔ اس لیے ہم اس بارے میں کوئی حکم نہیں لگا سکتے۔ "ذاتِ مطلق اُن چیزوں میں سے کوئی چیز بھی نہیں جو اُس سے ظہور میں آئیں۔ ہم اُس کی نسبت کوئی حکم نہیں لگا سکتے۔ ہم نہ تو اُسے موجودیت سے تعبیر کر سکتے ہیں نہ جوہر سے۔ نہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ زندگی ہے۔ حقیقت ان تمام تعبیروں سے وراء الوراء ہے[1]"

سقراط اور افلاطون نے حقیقت کو "الخیر" سے تعبیر کیا تھا۔ اس لیے فلاطینس وہاں تک بڑھنے سے انکار نہ کر سکا لیکن اس سے آگے کی تمام راہیں بند کر دیں "جب تم نے کہا الخیر، تو بس یہ کہہ کر رک جاؤ اور اس پر اور کچھ نہ بڑھاؤ۔ اگر تم کسی دوسرے خیال کا اضافہ کرو گے تو ہر اضافہ کے ساتھ ایک نئے نقص کی اُس سے تقریب کرتے جاؤ گے[2]" ارسطو نے حقیقت کا سُراغ عقول مجردہ کی راہ سے لگایا تھا، اور علۃ العلل کو عقل اوّل سے تعبیر کیا تھا، مگر فلاطینس کا مطلق اس تعبیر کی گرانی بھی برداشت نہیں کر سکتا۔ "یہ بھی مت کہو کہ وہ عقل ہے۔ تم اس طرح اسے منقسم کرنے لگو گے[3]"

لیکن اگر ہم "عقل" کا اطلاق اس پر نہیں کر سکتے تو پھر "الوجود" اور "الخیر" کیونکر کہہ سکتے ہیں؟ اگر ہم اپنے متصورہ صفتوں میں سے کوئی صفت بھی اُس کے لیے نہیں بول سکتے، تو پھر وجودیت اور خیریّت کی صفات بھی کیوں ممنوع نہ ہوں؟ اس اعتراض کا وہ خود جواب دیتا ہے:

"ہم نے اگر اُسے 'الخیر' کہا، تو اُس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہم کوئی باقاعدہ تصدیق کسی خاص وصف کی کرنی چاہتے ہیں جو اُس کے اندر موجود ہے۔ ہم اس تعبیر کے ذریعہ صرف یہ بات واضح کرنی چاہتے ہیں کہ وہ ایک مقصد اور منتہی ہے جس پر تمام سلسلے جا کر ختم ہو جاتے ہیں۔ یہ گویا ایک اصطلاح ہوئی جو ایک خاص غرض کے لیے کام میں لائی گئی ہے۔ اسی طرح اگر ہم اُس کی نسبت وجود کا حکم لگاتے ہیں تو صرف اس لیے کہ عدم کے دائرہ سے اُسے باہر رکھیں۔ وہ تو ہر چیز سے ماوراء ہے۔ حتیٰ کہ وجود کے اوصاف و خواص سے بھی[4]"

---

[1] E.T. Mokenna - جلد ۲، صفحہ ۱۳۴ [2] ایضاً [3] ایضاً

[4] ایضاً جلد اول صفحہ ۱۱۸ ۔ مذہب افلاطون جدید افلاطون کی طرف اس لیے منسوب ہوا کہ اُس کی بنیاد بعض افلاطونی مبادیات پر رکھی گئی تھی۔ مگر پھر اپنی بحث و نظر میں اُس نے جو راہ اختیار کی اور جن نتائج تک پہنچا، انہیں افلاطون سے کوئی تعلق نہیں۔ لیکن عرب فلاسفہ کا ایک بڑا طبقہ اس غلط فہمی میں پڑ گیا کہ فی الحقیقت یہ افلاطون ہی کا مذہب ہے۔ اس مذہب کے بعض فلسفیوں مثلاً فورفوریوس نے ارسطو کی شرح کرتے ہوئے اس کے مذہب میں جو اضافے کیے تھے، اُسے بھی عرب حکماء اصل سے ممتاز نہ کر سکے۔ چنانچہ ابو نصر فارابی نے (بقیہ بر صفحہ ۱۵۵)

اسکندریہ کے کلیمنٹ (Clement) نے اِس مسلک کا خلاصہ چند لفظوں میں کہہ دیا: "اس کی شناخت اس سے نہیں کی جاسکتی کہ وہ کیا ہے؟ صرف اس سے کی جاسکتی ہے کہ وہ کیا کچھ نہیں ہے" یعنی یہاں صرف سلب ونفی کی راہ ملتی ہے۔ ایجاب واثبات کی راہیں بند ہیں:

سرُّ، لسان النطق عنہ اخرس!

باب صفات میں یہ وہی بات ہوئی جو اُپانی شد کی "نیتی نیتی" میں ہم سُن چکے ہیں، اور جس پر شنکر نے اپنے مذہب کی مبادیات کی تمام عمارتیں استوار کی ہیں۔

ازمنۂ وسطیٰ کے یہودی فلاسفہ نے بھی یہی مسلک اختیار کیا تھا۔ موسیٰ بن میمون (المتوفی ۱۲۰۴ء) خدا کو "للوجود" کہنے سے بھی انکار کرتا ہے اور کہتا ہے، ہم جونہی "موجود" کا وصف بولتے ہیں، ہمارے تصور پر مخلوق کے اوصاف وخواص کی پرچھائیں پڑنے لگتی ہے، اور خدا ان اوصاف سے منزہ ہے۔ اُس نے اس سے بھی انکار کیا کہ خدا کو وحدہٗ لاشریک کہا جائے۔ کیونکہ "وحدت" اور "عدم شرکت" کے تصورات بھی اضافی نسبتوں سے خالی نہیں۔ ابن میمون کا یہ مسلک دراصل فلسفۂ اسکندریہ ہی کی بازگشت تھی۔

قرآنی تصور بہرحال چھٹی صدی مسیحی میں دنیا کی خداپرستانہ زندگی کے تصورات اِس حدتک پہنچے تھے کہ قرآن کا نزول ہوا۔ اب غور کرو کہ قرآن کے تصورِ الٰہی کا کیا حال ہے؟ جب ہم ان تمام تصورات کے مطالعہ کے بعد قرآن کے تصور پر نظر ڈالتے ہیں، تو صاف نظر آجاتا ہے کہ تصورِ الٰہی کی تمام تصویروں میں اُس کی تصویر جامع اور بلند تر ہے۔

اس سلسلہ میں حسب ذیل امور قابلِ غور ہیں:

(۱) تنزیہہ کی تکمیل اوّلاً، تجسم اور تنزیہہ کے لحاظ سے قرآن کا تصور تنزیہہ کی ایسی تکمیل ہے جس کی کوئی نمود اُس وقت دنیا میں موجود نہیں تھی۔ قرآن سے پہلے تنزیہہ کا بڑے سے بڑا مرتبہ جس کا ذہنِ انسانی متحمل ہوسکا تھا، یہ تھا کہ اصنام پرستی کی جگہ ایک اَن دیکھے خدا کی پرستش کی جائے لیکن جہاں تک صفاتِ الٰہی کا تعلق ہے، انسانی اوصاف وجذبات کی مشابہت اور جسم وہیئت کے تمثل سے کوئی تصور بھی خالی نہ تھا۔ ہندوستان اور یونان کا حال ہم دیکھ چکے ہیں۔ یہودی

(بقیہ نوٹ صفحہ ۱۵۴) الجمع بین الرائین میں ارسطو کا جو مذہب ظاہر کیا ہے، اُس سے یہ حقیقت واضح ہوجاتی ہے۔ ابن رشد پہلا عرب فلسفی ہے جس نے یہ غلط فہمی محسوس کی اور ارسطو کے مذہب کو شارحوں کے اضافے سے خالص کرکے دیکھنا چاہا۔

۵۲۹ء میں جب شہنشاہ جسٹینین کے حکم سے اسکندریہ کے فلاسفہ جلاوطن کیے گئے تو ان میں سے بعض نے ایران میں پناہ لی۔ چنانچہ سیمپلس اور ڈیماسیس خسرو کے دربار میں معزز جگہ رکھتے تھے۔ ان فلاسفہ کی وجہ سے پہلوی زبان بھی مذہب افلاطون جدید سے آشنا ہوگئی، اور ایرانی مجوس نے اُسے قومی رنگ دینے کے لیے زردشت اور جاماسپ کی طرف منسوب کردیا۔ عربی میں جب پہلوی ادبیات منتقل ہوئیں تو یہ فلسفیانہ مقالات بھی ترجمہ ہوئے اور عام طور پر یہ خیال پیدا ہوگیا کہ یہ زردشت اور جاماسپ کا ایک پراسرار فلسفہ ہے۔ چنانچہ شیخ شہاب الدین نے حکمۃ الاشراق میں اور شیرازی نے اس کی شرح میں دونوں غلطیاں جمع کردی ہیں۔ وہ مذہب افلاطونِ جدید کو افلاطون کا مذہب سمجھتے ہیں اور زردشت اور جاماسپ کا بھی حوالہ دیتے ہیں!

تصور جس نے اصنام پرستی کی کوئی شکل بھی جائز نہیں رکھی تھی، وہ بھی اس طرح کے تشبّہ و تمثّل سے یکسر آلودہ ہے حضرت ابراہیمؑ کا خدا کو ممرے کے بلوطوں میں دیکھنا، خدا کا حضرت یعقوبؑ سے کشتی لڑنا، کوہ طور پر شعلوں کے اندر نمودار ہونا، حضرت موسیٰؑ کا خدا کو پیچھے سے دیکھنا، خدا کا جوشِ غضب میں آ کر کوئی کام کر بیٹھنا اور پھر پچھتانا، بنی اسرائیل کو اپنی چہیتی بیوی بنا لینا اور پھر اُس کی بدچلنی پر ماتم کرنا، ہیکل کی تباہی پر اُس کا نوحہ، اُس کی انتڑیوں میں درد کا اُٹھنا اور کلیجے میں سوراخ پڑ جانا، تورات کا عام اسلوب بیان ہے +

اصل یہ ہے کہ قرآن سے پہلے فکرِ انسانی اس درجہ بلند نہیں ہوا تھا کہ تمثیل کا پردہ ہٹا کر صفاتِ الٰہی کا جلوہ دیکھ لیتا۔ اس لیے ہر تصور کی بنیاد تمام تر تمثیل و تشبیہ ہی پر رکھنی پڑی۔ مثلاً تورات میں ہم دیکھتے ہیں کہ ایک طرف زبور کے ترانوں اور یشعیاہ کی کتاب میں خدا کے لیے شائستہ صفات کا تخیل موجود ہے لیکن دوسری طرف خدا کا کوئی مخاطبہ ایسا نہیں جو سر تا سر انسانی اوصاف و جذبات کی تشبیہ سے ملوّث نہ ہو۔ حضرت مسیحؑ نے جب چاہا کہ رحمتِ الٰہی کا عالمگیر تصور پیدا کریں، تو وہ بھی مجبور ہوئے کہ خدا کے لیے باپ کی تشبیہ سے کام لیں۔ اسی تشبیہ سے ظاہر پرستوں نے ٹھوکر کھائی، اور ابنیتِ مسیحؑ کا عقیدہ پیدا کر لیا +

لیکن اِن تمام تصورات کے بعد جب ہم قرآن کی طرف رُخ کرتے ہیں، تو ایسا معلوم ہوتا ہے، گویا اچانک فکر و تصور کی ایک بالکل نئی دنیا سامنے آ گئی۔ یہاں تمثیل و تشبیہ کے تمام پردے بہ یک دفعہ اُٹھ جاتے ہیں، انسانی اوصاف و جذبات کی مشابہت مفقود ہو جاتی ہے، ہر گوشہ میں مجاز کی جگہ حقیقت کا جلوہ نمایاں ہو جاتا ہے، اور تجسّم کا شائبہ تک باقی نہیں رہتا۔ تنزیہہ اس مرتبۂ کمال تک پہنچ جاتی ہے کہ:

لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ (۴۲: ۱۱) اُس کے مثل کوئی شے نہیں۔ کسی چیز سے بھی تم اُسے مشابہ نہیں ٹھہرا سکتے!

لَا تُدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْأَبْصَارَ ۖ وَهُوَ اللَّطِيفُ الْخَبِيرُ (۶: ۱۰۳) انسان کی نگاہیں اُسے نہیں پا سکتیں، لیکن وہ انسان کی نگاہوں کو دیکھ رہا ہے!

قُلْ هُوَ اللَّهُ أَحَدٌ ۝ اللَّهُ الصَّمَدُ ۝ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُولَدْ ۝ وَلَمْ يَكُن لَّهُ كُفُوًا أَحَدٌ ۝ (۱۱۲: ۱-۴) اللہ کی ذات یگانہ ہے، بے نیاز ہے، اُسے کسی کی احتیاج نہیں۔ نہ تو اُس سے کوئی پیدا ہوا، نہ وہ کسی سے پیدا ہوا، اور نہ کوئی ہستی اُس کے درجے اور برابری کی ہوئی!

تورات اور قرآن کے جو مقامات مشترک ہیں، دقّتِ نظر کے ساتھ ان کا مطالعہ کرو۔ تورات میں جہاں کہیں خدا کی براہِ راست نمود کا ذکر کیا گیا ہے، قرآن وہاں خدا کی تجلّی کا ذکر کرتا ہے۔ تورات میں جہاں یہ پاؤ گے کہ خدا متشکّل ہو کر اُترا، قرآن اُس موقع کی یوں تعبیر کرے گا کہ خدا کا فرشتہ متشکّل ہو کر نمودار ہوا بطور مثال کے صرف ایک مقام پر نظر ڈال لی جائے۔ تورات میں ہے:

"خداوند نے کہا، اے موسیٰ دیکھ، یہ جگہ میرے پاس ہے، تو اس چٹان پر کھڑا رہ، اور یوں ہوگا کہ جب میرے جلال کا گذر ہوگا تو میں تجھے اس چٹان کی دراڑ میں رکھوں گا، اور جب تک نہ گزروں گا، تجھے اپنی ہتیلی سے ڈھانپے رہوں گا۔ پھر ایسا ہوگا کہ میں ہتیلی اُٹھالونگا اور تو میرا پیچھا دیکھ لیگا، لیکن تو میرا چہرہ نہیں دیکھ سکتا۔" خروج ۳۳: ۲۰)

"تب خداوند بدلی کے ستون میں ہو کر اُترا اور خیمہ کے دروازے پر کھڑا رہا .... اُس نے کہا کہ میرا بندہ موسیٰ اپنے خداوند کی شبیہ دیکھے گا۔" (گنتی ۱۲: ۵)

اسی معاملہ کی تعبیر قرآن نے یوں کی ہے:

قَالَ رَبِّ اَرِنِيْٓ اَنْظُرْ اِلَيْكَ قَالَ موسیٰ نے کہا، اے پروردگار! مجھے اپنا جلوہ دکھا تا کہ میں تیری طرف نگاہ کرسکوں

لَنْ تَرٰىنِيْ وَلٰكِنِ انْظُرْ اِلَى الْجَبَلِ (۷: ۱۳۹) فرمایا نہیں، تو کبھی مجھے نہیں دیکھے گا، لیکن ہاں، اس پہاڑ کی طرف دیکھ۔

تنزیہ اور تعطیل کا فرق البتہ یاد رہے کہ تنزیہ اور تعطیل میں فرق ہے۔ تنزیہ سے مقصود یہ ہے کہ جہاں تک عقل بشری کی پہنچ ہو، صفاتِ الٰہی کو مخلوقات کی مشابہت سے پاک اور بلند رکھا جائے، تعطیل کے معنی یہ ہیں کہ تنزیہ کے منع و نفی کو اس حد تک پہنچا دیا جائے کہ فکر انسانی کے تصوّر کے لیے کوئی بات باقی ہی نہ رہے۔ قرآن کا تصور تنزیہ کی تکمیل ہے تعطیل کی ابتدا نہیں ہے۔

بلاشبہ اوپانی شد تنزیہ کی "نیتی نیتی"* کو بہت دور تک لے گئے لیکن عملاً نتیجہ کیا نکلا؟ یہی نہ کہ ذاتِ مطلق (برہما) کو ذاتِ متشخص (ایشور) میں اُتارے بغیر کام نہ چل سکا:

بنتی نہیں ہے بادۂ و ساغر کہے بغیر!

جس طرح اثباتِ صفات میں غلو تشبیہ کی طرف لے جاتا ہے، اسی طرح نفیِ صفات میں غلو تعطیل تک پہنچا دیتا ہے اور دونوں میں تصورِ انسانی کے لیے ٹھوکر ہوئی۔ اگر تشبیہ اُسے حقیقت سے ناآشنا کر دیتا ہے، تو تعطل اُسے عقیدہ کی روح سے محروم کر دیتا ہے۔ پس یہاں ضروری ہوا کہ افراط اور تفریط، دونوں سے قدم روکے جائیں، اور تشبیہ اور تعطیل، دونوں کے درمیان راہ نکالی جائے۔ چنانچہ قرآن نے جو راہ اختیار کی ہے، وہ دونوں راہوں کے درمیان جاتی ہے، اور دونوں انتہائی سمتوں کے میلان سے بچتی ہوئی نکل گئی ہے۔

اگر خدا کے تصور کے لیے صفات و افعال کی کوئی صورت ایسی باقی نہ رہے جو فکر انسانی کی پکڑ میں آسکتی ہے، تو کیا نتیجہ نکلے گا؟ یہی نکلیگا کہ تنزیہ کے معنی نفی وجود کے ہو جائینگے۔ یعنی اگر کہا جائے، ہم خدا کے لیے کوئی ایجابی

---

* نیتی یعنی کلمۂ نفی۔ وہ ایسا بھی نہیں ہے۔ ایسا بھی نہیں ہے۔ برہد رنیاک اوپانی شد میں یہ نفی دور تک چلی گئی ہے۔ وہ کثیف ہے؟ "نہیں" وہ لطیف ہے؟ "نہیں" وہ کوتاہ ہے؟ "نہیں" وہ دراز ہے؟ "نہیں" غرضکہ ہر مشابہت کے جواب میں "نہیں" دہرایا جاتا ہے۔ نہ وہ ایسا ہے۔ نہ ویسا ہے۔ نہ یہ ہے۔ نہ وہ ہے:

اے بروں از وہم و قال و قیلِ من خاک بر فرقِ من و تمثیلِ من!

صفت قرار نہیں دے سکتے۔ کیونکہ جو صفت بھی قرار دینگے، اس میں مخلوق کے اوصاف سے مشابہت کی جھلک آجائیگی، تو ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں فکرِ انسانی کے لیے کوئی سررشتۂ تصور باقی نہیں رہیگا اور وہ کسی ایسی ذات کا تصور ہی نہیں کرسکے گا، اور جب تصور نہیں کرسکیگا تو ایسا عقیدہ اس کے اندر کوئی پکڑ اور لگاؤ بھی پیدا نہیں کرسکیگا۔ ایسا تصور اگرچہ اثباتِ وجود کی کوشش کرے، لیکن فی الحقیقت وہ نفیِ وجود کا تصور ہوگا۔ کیونکہ صرف سلبی تصور کے ذریعہ ہم ہستی کو نیستی سے جُدا نہیں کرسکتے۔

خدا کی ہستی کا اعتقاد انسانی فطرت کے اندرونی تقاضوں کا جواب ہے۔ اُسے حیوانی سطح سے بلند ہونے اور انسانیتِ اعلیٰ کے درجہ تک پہنچنے کے لیے بلندی کے ایک نصب العین کی ضرورت ہے، اور اس نصب العین کی طلب بغیر کسی ایسے تصور کے پوری نہیں ہوسکتی جو کسی نہ کسی شکل میں اُس کے سامنے آئے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ مطلق کا تصور سامنے آ نہیں سکتا۔ وہ جبھی آئے گا کہ ایجابی صفتوں کے تشخص کا کوئی نہ کوئی نقاب چہرے پر ڈال لے۔ چنانچہ ہمیشہ اس نقاب ہی کے ذریعہ جمالِ حقیقت کو دیکھنا پڑا۔ یہ کبھی بھاری ہُوا کبھی ہلکا، کبھی پُرخوف رہا کبھی دلاویز، مگر اُترا کبھی نہیں:

آہ ازاں حوصلۂ تنگ وازاں حُسنِ بلند
کہ دلم را گلہ از حسرتِ دیدارِ تو نیست!

جمالِ حقیقت بے نقاب ہے، مگر ہماری نگاہوں میں یارائے دید نہیں۔ ہم اپنی نگاہوں پر نقاب ڈال کر اسے دیکھنا چاہتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اُس کے چہرے پر نقاب پڑگیا:

ہرچہ ہست از قامتِ ناساز و بے اندامِ ماست
ورنہ تشریفِ تو بر بالائے کس دشوار نیست!

غیر صفاتی تصور کو انسان پکڑ نہیں سکتا، اور طلب اُسے ایسے مطلوب کی ہوئی جو اُس کی پکڑ میں آسکے۔ وہ ایک ایسا جلوۂ محبوبی چاہتا ہے جس کے عشق میں اُس کا دل اٹک سکے۔ جس کے حُسنِ گریزاں کے پیچھے وہ والہانہ دوڑ سکے، جس کا دامنِ کبریائی پکڑنے کے لیے ہمیشہ اپنا دستِ عجز و نیاز بڑھاتا رہے۔ جو اگرچہ زیادہ سے زیادہ بلندی پر ہو لیکن پھر بھی اسے ہر دم جھانک لگائے تاک رہا ہو کہ ان ربك لبالمرصاد[1] (۸۹:۱۲) اور واذا سألك عبادی عنی، فانی قریب، اجیب دعوة الداع اذا دعان[2] (۲:۱۸۳)

در پردہ و بر ہمہ کس پردہ می دری — باہر کسی و با تو کسے را وصال نیست

---

[1] بیشک تمہارا پروردگار تمہیں گھات لگائے تاک رہا ہے! [2] اور جب میرا بندہ تجھ سے میری نسبت سوال کرتا ہے تو اُس سے کہہ دے کہ میں اُس سے دور کب ہوں؟ میں تو بالکل اس کے پاس ہوں۔

غیر صفاتی تصور محض نفی و سلب ہوتا ہے اور اس سے انسانی طلب کی پیاس نہیں بجھ سکتی۔ ایسا تصور ایک فلسفیانہ تخیل ضرور پیدا کر دے گا لیکن دلوں کا زندہ او رسرگرم عقیدہ نہیں بن سکیگا۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن نے جو راہ اختیار کی، وہ ایک طرف تو تنزیہہ کو اُس کے کمال درجہ پر پہنچا دیتی ہے۔ دُوسری طرف تعطیل سے بھی تصور کو بچالے جاتی ہے۔ وہ فرداً فرداً تمام صفات و افعال کا اثبات کرتا ہے، مگر ساتھ ہی مشابہت کی قطعی نفی بھی کرتا جاتا ہے۔ وہ کہتا ہے، خدا حسن و خوبی کی ان تمام صفتوں سے جو انسانی فکر میں آسکتی ہیں، متصف ہے۔ وہ زندہ ہے، قدرت والا ہے، پالنے والا ہے، رحمت والا ہے، دیکھنے والا، سُننے والا، سب کچھ جاننے والا ہے۔ اور پھر اتنا ہی نہیں بلکہ انسان کی بول چال میں قدرت و اختیار اور ارادۂ و فعل کی جتنی شائستہ تعبیرات ہیں، اُنہیں بھی بلا تامل استعمال کرتا ہے۔ مثلاً خدا کے ہاتھ تنگ نہیں: بَلْ يَدَاهُ مَبْسُوطَتَانِ (۵: ۶۴) اُس کے تختِ حکومت و کبریائی کے احاطہ سے کوئی گوشہ باہر نہیں: وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ (۲: ۲۵۵) لیکن یہ بھی صاف صاف اور بے لچک لفظوں میں کہہ دیتا ہے کہ اُس سے مشابہ کوئی چیز نہیں جو تمہارے تصور میں آسکتی۔ وہ عدیم المثال ہے: لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ (۴۲: ۱۱) تمہاری نگاہ اسے پا ہی نہیں سکتی: لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ (۶: ۱۰۳) تم اُس کے لیے اپنے تخیل سے مثالیں نہ گھڑو: فَلَا تَضْرِبُوا لِلّٰهِ الْاَمْثَالَ (۱۶: ۷۴) پس ظاہر ہے کہ اُس کا زندہ ہونا ہمارے زندہ ہونے کی طرح نہیں ہو سکتا۔ اس کی پروردگاری ہماری پروردگاری کی طرح نہیں ہو سکتی۔ اس کا دیکھنا، سُننا، جاننا ویسا نہیں ہو سکتا، جس طرح کے دیکھنے، سُننے، اور جاننے کا ہم تصور کر سکتے ہیں۔ اُس کی قدرت و بخشش کا ہاتھ اور جلال و احاطہ کا عرش ضرور ہے، لیکن یقیناً اس کا مطلب وہ نہیں ہو سکتا جو ان الفاظ کے مدلولات سے ہمارے ذہن میں متشکل ہونے لگتا ہے۔

قرآن کے تصورِ الٰہی کا یہ پہلو فی الحقیقت اس راہ کی تمام درماندگیوں کا ایک ہی حل ہے، اور ساری عمر کی سرگردانیوں کے بعد بالآخر اسی منزل پر پہنچ کر دم لینا پڑتا ہے۔ انسانی فکر جتنی بھی کاوشیں کریگا، اس کے سوا اور کوئی حل پیدا نہیں کر سکیگا۔ یہاں ایک طرف بامِ حقیقت کی بلندی اور فکرِ کوتاہ کی نارسائیاں ہوئیں۔ دوسری طرف ہماری فطرت کا اضطرابِ طلب اور ہمارے دل کا تقاضائے دید ہوا۔ بام اتنا بلند کہ نگاہِ تصور تھک تھک کے رہجاتی ہے۔ تقاضائے دید اتنا سخت کہ بغیر کسی کا جلوہ سامنے لائے چین نہیں پا سکتا:

نہ باندازۂ بازوست کمندم ہیہات
ورنہ با گوشۂ بامیم سروکارے ہست!

ایک طرف راہ کی اتنی دشواریاں۔ دوسری طرف طلب کی اتنی سہل اندیشیاں! ولنعم ماقیل:

ملنا ترا اگر نہیں آساں تو سہل ہے ۔۔۔ دشوار تو یہی ہے کہ دشوار بھی نہیں!

اگر تنزیہ کی طرف زیادہ جھکتے ہیں تو تعطیل میں جاگرتے ہیں۔ اگر اثباتِ صفات کی صورت آرائیوں میں دور نکل جاتے ہیں، تو تشبیہ اور تجسیم میں کھوئے جاتے ہیں۔ پس نجات کی راہ صرف یہی ہوئی کہ دونوں کے درمیان قدم سنبھالے رکھیں۔ اثبات کا دامن بھی ہاتھ سے نہ چھوٹے۔ تنزیہ کی باگ بھی ڈھیلی نہ پڑنے پائے۔ اثبات، اُس کی دل آویز صفتوں کا مرقع کھینچے گا۔ تنزیہ تشبیہ کی پرچھائیں بچاتی رہیگی۔ ایک کا ہاتھ حُسنِ مطلق کو صورتِ صفات میں جلوہ آرا کردیگا۔ دوسرے کا ہاتھ اُسے اتنی بلندی پر تھامے رہیگا کہ تشبیہ کا گرد و غبار اُسے چھُونے کی جرأت نہیں کرسکے گا۔

بر چہرۂ حقیقت اگر ماند پردۂ
جُرمِ نگاہ دیدۂ صورت پرستِ ماست!

اوپانی شد کے مصنفوں کا نفیِ صفات میں غلو معلوم ہے لیکن مسلمانوں میں جب علمِ کلام کے مختلف مذاہب و آرا، پیدا ہوئے، تو اُن کی نظری کاوشیں اس میدان میں اُن سے بھی آگے نکل گئیں اور صفاتِ باری کا مسئلہ بحث و نظر کا ایک معرکۃ الآرا مسئلہ بن گیا۔ جہمیہ اور باطنیہ قطعی انکار کی طرف گئے۔ معتزلہ نے انکار نہیں کیا لیکن ان کا رُخ رہا اسی طرف۔ امام ابوالحسن اشعری نے گو خود معتدل راہ اختیار کی تھی (جیسا کہ کتاب الابانہ سے ظاہر ہے) لیکن ان کے پیرؤں کی کاوشیں تاویلِ صفات میں دور تک چلی گئیں اور بحث و نزاع سے غلو کا رنگ پیدا ہوگیا لیکن اِن میں سے کوئی بھی معاملہ کی گتھی نہ سلجھا سکا۔ اگر گتھی سُلجھی تو اسی طریقہ سے سُلجھی جو قرآن نے اختیار کیا ہے۔ امام جوینی یہ اقرار کرتے ہوئے دنیا سے گئے کہ "ھا انا ذا اموت علیٰ عقیدۃ امّی" (میری ماں نے جو عقیدہ سکھلایا تھا، اُس پر دُنیا سے جارہا ہوں!)

اشاعرہ میں امام فخرالدین رازی سب سے زیادہ ان کاوشوں میں سرگرم رہے ہیں، لیکن بالآخر اپنی زندگی کی آخری تصنیف میں اُنہیں بھی اقرار کرنا پڑا تھا کہ

لقد تأملت الطرق الکلامیہ، والمناھج الفلسفیہ، فما رأیتھا تشفی علیلاً ولا تروی غلیلاً، ورأیت اقرب الطرق طریق القرآن اقرأ فی الاثبات "الرحمٰن علی العرش استویٰ" وفی النفی "لیس کمثلہ شیٔ" ومن جرب مثل تجربتی، عرف مثل معرفتی (نقلہ ملّا علی القاری فی شرح الفقہ الاکبر)

میں نے علمِ کلام اور فلسفہ کے تمام طریقوں کو خوب دیکھا بھالا لیکن بالآخر معلوم ہوا کہ نہ تو ان میں کسی بیمار دل کے لیے شفا ہے، نہ کسی پیاسے کے لیے سیرابی۔ سب سے بہتر اور حقیقت سے نزدیک تر راہ وہی ہے جو قرآن کی راہ ہے۔ اثباتِ صفات میں پڑھو "الرحمٰن علی العرش استویٰ" اور نفیِ تشبیہ میں پڑھو "لیس کمثلہ شیٔ" یعنی اثبات اور نفی، دونوں کا دامن تھامے رہو۔ اور جس کسی کو میری طرح اس معاملہ کے تجربے کا موقع ملا ہوگا، اُسے میری طرح حقیقت معلوم ہوگئی ہوگی"

یہی وجہ ہے کہ اصحابِ حدیث اور سلفیہ نے اس باب میں تفویض[1] کا مسلک اختیار کیا تھا اور تاویلِ صفات میں کاوشیں کرنا پسند نہیں کرتے تھے، اور اسی بنا پر اُنہوں نے جہمیہ کے انکارِ صفات کو تعطیل سے تعبیر کیا اور معتزلہ و اشاعرہ کی تاویلوں میں بھی تعطل کی بو سونگھنے لگے۔ متکلمین نے اُن پر تجسّم اور تشبیہ کا الزام لگایا، لیکن وہ کہتے تھے کہ تمہارے تعطّل سے تو ہمارا نام نہاد تشبیہ ہی بہتر ہے۔ کیونکہ یہاں عقیدہ کے لیے ایک تصوّر تو باقی رہ جاتا ہے، تمہارے سلب و نفی کی کاوشوں کے بعد تو کچھ بھی باقی نہیں رہتا۔ متاخّرین اصحابِ حدیث میں امام ابن تیمیہ اور اُن کے شاگرد امام ابنِ قیّم نے اس مسئلہ کی گہرائیوں کو خوب سمجھا، اور اسی لیے سلف کے مسلک سے اِدھر اُدھر ہونا گوارا نہیں کیا۔

آریائی اور سامی نقطۂ خیال کا اختلاف

آریائی اور سامی تعلیموں کے نقطۂ خیال کا اختلاف ہم اس معاملہ میں پوری طرح دیکھ لے سکتے ہیں۔ آریائی حکمت نے فطرتِ انسانی کی جس صورت پرستی کے تقاضے کا جواب مورتی پوجا کا دروازہ کھول کر دیا، قرآن نے اسے صرف صفات کی صورت آرائی سے پورا کر دیا اور پھر اس سے نیچے اُترنے کی تمام راہیں بند کر دیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اُن تمام مفاسد کے کُھلنے کے دروازے بند ہو گئے جو بُت پرستی کی غیر عقلی زندگی سے پیدا ہو سکتے تھے اور ہندوستان میں پیدا ہوئے۔

محکمات اور متشابہات

قرآن نے اپنے مطالب کی دو بنیادی قسمیں قرار دی ہیں۔ ایک کو "محکمات" سے تعبیر کیا ہے۔ دوسری کو "متشابہات" سے۔ "محکمات" سے وہ باتیں مقصود ہیں جو صاف صاف انسان کی سمجھ میں آجاتی ہیں اور اس کی عملی زندگی سے تعلق رکھتی ہیں، اور اس لیے ایک سے زیادہ معانی کا اُن میں احتمال نہیں۔ "متشابہات" وہ ہیں جن کی حقیقت وہ پا نہیں سکتا اور اس کے سوا چارہ نہیں کہ ایک خاص حد تک جا کر رُک جائے اور بے نتیجہ باریک بینیاں نہ کرے: هُوَ الَّذِيٓ اَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ مِنْهُ اٰيٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ ۭ فَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَاۗءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَاۗءَ تَاْوِيْلِهٖ ڤ وَمَا يَعْلَمُ تَاْوِيْلَهٗٓ اِلَّا اللّٰهُ ۘ وَالرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ يَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِهٖ ۙ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا ۚ وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ (۳: ۷)

صفاتِ الٰہی کی حقیقت متشابہات میں داخل ہے۔ اس لیے قرآن کہتا ہے کہ اس باب میں فکری کاوشیں کچھ سود مند نہیں ہو سکتیں۔ بلکہ طرح طرح کی کج اندیشیوں کا دروازہ کھول دیتی ہیں یہاں بجز تفویض کے چارۂ کار نہیں، پس وہ تمام فلسفیانہ کاوشیں جو ہمارے متکلموں نے کی ہیں، فی الحقیقت قرآن کے معیارِ تعلیم کا ساتھ نہیں دے سکتیں۔

---

[1] تفویض کے مسلک سے مقصود یہ ہے کہ جو حقائق ہمارے دائرۂ علم و ادراک سے باہر ہیں، ان میں ردّ و کد اور باریک بینی نہ کرنا اور اپنے عجز و نارسائی کا اعتراف کر لینا۔

اوپانی شد کا مرتبۂ اطلاق اور مرتبۂ تشخص

اس موقعے پر یہ بات بھی صاف ہو جانی چاہیے کہ ویدانت سوتر اور اس کے سب سے بڑے شارح شنکا چاریا نے نفی صفات پر جتنا زور دیا ہے، وہ حقیقت کے اس مرتبۂ اطلاق سے تعلق رکھتا ہے جسے وہ "برہمن" سے تعبیر کرتے ہیں یعنی ذاتِ مطلق سے۔ لیکن اس سے اُنہیں بھی انکار نہیں کہ مرتبۂ اطلاق کے نیچے ایک اور مرتبہ بھی ہے جہاں تمام صفاتِ ایجابی کی نقش آرائی ظہور میں آجاتی ہے، اور انسان کے تمام عابدانہ تصورات کا معبود وہی ذات متصف ہوتی ہے۔

اوپانی شد کے نزدیک ذاتِ مطلق "نیرو پادھیک نست" اور "نرگن" ہے۔ یعنی تمام مظاہرات سے منزہ اور عدیم التوصیف ہے۔ اگر کوئی ایجابی صفت اس کی نسبت سے کہی بھی جا سکتی ہے تو وہ اسی سلب کا ایجاب ہے یعنی وہ "نرگنو گنی" ہے۔ عدیم الوصفی صفت سے متصف۔ "ہم اس کی نسبت کچھ نہیں کہہ سکتے۔ کیونکہ ہم جو کچھ کہیں گے، اُس کا لازمی نتیجہ یہ نکلے گا کہ لامحدود کو محدود بنا دیں گے۔ اگر محدود لامحدود کا تصور کر سکتا ہے تو پھر یا تو محدود کو لامحدود ماننا پڑیگا یا لامحدود کو محدود بن جانا پڑیگا" (شنکرا بھاشیا برہم سوتر۔ باب ۳)۔ "ہم کسی چیز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جو الفاظ بولتے ہیں، وہ یا تو اس چیز کا تعلق کسی خاص نوع سے ظاہر کرتے ہیں، یا اس کے فعلی خواص بتلاتے ہیں، یا اس کی قسم کی خبر دیتے ہیں، یا کسی اور اضافی نوعیت کی وضاحت کرتے ہیں۔ لیکن برہمن کے لیے کوئی نوع نہیں ٹھہرائی جا سکتی۔ اس کی کوئی قسم نہیں۔ اُس کے فعلی خواص بتلائے نہیں جا سکتے۔ اس کے لیے کوئی اضافت نہیں۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ وہ ایسا ہے۔ یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ وہ اس طرح کا نہیں ہے۔ کیونکہ اس کے لیے کوئی مشابہت نہیں، اور چونکہ مشابہت نہیں اس لیے اس کی عدیم مشابہت اور غیریت بھی انسانی تصور میں نہیں لائی جا سکتی۔ مشابہت کی طرح ہماری نفیِ مشابہت بھی اضافی رشتے رکھتی ہے" (ایضاً باب اول و ثانی)۔

غرضکہ حقیقت اپنے مرتبۂ اطلاق میں ناممکن التعریف ہے، اور منطقی ماورائیت سے بھی ماوراء ہے۔ اسی لیے ویدانت سوتر نے بنیادی طور پرستی کے دو دائرے ٹھہرا دیے۔ ایک کو ممکن التصور کہا ہے۔ دوسرے کو ناممکن التصور۔ ممکن التصور دائرہ پرکرتی، عناصر، ذہن، تعقل، اور خودی کا ہے۔ ناممکن التصور دائرہ برہمن (ذاتِ مطلق) کا۔ یہی مذہب اسکندریہ کے افلاطونیۂ جدیدہ کا بھی تھا، اور حکماء اسلام اور صوفیاء نے بھی یہی مسلک اختیار کیا۔ صوفیاء مرتبۂ اطلاق کو مرتبۂ "احدیت" سے تعبیر کرتے ہیں اور کہتے ہیں "احدیت" ناممکن التصور، ناممکن التعبیر، اور تمام منطقی ماورائیوں سے بھی وراء الوراء ہے:

بنامِ آں کہ آں نامے نہ دارد
بہ ہر نامے کہ خوانی سر بر آرد!

لیکن پھر مرتبۂ اطلاق ایک ایسے مرتبہ میں نزول کرتا ہے جس میں تمام ایجابی صفات کی صورت آرائی کا تشخص نمودار ہو جاتا ہے۔ اوپانی شد نے اسے "ایشور" سے اور صوفیا نے "واحدیت" سے تعبیر کیا ہے۔ ویدانت سوتر کے شارحوں میں شنکر نے سب سے زیادہ اوپانی شد کے نفی صفات کے مسلک کو قائم رکھنا چاہا ہے۔ اور اس باب میں بڑی کاوش کی۔ تاہم اسے بھی "سگن برہمن" یعنی ذات مشخص و متصف کے مرتبہ کا اعتراف کرنا پڑا، اور گو اس مرتبہ کے عرفان کو وہ "اپرم" یعنی فروتر مرتبہ کا عرفان قرار دیتا ہے مگر ساتھ ہی تسلیم کرتا ہے کہ ایک معبود ہستی کا تصور بغیر اس کے ممکن نہیں۔ اور انسانی ذہن و ادراک کے لیے زیادہ سے زیادہ بلند پروازی جو یہاں ہو سکتی ہے، وہ یہی ہے[1]۔

(۲) صفاتِ رحمت و جمال

ثانیاً تنزیہہ کی طرح صفاتِ رحمت و جمال کے لحاظ سے بھی قرآن کے تصور پر نظر ڈالی جائے، تو اس کی شانِ تکمیل نمایاں ہے۔ نزولِ قرآن کے وقت یہودی تصور میں قہر و غضب کا عنصر غالب تھا۔ مجوسی تصور نے نور و ظلمت کی دو مساویانہ قوتیں الگ الگ بنالی تھیں۔ مسیحی تصور نے رحم و محبت پر زور دیا تھا لیکن جزا کی حقیقت مستور ہو گئی تھی۔ اسی طرح پیروانِ بدھ نے بھی صرف رحم و محبت پر زور دیا۔ عدالت نمایاں نہیں ہوئی۔ گویا جہاں تک رحمت و جمال کا تعلق ہے، یا تو قہر و غضب کا عنصر غالب تھا، یا مساوی تھا، یا پھر رحمت و محبت آئی تھی، تو اس طرح آئی تھی، کہ عدالت کے لیے کوئی جگہ باقی نہیں رہی تھی۔

لیکن قرآن نے ایک طرف تو رحمت و جمال کا ایسا کامل تصور پیدا کر دیا کہ قہر و غضب کے لیے کوئی جگہ ہی نہ رہی، دوسری طرف جزاءِ عمل کا سر رشتہ بھی ہاتھ سے نہیں دیا، کیونکہ جزا کا اعتقاد قہر و غضب کی بنا پر نہیں بلکہ عدالت کی بنا پر قائم کر دیا۔ چنانچہ صفاتِ الٰہی کے بارے میں اس کا عام اعلان یہ ہے:

قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ ؕ اَیًّا مَّا تَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى ؕ (۱۷ : ۱۱۰)

اے پیغمبر، ان سے کہہ دو، تم خدا کو اللہ کے نام سے پکارو یا رحمٰن کہہ کر پکارو جس صفت سے بھی پکارو، اس کی ساری صفتیں حسن و خوبی کی صفتیں ہیں۔

یعنی وہ خدا کی تمام صفتوں کو "اسماءِ حسنیٰ" قرار دیتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ خدا کی کوئی صفت نہیں جو حسن و خوبی کی صفت نہ ہو۔ یہ صفتیں کیا کیا ہیں؟ قرآن نے پوری وسعت کے ساتھ انہیں جا بجا بیان کیا ہے۔ ان میں ایسی صفتیں بھی ہیں جو بظاہر قہر و جلال کی صفتیں ہیں۔ مثلاً جبار، قہار، لیکن قرآن کہتا ہے وہ بھی "اسماءِ حسنیٰ" ہیں کیونکہ ان میں قدرت و عدالت کا ظہور ہوا ہے، اور قدرت و عدالت حسن و خوبی ہے۔ خونخواری و خوفناکی نہیں ہے۔ چنانچہ سورۂ حشر میں صفاتِ رحمت و جمال کے ساتھ قہر و جلال کا بھی ذکر کیا ہے، اور پھر متصلاً ان سب کو "اسماءِ حسنیٰ" قرار دیا ہے:

---

[1] شنکر بھاشیا ۱ : ۱ : ۲ ۔ اور چھندوگیا اوپانی شد قسم ۸

هُوَ اللّٰهُ الَّذِیْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ اَلْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ السَّلٰمُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَيْمِنُ الْعَزِيْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ ؕ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ۝ هُوَ اللّٰهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی ؕ يُسَبِّحُ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝ (۵۹: ۲۴)

وہ اللہ ہے۔ اُس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہ الملک ہے۔ القدوس ہے۔ السلام ہے۔ المؤمن ہے۔ المہیمن ہے۔ العزیز، الجبار ہے۔ المتکبر ہے۔ اور اُس ساجھے سے پاک ہے جو لوگوں نے اُس کی معبودیت میں بنا رکھے ہیں۔

وہ الخالق ہے۔ الباری ہے۔ المصور ہے (غرضکہ) اُس کے لیے حسن و خوبی کی صفتیں ہیں۔ آسمان و زمین میں جتنی بھی مخلوقات ہیں، سب اُس کی پاکی اور عظمت کی شہادت دے رہی ہیں اور بلاشبہ وہی ہے جو حکمت کے ساتھ غلبہ و توانائی بھی رکھنے والا ہے!

اِسی طرح سورۂ اعراف میں ہے:

وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی فَادْعُوْهُ بِهَا ۪ وَذَرُوا الَّذِيْنَ يُلْحِدُوْنَ فِیْٓ اَسْمَآئِهٖ[1] (۷: ۱۸۰)

اور اللہ کے لیے حسن و خوبی کی صفتیں ہیں، سو چاہیے کہ اُن صفتوں سے اُسے پکارو اور جن لوگوں کا شیوہ یہ ہے کہ اُس کی صفتوں میں کج اندیشیاں کرتے ہیں، اُنہیں اُن کے حال پر چھوڑ دو۔

چنانچہ اِسی لیے سورۂ فاتحہ میں صرف تین صفتیں نمایاں ہوئیں: ربوبیت، رحمت، اور عدالت۔ اور قہر و غضب کی کسی صفت کو یہاں جگہ نہ دی گئی۔

(۳) اشراکی تصورات کا کلی انسداد

ثالثاً، جہاں تک توحید و اشراک کا تعلق ہے، قرآن کا تصور اس درجہ کامل اور بے لچک ہے کہ اس کی کوئی نظیر پچھلے تصورات میں نہیں مل سکتی۔

اگر خدا اپنی ذات میں یگانہ ہے، تو ضروری ہے کہ وہ اپنی صفات میں بھی یگانہ ہو کیونکہ اس کی یگانگت کی عظمت قائم نہیں رہ سکتی، اگر کوئی دوسری ہستی اُس کے صفات میں شریک و سہیم مان لی جائے۔ قرآن سے پہلے توحید کے ایجابی پہلو پر تو تمام مذاہب نے زور دیا تھا، لیکن سلبی پہلو نمایاں نہیں ہو سکا تھا۔ ایجابی پہلو یہ ہے کہ خدا ایک ہے۔ سلبی یہ ہے کہ اُس کی طرح کوئی نہیں۔ اور جب اُس کی طرح کوئی نہیں، تو ضروری ہے کہ

---

[1] اِس آیت میں "الحاد فی الاسماء" سے مقصود کیا ہے؟ "الحاد" لحد سے ہے۔ "لحد" کے معنی میلان عن الوسط کے ہیں یعنی درمیان سے کسی ایک طرف کو ہٹا ہوا ہونا۔ اسی لیے ایسی قبر کو جس میں نعش کی جگہ ایک طرف کو ہٹی ہوئی ہوتی ہے۔ لحد کہتے ہیں۔ جب یہ لفظ انسانی افعال کے لیے بولا جاتا ہے تو اِس کے معنی راہِ حق سے ہٹ جانے کے ہوتے ہیں۔ کیونکہ وسط حق ہے، اور جو اس سے منحرف ہو، باطل ہے "الحد فلان" ای مال عن الحق۔ پس یہاں الحاد فی الاسماء کا مطلب یہ ہوا کہ خدا کی صفات کے بارے میں جو راہ حق ہے، اُس سے منحرف ہو جانا۔ امام راغب اصفہانی نے اس کی تشریح حسب ذیل لفظوں میں کی ہے: "ان یوصف بما لا یصح وصفه به، او ان یتاول اوصافه علی ما لا یلیق به" (مفردات ۴۶۳) یعنی خدا کے لیے کوئی ایسا وصف قرار دینا جو اُس کا وصف نہیں ہونا چاہیے، یا اس کی صفتوں کا ایسا مطلب ٹھہرانا جو اُس کی شان کے لائق نہیں۔"

جو صفتیں اُس کے لیے ٹھہرا دی گئی ہیں، اُن میں کوئی دوسری ہستی شریک نہ ہو۔ پہلی بات: توحید فی الذات سے اور دوسری توحید فی الصفات سے تعبیر کی گئی ہے۔ قرآن سے پہلے اقوام عالم کی استعداد اس درجہ بلند نہیں ہوئی تھی کہ توحید فی الصفات کی نزاکتوں اور بندشوں کی متحمل ہو سکتی، اس لیے مذاہب نے تمام تر زور توحید فی الذات ہی پر دیا۔ توحید فی الصفات اپنی ابتدائی اور سادہ حالت میں چھوڑ دی گئی؛

چنانچہ یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں، باوجودیکہ تمام مذاہب قبل از قرآن میں عقیدۂ توحید کی تعلیم موجود تھی لیکن کسی نہ کسی صورت میں شخصیت پرستی عظمت پرستی، اور اصنام پرستی، نمودار ہوتی رہی، اور رہنمایانِ مذاہب اس کا دروازہ بند نہ کر سکے۔ ہندوستان میں تو غالباً اوّل روز ہی سے یہ بات تسلیم کر لی گئی تھی کہ عوام کی تشفی کے لیے دیوتاؤں اور انسانی عظمتوں کی پرستاری ناگزیر ہے، اور اس لیے توحید کا مقام صرف خواص کے لیے مخصوص ہونا چاہیے۔ فلاسفۂ یونان کا بھی یہی خیال تھا۔ یقیناً وہ اس بات سے بے خبر نہ تھے کہ کوہ المپس کے دیوتاؤں کی کوئی اصلیت نہیں، تاہم سقراط کے علاوہ کسی نے بھی اس کی ضرورت محسوس نہیں کی کہ عوام کے اصنامی عقائد میں خلل انداز ہو۔ وہ کہتے تھے، اگر دیوتاؤں کی پرستش کا نظام قائم نہ رہا تو عوام کی مذہبی زندگی درہم برہم ہو جائے گی فیثاغورس کی نسبت بیان کیا گیا ہے کہ جب اُس نے اپنا مشہور حسابی قاعدہ معلوم کیا تھا تو اس کے شکرانے میں سو بچھڑوں کی قربانی دیوتاؤں کے نذر کی تھی؛

اس بارے میں سب سے زیادہ نازک معاملہ معلّم و رہنما کی شخصیت کا تھا۔ یہ ظاہر ہے کہ کوئی تعلیم عظمت و رفعت حاصل نہیں کر سکتی، جب تک معلّم کی شخصیت میں بھی عظمت کی شان پیدا نہ ہو جائے لیکن شخصیت کی عظمت کے حدود کیا ہیں؟ یہیں آکر سب کے قدموں نے ٹھوکر کھائی۔ وہ اس کی ٹھیک ٹھیک حدبندی نہ کر سکے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ کبھی شخصیت کو خدا کا اوتار بنا دیا، کبھی ابن اللہ سمجھ لیا، کبھی شریک و سہیم ٹھہرا دیا، اور اگر یہ نہیں کیا تو کم از کم اُس کی تعظیم میں بندگی و نیاز کی سی شان پیدا کر دی۔ یہودیوں نے اپنے ابتدائی عہد کی گمراہیوں کے بعد، کبھی ایسا نہیں کیا کہ پتھر کے بت تراش کر اُن کی پوجا کی ہو۔ لیکن اس بات سے وہ بھی نہ بچ سکے کہ اپنے نبیوں کی قبروں پر ہیکل تعمیر کر کے انہیں عبادت گاہوں کی سی شان و تقدیس دے دیتے تھے۔ گوتم بدھ کی نسبت معلوم ہے کہ اُس کی تعلیم میں اصنام پرستی کے لیے کوئی جگہ نہ تھی۔ اس کی آخری وصیت جو ہم تک پہنچی ہے[۱]، یہ ہے "ایسا نہ کرنا کہ میری نعش کی راکھ کی پوجا شروع کر دو۔ اگر تم نے ایسا کیا تو یقین کرو، نجات کی راہ تم پر بند ہو جائے گی" لیکن اس وصیت پر جیسا کچھ عمل کیا گیا، وہ دنیا کے سامنے ہے۔ نہ صرف بدھ کی خاک اور یادگاروں پر معبد تعمیر کیے گئے۔ بلکہ مذہب کی اشاعت کا ذریعہ ہی یہ سمجھا گیا کہ اُس کے مجسموں سے زمین کا کوئی گوشہ خالی نہ رہے۔ یہ واقعہ

---

[۱] آرلی بودھ ازم ۱۲

ہے کہ دنیا میں کسی معبود کے بھی اتنے مجسمے نہیں بنائے گئے، جتنے گوتم بدھ کے بنائے گئے ہیں۔ اسی طرح ہمیں معلوم ہے کہ مسیحیت کی حقیقی تعلیم سرتاسر توحید کی تعلیم تھی، لیکن ابھی اس کے ظہور پر پورے سو برس بھی نہیں گزرے تھے کہ اُلوہیتِ مسیح کا عقیدہ نشوونما پا چکا تھا۔

توحید فی الصفات

لیکن قرآن نے توحید فی الصفات کا ایسا کامل نقشہ کھینچ دیا کہ اس طرح کی لغزشوں کے تمام دروازے بند ہو گئے۔ اُس نے صرف توحید ہی پر زور نہیں دیا، بلکہ شرک کی بھی راہیں بند کر دیں، اور یہی اس باب میں اس کی خصوصیت ہے۔

وہ کہتا ہے، ہر طرح کی عبادت اور نیاز کی مستحق صرف خدا ہی کی ذات ہے۔ پس اگر تم نے عابدانہ عجز و نیاز کے ساتھ کسی دوسری ہستی کے سامنے سر جھکایا، تو توحید الٰہی کا اعتقاد باقی نہ رہا۔ وہ کہتا ہے، یہ اسی کی ذات ہے جو انسانوں کی پکار سنتی اور اُن کی دعائیں قبول کرتی ہے۔ پس اگر تم نے اپنی دعاؤں اور طلبگاریوں میں کسی دوسری ہستی کو بھی شریک کر لیا، تو گویا تم نے اُسے خدا کی خدائی میں شریک کر لیا۔ وہ کہتا ہے، دعا، استعانت، رکوع، سجود، عجز و نیاز، اعتماد و توکل، اور اس طرح کے تمام عبادت گزارانہ اور نیازمندانہ اعمال، وہ اعمال ہیں جو خدا اور اُس کے بندوں کا باہمی رشتہ قائم کرتے ہیں۔ پس اگر ان اعمال میں تم نے کسی دوسری ہستی کو بھی شریک کر لیا، تو خدا کے رشتۂ معبودیت کی یگانگی باقی نہ رہی۔ اسی طرح عظمتوں، کبریائیوں، کارسازیوں، اور بے نیازیوں کا جو اعتقاد تمہارے اندر خدا کی ہستی کا تصور پیدا کرتا ہے، وہ صرف خدا ہی کے لیے مخصوص ہونا چاہیے۔ اگر تم نے ویسا ہی اعتقاد کسی دوسری ہستی کے لیے بھی پیدا کر لیا، تو تم نے اُسے خدا کا نِد یعنی شریک ٹھہرا لیا، اور توحید کا اعتقاد درہم برہم ہو گیا!

یہی وجہ ہے کہ سورۂ فاتحہ میں اِیَّاکَ نَعۡبُدُ وَاِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ ؕ کی تلقین کی گئی۔ اس میں اوّل تو عبادت کے ساتھ استعانت کا بھی ذکر کیا گیا، پھر دونوں جگہ مفعول کو مقدم کیا جو مفید حصر ہے۔ یعنی "صرف تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور صرف تجھی سے مدد طلب کرتے ہیں"۔ اس کے علاوہ تمام قرآن میں اس کثرت کے ساتھ توحید فی الصفات اور ردِ اشراک پر زور دیا گیا ہے کہ شاید ہی کوئی سورت بلکہ کوئی صفحہ اس سے خالی ہو۔

مقامِ نبوت کی حد بندی

سب سے زیادہ اہم مسئلہ مقامِ نبوت کی حد بندی کا تھا یعنی معلم کی شخصیت کو اس کی اصلی جگہ میں محدود کر دینا، تاکہ شخصیت پرستی کا ہمیشہ کے لیے سدِ باب ہو جائے۔ اس بارے میں قرآن نے جس طرح صاف اور قطعی لفظوں میں جابجا پیغمبر اسلام کی بشریت اور بندگی پر زور دیا ہے، محتاجِ بیان نہیں۔ ہم یہاں صرف ایک بات کی طرف توجہ دلائیں گے۔ اسلام نے اپنی تعلیم کا بنیادی کلمہ جو قرار دیا ہے وہ سب کو معلوم ہے: اَشۡهَدُ اَنۡ لَّاۤ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشۡهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبۡدُهٗ وَرَسُوۡلُهٗ یعنی "میں اقرار کرتا ہوں کہ خدا کے سوا کوئی معبود نہیں، اور میں اقرار کرتا ہوں کہ محمد (صلعم) خدا کا بندہ اور اُس کا رسول ہے" اس اقرار میں جس طرح خدا

کی توحید کا اعتراف کیا گیا ہے، ٹھیک اُسی طرح پیغمبرِ اسلام کی بندگی اور درجۂ رسالت کا بھی اعتراف ہے۔ غور کرنا چاہیے کہ ایسا کیوں کیا گیا؟ صرف اس لیے کہ پیغمبرِ اسلام کی بندگی اور درجۂ رسالت کا اعتقاد اسلام کی اصل و اساس بن جائے، اور اس کا کوئی موقع ہی باقی نہ رہے کہ عبدیت کی جگہ معبودیت کا اور رسالت کی جگہ اوتار کا تخیل پیدا ہو۔ ظاہر ہے کہ اس سے زیادہ اس معاملہ کا تحفظ کیا کیا جا سکتا تھا؟ کوئی شخص دائرۂ اسلام میں داخل ہی نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ خدا کی توحید کی طرح پیغمبرِ اسلامؐ کی بندگی کا بھی اقرار نہ کر لے!

یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں، پیغمبرِ اسلام (صلعم) کی وفات کے بعد مسلمانوں میں بہت سے اختلافات پیدا ہوئے، لیکن اُن کی شخصیت کے بارے میں کبھی کوئی سوال پیدا نہیں ہوا۔ ابھی اُن کی وفات پر چند گھنٹے بھی نہیں گزرے تھے کہ حضرت ابوبکرؓ نے برسرِ منبر اعلان کر دیا تھا:

مَنْ کَانَ مِنْکُمْ یَعْبُدُ مُحَمَّدًا فَاِنَّ مُحَمَّدًا قَدْ مَاتَ، وَمَنْ کَانَ مِنْکُمْ یَعْبُدُ اللّٰہَ فَاِنَّ اللّٰہَ حَیٌّ لَّا یَمُوْتُ! (بخاری)

جو کوئی تم میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی پرستش کرتا تھا۔ سو اُسے معلوم ہونا چاہیے کہ محمدؐ نے وفات پائی۔ اور جو کوئی تم میں سے اللہ کی پرستش کرتا تھا تو اُسے معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ کی ذات ہمیشہ زندہ ہے اُس کے لیے موت نہیں:

(۴) عوام اور خواص دونوں کے لیے ایک تصور

رابعًا، قرآن سے پہلے علوم و فنون کی طرح مذہبی عقائد میں بھی خاص و عام کا امتیاز ملحوظ رکھا جاتا تھا، اور خیال کیا جاتا تھا کہ خدا کا ایک تصور تو حقیقی ہے اور خواص کے لیے ہے۔ ایک تصور مجازی ہے اور عوام کے لیے ہے۔ چنانچہ ہندوستان میں خداشناسی کے تین درجے قرار دیے گئے:

عوام کے لیے دیوتاؤں کی پرستش، خواص کے لیے براہِ راست خدا کی پرستش، اخص الخواص کے لیے وحدۃ الوجود کا مشاہدہ۔ یہی حال فلاسفۂ یونان کا تھا۔ وہ خیال کرتے تھے کہ ایک غیر مرئی اور غیر مجسم خدا کا تصور صرف اہلِ علم و حکمت ہی کر سکتے ہیں۔ عوام کے لیے اسی میں امن ہے کہ دیوتاؤں کی پرستاری میں مشغول رہیں۔

لیکن قرآن نے حقیقت و مجاز یا خاص و عام کا کوئی امتیاز باقی نہ رکھا۔ اُس نے سب کو خداپرستی کی ایک ہی راہ دکھائی، اور سب کے لیے صفاتِ الٰہی کا ایک ہی تصور پیش کر دیا۔ وہ حکما و عرفا سے لے کر جہال و عوام تک، سب کو حقیقت کا ایک ہی جلوہ دکھاتا ہے، اور سب پر اعتقاد و ایمان کا ایک ہی دروازہ کھولتا ہے۔ اُس کا تصوّر جس طرح ایک حکیم و عارف کے لیے سرمایۂ تفکر ہے، اسی طرح ایک چرواہے اور دہقان کے لیے سامانِ تسکین!

اس سلسلہ میں معاملہ کا ایک اور پہلو بھی قابلِ غور ہے۔ ہندوستان میں خواص اور عوام کے خداپرستانہ تصوروں میں جو فرقِ مراتب ملحوظ رکھا گیا، وہ معاملہ کو اس رنگ میں بھی نمایاں کرتا ہے کہ یہاں کا مذہبی نقطۂ خیال ابتدا سے فکر و عمل کی رواداری پر مبنی رہا ہے۔ یعنی کسی دائرۂ فکر کو بھی اتنا تنگ اور بے لچک نہیں رکھا گیا کہ کسی دوسرے دائرہ کی اس میں گنجائش ہی نہ نکل سکے۔ یہاں خواص توحید کی راہ پر گامزن ہوئے لیکن

عوام کے لیے دیوتاؤں کی پرستش اور مورتیوں کی معبودیت کی راہیں بھی کھلی چھوڑ دی گئیں۔ گویا ہر عقیدے کو جگہ دی گئی، ہر عمل کے لیے گنجائش نکالی گئی، اور ہر طور طریقہ کو آزادانہ نشوونما کا موقعہ مل گیا۔ مذہبی اختلاف جو دوسری قوموں میں باہمی جنگ و جدال کا ذریعہ رہا ہے، یہاں آپس کے سمجھوتوں کا ذریعہ بنا، اور ہمیشہ متعارض اصول باہم ٹکرانے کی جگہ ایک دوسرے کے لیے جگہیں نکالتے رہے۔ تخالف کی حالت میں تفاہم اور تعارض کی حالت میں تطابق، گویا یہاں کے ذہنی مزاج کی عام خصوصیت تھی۔ ایک ویدانتی جانتا ہے کہ اصل حقیقت اشراک اور بت پرستی کے عقائد سے بالاتر ہے، تاہم یہ جاننے پر بھی وہ بت پرستی کا منکر و مخالف نہیں ہو جاتا۔ کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ پس ماندگانِ راہ کے لیے یہی ایک ابتدائی منزل ہوئی، اور رہرو کوئی راہ اختیار کرے، مگر مقصود اصلی ہر حال میں سب کا ایک ہی ہے:

خواہ از طریقِ میکدہ خواہ از رہِ حرم　　از ہر جہت کہ شاد شوی فتح باب گیر!

چنانچہ چند سال ہوئے، پروفیسر سی۔ ای۔ ام جوڈ (Joad) نے ہندوستان کے تاریخی خصائص پر نظر ڈالتے ہوئے اس خصوصیت کو سب سے زیادہ نمایاں جگہ دی تھی، اور اُس سے پہلے دوسرے اہل قلم بھی اس پہلو پر زور دے چکے ہیں۔

ہمیں چاہیے، معاملے کے اس پہلو پر بھی ایک نظر ڈال لیں۔

بلاشبہ فکر و عمل کی اس روادارانہ سوچ کا جو ہندوستان کی تاریخ میں برابر اُبھرتی رہی ہے، ہمیں اعتراف کرنا چاہیے، لیکن معاملہ صرف اتنے ہی پر ختم نہیں ہو جاتا۔ زندگی کے حقائق کے تقاضوں کا یہاں کچھ عجیب حال ہے۔ یہاں ہم کسی ایک گوشے ہی کے ہو کر نہیں رہ جا سکتے۔ دوسرے گوشوں کی بھی خبر رکھنی پڑتی ہے، اور فکر و عمل کی ہر راہ اتنی دور تک چلی گئی ہے کہ کہیں نہ کہیں جا کر حد بندی کی لکیریں کھینچنی پڑتی ہیں۔ اگر ایسا نہ کریں تو علم و اخلاق کے تمام احکام متزلزل ہو جائیں، اور اخلاقی اقدار کی کوئی مستقل حیثیت باقی نہ رہے۔ رواداری یقیناً ایک خوبی کی بات ہے، لیکن ساتھ ہی عقیدہ کی مضبوطی، رائے کی پختگی، اور فکر کی استقامت کی خوبیوں سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔ پس یہاں کوئی نہ کوئی حد بندی کا خط ضرور ہونا چاہیے جو ان تمام خوبیوں کو اپنی اپنی جگہ قائم رکھے۔ اخلاق کے تمام احکام انہی حد بندیوں کے خطوط سے بنتے اور اُبھرتے ہیں۔ جونہی یہ ہلنے لگتے ہیں، اخلاق کی پوری دیوار ہل جاتی ہے۔ عفو و درگزر بڑی ہی حسن و خوبی کی بات ہے، لیکن یہی عفو و درگزر جب اپنی حد بندی کے خط سے آگے بڑھ جاتا ہے، تو عفو و درگزر نہیں رہتا، اُسے بزدلی اور بے ہمتی کے نام سے پکارنے لگتے ہیں۔ شجاعت انسانی سیرت کا سب سے بڑا وصف ہے، لیکن یہی وصف جب اپنی حد سے گزر جائے گا، تو نہ صرف اس کا حکم ہی بدل جائے گا، بلکہ صورت بھی بدل جائیگی۔ اب اُسے دیکھیے تو وہ شجاعت نہیں ہے قہر و

غضب اور ظلم و تشدد ہوگیا ہے!

دو حالتیں ہیں، اور دونوں کا حکم ایک نہیں ہو سکتا۔ ایک حالت یہ ہے کہ کسی خاص اعتقاد اور عمل کی روشنی ہمارے سامنے آگئی ہے اور ہم ایک خاص نتیجہ تک پہنچ گئے ہیں۔ اب اس کی نسبت ہمارا طرزِ عمل کیا ہونا چاہیئے؟ ہم اس پر مضبوطی کے ساتھ جمے رہیں یا متزلزل رہیں؟ دوسری حالت یہ ہے کہ جس طرح ہم کسی خاص نتیجے تک پہنچے ہیں، اُسی طرح ایک دوسرا شخص بھی ایک دوسرے نتیجے تک پہنچ گیا ہے، اور یہاں فکر و عمل کی ایک ہی راہ سب کے آگے نہیں کھلتی۔ اب ہمارا طرزِ عمل اس شخص کی نسبت کیا ہونا چاہیے؟ ہماری طرح اُسے بھی اپنی راہ چلنے کا حق ہے یا نہیں؟ رواداری کا صحیح محل دوسری حالت ہے۔ پہلی نہیں ہے۔ اگر پہلی حالت میں وہ آئے گی تو یہ رواداری نہ ہوگی۔ اعتقاد کی کمزوری اور یقین کا فقدان ہوگا۔

رواداری یہ ہے کہ اپنے حقِ اعتقاد و عمل کے ساتھ دوسرے حقِ اعتقاد و عمل کا بھی اعتراف کیجیے، اور اگر دوسرے کی راہ آپ کو صریح غلط دکھائی دے رہی ہے، جب بھی اُس کے اس حق سے انکار نہ کیجیے کہ وہ اپنی غلط راہ پر بھی چل سکتا ہے لیکن اگر رواداری کے حدود یہاں تک بڑھا دیے گئے کہ وہ آپ کے عقیدوں میں بھی مداخلت کر سکتی ہے اور آپ کے فیصلوں کو بھی نرم کر دے سکتی ہے، تو پھر یہ رواداری نہ ہوئی، استقامت فکر کی نفی ہوگئی۔

مفاہمت زندگی کی ایک بنیادی ضرورت ہے، اور ہماری زندگی ہی سرتاسر مفاہمت ہے۔ لیکن ہر راہ کی طرح یہاں بھی حد بندی کی کوئی لکیر کھینچنی پڑیگی، اور جس حد پر بھی جا کر لکیر کھنچ گئی، معاً عقیدہ پیدا ہوگیا۔ اب جب تک عقیدہ کی تبدیلی کی کوئی روشنی سامنے نہیں آتی، آپ مجبور ہیں کہ اُس پر جمے رہیں اور اس میں کاٹ چھانٹ نہ کریں۔ آپ دوسروں کے عقائد کا احترام ضرور کرینگے، لیکن اپنے عقیدہ کو بھی کمزوری کے حوالہ نہیں ہونے دینگے۔

کتنی ہی مصیبتیں ہیں جو اعتقاد اور عمل کے تمام گوشوں میں اسی دروازہ سے آئیں کہ ان دو مختلف حالتوں کا امتیازی خط اپنی جگہ سے ہل گیا۔ اگر اعتقاد کی مضبوطی آئی تو اتنی دور تک چلی گئی کہ رواداری کے تمام تقاضے بھلا دیے گئے اور دوسروں کے اعتقاد و عمل میں جبراً مداخلت کی جانے لگی۔ اگر رواداری آئی تو اس بے اعتدالی کے ساتھ آئی کہ استقامتِ فکر و رائے کے لیے کوئی جگہ نہ رہی، ہر عقیدہ لچک گیا، ہر یقین ہلنے لگا۔ پہلی بے اعتدالی کی مثالیں ہمیں ان مذہبی تنگ نظریوں اور سخت گیریوں میں ملتی ہیں جن کی خونچکاں داستانوں سے تاریخ کے اوراق رنگین ہو چکے ہیں۔ دوسری بے اعتدالی کے نتائج کی مثال ہمیں ہندوستان کی تاریخ مہیا کر دیتی ہے۔ یہاں فکر و عقیدہ کی کوئی بلندی بھی وہم و جہالت کی گراوٹ سے اپنے آپ کو محفوظ نہ رکھ سکی، اور علم و عقل اور وہم و جہل میں ہمیشہ سمجھوتوں کا سلسلہ جاری رہا۔ ان سمجھوتوں نے ہندوستانی دماغ کی شکل و صورت بگاڑ دی۔ اس کی فکری

ترقیوں کا تمام حُسن اصنامی عقیدوں اور وہم پرستیوں کے گرد و غبار میں چھپ گیا۔

زمانۂ حال کے مؤرخوں نے اس صورتِ حال کا اعتراف کیا ہے۔ ہمارے زمانے کا ایک قابل ہندو مصنف اس عہد کی فکری حالت پر نظر ڈالتے ہوئے جب آریائی تصورات ہندوستان کے مقامی مذاہب سے مخلوط ہونے لگے تھے، تسلیم کرتا ہے کہ "ہندو مذہب کی مخلوط نوعیّت کی توضیح ہمیں اس صورتِ حال میں مل جاتی ہے۔ صحرا نورد قبائل کے وحشیانہ توہمات سے لے کر اونچے سے اونچے درجہ کے تہ در تہ غور و خوض تک، ہر درجہ اور ہر دائرۂ فکر کے خیالات یہاں باہم دگر ملتے اور مخلوط ہوتے رہے۔ آریائی مذہب اوّل روز سے کشادہ دل، خود رَو اور روادار تھا۔ وہ جب کبھی کسی نئے مؤثر سے دوچار ہوا، تو خود سمٹتا گیا اور جگہیں نکالتا رہا۔ اُس کی اس مزاجی حالت میں ہم ایک سچے انکسارِ طبع اور ہمدردانہ مفاہمت کا شائستہ رجحان محسوس کرتے ہیں۔ ہندو دماغ اس کے لیے طیّار نہیں ہوا کہ نچلے درجہ کے مذہبوں کو نظر انداز کر دے یا لڑ کر ان کی ہستی مٹا دے۔ اس کے اندر ایک مذہبی مجنون کا غرور نہیں تھا کہ صرف اُسی کا مذہب سچّا مذہب ہے۔ اگر انسانوں کے ایک گروہ کو کسی ایک معبود کی پرستش اُس کے طور طریقے پر تسکینِ قلب مہیّا کر دیتی ہے، تو تسلیم کر لینا چاہیے کہ یہ بھی سچائی کی ایک راہ ہے۔ مکمل سچّائی پر کوئی بہ یک دفعہ قابض نہیں ہو جا سکتا۔ وہ صرف بہ تدریج اور بہ تفریق ہی حاصل کی جا سکتی ہے، اور یہاں ابتدائی اور عارضی درجوں کو بھی ان کی ایک جگہ دینی پڑتی ہے۔ ہندو دماغ نے رواداری اور باہمی مفاہمتوں کی یہ راہ اختیار کر لی لیکن وہ یہ بات بھول گیا کہ بعض حالات ایسے بھی ہوتے ہیں جب رواداری کی جگہ ناروا داری ایک فضیلت کا حکم پیدا کر لیتی ہے، اور مذہبی معاملات میں بھی گریشم (Gresham) کے قانون کی طرح کا ایک قانون کام کرتا رہتا ہے[1]۔ جب آریائی اور غیر آریائی مذاہب باہم دگر ملے۔ ایک شائستہ، دوسرا ناشائستہ۔ ایک اچھّی قسم کا، دوسرا نکمّا۔ تو غیر شائستہ اور نکمّے اجزاء میں قدرتی طور پر یہ میلان پیدا ہو گیا کہ شائستہ اور اچھّے اجزاء کو دبا کر معطّل کر دے[2]۔"

بہر حال قرآن کے تصوّرِ الٰہی کی ایک بنیادی خصوصیّت یہ ہے کہ اس نے کسی طرح کی اعتقادی مفاہمت اس بارے میں جائز نہیں رکھی۔ وہ اپنے توحیدی اور تنزیہی تصوّر میں سرتاسر بے میل اور بے لچک رہا۔ اس کی یہ مضبوط جگہ کسی طرح بھی ہمیں روادارانہ طرزِ عمل سے روکنا نہیں چاہتی۔ البتہ اعتقادی مفاہمتوں کے تمام دروازے بند کر دیتی ہے۔

خامسًا، قرآن نے تصورِ الٰہی کی بنیاد انسان کے عالمگیر وجدانی احساس پر رکھی ہے۔ یہ نہیں کیا ہے کہ اسے نظر و فکر کی کاوشوں کا ایک ایسا معمّہ بنا دیا ہو جسے کسی خاص طبقہ کا ذہن ہی حل کر سکے۔ انسان کا عالمگیر

---

[1] گریشم کے قانون سے مقصود اقتصادیات کی یہ اصل ہے کہ اگر کھرے سکوں کے ساتھ کھوٹے سکّے ملا دیے جائیں گے تو کھرے سکوں کی قیمت باقی نہیں رہے گی۔ [2] پروفیسر ایس۔ رادھا کرشناں۔ انڈین فلاسفی۔ جلد اوّل صفحہ ۱۱۹۔ طبع ثانی۔

وجدانی احساس کیا ہے؟ یہ ہے کہ کائناتِ ہستی خود بخود پیدا نہیں ہوگئی۔ پیدا کی گئی ہے، اور اس لیے ضروری ہے کہ ایک صانع ہستی موجود ہو۔ پس قرآن بھی اس بارے میں عام طور پر جو کچھ بتلاتا ہے، وہ اتنا ہی ہے، اس سے زیادہ جو کچھ ہے، وہ مذہبی عقیدہ کا معاملہ نہیں ہے۔ انفرادی اور ذاتی تجربہ و احوال کا معاملہ ہے۔ اس لیے وہ اس کا بوجھ جماعت کے افکار پر نہیں ڈالتا۔ اسے اصحابِ جہد و طلب کے لیے چھوڑ دیتا ہے:

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا، لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا، وَاِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ (۲۹: آخری آیت)	اور جو لوگ ہم تک پہنچنے کے لیے کوشش کریں گے تو ہم بھی ضرور اُن پر راہ کھول دیں گے، اور اللہ نیک کرداروں سے الگ کب ہے؟ وہ تو اُن کے ساتھ ہے!
وَفِي الْاَرْضِ اٰيٰتٌ لِّلْمُوْقِنِيْنَ، وَفِيْٓ اَنْفُسِكُمْ، اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ؟ (۵۱: ۲۱)	اور اُن لوگوں کے لیے جو یقین رکھتے ہیں، زمین میں کتنی ہی حقیقت کی نشانیاں ہیں، اور خود تمہارے اندر بھی، پھر کیا تم دیکھتے نہیں؟

سادساً، اِسی مقام سے وہ فرقِ مراتب بھی نمایاں ہو جاتا ہے، جو اسلام نے بالکل ایک دوسری شکل و نوعیت میں عوام و خواص کا ملحوظ رکھا ہے۔ ہندو مفکروں نے عوام اور خواص میں الگ الگ تصور اور عقیدے تقسیم کیے۔ اسلام نے تصور اور عقیدے کے اعتبار سے کوئی امتیاز جائز نہیں رکھا۔ وہ حقیقت کا ایک ہی عقیدہ ہر انسانی دل و دماغ کے آگے پیش کرتا ہے لیکن یہ ظاہر ہے کہ طلب و جہد کے لحاظ سے سب کے مراتب یکساں نہیں ہو سکتے، اور یہاں ایک ہی درجہ کی پیاس سے کر ہر طالبِ حقیقت نہیں آتا۔ عامۃ الناس بہ حیثیت جماعت کے اپنا ایک خاص مزاج اور اپنی خاص احتیاج رکھتے ہیں۔ خاص افراد بہ حیثیت فرد کے اپنی طلب و استعداد کا الگ الگ درجہ و مقام رکھتے ہیں پس اس نے جس امتیاز سے پہلی صورت میں انکار کر دیا تھا، اُس سے دوسری صورت میں انکار نہیں کیا، اور مختلف مدارجِ طلب کے لیے عرفان و یقین کی مختلف راہیں کھلی چھوڑ دیں۔

صحیح بخاری اور مسلم کی ایک متفق علیہ روایت میں جو حدیث جبریل کے نام سے مشہور ہے نہایت جامع و مانع لفظوں میں یہ فرقِ مراتب واضح کر دیا گیا ہے۔ یہ حدیث تین مرتبوں کا ذکر کرتی ہے: اسلام، ایمان، اور احسان۔ اِسلام یہ ہے کہ اسلامی عقیدے کا اقرار کرنا اور عمل کے چاروں رکن یعنی نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ انجام دینا۔ ایمان یہ ہے کہ اقرار کے مرتبہ سے آگے بڑھنا اور اسلام کے بنیادی عقائد کے حق الیقین کا مرتبہ حاصل کرنا۔ احسان یہ ہے کہ:

ان تعبد اللّٰہ کانک تراہ، وان لم تکن تراہ فانہ یراک (صحیحین)	تو اللہ کی اس طرح عبادت کرے، گویا اُسے اپنے سامنے دیکھ رہا ہے اور اگر تو اُسے نہیں دیکھ رہا تو وہ تجھے دیکھ رہا ہے۔

پس گویا عرفانِ حقیقت کے لحاظ سے یہاں تین مرتبے ہوئے۔ پہلا مرتبہ اسلامی دائرہ کے عام اعتقاد و عمل کا ہے۔ یہ اسلام ہے یعنی جس نے اسلامی عقیدہ کا اقرار کر لیا، اور اس کے اعمال کی زندگی اختیار کر لی، وہ اس دائرہ میں آگیا۔

لیکن دائرہ میں داخل ہو جانے سے یہ لازم نہیں آجاتا کہ علم ویقین کے جو مقامات ہیں، وہ بھی ہر وارد و داخل کو حاصل ہو گئے۔ پس اب دُوسرا مرتبہ نمایاں ہُوا جسے ایمان سے تعبیر کیا ہے۔ اسلام ظاہر کا اقرار و عمل تھا۔ ایمان دل و دماغ کا یقین واذعان ہے۔ یہ مرتبہ جس نے حاصل کر لیا، وہ عوام سے نکل کر خواص کے زمرہ میں داخل ہو گیا لیکن معاملہ اتنے ہی پر ختم نہیں ہو جاتا۔ عرفانِ حقیقت اور عین الیقینی ایقان کا ایک اور مرتبہ بھی باقی رہ جاتا ہے۔ اسے احسان سے تعبیر کیا گیا۔ لیکن یہ مقام محض اعتقاد اور یقین پیدا کر لینے کا نہیں ہے جو ایک گروہ کو بہ حیثیت گروہ کے حاصل ہو جا سکتا ہے۔ یہ ذاتی تجربہ کا مقام ہے۔ جو یہاں تک پہنچتا ہے، وہ اپنے ذاتی تجربہ و کشف سے یہ درجہ حاصل کر لیتا ہے۔ تعلیمی اور احکامی عقائد کو اس میں دخل نہیں۔ بحث و نظر کی اس میں گنجائش نہیں۔ یہ خود کرنے اور پانے کا معاملہ ہے بتلانے اور سمجھانے کا معاملہ نہیں۔ جو یہاں تک پہنچ گیا، وہ اگر کچھ بتلائے گا بھی تو یہی بتلائے گا کہ میری طرح بن جاؤ پھر جو کچھ دکھائی دیتا ہے، دیکھ لو:

پرسید یکے کہ عاشقی چیست ؟ گفتم کہ چو من شوی بدانی

اسلام نے اس طرح طلب وجد کی ہر پیاس کے لیے درجہ بدرجہ سیرابی کا سامان کر دیا۔ عوام کے لیے پہلا مرتبہ کافی ہے۔ خواص کے لیے دوسرا مرتبہ ضروری ہے، اور اخص الخواص کی پیاس بغیر تیسرے جام کے تسکین پانے والی نہیں۔ اُس کے تصورِ الٰہی اور عقیدہ کا میخانہ ایک ہے، لیکن جام الگ الگ ہوئے ہر طالب کے حصے میں اُس کے ظرف کے مطابق ایک جام آجاتا ہے، اور اس کی سرشاری کی کیفیتیں مہیا کر دیتا ہے۔ و نشدِ درّ ما قال:

ساقی بہ ہمہ بادہ زیک خُم دہد، امّا
در مجلسِ او مستی ہر کس ز شرابے ست!

یہاں یہ امر بھی واضح کر دینا بے محل نہ ہو گا کہ قرآن کی متعدد تصریحات ہیں جنہیں اگر وحدۃ الوجودی تصوّر کی طرف لے جایا جائے تو بلا تکلف دور تک جا سکتی ہیں۔ مثلاً "ھوالاوّل والاٰخر والظاھر والباطن" اور "اینما تولوا فثم وجہ اللہ" اور "ونحن اقرب الیہ من حبل الورید" اور "کل یوم ھو فی شان" یا تمام اس طرح کی تصریحات جن میں تمام موجودات کا بالآخر اللہ کی طرف لوٹنا بیان کیا گیا ہے۔ توحیدِ وجودی کے قائل ان تمام آیات سے مسئلہ وحدۃ الوجود پر استدلال کرتے ہیں، اور شاہ ولی اللہ نے تو یہاں تک لکھ دیا ہے کہ "اگر میں مسئلہ وحدۃ الوجود کو ثابت کرنا چاہوں تو قرآن و حدیث کے تمام نصوص و ظواہر سے اس کا اثبات کر سکتا ہوں" لیکن صاف بات جو اس بارے میں معلوم ہوتی ہے، وہ یہی ہے کہ ان تمام تصریحات کو ان کے قریبی محامل سے دور نہیں لے جانا چاہیے، اور ان معانی سے آگے نہیں بڑھنا چاہیے جو صدرِ اوّل کے مخاطبوں نے سمجھے تھے۔ باقی رہا حقیقت

کے کشف وعرفان کا وہ مقام جو عرفا و طریق کو پیش آتا ہے، تو وہ کسی طرح بھی قرآن کے تصور الٰہی کے عقیدے کے خلاف نہیں۔ اُس کا تصور ایک جامع تصور ہے، اور ہر توحیدی تصور کی اس میں گنجائش موجود ہے۔ جو افراد خاصہ مقام احسان تک رسائی حاصل کرتے ہیں، وہ حقیقت کو اس کی پس پردہ جلوہ طرازیوں میں بھی دیکھ لیتے ہیں اور عرفان کا وہ منتہیٰ مرتبہ جو فکر انسانی کے دست رس میں ہے، انہیں حاصل ہو جاتا ہے۔ ومن لم یذق، لم یدر:

تو نظر باز نۂ ورنہ تغافل نگہ ست

تو زباں فہم نۂ ورنہ خموشی سخن ست!

سابعاً جس ترتیب کے ساتھ سورۂ فاتحہ میں یہ تینوں صفتیں بیان کی گئی ہیں، دراصل فکر انسانی کی طلب و معرفت کی قدرتی منزلیں ہیں، اور اگر غور کیا جائے، تو اسی ترتیب سے پیش آتی ہیں۔ سب سے پہلے ربوبیت کا ذکر کیا گیا۔ کیونکہ کائناتِ ہستی میں سب سے زیادہ ظاہر نمود اِسی صفت کی ہے، اور ہر وجود کو سب سے زیادہ اِسی کی احتیاج ہے۔ ربوبیت کے بعد رحمت کا ذکر کیا گیا، کیونکہ اس کی حقیقت بمقابلۂ ربوبیت کے مطالعہ و تفکر کی محتاج تھی، اور ربوبیت کے مشاہدات سے جب نظر آگے بڑھتی ہے، تب رحمت کا جلوہ نمودار ہوتا ہے۔ پھر رحمت کے بعد عدالت کی صفت جلوہ افروز ہوئی، کیونکہ یہ سفر کی آخری منزل ہے۔ رحمت کے مشاہدات کی منزل سے جب قدم آگے بڑھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے، یہاں عدالت کی نمود بھی ہر جگہ موجود ہے، اور اس لیے موجود ہے کہ ربوبیت اور رحمت کا مقتضا یہی ہے۔

---

(۶)

اِهۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِيۡمَ ﴿۱﴾

ہدایت

ہدایت کے معنی رہنمائی کرنے، راہ دکھانے، راہ پر لگا دینے کے ہیں۔ اجمالاً اس کا ذکر اوپر گزر چکا ہے۔ یہاں ہم چاہتے ہیں، ہدایت کے مختلف مراتب و اقسام پر نظر ڈالیں جن کا قرآنِ حکیم نے ذکر کیا ہے، اور جن میں سے ایک خاص مرتبہ، وحی و نبوت کی ہدایت کا ہے۔

تکوینِ وجود کے مراتبِ اربعہ

تم ابھی پڑھ چکے ہو کہ خدا کی ربوبیت نے جس طرح مخلوقات کو اُن کے مناسبِ حال جسم و قویٰ دیئے ہیں، اُسی طرح اُن کی ہدایت کا فطری سامان بھی مہیا کر دیا ہے۔ فطرت کی یہی ہدایت ہے جو ہر وجود کو زندگی و معیشت کی راہ پر لگاتی اور ضروریاتِ زندگی کی جستجو میں رہنما ہوتی ہے۔ اگر فطرت کی یہ ہدایت موجود نہ ہوتی، تو ممکن نہ تھا کہ کوئی مخلوق بھی زندگی و بقا کا سامان بہم پہنچا سکتی۔ چنانچہ قرآن نے جابجا اس حقیقت پر توجہ دلائی ہے۔ وہ کہتا ہے، ہر وجود کے بننے اور درجۂ تکمیل تک پہنچنے کے مختلف مراتب ہیں، اور اُن میں آخری مرتبہ ہدایت کا مرتبہ ہے۔ سورۂ اعلیٰ میں بالترتیب چار مرتبوں کا ذکر کیا ہے:

اَلَّذِیۡ خَلَقَ فَسَوّٰی ۪ۙ وَ الَّذِیۡ قَدَّرَ فَهَدٰی ۪ۙ (۸۷ : ۲) — وہ پروردگار جس نے ہر چیز پیدا کی، پھر اُسے درست کیا، پھر ایک اندازہ ٹھہرا دیا، پھر اُس پر راہ (عمل) کھول دی!

یعنی تکوینِ وجود کے چار مرتبے ہوئے: تخلیق، تسویہ، تقدیر، ہدایت۔

تخلیق کے معنی پیدا کرنے کے ہیں۔ یہ بات کہ کائناتِ خلقت اور اُس کے ہر وجود کا مواد عدم سے وجود میں آ گیا، تخلیق ہے۔

تسویہ کے معنی یہ ہیں کہ ایک چیز کو جس طرح ہونا چاہیے، ٹھیک ٹھیک اُسی طرح درست اور آراستہ کر دینا۔

تقدیر کے معنی اندازہ ٹھہرا دینے کے ہیں، اور اِس کی تشریح اوپر گزر چکی ہے۔

ہدایت سے مقصود یہ ہے کہ ہر وجود پر اُس کی زندگی و معیشت کی راہ کھول دی جائے، اور اس کی تشریح بھی ربوبیت کے مبحث میں گزر چکی ہے۔

مثلاً مخلوقات میں ایک خاص قسم پرند کی ہے۔

(۱) یہ بات کہ اُن کا مادہ خلقت ظہور میں آ گیا، تخلیق ہے۔

(۲) یہ بات کہ اُن کے تمام ظاہری و باطنی قویٰ اس طرح بنا دیے گئے کہ ٹھیک ٹھیک قوام و اعتدال کی حالت پیدا ہوگئی، تسویہ ہے۔

(۳) یہ بات کہ اُن کے ظاہری و باطنی قویٰ کے اعمال کے لیے ایک خاص طرح کا اندازہ ٹھہرا دیا گیا ہے جس سے وہ باہر نہیں جا سکتے، تقدیر ہے۔ مثلاً یہ کہ ہوا میں اُڑیں گے مچھلیوں کی طرح پانی میں تیریں گے نہیں۔

(۴) یہ بات کہ اُن کے اندر وجدان و حواس کی روشنی پیدا ہوگئی جو انہیں زندگی و بقا کی راہیں دکھاتی، اور سامانِ حیات کے طلب و حصول میں رہنمائی کرتی ہے، ہدایت ہے۔

قرآن کہتا ہے، خدا کی ربوبیت کا مقتضا یہی تھا کہ جس طرح اُس نے ہر وجود کو اُس کا جامۂ ہستی عطا فرمایا، اور اُس کے ظاہری و باطنی قویٰ درست کر دیے، اور اُس کے اعمال کے لیے ایک مناسب حال اندازہ ٹھہرا دیا، اُسی طرح اُس کی ہدایت کا بھی سر و سامان کر دیا:

رَبُّنَا الَّذِیْٓ اَعْطٰی کُلَّ شَیْءٍ خَلْقَہٗ ثُمَّ ھَدٰی (۲۰: ۵۰)

ہمارا پروردگار وہ ہے جس نے ہر چیز کو اُس کی بناوٹ دی، پھر اُس پر راہِ عمل کھول دی!

قرآن نے حضرت ابراہیم (علیہ السلام) اور اُن کی قوم کا جو مکالمہ جابجا نقل کیا ہے، اُس میں حضرت ابراہیمؑ اپنے عقیدہ کا اعلان کرتے ہوئے کہتے ہیں:

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰھِیْمُ لِاَبِیْہِ وَقَوْمِہٖٓ اِنَّنِیْ بَرَآءٌ مِّمَّا تَعْبُدُوْنَ ۙ اِلَّا الَّذِیْ فَطَرَنِیْ فَاِنَّہٗ سَیَھْدِیْنِ (۴۳: ۲۶-۲۷)

اور جب ابراہیم نے اپنے باپ اور قوم سے کہا تھا: تم جن (دیوتاؤں) کی پرستش کرتے ہو، مجھے اُن سے کوئی سروکار نہیں۔ میرا اگر رشتہ ہے تو اُس ذات سے، جس نے مجھے پیدا کیا ہے، اور وہی میری رہنمائی کرے گی۔

"اَلَّذِیْ فَطَرَنِیْ فَاِنَّہٗ سَیَھْدِیْنِ" یعنی جس خالق نے مجھے جسم و وجود عطا فرمایا ہے، ضروری ہے کہ اُس نے میری ہدایت کا بھی سامان کر دیا ہو۔ سورۂ شعرا میں یہی بات زیادہ وضاحت کے ساتھ بیان کی گئی ہے:

اَلَّذِیْ خَلَقَنِیْ فَھُوَ یَھْدِیْنِ ۙ وَالَّذِیْ ھُوَ یُطْعِمُنِیْ وَیَسْقِیْنِ ۙ وَاِذَا مَرِضْتُ فَھُوَ یَشْفِیْنِ ۙ (۲۶: ۸۰)

جس پروردگار نے مجھے پیدا کیا ہے، وہی میری ہدایت کرے گا، اور پھر وہی ہے جو مجھے کھلاتا اور پلاتا ہے؛ اور جب بیمار ہو جاتا ہوں تو شفا بخشتا ہے!

یعنی جس پروردگار کی پروردگاری نے میری تمام ضروریاتِ زندگی کا سامان کر دیا ہے، جو مجھے بھوک کے لیے غذا، پیاس کے لیے پانی اور بیماری میں شفا عطا فرماتا ہے؛ کیونکر ممکن ہے کہ اُس نے مجھے پیدا تو کیا ہو لیکن میری ہدایت کا سامان نہ کیا ہو؟ اگر اُس نے مجھے پیدا کیا ہے، تو یقیناً وہی ہے جو طلب و سعی میں میری رہنمائی بھی کرے

سورۂ صافات میں یہی مطلب ان لفظوں میں ادا کیا گیا ہے:

اِنِّیْ ذَاهِبٌ اِلٰی رَبِّیْ سَیَهْدِیْنِ (۹۹:۳۷) — میں (ہر طرف سے کٹ کر) اپنے پروردگار کا رُخ کرتا ہوں۔ وہ میری ہدایت کرے گا!

"رَبِّیْ" کے لفظ پر غور کرو، وہ میرا "رب" ہے، اور جب وہ "رب" ہے تو ضروری ہے کہ وہی مجھ پر راہِ عمل بھی کھول دے!

ہدایت کے ابتدائی تین مرتبے

پھر ہدایت کے بھی مختلف مراتب ہیں جو ہم حیوانات میں محسوس کرتے ہیں۔

سب سے پہلا مرتبہ وجدان کی ہدایت کا ہے۔ وجدان طبیعتِ حیوانی کا فطری اور اندرونی الہام ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ایک بچہ پیدا ہوتے ہی غذا کے لیے رونے لگتا ہے، اور بغیر اس کے کہ خارج کی کوئی رہنمائی اُسے ملی ہو، ماں کی چھاتی مُنہ میں لیتے ہی اُسے چوسنا اور اپنی غذا حاصل کر لیتا ہے۔

وجدان کے بعد حواس کی ہدایت کا مرتبہ ہے، اور وہ اس سے بلند تر ہے۔ یہ ہمیں دیکھنے، سُننے، چکھنے، چھونے، اور سونگھنے کی توفیق بخشتی ہے، اور انہی کے ذریعہ ہم خارج کا علم حاصل کرتے ہیں۔

ہدایتِ فطرت کے یہ دونوں مرتبے انسان اور حیوان، سب کے لیے ہیں، لیکن جہاں تک انسان کا تعلق ہے، ہم دیکھتے ہیں کہ ایک تیسرا مرتبۂ ہدایت بھی موجود ہے، اور وہ عقل کی ہدایت ہے۔ فطرت کی یہی ہدایت ہے جس نے انسان کے آگے غیر محدود ترقیات کا دروازہ کھول دیا ہے، اور اُسے کائناتِ ارضی کی تمام مخلوقات کا حاصل و خلاصہ بنا دیا ہے۔

وجدان کی ہدایت اُس میں سعی و طلب کا ولولہ پیدا کرتی ہے، حواس اس کے لیے معلومات بہم پہنچاتے ہیں، اور عقل، نتائج و احکام مرتب کرتی ہے۔ حیوانات کو اس آخری مرتبہ کی ضرورت نہ تھی، اس لیے اُن کا قدم وجدان اور حواس سے آگے نہیں بڑھا، لیکن انسان میں یہ تینوں مرتبے جمع ہو گئے۔

جوہرِ عقل کیا ہے؟ دراصل اُسی قوت کی ایک ترقی یافتہ حالت ہے جس نے حیوانات میں وجدان اور حواس کی روشنی پیدا کر دی ہے۔ جس طرح انسان کا جسم، اجسامِ ارضی کی سب سے اعلیٰ کڑی ہے، اُسی طرح اس کی معنوی قوت بھی تمام معنوی قوتوں کا برترین جوہر ہے۔ روحِ حیوانی کا وہ جوہرِ ادراک، جو نباتات میں مخفی، اور حیوانات کے وجدان و مشاعر میں نمایاں تھا، انسان کے مرتبے میں پہنچ کر درجۂ کمال تک پہنچ گیا، اور جوہرِ عقل کے نام سے پکارا گیا۔

ہر مرتبۂ ہدایت ایک خاص حد سے آگے رہنمائی نہیں کر سکتا

پھر ہم دیکھتے ہیں کہ ہدایتِ فطرت کے اِن تینوں مرتبوں میں سے ہر مرتبہ اپنی قوت و عمل کا ایک خاص دائرہ رکھتا ہے۔ اُس سے آگے نہیں بڑھ سکتا۔ اور اگر اُس مرتبہ سے ایک دوسرا

بلند تر مرتبہ موجود نہ ہوتا، تو ہماری معنوی قوتیں اُس حد تک ترقی نہ کرسکتیں جس حد تک فطرت کی رہنمائی سے ترقی کر رہی ہیں۔

وجدان کی ہدایت ہم میں طلب وسعی کا جوش پیدا کرتی ہے اور مطلوباتِ زندگی کی راہ پر لگاتی ہے۔ لیکن ہمارے وجود سے باہر جو کچھ موجود ہے، اُس کا ادراک حاصل نہیں کرسکتی۔ یہ کام مرتبۂ حواس کی ہدایت کا ہے۔ وجدان کی رہنمائی جب درماندہ ہو جاتی ہے تو حواس کی دستگیری نمایاں ہوتی ہے۔ آنکھ دیکھتی ہے۔ کان سُنتا ہے۔ زبان چکھتی ہے۔ ہاتھ چھوتا ہے، ناک سونگھتی ہے، اور اس طرح ہم اپنے وجود سے باہر کی تمام محسوس اشیا کا ادراک حاصل کر لیتے ہیں؛

لیکن حواس کی ہدایت بھی ایک خاص حد تک ہی کام دے سکتی ہے۔ اُس سے آگے نہیں بڑھ سکتی۔ آنکھ دیکھتی ہے مگر صرف اُسی حالت میں جبکہ دیکھنے کی تمام شرطیں موجود ہوں۔ اگر کوئی ایک شرط بھی نہ پائی جائے۔ مثلاً روشنی نہ ہو، یا فاصلہ زیادہ ہو، تو ہم آنکھ رکھتے ہوئے بھی ایک موجود چیز کو براہِ راست نہیں دیکھ سکتے۔ علاوہ بریں حواس کی ہدایت صرف اتنا ہی کرسکتی ہے کہ اشیا کا احساس پیدا کردے، لیکن مجرد احساس کافی نہیں ہے ہمیں استنباط و استنتاج کی ضرورت ہے، احکام کی ضرورت ہے، کلّیات کی ضرورت ہے۔ اور یہ کام عقل کی ہدایت کا ہے۔ وہ اُن تمام مُدرکات کو جو حواس کے ذریعہ حاصل ہوتی ہیں، ترتیب دیتی ہے، اور ان سے احکام و کُلیات کا استنباط کرتی ہے؛

ہر مرتبۂ ہدایت اپنی تصحیح و نگرانی میں بالاتر مرتبۂ ہدایت کا محتاج ہے

علاوہ بریں جس طرح وجدان کی نگرانی کے لیے حواس و مشاعر کی ضرورت تھی، اُسی طرح حواس کی تصحیح و نگرانی کے لیے عقل کی ضرورت ہوئی۔ حواس کا ذریعۂ ادراک نہ صرف محدود ہے، بلکہ بسا اوقات غلطی و گمراہی سے بھی محفوظ نہیں۔ ہم دور سے ایک چیز دیکھتے ہیں، اور محسوس کرتے ہیں کہ ایک سیاہ نقطے سے زیادہ حجم نہیں رکھتی۔ حالانکہ وہ ایک عظیم الشان گنبد ہوتا ہے۔ ہم بیماری کی حالت میں شہد جیسی میٹھی چیز چکھتے ہیں، لیکن ہمارا حاسۂ ذوق یقین دلاتا ہے کہ مزہ کڑوا ہے۔ ہم تالاب میں ایک لکڑی کا عکس دیکھتے ہیں۔ لکڑی مستقیم ہوتی ہے لیکن عکس میں ٹیڑھی دکھائی دیتی ہے۔ بارہا ایسا ہوتا ہے کہ کسی عارضے کی وجہ سے کان بجنے لگتے ہیں، اور ہمیں ایسی صدائیں سُنائی دیتی ہیں جن کا خارج میں کوئی وجود نہیں۔ اگر مرتبۂ حواس سے ایک بلند تر مرتبۂ ہدایت وجود نہ ہوتا تو ممکن نہ تھا کہ ہم حواس کی ان درماندگیوں میں حقیقت کا سُراغ پا سکتے۔ لیکن ان تمام حالتوں میں عقل کی ہدایت نمودار ہوتی ہے۔ وہ حواس کی درماندگیوں میں ہماری رہنمائی کرتی ہے۔ وہ ہمیں بتلاتی ہے کہ سورج ایک عظیم الشان کرہ ہے۔ اگرچہ ہماری آنکھ اُسے ایک سُنہری تھال سے زیادہ محسوس نہیں کرتی۔ وہ ہمیں بتلاتی ہے کہ شہد کا مزہ ہر حال میں میٹھا ہے، اور اگر ہمیں کڑوا محسوس ہوا ہے، تو یہ اس لیے ہے کہ ہمارے مُنہ کا مزہ بگڑ گیا ہے۔ اسی طرح وہ ہمیں بتلاتی ہے کہ بعض اوقات خشکی بڑھ جانے سے کان بجنے لگتے ہیں،"

اور اس حالت میں جو صدائیں سُنائی دیتی ہیں، وہ خارج کی صدائیں نہیں ہوتیں۔ خود ہمارے ہی دماغ کی گونج ہوتی ہے:

ہدایتِ فطرت کا چوتھا مرتبہ لیکن جس طرح وجدان کے بعد حواس کی ہدایت نمودار ہوئی، کیونکہ وجدان کی ہدایت ایک خاص حد سے آگے نہیں بڑھ سکتی تھی، اور جس طرح حواس کے بعد عقل کی ہدایت نمودار ہوئی، کیونکہ حواس کی ہدایت بھی ایک خاص حد سے آگے نہیں بڑھ سکتی تھی، ٹھیک اسی طرح ہم محسوس کرتے ہیں کہ عقل کی ہدایت کے بعد بھی ہدایت کا کوئی مزید مرتبہ ہونا چاہیے، کیونکہ عقل کی ہدایت بھی ایک خاص حد سے آگے نہیں بڑھ سکتی، اور اُس کے دائرۂ عمل کے بعد بھی ایک دائرہ باقی رہ جاتا ہے۔ عقل کی کارفرمائی جیسی کچھ اور جتنی کچھ بھی ہے، محسوسات کے دائرہ میں محدود ہے۔ یعنی وہ صرف اُسی حد تک کام دے سکتی ہے جس حد تک ہمارے حواسِ خمسہ معلومات بہم پہنچاتے رہتے ہیں۔ لیکن محسوسات کی سرحد سے آگے کیا ہے؟ اس پردے کے پیچھے کیا ہے جس سے آگے ہماری جستجو حواس نہیں بڑھ سکتی؟ یہاں پہنچ کر عقل یک قلم درماندہ ہو جاتی ہے۔ اُس کی ہدایت ہمیں کوئی روشنی نہیں دے سکتی:

علاوہ بریں جہاں تک انسان کی عملی زندگی کا تعلق ہے، عقل کی ہدایت نہ تو ہر حال میں کافی ہے۔ نہ ہر حال میں مؤثر۔ نفسِ انسانی طرح طرح کی خواہشوں اور جذبوں سے کچھ اس طرح مقہور واقع ہؤا ہے کہ جب کبھی عقل اور جذبات میں کشمکش ہوتی ہے، تو اکثر حالتوں میں فتح جذبات ہی کے لیے ہوتی ہے۔ بسا اوقات عقل ہمیں یقین دلاتی ہے کہ فلاں فعل مضر اور مہلک ہے۔ لیکن جذبات ہمیں ترغیب دیتے ہیں، اور ہم اُس کے ارتکاب سے اپنے آپ کو نہیں روک سکتے۔ عقل کی بڑی سے بڑی دلیل بھی ہمیں ایسا نہیں بنا دے سکتی کہ غصّے کی حالت میں بے قابو نہ ہو جائیں، اور بھوک کی حالت میں مُضر غذا کی طرف ہاتھ نہ بڑھائیں:

اچھا۔ اگر خدا کی ربوبیّت کے لیے ضروری تھا کہ وہ ہمیں وجدان کے ساتھ حواس بھی دے، کیونکہ وجدان کی ہدایت ایک خاص حد سے آگے نہیں بڑھ سکتی، اور اگر ضروری تھا کہ حواس کے ساتھ عقل بھی دے، کیونکہ حواس کی ہدایت بھی ایک خاص حد سے آگے نہیں بڑھ سکتی، تو کیا یہ ضروری نہ تھا کہ عقل کے ساتھ کچھ اور بھی دے، کیونکہ عقل کی ہدایت بھی ایک خاص حد سے آگے نہیں بڑھ سکتی، اور اعمال کی درستگی و انضباط کے لیے کافی نہیں؟ اگر اُس نے وجدان کے ساتھ حواس بھی دیے، تاکہ وجدان کی لغزشوں میں نگرانی کریں، اور اگر حواس کے ساتھ عقل بھی دی، تاکہ حواس کی غلطیوں میں قاضی و حاکم ہو، تو کیا ضروری نہ تھا کہ عقل کے ساتھ کچھ اور بھی دیتا، تاکہ عقل کی درماندگیوں میں سہارا اور فیصلہ کُن ہوتا؟

قرآن کہتا ہے کہ ضروری تھا، اور اسی لیے اللہ کی ربوبیّت نے انسان کے لیے ایک چوتھے مرتبۂ ہدایت کا بھی

سامان کر دیا۔ یہی مرتبۂ ہدایت ہے جسے وہ وحی و نبوت کی ہدایت سے تعبیر کرتا ہے:

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں، اُس نے جابجا اِن مراتبِ ہدایت کا ذکر کیا ہے، اور انہیں ربوبیتِ الٰہی کی سب سے بڑی بخشش و مرحمت قرار دیا ہے:

إِنَّا خَلَقْنَا الْإِنسَانَ مِن نُّطْفَةٍ أَمْشَاجٍ نَّبْتَلِيهِ فَجَعَلْنَاهُ سَمِيعًا بَصِيرًا ۝ إِنَّا هَدَيْنَاهُ السَّبِيلَ إِمَّا شَاكِرًا وَإِمَّا كَفُورًا ۝ (۷۶: ۲)

ہم نے انسانوں کو ملے جُلے نطفہ سے پیدا کیا جسے (ایک کے بعد ایک مختلف حالتوں میں) پلٹتے ہیں، پھر اُسے ایسا بنا دیا کہ سُننے والا اور دیکھنے والا وجود ہو گیا۔ ہم نے اُس پر راہِ عمل کھول دی۔ اب یہ اُس کا کام ہے کہ یا تو شکر کرنے والا ہو، یا ناشکرا (یعنی یا تو خدا کی دی ہوئی قوتیں ٹھیک ٹھیک کام میں لائے اور فلاح و سعادت کی راہ اختیار کرے، یا ان سے کام نہ لے، اور گمراہ ہو جائے)

أَلَمْ نَجْعَل لَّهُ عَيْنَيْنِ ۝ وَلِسَانًا وَشَفَتَيْنِ ۝ وَهَدَيْنَاهُ النَّجْدَيْنِ ۝ (۹۰: ۶)

کیا ہم نے اُسے ایک چھوڑ دو دو آنکھیں نہیں دے دی ہیں (جن سے وہ دیکھتا ہے) اور زبان اور ہونٹ نہیں دیے ہیں (جو گویائی کا ذریعہ ہیں)؟ اور کیا اُس نے (سعادت و شقاوت کی) دونوں راہیں نہیں دکھا دیں؟

وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْأَبْصَارَ وَالْأَفْئِدَةَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ۝ (۱۶: ۸۰)

اور اللہ نے تمہارے لیے سُننے اور دیکھنے کے حواس پیدا کر دیے اور سوچنے کے لیے دل (یعنی عقل[1]) تاکہ تم شکر گزار ہو! (یعنی خدا کی دی ہوئی قوتیں ٹھیک طریقہ پر کام میں لاؤ)

اِن آیات اور اِن کی ہم معنی آیات میں حواس و مشاعر اور عقل و فکر کی ہدایت کی طرف اشارات کیے گئے ہیں، لیکن وہ تمام مقامات جہاں انسان کی روحانی سعادت و شقاوت کا ذکر کیا گیا ہے، وحی و نبوت کی ہدایت سے متعلق ہیں۔ مثلاً:

إِنَّ عَلَيْنَا لَلْهُدَىٰ وَإِنَّ لَنَا لَلْآخِرَةَ وَالْأُولَىٰ (۹۲: ۱۳)

بلاشبہ یہ ہمارا کام ہے کہ ہم رہنمائی کریں، اور یقیناً آخرت اور دنیا، دونوں ہمارے ہی لیے ہیں:

وَأَمَّا ثَمُودُ فَهَدَيْنَاهُمْ فَاسْتَحَبُّوا الْعَمَىٰ عَلَى الْهُدَىٰ (۴۱: ۱۶)

اور باقی رہی قوم ثمود، تو اُسے بھی ہم نے راہ (حق) دکھلا دی تھی، لیکن اُس نے ہدایت کی راہ چھوڑ کر اندھے پن کا شیوہ پسند کیا:

وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ۚ وَإِنَّ اللَّهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِينَ ۝ (۲۹: ۶۹)

اور جن لوگوں نے ہماری راہ میں جانفشانی کی، تو ضروری ہے کہ ہم بھی اُن پر اپنی راہیں کھول دیں، اور بلاشبہ اللہ اُن لوگوں کا ساتھی ہے جو نیک عمل ہیں!

---

[1] یاد رہے کہ عربی میں قلب اور فؤاد کے معنی محض اُس عضو ہی کے نہیں ہیں جسے اُردو میں دل کہتے ہیں، بلکہ اس کا اطلاق عقل و فکر پر بھی ہوتا ہے، قرآن میں جہاں کہیں سمع و بصر وغیرہ کے ساتھ قلب اور فؤاد کہا گیا ہے، اُس سے مقصود جوہرِ عقل ہے ۱۲

الھُدٰی

چنانچہ اس سلسلہ میں وہ اللہ کی ایک خاص ہدایت کا ذکر کرتا ہے، اور اسے "الھُدٰی" کے نام سے پکارتا ہے یعنی الف لام تعریف کے ساتھ:

قُلْ اِنَّ ھُدَی اللّٰہِ ھُوَالْھُدٰی ؕ وَ اُمِرْنَا لِنُسْلِمَ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝ (۶ : ۷۱)

(اے پیغمبر ان سے) کہہ دو، یقیناً اللہ کی ہدایت تو "الھُدٰی" ہے، اور ہم سب کو اسی بات کا حکم دیا گیا ہو کہ تمام جہانوں کے پروردگار کے آگے سرِ بندگی جھکا دیں!

وَلَنْ تَرْضٰی عَنْکَ الْیَھُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰی حَتّٰی تَتَّبِعَ مِلَّتَھُمْ ؕ قُلْ اِنَّ ھُدَی اللّٰہِ ھُوَالْھُدٰی ؕ (۲ : ۱۲۰)

اور (یاد رکھو) یہودی تم سے خوش ہونے والے نہیں جب تک کہ تم اُن کی ملت کی پیروی نہ کرو، اور یہی حال نصاریٰ کا ہے۔ (اے پیغمبر تم ان سے کہہ دو اللہ کی ہدایت کی راہ تو وہی ہے جو الھُدٰی ہے (یعنی ہدایت کی حقیقی اور عالمگیر راہ)

یہ "الھُدٰی" یعنی ہدایت کی ایک ہی اور حقیقی راہ، کونسی ہے؟ قرآن کہتا ہے، وحیِ الٰہی کی عالمگیر ہدایت ہے جو اوّل دن سے دنیا میں موجود ہے، اور بلا تفریق و امتیاز، تمام نوعِ انسانی کے لیے ہے۔ وہ کہتا ہے جس طرح خدا نے وجدان، حواس، اور عقل کی ہدایت میں نہ تو نسل و قوم کا امتیاز رکھا، نہ زمان و مکان کا، اسی طرح اُس کی ہدایتِ وحی بھی ہر طرح کے تفرقہ و امتیاز سے پاک ہے۔ وہ سب کے لیے ہے، اور سب کو دی گئی ہے، اور اس ایک ہدایت کے سوا اور جتنی ہدایتیں بھی انسانوں نے سمجھ رکھی ہیں، سب انسانی بناوٹ کی راہیں ہیں۔ خدا کی ٹھہرائی ہوئی راہ، صرف یہی ایک راہ ہے۔

اسی لیے وہ ہدایت کی اُن تمام صورتوں سے یک قلم انکار کرتا ہے جو اس اصل سے منحرف ہو کر طرح طرح کی مذہبی گروہ بندیوں اور متخالف ٹولیوں میں بٹ گئی ہیں، اور سعادت و نجات کی عالمگیر حقیقت خاص خاص گروہوں اور حلقوں کی میراث بنالی گئی ہے۔ وہ کہتا ہے، انسانی بناوٹ کی یہ الگ الگ راہیں، ہدایت کی راہ نہیں ہوسکتیں۔ ہدایت کی راہ تو وہی عالمگیر ہدایت کی راہ ہے۔ اُسی عالمگیر ہدایتِ وحی کو وہ "الدِّین" کے نام سے پکارتا ہے یعنی نوعِ انسانی کے لیے حقیقی دین۔ اور اسی کا نام اس کی زبان میں "الاسلام" ہے۔

وحدتِ دین کی اصلِ عظیم اور قرآنِ حکیم

یہ اصلِ عظیم قرآن کی دعوت کی سب سے پہلی بنیاد ہے۔ وہ جو کچھ بھی بتلانا چاہتا ہے، تمام تر اسی اصل پر مبنی ہے۔ اگر

اس اصل سے قطع نظر کرلی جائے، تو اُس کا تمام کارخانۂ دعوت درہم برہم ہوجائے لیکن تاریخ عالم کے عجائب تصرفات میں سے یہ واقعہ بھی سمجھنا چاہیے کہ جس درجہ قرآن نے اس اصل پر زور دیا تھا، اتنا ہی زیادہ دنیا کی نگاہوں نے اس سے اعراض کیا۔ حتیٰ کہ کہا جاسکتا ہے، آج قرآن کی کوئی بات بھی دنیا کی نظروں سے اس درجہ پوشیدہ نہیں ہے جس قدر کہ یہ اصل عظیم۔ اگر ایک شخص ہر طرح کے خارجی اثرات سے خالی الذہن ہوکر قرآن کا مطالعہ کرے، اور اُس کے صفحات میں جابجا اس اصل عظیم کے قطعی اور واضح اعلانات پڑھے، اور پھر دنیا کی طرف نظر اٹھائے جو قرآن کی حقیقت اس سے زیادہ نہیں سمجھتی کہ بہت سی مذہبی گروہ بندیوں کی طرح وہ بھی ایک مذہبی گروہ بندی ہے، تو یقیناً وہ حیران ہوکر پکار اٹھیگا، یا تو اُس کی نگاہیں اُسے دھوکا دے رہی ہیں، یا دنیا ہمیشہ آنکھیں کھولے بغیر ہی اپنے فیصلے صادر کردیا کرتی ہے۔

دین کی حقیقت اور قرآن کی تصریحات

اس حقیقت کی توضیح کے لیے ضروری ہے کہ ایک مرتبہ تفصیل کے ساتھ یہ بات واضح کردی جائے کہ جہاں تک وحی و نبوت کا یعنی دین کا تعلق ہے، قرآن کی دعوت کیا ہے۔ اور کس راہ کی طرف نوع انسانی کو لے جانا چاہتی ہے؟

جمعیتِ بشری کی ابتدائی وحدت، پھر اختلاف اور ہدایتِ وحی کا ظہور

اس باب میں قرآن نے جو کچھ بیان کیا ہے، اُس کا خلاصہ حسب ذیل ہے:

وہ کہتا ہے، ابتدا میں انسانی جمعیت کا یہ حال تھا کہ لوگ قدرتی زندگی بسر کرتے تھے ان میں نہ تو کسی طرح کا باہمی اختلاف تھا، نہ کسی طرح کی مخاصمت۔ سب کی زندگی ایک ہی طرح کی تھی، اور سب اپنی قدرتی یگانگت پر قانع تھے۔ پھر ایسا ہوا کہ نسلِ انسانی کی کثرت اور ضروریاتِ معیشت کی وسعت سے طرح طرح کے اختلافات پیدا ہوگئے۔ اور اختلافات نے تفرقہ و انقطاع اور ظلم و فساد کی صورت اختیار کرلی۔ ہر گروہ دوسرے گروہ سے نفرت کرنے لگا، اور ہر زبردست زیردست کے حقوق پامال کرنے لگا۔ جب یہ صورتِ حال پیدا ہوئی، تو ضروری ہوا کہ نوع انسانی کی ہدایت اور عدل و صداقت کے قیام کے لیے وحی الٰہی کی روشنی نمودار ہو۔ چنانچہ یہ روشنی نمودار ہوئی: اور خدا کے رسولوں کی دعوت و تبلیغ کا سلسلہ قائم ہوگیا۔ وہ اُن تمام رہنماؤں کو جن کے ذریعہ اس ہدایت کا سلسلہ قائم ہوا، "رسول" کے نام سے تعبیر کرتا ہے۔ کیونکہ وہ خدا کی سچائی کا پیغام پہنچانے والے تھے، اور "رسول" کے معنی پیغام پہنچانے والے کے ہیں:

وَمَا كَانَ النَّاسُ إِلَّا أُمَّةً وَاحِدَةً فَاخْتَلَفُوا ۚ وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِن رَّبِّكَ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ فِيمَا فِيهِ يَخْتَلِفُونَ ۝ (۱۹:۱۰)	اور ابتدا میں تمام انسانوں کا ایک ہی گروہ تھا (الگ الگ گروہ نہ تھے، نہ تفرقہ تھے) پھر ایسا ہوا کہ وہ باہم دگر مختلف ہوگئے۔ اور اگر اس بارے میں تمہارے پروردگار نے پہلے سے ایک فیصلہ نہ کردیا ہوتا، (یعنی یہ کہ انسانوں میں اختلاف ہوگا، اور مختلف راہیں لوگ اختیار کرینگے) تو جن باتوں میں لوگ اختلاف کرتے ہیں ان کا کبھی دنیا میں فیصلہ کردیا جاتا!

كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً ۗ فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ ۖ وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ۗ (۲: ۲۱۳)

ابتدا میں تمام انسان ایک ہی گروہ تھے (پھر اُن میں اختلاف پیدا ہوا) پس اللہ نے (یکے بعد دیگرے) نبیوں کو مبعوث کیا۔ وہ (نیک عملی کے نتائج کی) بشارت دیتے اور (بد عملی کے نتائج سے) متنبہ کرتے۔ نیز اُن کے ساتھ الکتاب (یعنی وحی الٰہی سے لکھی جانے والی تعلیم) نازل کی تاکہ جن باتوں میں لوگ اختلاف کرنے لگے تھے اُن میں وہ فیصلہ کر دینے والی ہو۔

عمومِ ہدایت

یہ ہدایت کسی خاص ملک و قوم یا عہد کے لیے مخصوص نہ تھی بلکہ تمام نوعِ انسانی کے لیے تھی۔ چنانچہ ہر زمانے اور ہر ملک میں، یکساں طور پر، اُس کا ظہور ہوا۔ قرآن کہتا ہے، دنیا کا کوئی گوشہ نہیں جہاں نسلِ انسانی آباد ہوئی ہو، اور خدا کا کوئی رسول مبعوث نہ ہوا ہو:

وَاِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ ۝ (۳۵: ۲۵)

اور کوئی قوم دنیا کی ایسی نہیں جس میں (بد عملیوں کے نتائج سے) متنبہ کرنے والا (خدا کا کوئی رسول) نہ گزرا ہو۔

اِنَّمَآ اَنْتَ مُنْذِرٌ وَّلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ ۝ (۱۳: ۹)

(اے پیغمبر) بلاشبہ تم اس کے سوا اور کیا ہو کہ (بد عملیوں کے نتائج سے) متنبہ کرنے والے ہو، اور دنیا میں ہر قوم کے لیے ایک ہدایت کرنے والا ہوا ہے۔

وَلِكُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلٌ ۚ فَاِذَا جَآءَ رَسُوْلُهُمْ قُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ۝ (۱۰: ۴۸)

اور ہر قوم کے لیے ایک رسول ہے، پس جب رسول ظاہر ہوتا ہے، تو تمام باتوں کا انصاف کے ساتھ فیصلہ کر دیا جاتا ہے۔

نسلِ انسانی کے ابتدائی عہد اور خدا کے رسول

وہ کہتا ہے، نسلِ انسانی کے ابتدائی عہدوں میں کتنے ہی پیغمبر گزرے ہیں جو یکے بعد دیگرے مبعوث ہوئے، اور قوموں کو پیغامِ حق پہنچایا:

وَكَمْ اَرْسَلْنَا مِنْ نَّبِيٍّ فِي الْاَوَّلِيْنَ ۝ (۴۳: ۵)

اور کتنے ہی نبی ہیں جو ہم نے پہلوں میں (یعنی ابتدائی عہد کی قوموں میں) مبعوث کیے!

عدلِ الٰہی اور بعثتِ رسل

وہ کہتا ہے، یہ بات عدلِ الٰہی کے خلاف ہے کہ ایک گروہ اپنے اعمالِ بد کے لیے جواب دہ ٹھہرایا جائے، حالانکہ اُس کی ہدایت کے لیے کوئی رسول نہ بھیجا گیا ہو:

وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا ۝ (۱۷: ۱۶)

اور (ہمارا قانون یہ ہے کہ) جب تک ہم ایک پیغمبر مبعوث کر کے راہِ ہدایت دکھا نہ دیں اُس وقت تک (پاداشِ عمل میں) عذاب دینے والے نہیں!

وَمَا كَانَ رَبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرٰى حَتّٰى يَبْعَثَ فِيْٓ اُمِّهَا رَسُوْلًا يَّتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِنَا ۚ وَمَا كُنَّا مُهْلِكِي الْقُرٰٓى

اور (یاد رکھو) تمہارے پروردگار کا قانون یہ ہے کہ وہ کبھی انسان کی بستیوں کو (پاداشِ عمل میں) ہلاک نہیں کرتا، جب تک کہ اُن میں ایک پیغمبر مبعوث نہ کر دے، اور وہ خدا کی آیتیں پڑھ کر سُنا دے، اور ہم کبھی بستیوں کو ہلاک

اِلَّا وَاَھْلُھَا ظٰلِمُوْنَ ٥ (۲۸ : ۵۹)

کرنے والے نہیں، مگر صرف اُسی حالت میں کہ اُن کے باشندوں نے ظلم کا شیوہ اختیار کر لیا ہو۔

بعض رسولوں کا ذکر کیا گیا بعض کا نہیں کیا گیا

خدا کے اِن رسولوں اور دینِ الٰہی کے داعیوں میں سے بعض کا ذکر قرآن میں کیا گیا ہے، بعض کا نہیں کیا گیا:

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ مِنْهُمْ مَّنْ قَصَصْنَا عَلَيْكَ وَمِنْهُمْ مَّنْ لَّمْ نَقْصُصْ عَلَيْكَ (۴۰ : ۷۸)

اور (اے پیغمبر!) ہم نے تم سے پہلے کتنے ہی پیغمبر مبعوث کیے۔ ان میں سے کچھ ایسے ہیں جن کے حالات تمہیں سُنائے ہیں۔ کچھ ایسے ہیں جن کے حالات نہیں سُنائے (یعنی قرآن میں ان کا ذکر نہیں کیا گیا)

بے شمار قومیں اور بے شمار رسول

قومِ نوح اور عاد و ثمود کے بعد کتنی ہی قومیں گزر چکی ہیں، اور اُن میں کتنے ہی رسول مبعوث ہو چکے ہیں، جن کا ٹھیک ٹھیک حال اللہ ہی کو معلوم ہے:

اَلَمْ يَاْتِكُمْ نَبَؤُا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ قَوْمِ نُوْحٍ وَّعَادٍ وَّثَمُوْدَ ۬ۛ وَالَّذِيْنَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ ۬ۛ لَا يَعْلَمُهُمْ اِلَّا اللّٰهُ ؕ جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَرَدُّوْۤا اَيْدِيَهُمْ فِيْۤ اَفْوَاهِهِمْ (۱۴ : ۹)

تم سے پہلے جو قومیں گذر چکی ہیں، کیا تم تک اُن کی خبر نہیں پہنچی؟ قومِ نوح، قومِ عاد، قومِ ثمود، اور وہ قومیں جو اُن کے بعد ہوئیں، جن کی ٹھیک ٹھیک تعداد اللہ ہی کو معلوم ہے۔ اِن سب میں ان کے پیغمبر سچائی کی روشنیوں کے ساتھ مبعوث ہوئے، مگر اُنھوں نے جہل و سرکشی سے اُن کی تعلیم اُنہی پر لوٹا دی، اور کان دھرنے سے اِنکار کر دیا!

ہدایت ہمیشہ ایک ہی رہی اور وہ ایمان اور عملِ صالح کی دعوت کے سوا کچھ نہ تھی

فطرتِ الٰہی کی راہ، کائناتِ ہستی کے ہر گوشہ میں ایک ہی ہے۔ وہ نہ تو ایک سے زیادہ ہو سکتی ہے، نہ باہم دگر مختلف۔ پس ضروری تھا کہ یہ ہدایت بھی اوّل دن سے ایک ہی ہوتی، اور ایک ہی طرح پر تمام انسانوں کو مخاطب کرتی۔ چنانچہ قرآن کہتا ہے، خدا کے جتنے پیغامبر پیدا ہوئے خواہ وہ کسی زمانے اور کسی گوشے میں ہوئے ہوں، سب کی راہ ایک ہی تھی، اور سب خدا کے ایک ہی عالمگیر قانونِ سعادت کی تعلیم دینے والے تھے۔ یہ عالمگیر قانونِ سعادت کیا ہے؟ ایمان اور عملِ صالح کا قانون ہے۔ یعنی ایک پروردگارِ عالم کی پرستش کرنی، اور نیک عملی کی زندگی بسر کرنی۔ اِس کے علاوہ، اور اس کے خلاف جو کچھ بھی دین کے نام سے کہا جاتا ہے، دینِ حقیقی کی تعلیم نہیں ہے:

وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ ۚ (۱۶ : ۳۶)

اور بلاشبہ ہم نے دنیا کی ہر قوم میں ایک پیغمبر مبعوث کیا (جس کی تعلیم یہ تھی کہ) اللہ کی عبادت کرو، اور طاغوت سے (یعنی سرکش اور شریر قوتوں سے) اجتناب کرو۔

وَمَاۤ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا

اور (اے پیغمبر!) ہم نے تم سے پہلے کوئی رسول دنیا میں نہیں بھیجا مگر اس وحی

نُوحِیْٓ اِلَیْهِ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ (۲۱: ۲۵) کے ساتھ، کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں، پس میری ہی عبادت کرو!

سب نے ایک ہی دین پر اکٹھے رہنے اور تفرقہ و اختلاف سے بچنے کی تعلیم دی

وہ کہتا ہے، دنیا میں کوئی بانیِ مذہب بھی ایسا نہیں ہوا ہے جس نے ایک ہی دین پر اکٹھے رہنے اور تفرقہ و اختلاف سے بچنے کی تعلیم نہ دی ہو۔ سب کی تعلیم یہی تھی کہ خدا کا دین بچھڑے ہوئے انسانوں کو جمع کر دینے کے لیے ہے۔ الگ الگ کر دینے کے لیے نہیں ہے پس ایک پروردگارِ عالم کی بندگی و نیاز میں سب متحد ہو جاؤ، اور تفرقہ و مخاصمت کی جگہ باہمی محبت و یک جہتی کی راہ اختیار کرو!

وَاِنَّ هٰذِهٖٓ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً اور (دیکھو) یہ تمہاری اُمت، فی الحقیقت ایک ہی اُمت ہے اور میں تم سب کا پروردگار
وَّاَنَا رَبُّكُمْ فَاتَّقُوْنِ (۲۳: ۵۲) ہوں، پس (میری عبودیت و نیاز کی راہ میں تم سب ایک ہو جاؤ، اور) نافرمانی سے بچو!

وہ کہتا ہے، خدا نے تمہیں ایک ہی جامۂ انسانیت دیا تھا، لیکن تم نے طرح طرح کے بھیس اور نام اختیار کر لیے اور رشتۂ انسانیت کی وحدت سیکڑوں ٹکڑوں میں بکھر گئی۔ تمہاری نسلیں بہت سی ہیں، اس لیے تم نسل کے نام پر ایک دوسرے سے الگ ہو گئے ہو۔ تمہارے وطن بہت سے بن گئے ہیں، اس لیے اختلافِ وطن کے نام پر ایک دوسرے سے لڑ رہے ہو۔ تمہاری قومیتیں بے شمار ہیں، اس لیے ہر قوم دوسری قوم سے دست و گریباں ہو رہی ہے۔ تمہارے رنگ یکساں نہیں، اور یہ بھی باہمی نفرت و عناد کا ایک بڑا ذریعہ بن گیا ہے۔ تمہاری بولیاں مختلف ہیں، اور یہ بھی ایک دوسرے سے جُدا رہنے کی بہت بڑی حجت بن گئی ہے، پھر ان کے علاوہ امیر و فقیر، نوکر و آقا، وضیع و شریف، ضعیف و قوی، ادنیٰ و اعلیٰ، بے شمار اختلاف پیدا کر لیے گئے ہیں۔ اور سب کا منشا یہی ہے کہ ایک دوسرے سے جُدا ہو جاؤ، اور ایک دوسرے سے نفرت کرتے رہو۔ ایسی حالت میں بتلاؤ، وہ رشتہ کون سا رشتہ ہے، جو اتنے اختلافات رکھنے پر بھی انسانوں کو ایک دوسرے سے جوڑ دے، اور انسانیت کا بچھڑا ہوا گھرانا پھر از سرِ نو آباد ہو جائے؟

وہ کہتا ہے، صرف ایک ہی رشتہ باقی رہ گیا ہے، اور وہ خدا پرستی کا مقدس رشتہ ہے۔ تم کتنے ہی الگ الگ ہو گئے ہو، لیکن تمہارے خدا الگ الگ نہیں ہو جا سکتے۔ تم سب ایک ہی پروردگار کے بندے ہو، تم سب کی بندگی و نیاز کے لیے ایک ہی معبود کی چوکھٹ ہے، تم بے شمار اختلافات رکھنے پر بھی ایک ہی رشتۂ عبودیت میں جکڑے ہوئے ہو۔ تمہاری کوئی نسل ہو، تمہارا کوئی وطن ہو، تمہاری کوئی قومیت ہو، تم کسی درجے میں اور کسی حلقے کے انسان ہو، لیکن جب ایک ہی پروردگار کے آگے سرِ نیاز جھکا دو گے، تو یہ آسمانی رشتہ تمہارے تمام ارضی اختلافات مٹا دے گا، تم سب کے بچھڑے ہوئے دل ایک دوسرے سے جُڑ جائیں گے۔ تم محسوس کرو گے کہ تمام دنیا تمہارا وطن ہے، تمام نسلِ انسانی تمہارا گھرانا ہے، اور تم سب ایک ہی رب العلمین کی عیال ہو!

چنانچہ وہ کہتا ہے، خدا کے جتنے رسول بھی پیدا ہوئے، سب کی تعلیم یہی تھی کہ "الدین" یعنی بنی نوعِ انسانی کے ایک ہی عالمگیر دین پر قائم رہو، اور اس راہ میں ایک دوسرے سے الگ الگ نہ ہو جاؤ!

شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ ؕ (۴۲:۱۳)

اور (دیکھو) اُس نے تمہارے لیے دین کی وہی راہ قرار دی ہے جس کی وصیت نوح کو کی گئی تھی، اور جس پر چلنے کا حکم ابراہیمؑ، موسیٰؑ اور عیسیٰ کو دیا تھا۔ ان سب کی تعلیم یہی تھی، کہ الدین (یعنی خدا کا ایک ہی دین) قائم رکھو۔ اور اس راہ میں الگ الگ نہ ہو جاؤ!

قرآن کی تحدّی کہ اس حقیقت کے خلاف کوئی مذہبی تعلیم اور روایت نہیں پیش کی جا سکتی ہے

اسی بنا پر وہ بطور ایک دلیل کے اس بات پر زور دیتا ہے کہ اگر تمہیں میری تعلیم کی سچائی سے انکار ہے، تو کسی مذہب کی الہامی کتاب سے بھی ثابت کر دکھاؤ کہ دینِ حقیقی کی راہ اس کے سوا کچھ اور بھی ہو سکتی ہے۔ تم جس مذہب کی بھی حقیقی تعلیم دیکھو گے، اصل و بنیاد یہی ملے گی:

قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ ۚ هٰذَا ذِكْرُ مَنْ مَّعِيَ وَذِكْرُ مَنْ قَبْلِيْ ؕ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۙ الْحَقَّ فَهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ۝ وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِيْٓ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ ۝ (۲۱:۲۴-۲۵)

(اے پیغمبر! ان سے) کہہ دو اگر تمہیں میری تعلیم سے انکار ہے، تو اپنی دلیل پیش کرو۔ یہ تعلیم موجود ہے جس پر میرے ساتھی یقین رکھتے ہیں، اور اسی طرح وہ تمام تعلیمیں بھی موجود ہیں جو مجھ سے پہلے قوموں کو دی گئیں (تم ثابت کر دکھاؤ کسی نے بھی میری تعلیم کے خلاف تعلیم دی تھی) اصل یہ ہے کہ ان (منکرینِ حق) میں اکثر آدمی ایسے ہیں جنہیں سرے سے امرِ حق کی خبر ہی نہیں، اور اس لیے حقیقت کی طرف سے گردن موڑے ہوئے ہیں۔ اے پیغمبر! یقین کر! ہم نے تجھ سے پہلے کوئی پیغمبر بھی ایسا نہیں بھیجا جسے اس بات کے سوا کوئی دوسری بات بتلائی گئی ہو کہ "میرے سوا کوئی معبود نہیں، پس میری ہی عبادت کرو"!

اتنا ہی نہیں، بلکہ وہ کہتا ہے، علم و بصیرت کے کسی قول اور روایت سے تم ثابت کر دکھاؤ کہ جو کچھ میں بتلا رہا ہوں یہی تمام پچھلی دعوتوں کی تعلیم نہیں رہی ہے:

اِیْتُوْنِيْ بِكِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ هٰذَآ اَوْ اَثٰرَةٍ مِّنْ عِلْمٍ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝ (۴۶:۴)

اگر تم اپنے انکار میں سچے ہو، تو ثبوت میں کوئی کتاب پیش کرو جو اس سے پہلے نازل ہوئی ہو، یا (کم از کم) علم و بصیرت کی کوئی پچھلی روایت ہی لا دکھاؤ جو تمہارے پاس موجود ہو!

تمام مقدس کتابوں کی باہم دگر تصدیق اور اس سے قرآن کا استدلال

اسی بنا پر وہ تمام مذاہبِ عالم کی باہم دگر تصدیق کو بھی بطور ایک دلیل کے پیش کرتا ہے۔ یعنی وہ کہتا ہے، ان میں سے ہر تعلیم دوسری تعلیم کی تصدیق کرتی ہے جھٹلاتی نہیں۔ اور جب ہر تعلیم دوسری تعلیم کی تصدیق کرتی ہے، تو اس سے معلوم ہوا، ان تمام تعلیمات کے اندر کوئی ایک ہی ثابت و قائم حقیقت ضرور کام کر رہی ہے۔ کیونکہ اگر مختلف وقتوں، مختلف گوشوں، مختلف قوموں، مختلف ناموں، مختلف پیرایوں، اور مختلف زبانوں سے کوئی بات کہی گئی ہو، اور باوجود ان تمام اختلافات کے بات ہمیشہ ایک ہی ہو، اور ایک ہی مقصد پر زور دیتی ہو، تو قدرتی طور پر تمہیں ماننا پڑے گا کہ ایسی بات اصلیت سے خالی نہیں ہو سکتی!

نَزَّلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَاَنْزَلَ التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ ۙ مِنْ قَبْلُ هُدًى لِّلنَّاسِ (۲:۳)	(اے پیغمبر!) اللہ نے تم پر یہ کتاب سچائی کے ساتھ نازل کی ہے، جو اُن کتابوں کی تصدیق کرتی ہے جو اس سے پہلے نازل ہو چکی ہیں، اور اسی طرح لوگوں کی ہدایت کے لیے اُس نے تورات اور انجیل نازل کی تھی۔
وَاٰتَيْنٰهُ الْاِنْجِيْلَ فِيْهِ هُدًى وَّنُوْرٌ ۙ وَّمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرٰىةِ (۴۷:۵)	اور ہم نے عیسیٰ کو انجیل عطا کی۔ اس میں انسان کے لیے ہدایت اور روشنی ہے۔ اور اس سے پہلے جو تورات نازل ہو چکی تھی وہ اس کی تصدیق کرتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں، اُس کے بیان و موعظت کا ایک بڑا موضوع پچھلے عہدوں کی ہدایتوں اور رسالتوں کا تذکرہ ہے۔ وہ اُن کی یکسانی، ہم آہنگی، اور وحدتِ تعلیم سے مذہبی صداقت کے تمام مقاصد پر استشہاد کرتا ہے۔

"الدّین" اور "الشّرع"

اَدیان کا اختلاف اچھا، اگر تمام نوعِ انسانی کے لیے دین ایک ہی ہے، اور تمام بانیانِ مذاہب نے ایک ہی اصل و قانون کی تعلیم دی ہے، تو پھر مذاہب میں اختلاف کیوں ہوا؟ کیوں تمام مذہبوں میں ایک ہی طرح کے احکام، ایک ہی طرح کے اعمال، ایک ہی طرح کے رسوم و ظواہر نہ ہوئے؟ کسی مذہب میں عبادت کی ایک خاص شکل اختیار کی گئی ہے، کسی میں دوسری۔ کسی مذہب کے ماننے والے ایک طرف مُنہ کر کے عبادت کرتے ہیں، کسی مذہب کے ماننے والے دوسری طرف۔ کسی کے ہاں احکام و قوانین ایک خاص طرح کی نوعیت کے ہیں، کسی کے ہاں دوسری طرح کے۔

اختلاف دین میں نہیں ہوا، شرع و منہاج میں ہوا، اور یہ ناگزیر تھا قرآن کہتا ہے، مذاہب کا اختلاف دو طرح کا ہے۔ ایک اختلاف تو وہ ہے جو پیروانِ مذاہب نے مذہب کی حقیقی تعلیم سے منحرف ہو کر پیدا کر لیا ہے۔ یہ اختلاف مذاہب کا اختلاف نہیں ہے۔ پیروانِ مذاہب کی گمراہی کا نتیجہ ہے۔ دوسرا اختلاف وہ ہے جو فی الحقیقت مذاہب کے احکام و اعمال میں پایا جاتا ہے۔ مثلاً ایک مذہب میں عبادت کی کوئی خاص شکل اختیار کی گئی ہے، دوسرے میں کوئی دوسری شکل۔ تو یہ اختلاف اصل و حقیقت کا اختلاف نہیں ہے۔ محض فروع و ظواہر کا اختلاف ہے، اور ضروری تھا کہ ظہور میں آتا۔

وہ کہتا ہے، مذاہب کی تعلیم دو قسم کی باتوں سے مرکّب ہے۔ ایک قسم تو وہ ہے جو اس کی روح و حقیقت ہے۔ دوسری وہ ہے جس سے اُن کی ظاہری شکل و صورت آراستہ کی گئی ہے۔ پہلی چیز اصل ہے۔ دوسری فرع ہے۔ پہلی

چیز کو وہ "دین" سے تعبیر کرتا ہے۔ دوسری کو "شرع" اور "نسک" سے، اور اس کے لیے "منہاج" کا لفظ بھی استعمال کیا گیا ہے۔ "شرع" اور "منہاج" کے معنی راہ کے ہیں، اور "نسک" سے مقصود عبادت کا طور طریقہ ہے۔ پھر اصطلاح میں "شرع" قانونِ مذہب کو کہنے لگے اور "نسک" عبادت کو۔ وہ کہتا ہے، مذاہب میں جس قدر بھی اختلاف ہے اُن کا اصلی اختلاف ہے، وہ "دین" کا اختلاف نہیں محض شرع و منہاج کا اختلاف ہے، یعنی اصل کا نہیں ہے، فرع کا ہے حقیقت کا نہیں ہے، ظواہر کا ہے۔ روح کا نہیں ہے، صورت کا ہے۔ اور ضروری تھا کہ یہ اختلاف ظہور میں آتا۔ مذہب کا مقصود انسانی جمعیت کی سعادت و اصلاح ہے، لیکن انسانی جمعیت کے احوال و ظروف ہر عہد اور ہر ملک میں یکساں نہیں رہے ہیں، اور نہ یکساں رہ سکتے تھے۔ کسی زمانے کی معاشرتی اور ذہنی استعداد ایک خاص طرح کی نوعیت رکھتی تھی، کسی زمانے میں ایک خاص طرح کی۔ کسی ملک کے حالات ایک خاص طرح کی معیشت چاہتے تھے کسی دوسرے ملک کے حالات دوسری طرح کی۔ پس جس مذہب کا ظہور جیسے زمانے میں اور جیسی استعداد و طبیعت کے لوگوں میں ہوا، اُسی کے مطابق شرع و منہاج کی صورت بھی اختیار کی گئی۔ جس عہد اور جس ملک میں جو صورت اختیار کی گئی، وہی اُس کے لیے موزوں تھی۔ اس لیے ہر صورت اپنی جگہ بہتر اور حق ہے، اور یہ اختلاف اِس سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا، جتنی اہمیت نوع بشری کے تمام معاشرتی اور طبیعی اختلافات کو دی جا سکتی ہے:

لِكُلِّ أُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنسَكًا هُمْ نَاسِكُوهُ فَلَا يُنَازِعُنَّكَ فِي الْأَمْرِ وَادْعُ إِلَىٰ رَبِّكَ ۖ إِنَّكَ لَعَلَىٰ هُدًى مُّسْتَقِيمٍ

(اے پیغمبر) ہم نے ہر گروہ کے لیے عبادت کا ایک خاص طور طریقہ ٹھہرا دیا ہے جس پر وہ چلتا ہے، پس لوگوں کو چاہیے، اس معاملہ میں تم سے جھگڑا نہ کریں۔ تم لوگوں کو اپنے پروردگار کی طرف دعوت دو۔ یقیناً تم ہدایت کے سیدھے راستہ پر گامزن ہو۔ (۲۲: ۶۶)

تحویلِ قبلہ کا معاملہ اور قرآن کا اعلانِ حقیقت

جب تحویلِ قبلہ کا معاملہ پیش آیا۔ یعنی پیغمبر اسلام (صلعم) بیت المقدس کی جگہ خانۂ کعبہ کی طرف مُنہ کر کے نماز پڑھنے لگے، تو یہ بات یہودیوں اور عیسائیوں پر بہت شاق گزری۔ اُن کے نزدیک مذہب کا تمام دار و مدار اسی طرح کی ظاہری اور فرعی باتوں پر تھا، اور اُنہی کو وہ حق و باطل کا معیار سمجھتے تھے لیکن ہم دیکھتے ہیں، قرآن نے اس معاملہ کو بالکل دوسری ہی نظر سے دیکھا ہے۔ وہ کہتا ہے، تم اس طرح کی باتوں کو اِس قدر اہمیت کیوں دیتے ہو؟ یہ نہ تو حق و باطل کا معیار ہیں، نہ مذہب کی اصل و حقیقت میں اِنہیں کوئی دخل ہے۔ ہر مذہب نے اپنے حالات و مقتضیات کے مطابق کوئی ایک طریقہ عبادت کا اختیار کر لیا تھا، اور اُس پر لوگ کاربند ہو گئے۔ مقصودِ اصلی سب کا ایک ہی ہے، اور وہ خدا پرستی اور نیک عملی ہے۔ پس جو شخص سچائی کا طلبگار ہے، اُسے چاہیے کہ اصل مقصود پر نظر رکھے، اور اُسی کے لحاظ سے

ہر بات کو جانچے پرکھے۔ اِن باتوں کو حق و باطل کا معیار نہ بنا لے:

وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيْهَا فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ ۭ اَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا يَاْتِ بِكُمُ اللّٰهُ جَمِيْعًا ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (۲:۱۴۸)

اور (دیکھو) ہر گروہ کے لیے کوئی نہ کوئی سمت ہے جس کی طرف عبادت کرتے ہوئے وہ اپنا منہ کر لیتا ہے۔ پس (اس معاملہ کو اس قدر طول نہ دو) نیکی کی راہ میں ایک دوسرے سے آگے بڑھ جانے کی کوشش کرو (کہ اصلی کام یہی ہے) تم کسی جگہ بھی ہو، اللہ تم سب کو پالیگا۔ یقیناً اللہ کی قدرت سے کوئی چیز باہر نہیں!

قرآن کے نزدیک دین کے اعتقاد و عمل کی اصلی باتیں کیا کیا ہیں؟

پھر اسی سورت میں آگے چل کر، صاف صاف لفظوں میں واضح کر دیا ہے کہ اصل دین کیا ہے، اور کن باتوں سے ایک انسان دین کی سعادت و فلاح حاصل کر سکتا ہے؟ وہ کہتا ہے، دین محض اس طرح کی باتوں میں نہیں دھرا ہے کہ ایک شخص نے عبادت کے وقت پچھم کی طرف منہ کر لیا یا پورب کی طرف۔ اصل دین تو یہ ہے کہ دیکھا جائے، خدا پرستی اور نیک عملی کے لحاظ سے ایک انسان کا کیا حال ہے؟ پھر تفصیل کے ساتھ بتلایا ہے کہ خدا پرستی اور نیک عملی کی باتیں کیا کیا ہیں:

لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْھَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰۗىِٕكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ ۚ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰي حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ ۙ وَالسَّاۗىِٕلِيْنَ وَفِي الرِّقَابِ ۚ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ ۚ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰھَدُوْا ۚ وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَاۗءِ وَالضَّرَّاۗءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ ھُمُ الْمُتَّقُوْنَ (۲:۱۷۷)

اور (دیکھو) نیکی یہ نہیں ہے کہ تم نے (عبادت کے وقت) اپنا منہ پورب کی طرف اور پچھم کی طرف کر لیا۔ (یا اسی طرح کی کوئی دوسری بات ظاہری رسم اور ڈھنگ کی کر لی) نیکی کی راہ تو اُس کی راہ ہے جو اللہ پر، آخرت کے دن پر، ملائکہ پر، تمام کتابوں پر، اور تمام نبیوں پر ایمان لاتا ہے، اپنا مال خدا کی محبت کی راہ میں رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں، مسافروں، اور سائلوں کو دیتا ہے، اور غلاموں کے آزاد کرانے میں خرچ کرتا ہے۔ نماز قائم کرتا ہے، زکوٰۃ ادا کرتا ہے، قول و قرار کا پکا ہوتا ہے، تنگی اور مصیبت کی گھڑی ہو، یا خوف و ہراس کا وقت، ہر حال میں ثابت قدم رہتا ہے، (سو یاد رکھو) ایسے ہی لوگ ہیں جو (اپنی دینداری میں) سچے ہیں، اور یہی ہیں جو برائیوں سے بچنے والے ہیں۔

جس کتاب میں تیرہ سو برس سے یہ آیت موجود ہے، اگر دنیا اُس کی دعوت کا مقصدِ اصلی نہیں سمجھ سکتی، تو پھر کونسی بات ہے جسے دنیا سمجھ سکتی ہے؟

خدا کی حکمت اسی کی مقتضی ہوئی کہ اختلاف شرائع ظہور میں آئے

سورۂ مائدہ میں ہم دیکھتے ہیں، ایک خاص ترتیب کے ساتھ مختلف دعوتوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ ذکر حضرت موسیٰ اور تورات سے شروع ہوتا ہے: اِنَّآ اَنْزَلْنَا التَّوْرٰىةَ فِيْهَا

هُدًى وَّنُوْرٌ۔ پھر حضرت مسیح کے ظہور کا ذکر کیا جاتا ہے: ثُمَّ قَفَّيْنَا عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ بِعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ۔ حضرت مسیحؑ کے بعد پیغمبر اسلام کا ظہور ہوا: وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ۔ پھر ان مختلف دعوتوں کے ذکر کے بعد وہ لوگوں کو مخاطب کرتا ہے، اور کہتا ہے:

لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا ۚ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلٰكِنْ لِّيَبْلُوَكُمْ فِيْ مَآ اٰتٰىكُمْ فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ ۚ (۵ : ۴۸)	ہم نے تم میں سے ہر ایک کے لیے (یعنی ہر دعوت کے پیروؤں کے لیے) ایک خاص شریعت اور راہ ٹھہرا دی۔ اگر اللہ چاہتا، تو (شریعتوں کا کوئی اختلاف نہ ہوتا) تم سب کو ایک امت بنا دیتا، لیکن یہ اختلاف اس لیے ہوا کہ (ہر وقت وحالات کے مطابق) تمہیں جو احکام دیے گئے ہیں، ان میں تمہاری آزمائش کرے۔ پس (اس اختلاف کے پیچھے نہ پڑو) نیکی کی راہوں میں ایک دوسرے سے آگے نکل جانے کی کوشش کرو۔

پیروانِ مذاہب نے دین کی وحدت بھلا دی، اور شرع کے اختلاف کو بنائے نزاع بنا لیا

اس آیت پر سرسری نظر ڈال کر آگے نہ بڑھ جاؤ، بلکہ اس کے ایک ایک لفظ پر غور کرو۔ قرآن کا جب ظہور ہوا تو دنیا کا یہ حال تھا کہ تمام پیروانِ مذاہب، مذہب کو صرف اس کے ظاہر و رسوم ہی میں دیکھتے تھے، اور مذہبی اعتقاد کا تمام جوش وخروش اسی طرح کی باتوں میں سمٹ آیا تھا۔ ہر گروہ یقین کرتا تھا کہ دوسرا گروہ نجات سے محروم ہے، کیونکہ وہ دیکھتا تھا، دوسرے کے اعمال و رسوم ویسے نہیں ہیں، جیسے خود اس نے اختیار کر رکھے ہیں۔ لیکن قرآن کہتا ہے کہ نہیں، یہ اعمال و رسوم نہ تو دین کی اصل و حقیقت ہیں، نہ ان کا اختلاف حق وباطل کا اختلاف ہے۔ یہ محض مذہب کی عملی زندگی کا ظاہری ڈھانچا ہے، مگر روح وحقیقت ان سے بالاتر ہے، اور وہی اصلِ دین ہے۔ یہ اصلِ دین کیا ہے؟ ایک خدا کی پرستش اور نیک عملی کی زندگی۔ یہ کسی ایک گروہ ہی کی میراث نہیں ہے کہ اس کے سوا کسی انسان کو نہ ملی ہو۔ یہ تمام مذاہب میں یکساں طور پر موجود ہے، اور چونکہ یہ اصلِ دین ہے، اس لیے نہ تو اس میں تغیر ہوا، نہ کسی طرح کا اختلاف رونما ہوا۔ اعمال و رسوم فروع ہیں، اس لیے ہر زمانے اور ہر ملک کی حالت کے مطابق بدلتے رہے، اور جس قدر بھی اختلاف ہوا، انہی میں ہوا۔

پھر وہ کہتا ہے، اعمال و رسوم کے اس اختلاف کو تم اس قدر اہمیت کیوں دے رہے ہو؟ خدا نے ہر زمانے اور ہر ملک کے لیے ایک خاص طرح کا طور طریقہ ٹھہرا دیا تھا جو اس کی حالت اور ضرورت کے مطابق مناسب تھا، اور وہ اس پر کاربند ہو گیا۔ اگر خدا چاہتا تو تمام نوعِ انسانی کو ایک ہی قوم وجماعت بنا دیتا، اور فکر و عمل کا کوئی اختلاف وجود ہی میں نہ آتا، لیکن معلوم ہے کہ خدا نے ایسا نہیں چاہا۔ اس کی حکمت کا مقتضا یہی ہوا کہ فکر و عمل کی مختلف حالتیں پیدا ہوں۔ پس اس اختلاف کو حق وباطل کا اختلاف کیوں بنا لیا جائے؟ کیوں اس اختلاف کی بنا پر ایک جماعت دوسری جماعت سے برسرِ پیکار رہے؟ اصلی چیز جس پر تمام تر توجہ مبذول کرنی چاہیے

"خیرات" ہے۔ یعنی نیکی کے کام ہیں، اور تمام اعمال و رسوم بھی اُنہی کے لیے ہیں۔

غور کرو، اِس آیت میں لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا کہا یعنی تم میں سے ہر جماعت کے لیے ہم نے ایک "شرع" اور "منہاج" ٹھہرادی۔ یہ نہیں کہا کہ ایک "دین" ٹھہرادیا۔ کیونکہ دین تو سب کے لیے ایک ہی ہے۔ اس میں تعدد اور تنوع نہیں ہوسکتا۔ البتہ شرع و منہاج سب کے لیے یکساں نہیں ہوسکتے تھے۔ ضروری تھا کہ ہر عہد اور ہر ملک کے احوال و ظروف کے مطابق مختلف ہوں۔ پس مذاہب کا اختلاف، اصل کا اختلاف نہیں ہُوا محض شرع کا اختلاف ہُوا۔

اس موقع پر یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ جہاں کہیں قرآن نے اس بات پر زور دیا ہے کہ "اگر خدا چاہتا تو تمام انسان ایک ہی راہ پر جمع ہوجاتے" یا "ایک ہی قوم بن جاتے" جیسا کہ آیت مندرجۂ صدر میں ہے، تو اِن سب سے مقصود اسی حقیقت کا اظہار ہے۔ وہ چاہتا ہے، یہ بات لوگوں کے دلوں میں اُتار دے کہ فکر و عمل کا اختلاف طبیعت بشری کا قدرتی خاصہ ہے، اور جس طرح ہر گوشے میں موجود ہے، اُسی طرح مذہب کے معاملہ میں بھی موجود ہے پس اس اختلاف کو حق و باطل کا معیار نہیں سمجھنا چاہیے۔ وہ کہتا ہے، جب خدا نے انسان کی طبیعت ہی ایسی بنائی ہے کہ ہر انسان، ہر قوم، ہر عہد، اپنی اپنی سمجھ، اپنی اپنی پسند، اور اپنا اپنا طور طریقہ رکھتا ہے، اور ممکن نہیں، کسی ایک چھوٹی سے چھوٹی بات میں بھی تمام انسانوں کی طبیعت ایک طرح کی ہوجائے، تو پھر کیونکر ممکن تھا کہ مذہبی اعمال و رسوم کی راہیں مختلف نہ ہوتیں، اور سب ایک ہی طرح کی وضع و حالت اختیار کرلیتے؟ یہاں بھی اختلاف ہونا تھا، اور اختلاف ہُوا۔ کسی نے ایک طریقے سے اصل مقصود حاصل کرنا چاہا، کسی نے دوسرے طریقے سے، لیکن اصل مقصود یعنی خدا پرستی اور نیک عملی کی تعلیم، تو اس میں سب متفق رہے۔ پس جب اصل مقصود سب کا ایک ہے تو محض ظواہر و اعمال کے اختلاف سے کیوں ایک دوسرے کے مخالف و معاند ہوجائیں؟ کیوں ہر گروہ دوسرے گروہ کو جھٹلائے؟ کیوں مذہبی سچائی کسی ایک ہی نسل و گروہ کی میراث سمجھ لی جائے؟

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ وہ شریعتوں کے اس اختلاف ہی کے لیے نہیں بلکہ فکر و عمل کے ہر اختلاف کے لیے رواداری اور وسعتِ نظر کی تعلیم دیتا ہے۔ یہاں تک کہ جو لوگ اس کی دعوت کے خلاف جبر و تشدد کام میں لا رہے تھے، ان کی طرف سے بھی اُسے معذرت کرنے میں تامل نہیں۔ ایک موقعہ پر خود پیغمبر اسلام کو مخاطب کرتے ہوئے کہتا ہے۔ تم جوشِ دعوت میں چاہتے ہو کہ ہر انسان کو راہِ حقیقت دکھا دو، لیکن تمہیں یہ بات نہیں بھولنی چاہیے کہ اختلافِ فکر و عمل طبیعت انسانی کا قدرتی خاصہ ہے۔ تم بہ جبر کسی کے اندر ایک بات نہیں اُتار دے سکتے:

وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِي الْاَرْضِ	اور اگر تمہارا پروردگار چاہتا، تو زمین میں جتنے انسان ہیں، سب ایمان لے آتے
كُلُّهُمْ جَمِيْعًا ۚ اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ	(لیکن تم دیکھ رہے ہو کہ اُس کی حکمت کا فیصلہ یہی ہُوا کہ ہر انسان اپنی اپنی سمجھ اور

حَتّٰی یَکُوْنُوْا مُؤْمِنِیْنَ ۝ (۱۰: ۹۹)

اپنی اپنی راہ چلے) پھر کیا تم چاہتے ہو، لوگوں کو مجبور کر دو کہ مومن ہو جائیں؟

وہ کہتا ہے، انسان کی طبیعت ایسی واقع ہوئی ہے کہ ہر جماعت کو اپنا ہی طور طریقہ اچھا دکھائی دیتا ہے۔ وہ اپنی باتوں کو دوسروں کی مخالفانہ نگاہ سے نہیں دیکھ سکتا۔ جس طرح تمہاری نظر میں سب سے بہتر راہ تمہاری ہے، ٹھیک اسی طرح دوسروں کی نظر میں سب سے بہتر راہ اُن کی ہے۔ پس اس کے سوا چارہ نہیں کہ اس بارہ میں تحمل اور رواداری اپنے اندر پیدا کرو:

وَلَا تَسُبُّوا الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ فَیَسُبُّوا اللّٰہَ عَدْوًا بِغَیْرِ عِلْمٍ ۭ کَذٰلِکَ زَیَّنَّا لِکُلِّ اُمَّۃٍ عَمَلَھُمْ ۠ ثُمَّ اِلٰی رَبِّھِمْ مَّرْجِعُھُمْ فَیُنَبِّئُھُمْ بِمَا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ۝ (۶: ۱۰۸)

اور (دیکھو) جو لوگ خدا کو چھوڑ کر دوسرے معبودوں کو پکارتے ہیں، تم اُن پر سب و شتم نہ کرو۔ کیونکہ نتیجہ یہ نکلے گا کہ یہ لوگ بھی از راہِ جہل و نادانی خدا کو برا بھلا کہنے لگیں گے (یاد رکھو) ہم نے انسان کی طبیعت ہی ایسی بنائی ہے کہ ہر گروہ کو اپنا ہی عمل اچھا دکھائی دیتا ہے۔ پھر بالآخر سب کو اپنے پروردگار کی طرف لوٹنا ہے، اور وہیں ہر گروہ پر اُس کے اعمال کی حقیقت کھلنے والی ہے۔

"تشیّع" اور "تحزّب" کی گمراہی اور تجدیدِ دعوت کی ضرورت

اچھا، جب تمام مذاہب کا اصل مقصد ایک ہی ہے، اور سب کی بنیاد سچائی پر ہے، تو پھر قرآن کے ظہور کی ضرورت کیا تھی؟

وہ کہتا ہے: اس لیے، کہ اگرچہ تمام مذاہب سچے ہیں، لیکن تمام مذاہب کے پیرو سچائی سے منحرف ہو گئے ہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ سب کو اُن کی گم شدہ سچائی پر از سرِ نو جمع کر دیا جائے۔

اس سلسلہ میں اُس نے پیروانِ مذاہب کی تمام گمراہیاں ایک ایک کر کے گنائی ہیں۔ وہ اعتقادی اور عملی دونوں طرح کی ہیں۔ من جملہ اُن کے ایک سب سے بڑی گمراہی جس پر جا بجا زور دیتا ہے، وہ ہے، جسے اُس نے "تشیّع" اور "تحزّب" کے الفاظ سے تعبیر کیا ہے۔ عربی میں "تشیع" اور "تحزب" کے معنی یہ ہیں کہ الگ الگ جتھے بنا لینا، اور ان میں ایسی روح کا پیدا ہو جانا جسے اُردو میں گروہ پرستی کی روح سے تعبیر کیا جا سکتا ہے:

اِنَّ الَّذِیْنَ فَرَّقُوْا دِیْنَھُمْ وَکَانُوْا شِیَعًا لَّسْتَ مِنْھُمْ فِیْ شَیْءٍ ۭ اِنَّمَآ اَمْرُھُمْ اِلَی اللّٰہِ ثُمَّ یُنَبِّئُھُمْ بِمَا کَانُوْا یَفْعَلُوْنَ ۝ (۶: ۱۶۰)

جن لوگوں نے اپنے ایک ہی دین کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے، اور الگ الگ گروہ بندیوں میں بٹ گئے، تمہیں اُن سے کوئی واسطہ نہیں۔ اُن کا معاملہ خدا کے حوالے ہے جیسے کچھ اُن کے عمل رہے ہیں، اُس کا نتیجہ خدا انہیں بتلا دے گا۔

فَتَقَطَّعُوْٓا اَمْرَھُمْ بَیْنَھُمْ زُبُرًا ۭ کُلُّ

پھر لوگوں نے ایک دوسرے سے کٹ کر، جدا جدا دین بنا لیے، ہر ٹولی کے پاس

حِزْبٍۭ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ ﴿۵۳:۲۳﴾ جو کچھ پڑ گیا ہے، اُسی میں مگن ہے!

تشیع اور تحزب کی حقیقت

"تشیع" اور "تحزب" کی گمراہی سے کیا مقصود ہے؟ اُسے پوری وضاحت کے ساتھ سمجھ لینا چاہیے۔ وہ کہتا ہے، خدا کے ٹھہرائے ہوئے دین کی حقیقت تو یہ تھی کہ وہ نوعِ انسانی پر خدا پرستی اور نیک عملی کی راہ کھولتا تھا۔ یعنی خدا کے اس قانون کا اعلان کرتا تھا کہ دنیا کی ہر چیز کی طرح انسانی افکار و اعمال کے بھی خواص و نتائج ہیں۔ اچھے فکر و عمل کا بدلہ اچھا ہے۔ بُرے فکر و عمل کا بدلہ بُرا ہے لیکن لوگوں نے یہ حقیقت فراموش کر دی اور دین و مذہب کو نسلوں، قوموں، ملکوں، اور طرح طرح کی رسموں اور رواجوں کا ایک جتھا بنا لیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اب انسان کی نجات و سعادت کی راہ یہ نہیں سمجھی جاتی کہ کس کا اعتقاد اور عمل کیسا ہے؟ بلکہ سارا دار و مدار اس پر آکے ٹھہر گیا ہے کہ کون کس جتھے اور گروہ بندی میں داخل ہے؟ اگر ایک آدمی کسی خاص مذہبی گروہ بندی میں داخل ہے، تو یقین کیا جاتا ہے کہ وہ نجات یافتہ ہے اور دین کی سچائی اُسے مل گئی۔ اگر داخل نہیں ہے تو یقین کیا جاتا ہے کہ نجات کا دروازہ اُس پر بند ہو گیا، اور دین کی سچائی میں اُس کا کوئی حصہ نہیں۔ گویا دین کی سچائی، آخرت کی نجات، اور حق و باطل کا معیار، تمام تر گروہ بندی اور گروہ پرستی ہو گئی۔ اعتقاد اور عمل کوئی چیز نہیں رہی۔ پھر باوجودیکہ تمام مذاہب کا مقصود اصلی ایک ہی ہے، اور سب ایک ہی پروردگارِ عالم کی پرستش کرنے کے مدعی ہیں، لیکن ہر گروہ یقین کرتا ہے کہ دین کی سچائی صرف اُسی کے حصے میں آئی ہے۔ باقی تمام نوعِ انسانی اس سے محروم ہے۔ چنانچہ ہر مذہب کا پیرو دوسرے مذہب کے خلاف نفرت و تعصب کی تعلیم دیتا ہے اور دنیا میں خدا پرستی اور دین داری کی راہ، سرتاسر بغض و عداوت، نفرت و توحش، اور قتل و خونریزی کی راہ بن گئی ہے!

اس بارے میں دعوت قرآنی کی تین اہمات

اس سلسلہ میں قرآن نے جن اہمات پر زور دیا ہے، اُن میں تین باتیں سب سے نمایاں ہیں:

(۱) انسان کی نجات و سعادت کا دار و مدار اعتقاد و عمل پر ہے۔ نہ کہ کسی خاص گروہ بندی پر۔

(۲) نوعِ انسانی کے لیے دینِ الٰہی ایک ہی ہے، اور یکساں طور پر سب کو اسی کی تعلیم دی گئی ہے پس یہ جو پیروانِ مذاہب نے دین کی وحدت اور عالمگیر حقیقت ضائع کر کے بہت سے متخالف اور متخاصم جتھے بنا لیے ہیں، یہ صریح گمراہی ہے۔

(۳) اصل دین توحید ہے۔ یعنی ایک پروردگارِ عالم کی براہِ راست پرستش کرنی، اور تمام بانیانِ مذاہب نے اسی کی تعلیم دی ہے۔ اس کے خلاف جس قدر عقائد اور اعمال اختیار کر لیے گئے ہیں، اصلیت سے انحراف کا نتیجہ ہیں۔

یہودیت اور نصرانیت کی گروہ بندی اور اُس کا رد

چنانچہ آیاتِ مندرجۂ صدر کے علاوہ، حسبِ ذیل آیات میں بھی اسی حقیقت پر زور دیا گیا ہے:

وَقَالُوْا لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى اور یہود اور نصاریٰ نے کہا، جنت میں کوئی انسان داخل نہیں ہو سکتا جب تک کہ یہودی اور نصاریٰ نہ ہو (یعنی جب تک یہودیت یا نصرانیت کی گروہ بندی

تِلْكَ اَمَانِيُّهُمْ ؕ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ○ بَلٰى مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗٓ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ۪ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَ لَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ○

(۲ : ۱۰۶)

یں داخل نہ ہو) یہ اُن لوگوں کی (جاہلانہ) امنگیں ہیں۔ اے پیغمبر! ان سے کہہ دو، اگر تم (اس زعم باطل میں) سچے ہو تو بتلاؤ، تمہاری دلیل کیا ہے؟ ہاں (بلاشبہ نجات کی راہ کھلی ہوئی ہے مگر وہ کسی خاص گروہ بندی کی راہ نہیں ہو سکتی۔ وہ تو ایمان و عمل کی راہ ہے) جس کسی نے بھی خدا کے آگے سر جھکا دیا، اور وہ نیک عمل بھی ہوا، تو (خواہ وہ یہودی اور نصرانی ہو، خواہ کوئی ہو) وہ اپنے پروردگار سے اپنا اجر پائے گا۔ اُس کے لیے نہ تو کسی طرح کا کھٹکا ہے، نہ کسی طرح کی غمگینی!

دوسری جگہ یہی حقیقت زیادہ واضح لفظوں میں بیان کی گئی ہے:

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَ النَّصٰرٰى وَالصّٰبِـِٕيْنَ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ○ (۲ : ۵۹)

جو لوگ (پیغمبر اسلام پر) ایمان لائے ہیں، وہ ہوں، یا وہ لوگ ہوں جو یہودی کہلاتے ہیں۔ یا نصاریٰ، اور صابی ہوں (کوئی بھی ہو) لیکن جو کوئی بھی اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان لایا، اور اُس کے کام بھی اچھے ہوئے تو وہ اپنے ایمان و عمل کا اجر اپنے پروردگار سے ضرور پائے گا۔ اُس کے لیے نہ تو کسی طرح کا کھٹکا ہے، نہ کسی طرح کی غمگینی!

یعنی دین سے مقصود تو خدا پرستی اور نیک عملی کی راہ تھی۔ وہ کسی خاص حلقہ بندی کا نام نہ تھا۔ کوئی انسان ہو، کسی نسل و قوم سے ہو، کسی نام سے پکارا جاتا ہو، لیکن اگر خدا پر سچا ایمان رکھتا ہے، اور اس کے اعمال بھی نیک ہیں، تو دینِ الٰہی پر چلنے والا ہے اور اُس کے لیے نجات ہے۔ لیکن یہودیوں اور عیسائیوں نے ایک خاص طرح کی نسلی اور جماعتی گروہ بندی کا قانون بنا دیا۔ یہودیوں نے گروہ بندی کا ایک دائرہ کھینچا اور اُس کا نام "یہودیت" رکھ دیا۔ جو اس دائرہ کے اندر ہے، وہ سچائی پر ہے اور اُس کے لیے نجات ہے۔ جو اس سے باہر ہے، وہ باطل پر ہے، اور اُس کے لیے نجات نہیں۔ اسی طرح عیسائیوں نے بھی ایک دائرہ کھینچ لیا، اور اُس کا نام "مسیحیت" یا کلیسا رکھ دیا۔ جو اس میں داخل ہے صرف وہی سچائی پر ہے، اور صرف اُسی کے لیے نجات ہے۔ جو اس سے باہر ہے اس کا سچائی میں کوئی حصہ نہیں، اور نجات سے قطعاً محروم۔ باقی رہا عمل و اعتقاد، تو اُس کا قانون یک قلم غیر مؤثر ہو گیا۔ ایک شخص کتنا ہی خدا پرست اور نیک عمل ہو، لیکن اگر "یہودیت" کی نسلی گروہ بندی یا "مسیحیت" کی جماعتی گروہ بندی میں داخل نہیں، تو اُسے کوئی یہودی اور عیسائی ہدایت یافتہ انسان تسلیم نہیں کر سکتا۔ لیکن ایک سخت سے سخت بد عمل اور بد اعتقاد انسان بھی نجات یافتہ سمجھ لیا جائے گا، اگر ان گروہ بندیوں میں داخل ہو گا۔ قرآن اُن کے اسی اعتقاد کو ان لفظوں میں نقل کرتا ہے: كُوْنُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى تَهْتَدُوْا یعنی ہدایت کی راہ اعتقاد اور عمل کی راہ نہیں ہے، بلکہ یہودیت اور نصرانیت کی گروہ بندی کی راہ ہے۔ جب تک کوئی یہودی یا نصرانی نہ ہو جائے، ہدایت یافتہ

نہیں ہو سکتا۔ پھر اس کا رد کرتے ہوئے کہتا ہے، خدا کی ہدایت جو دنیا کا عالمگیر قانون ہے، وہ بھلا ان خود ساختہ گروہ بندیوں میں کیونکر محدود ہو جا سکتی ہے؟ بَلٰی مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ کے زور اور عموم پر غور کرو۔ کوئی انسان ہو، کسی نسل و قوم اور گروہ بندی کا ہو، لیکن جس کسی نے بھی اللہ کے آگے عبودیت کا سر جھکا دیا، اور نیک عملی کی زندگی اختیار کی، اُس نے دین کی نجات و سعادت پالی، اور اُس کے لیے کوئی غم اور کھٹکا نہیں!

غور کرو، مذہبی صداقت کی عالمگیر وسعت کا اس سے زیادہ واضح اور ہمہ گیر اعلان اور کیا ہو سکتا ہے:

وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ لَيْسَتِ النَّصٰرٰى عَلٰى شَيْءٍ وَّقَالَتِ النَّصٰرٰى لَيْسَتِ الْيَهُوْدُ عَلٰى شَيْءٍ وَّهُمْ يَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ مِثْلَ قَوْلِهِمْ فَاللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ۝ (۲ : ۱۱۳)	اور یہودیوں نے کہا، عیسائیوں کا دین کچھ نہیں ہے۔ اسی طرح عیسائیوں نے کہا یہودیوں کے پاس کیا دھرا ہے؟ حالانکہ دونوں اللہ کی کتاب پڑھتے ہیں (اور دونوں کا سرچشمۂ دین ایک ہی ہے) ٹھیک ایسی ہی بات ان لوگوں نے بھی کہی جو مقدس نوشتوں کا علم نہیں رکھتے (یعنی مشرکین عرب کہ وہ بھی صرف اپنے ہی کو نجات کا وارث سمجھتے ہیں) اچھا، جس بات میں باہم دگر جھگڑ رہے ہیں، قیامت کے دن اللہ اس کا فیصلہ کر دے گا، (اور اُس وقت حقیقتِ حال سب پر کھل جائے گی)

یعنی باوجودیکہ خدا کا دین ایک ہی ہے، اور کتاب الٰہی یعنی تورات دونوں کے سامنے ہے، بااین ہمہ مذہبی گروہ بندی کا نتیجہ یہ ہے کہ باہم دگر مخالف اور مکذب جتھے قائم ہو گئے ہیں۔ ہر جتھا دوسرے جتھے کو جھٹلاتا ہے، اور ہر جتھا صرف اپنے ہی کو نجات و سعادت کا مالک سمجھتا ہے!

سچائی اصلاً سب کے پاس ہے مگر عملاً سب نے کھو دی ہے

سوال یہ ہے کہ جب دین کی راہ ایک ہونے کی جگہ، بے شمار جتھوں اور ٹولیوں میں بٹ گئی، اور ہر جتھا ایک ہی طریقہ پر اپنی سچائی کا مدعی ہے اور ایک ہی طریقہ پر دوسروں کو جھٹلا رہا ہے، تو اب اس بات کا فیصلہ کیونکر ہو کہ فی الحقیقت سچائی ہے کہاں؟ قرآن کہتا ہے، "سچائی اصلاً سب کے پاس ہے۔ مگر عملاً سب نے کھو دی ہے۔ سب کو ایک ہی دین کی تعلیم دی گئی تھی، اور سب کے لیے ایک ہی عالمگیر قانونِ ہدایت تھا۔ لیکن سب نے اصل حقیقت ضائع کر دی، اور "الدین" پر قائم رہنے کی جگہ الگ الگ گروہ بندیاں کر لیں۔ اب ہر گروہ دوسرے گروہ سے لڑ رہا ہے، اور سمجھتا ہے، دین کی سعادت اور نجات صرف اسی کے ورثہ میں آئی ہے۔ دوسروں کا اس میں کوئی حصہ نہیں"۔

عبادت گاہوں میں تفرقہ

سورۂ بقرہ میں مندرجۂ صدر آیت کے بعد ہی حسب ذیل بیان شروع ہو جاتا ہے:

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ اَنْ يُّذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ وَسَعٰى فِيْ	اور غور کرو، اُس سے بڑھ کر ظلم کرنے والا انسان کون ہو سکتا ہے جو اللہ کی عبادت گاہوں میں اُس کے نام کی یاد سے مانع آئے۔ اور اُن کی ویرانی

خَرَابِهَا ۚ أُولَٰئِكَ مَا كَانَ لَهُمْ أَنْ يَدْخُلُوهَا إِلَّا خَائِفِينَ ۚ لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ وَلَهُمْ فِي الْآخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيمٌ ۝ (۲ : ۱۱۴)

میں کوشاں ہو؟ جن لوگوں کے ظلم و شرارت کا یہ حال ہے، یقیناً وہ اس لائق نہیں کہ خدا کی عبادت گاہوں میں قدم رکھیں۔ بجز اس حالت کے کہ (دوسروں کو اپنی طاقت سے ڈرانے کی جگہ خود دوسروں کی طاقت سے) ڈرے سہمے ہوئے ہوں

یاد رکھو، ایسے لوگوں کے لیے دنیا میں بھی رسوائی ہے اور آخرت میں بھی سخت ترین عذاب!

یعنی مذہبی گروہ بندی کی گمراہی کا نتیجہ یہ ہے کہ خدا کی عبادت گاہیں تک الگ الگ ہو گئی ہیں، اور باوجودیکہ تمام پیروانِ مذاہب ایک ہی خدا کے نام لیوا ہیں، لیکن ممکن نہیں، ایک مذہب کا پیرو دوسرے مذہب کی بنائی ہوئی عبادت گاہ میں جاکر خدا کا نام لے سکے۔ اتنا ہی نہیں، بلکہ ہر گروہ صرف اپنی عبادت گاہ کو خدا کی عبادت گاہ سمجھتا ہے۔ دوسرے گروہ کی عبادت گاہ اُس کی نظروں میں کوئی احترام نہیں رکھتی حتیٰ کہ بسا اوقات وہ مذہب کے نام پر اُٹھتا ہے اور دُوسروں کی عبادت گاہیں منہدم کر ڈالتا ہے۔ قرآن کہتا ہے، اس سے بڑھ کر انسان کا ظلم اور کیا ہو سکتا ہے کہ خدا کے بندوں کو خدا کی یاد سے روکا جائے؟ اور صرف اس لیے روکا جائے کہ وہ ایک دوسرے مذہبی گروہ سے تعلق رکھتے ہیں؟ یا ایک عبادت گاہ ڈھادی جائے، اور اس لیے ڈھادی جائے کہ وہ ہماری بنائی ہوئی نہیں ہے۔ دوسرے گروہ کی بنائی ہوئی ہے؟ کیا تمہارے بنائے ہوئے مذہبی جتھوں کے اختلاف سے خدا بھی مختلف ہو گئے؟ اور اس لیے ایک جتھے کی بنائی ہوئی عبادت گاہ تو خدا کی عبادت گاہ ہوئی، مگر دوسرے کی بنائی ہوئی عبادت گاہ خدا کی عبادت گاہ نہیں؟

وَلَا تُؤْمِنُوا إِلَّا لِمَنْ تَبِعَ دِينَكُمْ قُلْ إِنَّ الْهُدَىٰ هُدَى اللَّهِ أَنْ يُؤْتَىٰ أَحَدٌ مِثْلَ مَا أُوتِيتُمْ أَوْ يُحَاجُّوكُمْ عِنْدَ رَبِّكُمْ ۗ قُلْ إِنَّ الْفَضْلَ بِيَدِ اللَّهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَشَاءُ ۗ وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ ۝ (۳ : ۷۴)

اور (یہ لوگ آپس میں ایک دوسرے سے کہتے ہیں) یہ بات کبھی نہ مانو کہ دین کی جو سعادت تمہیں دی گئی ہے (یعنی یہودیوں کو دی گئی ہے) ویسی اب کسی دوسرے انسان کو مل سکے، یا اللہ کے حضور تمہارے خلاف کسی کی کوئی حجت چل سکے۔ (اے پیغمبر! ان لوگوں سے کہہ دو، ہدایت تو وہی ہے جو اللہ کی ہدایت ہے (اور اس کی راہ سب کے لیے کھلی ہوئی ہے) اور فضل و بخشش کا سر رشتہ تمہارے ہاتھ نہیں ہے، اللہ کے ہاتھ ہے جسے چاہے دیدے۔ وہ (اپنے فضل میں) بڑی وسعت رکھنے والا اور سب کچھ جاننے والا ہے۔

یعنی یہودیوں کا اعتقاد یہ ہے کہ وحی و نبوّت کی ہدایت جو انہیں دی گئی ہے، وہ صرف اُنہی کے لیے ہے۔ ممکن نہیں، کسی دوسرے انسان یا قوم کو یہ بات حاصل ہو سکے۔ چنانچہ اسی بنا پر وہ کہتے ہیں، اپنے مذہب کے آدمیوں کے علاوہ اور کسی آدمی کی سچائی اور بزرگی تسلیم نہ کرو، اور نہ یہ بات مانو کہ تمہارے خلاف (یعنی یہودیوں کے خلاف) کسی آدمی کی کوئی دلیل خدا کے حضور مقبول ہو سکتی ہے۔ قرآن اس زعم باطل کو رد کرتا ہے، اور کہتا ہے "اِنَّ الْهُدٰی

ھُدَی اللہِ" ہدایت کی راہ تو وہی ہے جو اللہ کی ہدایت ہے، اور اللہ کا فضل کسی ایک انسان یا گروہ ہی کے لیے نہیں ہے۔ سب کے لیے ہے، پس جو انسان بھی ہدایت کی راہ چلے گا، ہدایت یافتہ ہوگا۔ خواہ یہودی ہو یا کوئی ہو۔

یہودی اپنے آپ کو نجات یافتہ اُمت سمجھتے تھے، اور کہتے تھے، دوزخ کی آگ ہم پر حرام کردی گئی ہے۔

یہودیوں کی گروہ بندی کا غرور یہاں تک بڑھ گیا تھا کہ وہ کہتے تھے، خدا نے دوزخ کی آگ ہم پر حرام کردی ہے۔ اگر ہم میں سے کوئی آدمی جہنم میں ڈالا بھی جائے گا، تو اس لیے نہیں کہ اسے عذاب میں ڈالا جائے، بلکہ اس لیے کہ گناہ کے داغ دھبوں سے پاک و صاف کردیا جائے، اور پھر جنت میں جا داخل ہو۔ قرآن ان کا یہ زعم باطل جا بجا نقل کرتا ہے، اور پھر اس کا رد کرتے ہوئے پوچھتا ہے، یہ بات تمہیں کہاں سے معلوم ہوگئی کہ یہودی گروہ بندی کا ہر فرد نجات یافتہ ہے؟ اور عذابِ اُخروی سے اُسے چھٹکارا مل چکا ہے؟ کیا تمہیں خدا نے غیر مشروط نجات کا کوئی پٹہ لکھ کردے دیا ہے کہ جہاں ایک انسان یہودی ہوا، اور آتشِ دوزخ اُس پر حرام ہوگئی؟ اگر نہیں دیا ہے، تو پھر بتلاؤ، ایسا اعتقاد رکھنا خدا پر افترا نہیں ہے تو اور کیا ہے؟ اُس کے بعد صاف صاف لفظوں میں خدا کے قانونِ عمل کا اعلان کرتا ہے، "جس کسی نے بھی اپنے عمل سے بُرائی کمائی، اُس کے لیے بُرائی ہے جس کسی نے بھی بھلائی کمائی، اُس کے لیے بھلائی ہے۔" یعنی جس طرح سنکھیا کھانے سے ہر کھانے والا ہلاک ہو جاتا ہے، خواہ یہودی ہو یا غیر یہودی، اور دودھ پینے سے صحت و توانائی ملتی ہے، خواہ پینے والا کسی نسل و قوم اور گروہ سے تعلق رکھتا ہو، اسی طرح عالمِ معنویات میں بھی ہر عمل کا ایک خاصہ ہے، اور وہ اس لیے بدل نہیں جاسکتا کہ عمل کرنے والے کی نسل یا گروہ بندی کیا ہے۔

چنانچہ سورۂ بقرہ میں ہے:

وَقَالُوا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ إِلَّا أَيَّامًا مَعْدُودَةً ۚ قُلْ أَتَّخَذْتُمْ عِنْدَ اللَّهِ عَهْدًا فَلَنْ يُخْلِفَ اللَّهُ عَهْدَهُ ۖ أَمْ تَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ ۞ بَلَىٰ مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَأَحَاطَتْ بِهِ خَطِيئَتُهُ فَأُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ ۖ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ۞ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ الْجَنَّةِ ۖ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ۞ (۲ : ۸۱)	اور ان لوگوں نے (یعنی یہودیوں نے) کہا، ہمیں جہنم کی آگ کبھی چھونے والی نہیں، اور اگر چھوئے بھی تو اس سے زیادہ نہیں کہ چند دنوں کے لیے چھوئے (اے پیغمبر!) ان سے کہو، یہ جو تم کہتے ہو، تو کیا تم نے خدا سے کوئی قول و قرار کرالیا ہے، اور اب وہ اپنے قول و قرار سے پھر نہیں سکتا، یا پھر تم خدا کے نام سے ایک ایسی (جھوٹی) بات کہہ رہے ہو جس کا تمہیں کوئی علم نہیں؟ نہیں، (خدا کا قانون تو یہ ہے کہ کسی نسل اور کسی گروہ کا انسان ہو، لیکن جس کسی نے بھی بُرائی کمائی، اور اپنے گناہوں میں گھر گیا، تو وہ دوزخی گروہ میں سے ہے، ہمیشہ دوزخ میں رہنے والا۔ اور جس کسی نے بھی ایمان کی راہ اختیار کی اور نیک عمل ہوا، تو وہ بہشتی گروہ میں سے ہے، ہمیشہ بہشت میں رہنے والا!

قانونِ نجات کا اعلانِ عام

سورۂ نساء میں نہ صرف یہودیوں اور عیسائیوں کو، بلکہ سب کو مخاطب کرکے صاف صاف

اعلان کر دیا ہے۔ ایسا اعلان، جس کے بعد کسی طرح کے شک و شبہ کی گنجائش باقی نہیں رہی:

لَيْسَ بِاَمَانِيِّكُمْ وَلَآ اَمَانِيِّ اَهْلِ الْكِتٰبِ ۭ مَنْ يَّعْمَلْ سُوْۗءًا يُّجْزَ بِهٖ ۙ وَلَا يَجِدْ لَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ۝ (۴: ۱۲۳)	(مسلمانو! یاد رکھو، نجات اور سعادت) نہ تو تمہاری آرزوؤں پر موقوف ہے، نہ اہل کتاب کی آرزوؤں پر (خدا کا قانون تو یہ ہے کہ) جو کوئی بھی بُرائی کرے گا اس کا نتیجہ اُس کے سامنے آئیگا اور پھر نہ توکسی کی دوستی بچا سکے گی نہ کسی طاقت کی مددگاری!

یہودی سمجھتے تھے، غیر مذہب والوں کے ساتھ معاملت میں دیانتداری ضروری نہیں۔ قرآن کا اس پر انکار

اِسی مذہبی گروہ بندی کا نتیجہ تھا کہ یہودی سمجھتے تھے، سچائی اور دیانت داری کے جس قدر بھی احکام ہیں وہ اس لیے نہیں ہیں کہ تمام انسانوں کے ساتھ عمل میں لائے جائیں، بلکہ محض اس لیے ہیں کہ ایک یہودی دوسرے یہودی کے ساتھ بد دیانتی نہ کرے۔ وہ کہتے تھے اگر ایک آدمی ہمارا ہم مذہب نہیں ہے، تو ہمارے لیے جائز ہے کہ جس طرح بھی چاہیں، اُس کا مال کھالیں کچھ ضروری نہیں کہ راست بازی و دیانت کے اصول ملحوظ رکھے جائیں۔ چنانچہ لین دین میں سود لینے کی ممانعت کو اُنہوں نے صرف اپنے ہم مذہبوں کے ساتھ مخصوص کر دیا تھا، اور آج تک اُن کا طرز عمل یہی ہے۔ وہ کہتے ہیں ایک یہودی کو دوسرے یہودی سے ظالمانہ سود نہیں لینا چاہیے، لیکن ایک یہودی، غیر یہودی سے لے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ قرآن اُن کے اِس عقیدہ کا ذکر کرتا، اور اسے اُن کی بہت بڑی گمراہی قرار دیتا ہے:

وَّاَخْذِهِمُ الرِّبٰوا وَقَدْ نُھُوْا عَنْهُ وَاَكْلِهِمْ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ ۭ (۴: ۱۶۱)	اور ان کا سود کھانا، حالانکہ وہ اس سے روک دیے گئے تھے اور ان کی یہ بات کہ لوگوں کا مال ناجائز طریقے پر کھا لیتے تھے۔

اسی طرح جو یہودی عرب میں آباد تھے، وہ کہتے تھے، عرب کے اَن پڑھ باشندوں کے ساتھ معاملہ کرنے میں راست بازی و دیانت داری کچھ ضروری نہیں۔ یہ لوگ بُت پرست ہیں۔ ہم اِن لوگوں کا مال جس طرح بھی کھالیں، ہمارے لیے جائز ہے:

ذٰلِكَ بِاَنَّھُمْ قَالُوْا لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الْاُمِّيّٖنَ سَبِيْلٌ ۚ وَيَقُوْلُوْنَ عَلَي اللّٰهِ الْكَذِبَ وَھُمْ يَعْلَمُوْنَ ۝ بَلٰي مَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ وَاتَّقٰى فَاِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ۝ (۳: ۷۰)	(یہودیوں کی) یہ بد معاملگی اس لیے ہے کہ وہ کہتے ہیں، عرب کے اِن اَن پڑھ لوگوں سے (بد معاملگی کرنے میں) ہم سے کوئی باز پرس نہیں ہوگی (جس طرح بھی ہم چاہیں، ان کا مال کھا لے سکتے ہیں حالانکہ) ایسا کہتے ہوئے وہ صریح اللہ پر افترا کرتے ہیں۔ ہاں! ان سے باز پرس ہو، اور ضرور ہو، کیونکہ اللہ کا قانون تو یہ ہے کہ) جو کوئی اپنا قول و قرار سچائی کے ساتھ پورا کرتا ہے اور بُرائی سے بچتا ہے، تو وہی اللہ کی خوشنودی حاصل کرتا ہے اور اللہ بُرائی سے بچنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

یعنی ایسا عقیدہ رکھنا خدا کے دین پر صریح افترا ہے۔ خدا کا دین تو یہ ہے کہ ہر انسان کے ساتھ نیکی کرنی چاہیے

اور ہر حال میں راست بازی و دیانت داری کی راہ چلنی چاہیے، خواہ کوئی انسان ہو، اور کسی عقیدہ اور گروہ کا ہو، کیونکہ سفید ہر حال میں سفید ہے، اور سیاہ ہر حال میں سیاہ۔ کوئی سفید چیز اس لیے کالی نہیں ہو جاسکتی کہ کسی آدمی کو دی گئی ہے، اور کوئی کالی چیز اس لیے سفید نہیں ہو جاسکتی کہ کس نسل اور کس گروہ کے ہاتھوں نکلی ہے۔ پس دیانت داری ہر حال میں دیانت داری ہے، اور بددیانتی ہر حال میں بد دیانتی۔

حضرت ابراہیمؑ کی شخصیت سے استشہاد

نزول قرآن کے وقت بڑے مذہبی گروہ عرب میں تین تھے۔ یہودی، عیسائی، اور مشرکین عرب، اور یہ تینوں حضرت ابراہیم (علیہ السّلام) کی شخصیت کو یکساں طور پر عزت و احترام کی نظر سے دیکھتے تھے، کیونکہ تینوں گروہوں کے مورث اعلیٰ وہی تھے۔ پس قرآن مذہبی گروہ بندی کی گمراہی واضح کرنے کے لیے ایک نہایت سیدھا سادہ سوال ان تینوں کے سامنے پیش کرتا ہے۔ اگر دین کی سچائی گروہ بندیوں کے ساتھ وابستہ ہے، تو بتلاؤ حضرت ابراہیمؑ کس گروہ بندی کے آدمی تھے؟ یہ ظاہر ہے کہ اُس وقت تک نہ تو یہودیت کا ظہور ہوا تھا، نہ مسیحیت کا، اور نہ کوئی دوسری گروہ بندی ہی موجود تھی۔ پھر اگر حضرت ابراہیمؑ کسی گروہ بندی میں داخل نہ ہونے پر بھی دینِ حق کی راہ پر تھے، تو بتلاؤ، وہ راہ کونسی تھی؟ قرآن کہتا ہے، وہ اُسی دینِ حقیقی کی راہ تھی جو تمہاری تمام بنائی ہوئی گروہ بندیوں سے بالاتر، اور نوعِ انسانی کے لیے عالمگیر قانونِ نجات ہے۔ یعنی خدا کی موحدانہ پرستش اور نیک عملی کی زندگی:

وَقَالُوا كُونُوا هُودًا اَوْ نَصٰرٰى
تَهْتَدُوْا ۭ قُلْ بَلْ مِلَّةَ اِبْرٰهٖمَ
حَنِيْفًا ۭ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝
(۱۲۹:۲)

اور یہودی کہتے ہیں، یہودی ہو جاؤ، ہدایت پاؤ گے۔ نصاریٰ کہتے ہیں، نصرانی ہو جاؤ، ہدایت پاؤ گے (اے پیغمبر) تم کہو، نہیں، (اللہ کی عالمگیر ہدایت تمہاری اِن گروہ بندیوں کی پابند نہیں ہو جاسکتی) ہدایت کی راہ تو وہی حنیفی راہ ہے جو ابراہیمؑ کا طریقہ تھا، اور وہ مشرکوں میں سے نہ تھا۔

سورۂ آل عمران میں یہی مضمون زیادہ وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے:

يٰٓاَھْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تُحَاۗجُّوْنَ فِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ
وَمَآ اُنْزِلَتِ التَّوْرٰىةُ وَالْاِنْجِيْلُ اِلَّا
مِنْۢ بَعْدِهٖ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝ (۵۸:۳)

اے اہلِ کتاب! تم ابراہیمؑ کے بارے میں کیوں حجت کرتے ہو حالانکہ یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ تورات اور انجیل نازل نہیں ہوئیں مگر اُس کے بعد پھر کیا اتنی صاف بات بھی سمجھ نہیں سکتے؟

یعنی وہ یہودیوں اور عیسائیوں سے سوال کرتا ہے۔ تمہاری ان گروہ بندیوں کی تاریخ زیادہ سے زیادہ تورات اور انجیل کے ظہور تک جاسکتی ہے۔ کیونکہ اُنہی کی نسبت سے گروہ بندیوں کے حلقے کھنچ گئے ہیں۔ اچھا بتاؤ، تورات سے پہلے بھی ہدایت یافتہ انسان موجود تھے یا نہیں؟ اگر تھے تو اُن کی راہ کیا تھی؟ خود تمہارے اسرائیلی گھرانے کے تمام نبیوں کی راہ کیا تھی؟ حضرت ابراہیمؑ نے اپنے بیٹوں اور پوتوں کو جس دین کی تلقین کی، وہ دین کونسا تھا؟ حضرت یعقوبؑ

جب بسترِ مرگ پر تھے اور اپنے بیٹوں کو دینِ الٰہی پر قائم رہنے کی وصیّت کر رہے تھے، تو اُس دین سے مقصود کونسا دین تھا؟ یہ تو ظاہر ہے کہ وہ یہودیت یا مسیحیت کی گروہ بندی نہیں ہو سکتی، کیونکہ یہ دونوں گروہ بندیاں حضرت موسیٰؑ اور حضرت مسیحؑ کے نام پر کی گئی ہیں؛ اور وہ حضرت ابراہیمؑ اور حضرت یعقوبؑ وغیرہم سے کئی سو برس بعد پیدا ہوئے۔ پس معلوم ہُوا، تمہارے اِن خود ساختہ حلقہ ہائے نجات سے بھی کوئی بالاتر راہِ نجات موجود ہے، جو اُس وقت بھی نوعِ انسانی کے سامنے موجود تھی، جب اِن حلقہ بندیوں کا نام و نشان تک نہ تھا۔ قرآن کہتا ہے، یہی راہِ نجات، دین کی اصلی راہ ہے، اور اسے حاصل کرنے کے لیے کسی گروہ بندی کی نہیں بلکہ اعتقاد و عمل کی ضرورت ہے:

أَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ إِذْ حَضَرَ يَعْقُوْبَ الْمَوْتُ ۙ إِذْ قَالَ لِبَنِيْهِ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ بَعْدِيْ ؕ قَالُوْا نَعْبُدُ إِلٰهَكَ وَإِلٰهَ اٰبَآئِكَ إِبْرٰهِيْمَ وَإِسْمٰعِيْلَ وَإِسْحٰقَ إِلٰهًا وَّاحِدًا ۚۖ وَّنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ۝ (۲:۱۲۷)

پھر کیا تم اُس وقت موجود تھے جب یعقوبؑ کے سرہانے موت آکھڑی ہوئی تھی، اور اُس نے اپنی اولاد سے پوچھا تھا، بتلاؤ، میرے بعد کس کی عبادت کروگے؟ اُنہوں نے جواب میں کہا تھا۔ اُسی ایک خدا کی عبادت کریں گے جس کی تو نے عبادت کی ہے، اور تیرے بزرگوں، ابراہیمؑ، اسمٰعیلؑ، اور اسحٰقؑ نے کی ہے، اور ہم خدا کے حکموں کے فرمانبردار ہیں!

اصلِ دین وحدت و اخوت ہے۔ نہ کہ تفرقہ و منافرت

وہ کہتا ہے، دینِ الٰہی کی اصل، نوعِ انسانی کی اخوت و وحدت ہے، نہ کہ تفرقہ و منافرت۔ خدا کے جتنے رسول بھی دنیا میں آئے، سب نے یہی تعلیم دی تھی کہ تم سب اصلاً ایک ہی اُمت ہو، اور تم سب کا پروردگار ایک ہی پروردگار ہے۔ پس چاہیے کہ سب اُسی ایک پروردگار کی بندگی کریں، اور ایک گھرانے کے بھائیوں کی طرح مل جُل کر رہیں۔ اگرچہ ہر مذہب کے داعی نے اسی راہ کی تعلیم دی، لیکن ہر مذہب کے پیرؤوں نے اس سے انحراف کیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ہر ملک، ہر قوم، ہر نسل نے اپنے اپنے جتھے الگ الگ بنا لیے، اور ہر جتھا اپنے طور طریقہ میں مگن ہو گیا۔

قرآن نے پچھلے رسولوں اور مذہب کے بانیوں میں سے جن جن رہنماؤں کے مواعظ نقل کیے ہیں، اُن سب میں بھی اصل اصول یہی حقیقت ہے، اور عموماً اکثر مواعظ کا خاتمہ دین کی وحدت اور انسان کی عالمگیر اخوت کی تعلیم ہی پر ہوتا ہے۔ مثلاً سورۂ مومنون میں سب سے پہلے حضرت نوح (علیہ السلام) کی دعوت، کا ذکر کیا ہے: وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا نُوْحًا إِلٰى قَوْمِهٖ فَقَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ إِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ أَفَلَا تَتَّقُوْنَ ۝ (۲۳:۲۳) اِس کے بعد اُن دعوتوں کی طرف اشارہ کیا ہے جو حضرت نوحؑ کے بعد ظاہر ہوتی رہیں: ثُمَّ أَنْشَأْنَا مِنْ بَعْدِهِمْ قَرْنًا اٰخَرِيْنَ ۚ فَأَرْسَلْنَا فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ أَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ إِلٰهٍ غَيْرُهٗ (۳۲) پھر حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کا ذکر کیا ہے: ثُمَّ أَرْسَلْنَا مُوْسٰى وَأَخَاهُ هٰرُوْنَ (۴۷) حضرت موسیٰ کے بعد حضرت مسیح (علیہ السلام) کی دعوت نمایاں ہوئی: وَجَعَلْنَا ابْنَ مَرْيَمَ وَأُمَّهٗ اٰيَةً (۵۲) پھر اِن تمام دعوتوں کے بعد یہ صدائے حق بلند ہوتی ہے:

يٰٓأَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّيِّبٰتِ وَاعْمَلُوْا

اور ہم نے تمام رسولوں کو یہی حکم دیا تھا کہ پاک و صاف چیزیں کھاؤ، اور نیک عملی کی

صَالِحًا إِنِّي بِمَا تَعْمَلُونَ عَلِيمٌ ۝ وَإِنَّ هَٰذِهِ أُمَّتُكُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً وَأَنَا رَبُّكُمْ فَاتَّقُونِ ۝ فَتَقَطَّعُوا أَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ زُبُرًا كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ ۝ (۲۳: ۵۳)

زندگی بسر کرو، تم جو کچھ کرتے ہو، اُس سے میں بے خبر نہیں ہوں۔ اور دیکھو، یہ تمہاری قوم دراصل ایک ہی قوم ہے، اور میں تم سب کا پروردگار ہوں، پس نافرمانی سے بچو! لیکن پھر ایسا ہوا کہ لوگوں نے ایک دوسرے سے کٹ کر، جُدا جُدا دین بنا لیے۔ ہر ٹولی کے پلّے جو کچھ پڑ گیا ہے، اُسی میں مگن ہے!

یعنی تمام رسولوں نے یکے بعد دیگرے یہی تعلیم دی تھی کہ خدا کی بندگی کرو اور نیک عملی کی زندگی اختیار کرو، تم سب خدا کے نزدیک ایک ہی اُمت ہو۔ اور تم سب کا پروردگار ایک ہی پروردگار ہے۔ تم میں سے کوئی گروہ دوسرے گروہ کو اپنے سے الگ نہ سمجھے، نہ کوئی گروہ دوسرے گروہ کا مخالف ہو جائے۔ فَتَقَطَّعُوا أَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ زُبُرًا لیکن لوگوں نے یہ تعلیم فراموش کر دی اور اپنی الگ الگ ٹولیاں بنا لیں۔ كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ اب ہر ٹولی اُسی میں مگن ہے جو اُس کے پلّے پڑ گیا ہے۔

رسمِ اصطباغ | مذہبی گروہ بندی کی رسموں میں سے ایک رسم وہ ہے، جو عیسائی کلیسا نے اختیار کر رکھی ہے اور جسے وہ اصطباغ (بپتسما) سے تعبیر کرتے ہیں۔ یہ دراصل ایک یہودی رسم تھی جو اُس وقت ادا کی جاتی تھی جب لوگ گناہوں سے توبہ کیا کرتے تھے، اور اس لیے فی نفسہ ایک مقررہ رسم سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی لیکن عیسائیوں نے اسے انسانی نجات و سعادت کی بنیاد سمجھ لیا ہے۔ جب تک ایک شخص مسیح علیہ السلام کے نام پر اصطباغ نہ لے، وہ نجات یافتہ انسان نہیں سمجھا جاتا۔ قرآن کہتا ہے، یہ کیسی گمراہی ہے کہ انسانی نجات و سعادت جس کا دارومدار عمل و اعتقاد پر ہے، محض ایک مقررہ رسم کے ساتھ وابستہ کر دی جائے؟ انسانوں کا یہ ٹھہرایا ہوا اصطباغ اللہ کا اصطباغ نہیں ہے۔ اللہ کا اصطباغ تو یہ ہے کہ تمہارے دل خدا پرستی کے رنگ میں رنگ جائیں:

صِبْغَةَ اللَّهِ ۖ وَمَنْ أَحْسَنُ مِنَ اللَّهِ صِبْغَةً ۖ وَنَحْنُ لَهُ عَابِدُونَ ۝ (۲: ۱۳۸)

یہ اللہ کا رنگ ہے (یعنی دینِ الٰہی کا قدرتی اصطباغ ہے) اور اللہ سے بہتر رنگ دینے میں اور کون ہو سکتا ہے؟ ہم تو اُسی کی بندگی کرنے والے ہیں۔

قانونِ عمل | اسی طرح وہ سورۂ بقرہ میں بار بار کہتا ہے۔ دینِ الٰہی، عمل کا قانون ہے، اور ہر انسان کے لیے وہی ہونا ہے جو اُس کے عمل کی کمائی ہے۔ یہ بات کہ ایک گروہ میں بہت سے نبی اور برگزیدہ انسان ہو چکے ہیں، یا نیک انسانوں کی نسل میں سے ہے، یا کسی پچھلی قوم سے رشتۂ قدامت رکھتا ہے، نجات و سعادت کے لیے کچھ سودمند نہیں:

تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۖ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَا كَسَبْتُمْ ۖ وَلَا تُسْأَلُونَ عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ ۝ (۲: ۱۴۱)

یہ ایک اُمت تھی جو گزر چکی، اُس کے لیے وہ تھا، جو اُس نے اپنے عمل سے کمایا، اور تمہارے لیے وہ ہے، جو اپنے عمل سے کماؤ، تم سے اُس کی بازپرس نہیں ہوگی کہ ان کے عمل کیسے تھے۔

قرآن کی دعوت

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں، کوئی بات بھی قرآن کے صفحوں پر اس درجہ نمایاں نہیں ہے، جس قدر یہ بات ہے اُس نے بار بار صاف اور قطعی لفظوں میں اس حقیقت کا اعلان کر دیا ہے کہ وہ کسی نئی مذہبی گروہ بندی کی دعوت لے کر نہیں آیا ہے، بلکہ چاہتا ہے، تمام مذہبی گروہ بندیوں کی جنگ و نزاع سے دنیا کو نجات دلا دے، اور سب کو اسی ایک راہ پر جمع کر دے جو سب کی مشترک اور متفقہ راہ ہے!

وہ بار بار کہتا ہے جس راہ کی میں دعوت ہوں، وہ کوئی نئی راہ نہیں ہے، اور نہ سچائی کی راہ نئی ہو سکتی ہے یہ وہی راہ ہے جو اوّل روز سے موجود ہے، اور تمام مذاہب کے داعیوں نے اُسی کی طرف بلایا ہے:

شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ (۴۲: ۱۳)	اور (دیکھو) اُس نے تمہارے لیے دین کی وہی راہ ٹھہرائی ہے جس کی وصیت نوحؑ کو کی گئی تھی، اور جس پر چلنے کا ابراہیمؑ اور موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کو حکم دیا تھا (ان سب کی تعلیم یہی تھی)، کہ الدین (یعنی خدا کا ایک ہی دین) قائم رکھو، اور اس راہ میں الگ الگ نہ ہو جاؤ!

سورۂ نساء میں ہے:

اِنَّآ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ كَمَآ اَوْحَيْنَآ اِلٰى نُوْحٍ وَّالنَّبِيّٖنَ مِنْۢ بَعْدِهٖ ۚ وَاَوْحَيْنَآ اِلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَعِيْسٰى وَاَيُّوْبَ وَيُوْنُسَ وَهٰرُوْنَ وَسُلَيْمٰنَ ۚ وَاٰتَيْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا ۚ وَرُسُلًا قَدْ قَصَصْنٰهُمْ عَلَيْكَ مِنْ قَبْلُ وَرُسُلًا لَّمْ نَقْصُصْهُمْ عَلَيْكَ ۭ (۴: ۱۶۳)	(اے پیغمبر!) ہم نے تمہیں اسی طرح اپنی وحی سے مخاطب کیا ہے جس طرح نوحؑ کو کیا تھا، اور اُن تمام نبیوں کو کیا تھا، جو نوحؑ کے بعد ہوئے نیز جس طرح ابراہیمؑ، اسمٰعیلؑ، اسحٰقؑ، یعقوبؑ، اولادِ یعقوبؑ، یونسؑ ہارونؑ، سلیمانؑ (وغیرہم) کو مخاطب کیا، اور داؤدؑ کو زبور عطا کی۔ علاوہ بریں وہ رسول، جن میں سے بعض کا حال ہم تمہیں پہلے سُنا چکے ہیں، اور بعض ایسے ہیں جن کا حال تمہیں نہیں سُنایا۔

سورۂ انعام میں پچھلے رسولوں کا ذکر کر کے پیغمبرِ اسلام کو مخاطب کیا ہے، اور کہا ہے:

اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ ۭ (۶: ۹۰)	یہ وہ لوگ ہیں جنہیں اللہ نے راہِ حق دکھلائی۔ پس (اے پیغمبر) تم بھی انہی کی ہدایت کی پیروی کرو۔

> سب کی یکساں تصدیق اور سب کے متفقہ دین کی پیروی اُس کی دعوت کا اصل اصول ہے:

اسی لیے اس کی دعوت کی پہلی بنیاد ہی یہ ہے کہ تمام بانیانِ مذاہب کی یکساں طور پر تصدیق کی جائے یعنی یقین کیا جائے کہ سب حق پر تھے سب خدا

کی سچائی کے پیغامبر تھے، سب نے ایک ہی اصل و قانون کی تعلیم دی، اور سب کی اس متفقہ تعلیم پر کاربند ہونا ہی ہدایت و سعادت کی تنہا راہ ہے:

قُلْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَالنَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ ۠ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ ۡ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ۝ (۳: ۸۴)

(اے پیغمبر!) کہدو، ہمارا طریقہ تو یہ ہے کہ ہم اللہ پر ایمان لائے ہیں۔ اور جو کچھ اُس نے ہم پر نازل کیا ہے اُس پر ایمان لائے ہیں۔ نیز جو کچھ ابراہیم، اسمٰعیل، اسحٰق، یعقوب، اور اولادِ یعقوب پر نازل ہوا ہے، اُن سب پر ایمان رکھتے ہیں اسی طرح جو کچھ موسیٰ اور عیسیٰ کو اور دنیا کے تمام نبیوں کو اُن کے پروردگار سے دیا گیا ہے، سب پر ہمارا ایمان ہے۔ ہم ان میں سے کسی ایک کو بھی دوسرے سے جُدا نہیں کرتے (کہ اُسے نہ مانیں، دوسروں کو مانیں) اور ہم اللہ کے فرمانبردار ہیں (اُس کی سچائی جہاں کہیں بھی اور جس کسی کی زبانی بھی آئی ہو، اُس پر ہمارا ایمان ہے)

تفریق بین الرسل

قرآن نے اس آیت میں اور نیز متعدد موقعوں پر "تفریق بین الرسل" کو ایک بہت بڑی گمراہی قرار دیا ہے، اور سچائی کی راہ یہ بتلائی ہے کہ "تفریق بین الرسل" سے انکار کیا جائے۔ "تفریق بین الرسل" کے معنی یہ ہیں کہ خدا کے رسولوں میں باعتبارِ تصدیق، تفرقہ و امتیاز کرنا یعنی ایسا سمجھنا کہ ان میں سے فلاں سچا تھا، فلاں سچا نہ تھا۔ یا کسی ایک کی تصدیق کرنی، باقی سب سے انکار کر دینا۔ یا سب کی تصدیق کرنی، کسی ایک سے انکار کر دینا۔ قرآن کہتا ہے، ہر راست باز انسان کا جو خدا کے سچے دین پر چلنا چاہتا ہے، فرض ہے کہ بلا کسی امتیاز کے تمام رسولوں، تمام کتابوں، تمام مذہبی دعوتوں پر ایمان لائے، اور کسی ایک کا بھی انکار نہ کرے۔ اُس کا شیوہ یہ ہونا چاہیے کہ وہ کہے، سچائی جہاں کہیں بھی ظاہر ہوئی ہے، اور جس کسی کی زبان پر بھی ظاہر ہوئی ہے، سچائی ہے، اور میرا اُس پر ایمان ہے:

اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ۭ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰۗىِٕكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ ۣ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ ۣ وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ڭ غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ ۝ (۲: ۲۸۵)

اللہ کا رسول اُس (کلامِ حق) پر ایمان رکھتا ہے جو اُس کے پروردگار کی طرف سے اُس پر نازل ہوا ہے، اور وہ لوگ بھی جو ایمان لائے ہیں۔ یہ سب اللہ پر، اس کے ملائکہ پر، اُس کی کتابوں پر، اُس کے رسولوں پر (ایمان) رکھتے ہیں۔ (ان کے ایمان کا دستور العمل یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں) ہم اللہ کے رسولوں میں سے کسی کو دوسرے سے جُدا نہیں کرتے (کہ کسی کو مانیں، کسی کو نہ مانیں) اُنہوں نے کہا، خدایا! ہم نے تیرا پیام سُنا اور تیری فرمانبرداری کی۔ ہمیں تیری مغفرت نصیب ہو۔ ہم سب کو بالآخر تیری ہی طرف لوٹنا ہے!

وہ کہتا ہے، خدا ایک ہے، اُس کی سچائی ایک ہے، لیکن سچائی کا پیغام بہت سی زبانوں نے پہنچایا ہے

پھر اگر تم کسی ایک پیغامبر کی تصدیق کرتے ہو۔ دوسروں کا انکار کردیتے ہو، تو اُس کے معنی یہ ہوئے کہ ایک ہی حقیقت کو ایک جگہ مان لیتے ہو، دوسری جگہ ٹھکرا دیتے ہو۔ یا ایک ہی بات کو ملنتے بھی ہو، رد بھی کرتے ہو۔ ظاہر ہے، کہ ایسا ماننا، ماننا نہیں ہے، بلکہ ایک زیادہ بُری قسم کا انکار ہے!

خدا کی سچائی اُس کی عالمگیر بخشش ہے

وہ کہتا ہے، خُدا کی سچائی، اُس کی ساری باتوں کی طرح، اُس کی عالمگیر بخشش ہے۔ وہ نہ تو کسی خاص زمانہ سے وابستہ کی جا سکتی ہے، نہ کسی خاص نسل و قوم سے اور نہ کسی خاص مذہبی گروہ بندی سے۔ تم نے اپنے لیے طرح طرح کی قومیتیں اور جغرافیائی اور نسلی حد بندیاں بنالی ہیں، لیکن تم خدا کی سچائی کے لیے کوئی ایسا امتیاز نہیں گھڑ سکتے۔ اُس کی نہ تو کوئی قومیت ہے، نہ نسل ہے۔ نہ جغرافیائی حد بندی ہے، نہ جماعتی حلقہ بندی۔ وہ خدا کے سورج کی طرح ہر جگہ چمکتی اور نوع انسانی کے ہر فرد کو روشنی بخشتی ہے۔ اگر تم خدا کی سچائی کی ڈھونڈھ میں ہو، تو اُسے کسی ایک ہی گوشہ میں نہ ڈھونڈھو۔ وہ ہر جگہ نمودار ہوئی ہے، اور ہر عہد میں اپنا ظہور رکھتی ہے۔ تمہیں زمانوں کا، قوموں کا، وطنوں کا، زبانوں کا، اور طرح طرح کی گروہ بندیوں کا پرستار نہیں ہونا چاہیے۔ صرف خدا کا اور اُس کی عالمگیر سچائی کا پرستار ہونا چاہیے۔ اُس کی سچائی جہاں کہیں بھی آئی ہو اور جس بھیس میں بھی آئی ہو تمہاری متاع ہے اور تم اُس کے وارث ہو۔

راہیں صرف دو ہیں: ایمان کی یہ کہ سب کو مانو۔ انکار کی یہ ہے کہ سب کا یا کسی ایک کا انکار کردو:

چنانچہ اُس نے جابجا "تفریق بین الرسل" کی راہ کو انکار کی راہ قرار دیا ہے، اور ایمان کی راہ یہ بتلائی ہے کہ بلا تفریق سب کی تصدیق کی جائے۔ وہ کہتا ہے، یہاں راہیں صرف دو ہی ہیں تیسری نہیں ہوسکتی۔ ایمان کی راہ یہ ہے کہ سب کو مانو۔ انکار کی راہ یہ ہے کہ سب کا یا کسی ایک کا انکار کرو۔ یہاں کسی ایک کا انکار بھی وہی حکم رکھتا ہے جو سب کے انکار کا ہے:

اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَيُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّفَرِّقُوْا بَيْنَ اللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَيَقُوْلُوْنَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّنَكْفُرُ بِبَعْضٍ ۙ وَّيُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَّخِذُوْا بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا ۙ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ حَقًّا ۚ وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا ۔ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَلَمْ يُفَرِّقُوْا بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ	جو لوگ اللہ اور اُس کے پیغمبروں سے برگشتہ ہیں، اور چاہتے ہیں، اللہ اور اُس کے رسولوں میں تفرقہ کریں (یعنی کسی کو خدا کا رسول مانیں کسی کو نہ مانیں) اور کہتے ہیں، ان میں سے بعض کو ہم مانتے ہیں، بعض کا انکار کرتے ہیں، اور پھر اس طرح چاہتے ہیں، کفر اور ایمان کے درمیان کوئی تیسرا راستہ اختیار کرلیں، تو یقین کرو، یہی لوگ ہیں کہ ان کے کفر میں کوئی شبہ نہیں۔ اور جن لوگوں کی راہ کفر کی راہ ہو، تو اُن کے لیے رُسوا کن عذاب تیار ہے لیکن ہاں، جو لوگ اللہ اور اُس کے تمام پیغمبروں پر ایمان لائے اور کسی ایک پیغمبر کو بھی دوسروں سے جُدا نہیں کیا (یعنی کسی ایک کی سچائی سے

أُولَٰئِكَ سَوْفَ يُؤْتِيهِمْ أُجُورَهُمْ ۗ وَكَانَ اللَّهُ غَفُورًا رَّحِيمًا ۝ (۴ : ۱۴۹)

بھی انکار نہیں کیا) تو بلاشبہ یہی لوگ ہیں جنہیں عنقریب اللہ ان کے اجر عطا فرمائے گا، اور وہ بڑا ہی بخشنے والا مہربان ہے!

سورۂ بقرہ میں جو سورۂ فاتحہ کے بعد قرآن کی پہلی سورۃ ہے۔ سچے مومنوں کی راہ یہ تبلائی ہے:

وَالَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِمَا أُنزِلَ إِلَيْكَ وَمَا أُنزِلَ مِن قَبْلِكَ وَبِالْآخِرَةِ هُمْ يُوقِنُونَ ۝ أُولَٰئِكَ عَلَىٰ هُدًى مِّن رَّبِّهِمْ ۖ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ۝ (۲ : ۴ : ۵)

اور وہ لوگ جو اس سچائی پر ایمان لائے جو پیغمبر اسلام پر نازل ہوئی ہے اور ان تمام سچائیوں پر جو اُن سے پہلے نازل ہو چکی ہیں، اور نیز آخرت کی زندگی پر بھی یقین رکھتے ہیں۔ سو یہی لوگ ہیں جو اپنے پروردگار کی ٹھہرائی ہوئی ہدایت پر ہیں، اور یہی ہیں جنہوں نے فلاح پائی۔

جب سب ایک ہی خدا کے پرستار ہیں، اور سب کو اپنے اپنے عمل کے مطابق نتیجہ ملنا ہے، تو پھر دین کے نام پر نزاع کیوں ہو؟

وہ کہتا ہے، اگر تمہیں اس بات سے انکار نہیں کہ تمام کارخانۂ ہستی کا خالق ایک ہی خالق ہے، اور اُسی کی پروردگاری یکساں طور پر ہر مخلوق کو پرورش کر رہی ہے، تو پھر تمہیں اس بات سے کیوں انکار ہو کہ اس کی روحانی سچائی کا قانون بھی ایک ہی ہے، اور ایک ہی طرح پر تمام نوعِ انسانی کو دیا گیا ہے؟ وہ کہتا ہے، تم سب کا پروردگار ایک ہے، تم سب ایک ہی خدا کے نام لیوا ہو، تم سب کے رہنماؤں نے تمہیں ایک ہی راہ دکھلائی ہے پھر یہ کیسی گمراہی کی انتہا اور عقل کی موت ہے کہ رشتہ ایک ہے، مقصد ایک ہے، راہ ایک ہے، لیکن ہر گروہ دوسرے گروہ کا دشمن ہے، اور ہر انسان دوسرے انسان سے متنفر۔ اور پھر یہ تمام جنگ و نزاع کس کے نام پر کی جا رہی ہے؟ اُسی خدا کے نام پر، اور اُسی خدا کے دین کے نام پر، جس نے سب کو ایک ہی چوکھٹ پر جھکایا تھا، اور سب کو ایک ہی رشتۂ اخوت میں جکڑ دیا تھا؟

قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ هَلْ تَنقِمُونَ مِنَّا إِلَّا أَنْ آمَنَّا بِاللَّهِ وَمَا أُنزِلَ إِلَيْنَا وَمَا أُنزِلَ مِن قَبْلُ وَأَنَّ أَكْثَرَكُمْ فَاسِقُونَ ۝ (۵ : ۵۹)

ان لوگوں سے کہو کہ اے اہلِ کتاب! تم جو ہماری مخالفت میں کمربستہ ہو گئے ہو، تو بتاؤ اس کے سوا ہمارا جرم کیا ہے کہ ہم اللہ پر ایمان لائے ہیں، اور جو کچھ ہم پر نازل ہوا ہے اور جو کچھ ہم سے پہلے نازل ہو چکا ہے، سب پر ایمان رکھتے ہیں؟ پھر کیا خدا پرستی اور خدا کے تمام رسولوں کی تصدیق تمہارے نزدیک جرم اور عیب ہے؟ افسوس تم پر! تم میں اکثر ایسے ہی ہیں جو راہِ حق سے یکسر برگشتہ ہیں!

وَإِنَّ اللَّهَ رَبِّي وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوهُ ۚ هَٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيمٌ ۝ (۱۹ : ۳۶)

دیکھو، خدا تو میرا اور تمہارا، دونوں کا پروردگار ہے، پس اُسی کی بندگی کرو۔ یہی دین کی سیدھی راہ ہے!

قُلْ أَتُحَاجُّونَنَا فِي اللَّهِ وَهُوَ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ وَلَنَا أَعْمَالُنَا وَلَكُمْ

(اے پیغمبر ان سے) کہو، کیا تم خدا کے بارے میں ہم سے جھگڑا کرتے ہو، حالانکہ ہمارا اور تمہارا، دونوں کا پروردگار وہی ہے۔ اور ہمارے لیے ہمارے اعمال ہیں۔ تمہارے لیے

اَعْمَالُكُمْ وَنَحْنُ لَهٗ مُخْلِصُوْنَ ۝ (۲: ۱۳۹) تمہارے اعمال (یعنی ہر انسان کو اُس کے عمل کے مطابق نتیجہ ملتا ہے۔ پھر اس بارے میں جھگڑا کیوں ہو؟)

یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ قرآن میں جہاں کہیں اس طرح کے مخاطبات ہیں، جیسا کہ آیاتِ مندرجۂ صدر میں ہے: اِنَّ اللّٰہَ رَبِّیْ وَرَبُّکُمْ۔ اللہ ہمارا اور تمہارا دونوں کا پروردگار ہے۔ یا اِلٰھُنَا وَاِلٰھُکُمْ وَاحِدٌ "ہمارا اور تمہارا، دونوں کا خدا ایک ہی ہے" یا اَتُحَآجُّوْنَنَا فِی اللّٰہِ وَھُوَ رَبُّنَا وَرَبُّکُمْ وَلَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَکُمْ اَعْمَالُکُمْ "کیا تم خدا کے بارے میں ہم سے جھگڑا کرتے ہو حالانکہ وہ ہمارا اور تمہارا دونوں کا پروردگار ہے، اور ہمارے لیے ہمارے عمل ہیں تمہارے لیے تمہارے" تو ان تمام مخاطبات سے مقصود اسی حقیقت پر زور دینا ہے۔ یعنی جب سب کا پروردگار ایک ہے اور ہر انسان کے لیے ویسا ہی نتیجہ ہے جیسا اُس کا عمل ہے، تو پھر خدا اور مذہب کے نام پر یہ عالمگیر جنگ و جدال کیوں برپا ہے؟ وہ بار بار کہتا ہے۔ میری تعلیم اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ خدا پرستی اور نیک عملی کی طرف بلاتا ہوں۔ میں کسی مذہب کو نہیں جھٹلاتا، میں کسی رہنما سے انکار نہیں کرتا۔ "سب کی یکساں تصدیق" اور "سب کی مشترکہ اور متفقہ تعلیم" میرا دستور العمل ہے۔ پھر میرے خلاف تمام پیروانِ مذاہب نے کیوں اعلانِ جنگ کر دیا ہے؟

قرآن کا پیروانِ مذاہب سے مطالبہ

اور یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں، اُس نے کسی مذہب کے پیرو سے بھی یہ مطالبہ نہیں کیا کہ وہ کوئی نیا دین قبول کر لے، بلکہ ہر گروہ سے یہی مطالبہ کرتا ہے کہ اپنے اپنے مذہب کی حقیقی تعلیم پر جسے تم نے طرح طرح کی تحریفوں اور اضافوں سے مسخ کر دیا ہے، سچائی کے ساتھ کاربند ہو جاؤ۔ وہ کہتا ہے، اگر تم نے ایسا کر لیا، تو میرا کام پورا ہو گیا، کیونکہ جونہی تم اپنے مذہب کی حقیقی تعلیم کی طرف لوٹو گے، تمہارے سامنے وہی حقیقت آموجود ہو گی، جس کی طرف میں تمہیں بلا رہا ہوں۔ میرا پیام کوئی نیا پیام نہیں ہے، وہی قدیم اور عالمگیر پیام ہے جو تمام بانیانِ مذاہب دے چکے ہیں:

قُلْ یٰٓاَھْلَ الْکِتٰبِ لَسْتُمْ عَلٰی شَیْءٍ حَتّٰی تُقِیْمُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِیْلَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَیْکُمْ مِّنْ رَّبِّکُمْ ۭ وَلَیَزِیْدَنَّ کَثِیْرًا مِّنْھُمْ مَّآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ مِنْ رَّبِّکَ طُغْیَانًا وَّکُفْرًا ۚ فَلَا تَاْسَ عَلَی الْقَوْمِ الْکٰفِرِیْنَ ۝ اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِیْنَ ھَادُوْا وَالصّٰبِئُوْنَ وَالنَّصٰرٰی مَنْ اٰمَنَ

اے اہل کتاب! جب تک تم تورات اور انجیل کی، اور اُن تمام صحیفوں کی جو تم پر نازل ہوئے ہیں، حقیقت قائم نہ کرو، اُس وقت تک تمہارے پاس دین میں سے کچھ بھی نہیں ہے اور (اے پیغمبر!) تمہارے پروردگار کی طرف سے جو کچھ تم پر نازل ہوا ہے (بجائے اس کے کہ یہ لوگ اُس سے ہدایت حاصل کریں) تم دیکھو گے کہ ان میں سے بہتوں کا کفر و طغیان اُس کی وجہ سے اور زیادہ بڑھ جائیگا۔ تو جن لوگوں نے انکارِ حق کی راہ اختیار کر لی ہے تم اُن کی حالت پر بیکار کو غم نہ کھاؤ۔

جو لوگ تم پر ایمان لاتے ہیں، جو یہودی ہیں، جو صابی ہیں جو نصاریٰ ہیں، (یہ ہوں،

بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝

یا کوئی ہو) جو کوئی بھی اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان لایا اور اس کے عمل بھی نیک ہوئے تو اُس کے لیے نہ تو کسی طرح کا خوف ہے، نہ کسی طرح کی غمگینی

یہی وجہ ہے کہ قرآن نے اُن راست باز انسانوں کے ایمان و عمل کا پوری فراخ دلی کے ساتھ اعتراف کیا ہے جو نزولِ قرآن کے وقت مختلف مذاہب میں موجود تھے، اور جنہوں نے اپنے مذہبوں کی حقیقی روح ضائع نہیں کی تھی۔ البتہ وہ کہتا ہے، ایسے لوگوں کی تعداد بہت ہی کم ہے۔ غالب تعداد انہی لوگوں کی ہے جنہوں نے دینِ الٰہی کی اعتقادی اور عملی حقیقت یک قلم ضائع کر دی ہے:

لَيْسُوْا سَوَآءً ۭ مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اُمَّةٌ قَاۗىِٕمَةٌ يَّتْلُوْنَ اٰيٰتِ اللّٰهِ اٰنَاۗءَ الَّيْلِ وَھُمْ يَسْجُدُوْنَ ۝ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُسَارِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝ وَمَا يَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلَنْ يُّكْفَرُوْهُ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالْمُتَّقِيْنَ ۝ (۳ : ۱۱۳-۱۱۵)

یہ بات نہیں ہے کہ سب ایک ہی طرح کے ہوں۔ انہی اہلِ کتاب میں ایسے لوگ بھی ہیں کہ اصل دین پر قائم ہیں۔ وہ راتوں کو اُٹھ اُٹھ کر اللہ کے کلام کی تلاوت کرتے ہیں اور ان کے سر اس کے سامنے جھکے ہوتے ہیں! اور وہ اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتے ہیں، نیکی کا حکم دیتے ہیں، بُرائی سے روکتے ہیں نیکی کی راہوں میں تیز گام ہیں اور بلاشبہ یہی لوگ ہیں جو نیک انسانوں میں سے ہیں۔ اور (یاد رکھو) یہ لوگ جو کچھ بھی نیکی کرتے ہیں، تو ہرگز ایسا نہیں ہوگا کہ اس کی قدر نہ کی جائے۔ وہ جانتا ہے کہ (کس گروہ میں) کون پرہیزگار ہے۔

مِنْهُمْ اُمَّةٌ مُّقْتَصِدَةٌ ۭ وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ سَاۗءَ مَا يَعْمَلُوْنَ ۝ (۵ : ۶۶)

ان میں ایک گروہ ایسے لوگوں کا بھی ہے جو میانہ رو ہیں، لیکن بڑی تعداد ایسے لوگوں کی ہے کہ جو کچھ کرتے ہیں، بُرا ہی کرتے ہیں:

یہ جو قرآن جابجا اس بات پر زور دیتا ہے کہ وہ پچھلی آسمانی کتابوں کی تصدیق کرنے والا ہے، جھٹلانے والا نہیں، اور اہلِ کتاب سے بار بار کہتا ہے: وَاٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ (۲ : ۳۸) اُس کتاب پر ایمان لاؤ جو تمہاری کتاب کی تصدیق کرتی ہوئی نمایاں ہوئی ہے، تو اس سے مقصود بھی اسی حقیقت پر زور دینا ہے۔ یعنی جب میری تعلیم تمہارے مقدس نوشتوں کے خلاف کوئی نیا دین نہیں پیش کرتی، اور نہ اُن سے تمہیں منحرف کرانا چاہتی ہے، بلکہ سر تا سر مصدِّق اور مؤیّد ہے، تو پھر تم میں اور مجھ میں نزاع کیوں ہے؟ کیوں تم میرے خلاف اعلانِ جنگ کر دو؟

اصطلاحِ قرآنی میں المعروف اور المنکر

اور پھر یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں، اُس نے نیکی کے لیے "معروف" کا اور بُرائی کے لیے "منکر" کا لفظ اختیار کیا ہے۔ وَاْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ (۳۱ : ۱۷) معروف "عرف" سے ہے، جس کے معنی پہچاننے کے ہیں۔ پس "معروف" وہ بات ہوئی جو جانی پہچانی بات ہو۔ "منکر" کے معنی انکار کرنے کے ہیں۔ یعنی ایسی بات جس سے عام طور پر انکار کیا گیا ہو۔ پس قرآن نے نیکی اور بُرائی کے لیے یہ الفاظ اس لیے اختیار کیے کہ وہ کہتا ہے،

دنیا میں عقائد و افکار کا کتنا ہی اختلاف کیوں نہ ہو، لیکن کچھ باتیں ایسی ہیں جن کے اچھے ہونے پر سب کا اتفاق ہے، اور کچھ باتیں ایسی ہیں، جن کے بُرے ہونے پر سب متفق ہیں۔ مثلاً اس بات میں سب کا اتفاق ہے کہ سچ بولنا اچھا ہے۔ جھوٹ بولنا بُرا ہے۔ اس میں سب کا اتفاق ہے کہ دیانتداری اچھی بات ہے۔ بددیانتی بُرائی ہے۔ اس میں کسی کو اختلاف نہیں کہ ماں باپ کی خدمت، ہمسایہ سے سلوک، مسکینوں کی خبرگیری، مظلوم کی دادرسی، انسان کے اچھے اعمال ہیں، اور ظلم اور بدسلوکی بُرے اعمال ہیں۔ گویا یہ وہ باتیں ہوئیں جن کی اچھائی عام طور پر جانی بوجھی ہوئی ہے، اور جن کے خلاف جانا عام طور پر قابلِ انکار و اعتراض ہے۔ دنیا کے تمام مذاہب، دنیا کے تمام اخلاق، دنیا کی تمام حکمتیں، دنیا کی تمام جماعتیں، دوسری باتوں میں کتنا ہی اختلاف رکھتی ہوں، لیکن جہاں تک اِن اعمال کا تعلق ہے، سب ہم آہنگ و ہم رائے ہیں۔

قرآن کہتا ہے، یہ اعمال جن کی اچھائی عام طور پر نوعِ انسانی نے جانی بوجھی ہوئی ہے، دینِ الٰہی کے مطلوبہ اعمال ہیں۔ اسی طرح وہ اعمال جن سے عام طور پر انکار کیا گیا ہے، اور جن کی بُرائی پر تمام مذاہب متفق ہیں، دینِ الٰہی کے ممنوعہ اعمال ہیں۔ یہ بات چونکہ دین کی اصل حقیقت تھی، اس لیے اس میں اختلاف نہ ہو سکا، اور مذہبی گروہوں کی بے شمار گمراہیوں اور حقیقت فراموشیوں پر بھی ہمیشہ معلوم و مسلّم رہی۔ ان اعمال کی اچھائی اور بُرائی پر نوعِ انسانی کے تمام عہدوں، تمام مذہبوں، اور تمام قوموں کا عالمگیر اتفاق؛ اُن کی فطری اصلیت پر ایک بہت بڑی دلیل ہے۔ پس جہاں تک اعمال کا تعلق ہے، میں انہی باتوں کے کرنے کا حکم دیتا ہوں، جن کی اچھائی عام طور پر جانی بوجھی ہوئی ہے، اور انہی باتوں سے روکتا ہوں، جن سے عام طور پر نوعِ انسانی نے انکار کیا ہے یعنی میں معروف کا حکم دیتا ہوں منکر سے روکتا ہوں۔ پس جب میری دعوت کا یہ حال ہے، تو پھر کسی انسان کو بھی جسے راست بازی سے اختلاف نہیں، کیوں مجھ سے اختلاف ہو؟

"الدین القیم" اور "فطرتُ اللہ"

وہ کہتا ہے، یہی راہِ عمل، نوعِ انسانی کے لیے خدا کا ٹھہرایا ہوا فطری دین ہے، اور فطرت کے قوانین میں کبھی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ یہی "الدین القیم" ہے یعنی سیدھا اور درست دین جس میں کسی طرح کی کجی اور خامی نہیں۔ یہی "دینِ حنیف" ہے جس کی دعوت حضرت ابراہیمؑ نے دی تھی۔ اسی کا نام میری اصطلاح میں "الاسلام" ہے یعنی خدا کے ٹھہرائے قوانین کی فرمانبرداری:۔

فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ۭ فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ۭ لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ۭ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ ڎ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ مُنِيْبِيْنَ اِلَيْهِ وَ

تم ہر طرف سے منہ پھیر کر الدین کی طرف رُخ کرو، یہی خدا کی بناوٹ ہے جس پر اُس نے انسان کو پیدا کیا ہے۔ اللہ کی بناوٹ میں کبھی تبدیلی نہیں ہو سکتی یہی "الدین القیم" یعنی سیدھا اور سچا دین ہے، لیکن اکثر انسان ایسے ہیں جو نہیں جانتے۔ (دیکھو) اسی (ایک خدا) کی طرف متوجہ رہو۔ اُس کی نافرمانی سے

وَاتَّقُوْهُ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝ مِنَ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَكَانُوْا شِيَعًا ۝ كُلُّ حِزْبٍ ۢ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ ۝ (۳۰: ۳)

بچو، نماز قائم کرو، اور مشرکوں میں سے نہ ہو جاؤ جنہوں نے اپنے دین کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے اور گروہ بندیوں میں بٹ گئے، ہر گروہ کے پاس جو کچھ ہے، وہ اسی میں مگن ہے:

الاسلام

وہ کہتا ہے، خدا کا ٹھہرایا ہوا دین جو کچھ ہے، یہی ہے۔ اس کے سوا جو کچھ بنا لیا گیا ہے، وہ انسانی گروہ بندیوں کی گمراہیاں ہیں۔ پس اگر تم خدا پرستی اور عملِ صالح کی اصل پر جو تم سب کے یہاں اصلِ دین ہے، جمع ہو جاؤ اور خود ساختہ گمراہیوں سے باز آ جاؤ، تو میرا مقصد پورا ہو گیا۔ میں اس سے زیادہ اور کیا چاہتا ہوں؟

اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ ۣ وَمَا اخْتَلَفَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَاۗءَھُمُ الْعِلْمُ بَغْيًۢا بَيْنَھُمْ ۭ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَاِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ۝ فَاِنْ حَاۗجُّوْكَ فَقُلْ اَسْلَمْتُ وَجْهِيَ لِلّٰهِ وَمَنِ اتَّبَعَنِ ۭ وَقُلْ لِّلَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَالْاُمِّيّٖنَ ءَاَسْلَمْتُمْ ۭ فَاِنْ اَسْلَمُوْا فَقَدِ اھْتَدَوْا ۚ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ ۭ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ ۝ (۳: ۱۸)

اللہ کے نزدیک دین ایک ہی ہے، اور وہ الاسلام ہے، اور یہ جو اہل کتاب نے اختلاف کیا (اور ایک دین پر مجتمع رہنے کی جگہ یہودیت اور نصرانیت کی گروہ بندیوں میں بٹ گئے) تو یہ اس لیے ہوا کہ اگرچہ علم و حقیقت کی راہ اُن پر کھل چکی تھی، لیکن آپس کی ضد اور سرکشی سے اختلاف میں پڑ گئے۔ اور (یاد رکھو) جو کوئی اللہ کی آیتوں سے انکار کرتا ہے تو اللہ کا قانونِ مکافات بھی) حساب لینے میں سست رفتار نہیں!

پھر اگر یہ لوگ تم سے اس بارے میں جھگڑا کریں، تو تم کہو، میری اور میرے پیرووں کی راہ تو یہ ہے کہ اللہ کے آگے سرِ اطاعت جھکا دینا، اور ہم نے سر جھکا دیا ہے۔ پھر اہل کتاب سے اور اَن پڑھ لوگوں سے (یعنی مشرکینِ عرب سے) پوچھو، تم بھی اللہ کے آگے جھکتے ہو یا نہیں؟ (یعنی ساری باتیں جھگڑے کی چھوڑ دو، یہ بتلاؤ، تمہیں خدا پرستی منظور ہے یا نہیں؟) اگر وہ جھک گئے تو (سارا جھگڑا ختم ہو گیا اور) اُنہوں نے راہ پالی اگر روگردانی کریں، تو تمہارے ذمہ جو کچھ ہے، وہ پیامِ حق پہنچا دینا ہے، اور اللہ کی نظروں سے بندوں کا حال پوشیدہ نہیں!

اُس نے دین کے لیے الاسلام کا لفظ اسی لیے اختیار کیا ہے کہ "اسلام" کے معنی کسی بات کے مان لینے اور فرماں برداری کرنے کے ہیں۔ وہ کہتا ہے، دین کی حقیقت یہی ہے کہ خدا نے جو قانونِ سعادت انسان کے لیے ٹھہرا دیا ہے، اُس کی ٹھیک ٹھیک اطاعت کی جائے۔ وہ کہتا ہے، یہ کچھ انسان ہی کے لیے نہیں ہے، بلکہ تمام کائناتِ ہستی اسی اصل پر قائم ہے۔ سب کے بقاء و قیام کے لیے خدا نے کوئی نہ کوئی قانونِ عمل ٹھہرا دیا ہے، اور سب اُس کی اطاعت کر رہے ہیں۔ اگر ایک لمحہ کے لیے بھی روگردانی کریں، تو کارخانۂ ہستی درہم برہم ہو جائے:

اَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ يَبْغُوْنَ وَلَهٗٓ اَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ

پھر کیا یہ لوگ چاہتے ہیں، اللہ کا ٹھہرایا ہوا دین چھوڑ کر کوئی دوسرا دین ڈھونڈھ نکالیں؟ حالانکہ آسمان اور زمین میں جو کوئی بھی ہے سب چار و ناچار اُسی کے ٹھہرائے ہوئے

طَوْعًا وَّكَرْهًا وَّاِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ (۸۲:۳) قانون میں سے) آگے جھکے ہوئے ہیں اور بالآخر سب کو اُسی کی طرف لوٹنا ہے:

وہ جب کہتا ہے "الاسلام" کے سوا کوئی دین اللہ کے نزدیک مقبول نہیں، تو اس کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ دینِ حقیقی کے سوا، جو ایک ہی ہے اور تمام رسولوں کی مشترک تعلیم ہے، انسانی ساخت کی کوئی گروہ بندی مقبول نہیں۔ سورہٗ آلِ عمران میں جہاں یہ بات بیان کی ہے کہ دینِ حقیقی کی راہ تمام مذہبی رہنماؤں کی تصدیق اور پیروی کی راہ ہے، وہیں متصلاً یہ بھی کہہ دیا ہے:

وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿۸۵:۳﴾

اور جو کوئی اسلام کے سوا کوئی دوسرا دین چاہے گا، تو یاد رکھو، اُس کی راہ کبھی قبول نہ کی جائے گی، اور وہ آخرت کے دن دیکھے گا کہ تباہ ہونے والوں میں سے ہے:

اور اسی لیے وہ تمام پیروانِ دعوت کو بار بار متنبہ کرتا ہے کہ دین میں تفرقہ اور گروہ بندی سے بچیں، اور اُسی گمراہی میں مبتلا نہ ہو جائیں جس سے قرآن نے نجات دلائی ہے۔ وہ کہتا ہے میری دعوت نے تمام انسانوں کو جو مذہب کے نام پر ایک دوسرے کے دشمن ہو رہے تھے، خدا پرستی کی راہ میں اس طرح جوڑ دیا، کہ ایک دوسرے کے جان نثار بھائی بن گئے۔ ایک یہودی جو پہلے حضرت مسیحؑ کا نام سنتے ہی نفرت سے بھر جاتا تھا؛ ایک عیسائی جو ہر یہودی کے خون کا پیاسا تھا؛ ایک مجوسی جس کے نزدیک تمام غیر مجوسی ناپاک تھے، ایک عرب جو اپنے سوا سب کو انسانی شرف و محاسن سے تہی دست سمجھتا تھا ایک صابی جو یقین کرتا تھا کہ دنیا کی قدیم سچائی صرف اُسی کے حصے میں آئی ہے؛ ان سب کو دعوتِ قرآنی نے ایک صف میں کھڑا کر دیا ہے، اور اب یہ سب ایک دوسرے سے نفرت کرنے کی جگہ، ایک دوسرے کے مذہبی رہنماؤں کی تصدیق کرتے، اور سب کی بتلائی ہوئی متفقہ راہِ ہدایت پر گامزن ہیں:

وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا ۠ وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَاۗءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا ۚ وَكُنْتُمْ عَلٰي شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْھَا ۭ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَھْتَدُوْنَ ﴿۱۰۳:۳﴾

اور (دیکھو) سب مل جل کر اللہ کی رسی مضبوط پکڑ لو، اور جُدا جُدا نہ ہو؛ اللہ نے تم پر جو فضل و کرم کیا ہے، اُسے یاد کرو۔ تمہارا حال یہ تھا کہ ایک دوسرے کے دشمن ہو رہے تھے۔ پھر اللہ نے تمہارے دلوں میں باہم دگر الفت پیدا کر دی۔ پھر ایسا ہوا کہ انعامِ الٰہی سے بھائی بھائی ہو گئے۔ اور (دیکھو) تمہارا حال یہ تھا، گویا آگ سے بھرا ہوا گڑھا ہے اور اس کے کنارے کھڑے ہو، لیکن اللہ نے تمہیں بچا لیا۔ اللہ اسی طرح اپنی کارفرمائیوں کی نشانیاں تم پر واضح کرتا ہے، تاکہ ہدایت پاؤ:

وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ تَفَرَّقُوْا وَاخْتَلَفُوْا

اور (دیکھو) اُن لوگوں کی سی چال اختیار نہ کر لینا جو ایک دین پر قائم رہتے

مِنْ بَعْدِ مَا جَاۤءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۙ (۳: ۱۰۵)

کی جگہ جُدا جُدا ہو گئے اور اختلافات میں پڑ گئے، باوجودیکہ روشن دلیلیں اُن کے سامنے آچکی تھیں (یاد رکھو) یہی لوگ ہیں جن کے لیے (کامیابی و فلاح کی جگہ) بڑا (بھاری) عذاب ہے۔

وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ ۚ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ ۭ ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ (۶: ۱۵۵)

اور (دیکھو) یہ میری راہ ہے، بالکل سیدھی راہ۔ پس اسی ایک راہ پر چلو، طرح طرح کی راہوں کے پیچھے نہ پڑ جاؤ کہ وہ تمہیں خدا کی راہ سے ہٹا کر جُدا جُدا کر دیں گی۔ یہی بات ہے جس کا خدا تمہیں حکم دیتا ہے تاکہ تم (نافرمانی سے) بچو۔

قرآن اور اُس کے مخالفوں میں بنائِ نزاع

اب چند لمحوں کے لیے اُس نزاع پر غور کرو جو قرآن اور اُس کے مخالفوں میں پیدا ہو گئی تھی۔ یہ مخالف کون تھے؟ پچھلے مذاہب کے پیرو تھے۔ جن میں سے بعض کے پاس کتاب تھی، بعض کے پاس نہ تھی۔

اچھا، بنائِ نزاع کیا تھی؟

کیا یہ تھی کہ قرآن نے اُن کے بانیوں اور رہنماؤں کو جھٹلایا تھا، یا اُن کی مقدس کتابوں سے انکار کیا تھا؟ اور اس لیے وہ اس کی مخالفت میں کمربستہ ہو گئے تھے؟

کیا یہ تھی کہ اُس نے دعویٰ کیا تھا، خدا کی سچائی صرف میرے ہی حصہ میں آئی ہے، اور تمام پیروانِ مذاہب کو چاہیے، اپنے اپنے نبیوں سے برگشتہ ہو جائیں؟

یا پھر اُس نے دین کے نام سے کوئی ایسی بات پیش کر دی تھی جو پیروانِ مذاہب کے لیے بالکل نئی بات تھی، اور اس لیے قدرتی طور پر اُنہیں ماننے میں تامل تھا؟

قرآن کے صفحے کھلے ہوئے ہیں، اور اُس کے نزول کی تاریخ بھی دنیا کے سامنے ہے۔ یہ دونوں ہمیں بتلاتے ہیں کہ اِن تمام باتوں میں سے کوئی بات بھی نہ تھی، اور نہ ہو سکتی تھی۔ اُس نے نہ صرف اُن تمام رہنماؤں کی تصدیق کی جن کے نام لیوا اُس کے سامنے تھے، بلکہ صاف صاف لفظوں میں کہہ دیا، مجھ سے پہلے جتنے بھی پیغمبر آچکے ہیں، میں سب کی تصدیق کرتا ہوں، اور اُن میں سے کسی ایک کے انکار کو بھی خدا کی سچائی کا انکار سمجھتا ہوں۔ اُس نے کسی مذہب کے ماننے والے سے یہ مطالبہ نہیں کیا کہ وہ اپنے مذہب کی دعوت سے انکار کر دے، بلکہ جب کبھی مطالبہ کیا تو یہی کیا کہ اپنے اپنے مذہبوں کی حقیقی تعلیم پر کاربند ہو جاؤ، کیونکہ تمام مذہبوں کی اصل تعلیم ایک ہی ہے۔ اُس نے نہ تو کوئی نیا اصول پیش کیا، نہ کوئی نیا عمل بتلایا۔ اس نے ہمیشہ اُنہی باتوں پر زور دیا جو دنیا کے تمام

مذاہب کی سب سے زیادہ جانی بوجھی ہوئی باتیں رہی ہیں۔ یعنی ایمان اور عمل صالح۔ اُس نے جب کبھی لوگوں کو اپنی طرف بلایا ہے تو یہی کہا ہے، اپنے اپنے مذہبوں کی حقیقت از سر نو تازہ کرلو، تمہارا ایسا کرنا ہی مجھے قبول کرلینا ہے۔

سوال یہ ہے کہ جب قرآن کی دعوت کا یہ حال تھا، تو پھر آخر اُس میں اور اُس کے مخالفوں میں وجہ نزاع کیا تھی؟ ایک شخص جو کسی کو برا نہیں کہتا۔ سب کو مانتا اور سب کی تعظیم کرتا ہے، اور ہمیشہ اُنہی باتوں کی تلقین کرتا ہے جو سب کے یہاں مانی ہوئی ہیں، کوئی اُس سے لڑے تو کیوں لڑے؟ اور کیوں لوگوں کو اُس کا ساتھ دینے سے انکار ہو؟

کہا جا سکتا ہے کہ قریشِ مکہ کی مخالفت اس بنا پر تھی کہ قرآن نے بُت پرستی سے انکار کر دیا تھا، اور وہ بُت پرستی کے طریقوں سے مالوف ہو چکے تھے، بلاشبہ ایک وجہ نزاع یہ بھی ہے، لیکن صرف یہی وجہ نزاع نہیں ہو سکتی۔ سوال یہ ہے کہ یہودیوں نے کیوں مخالفت کی جو بُت پرستی سے قطعاً کنارہ کش تھے؟ عیسائی کیوں برسرپیکار ہوگئے جنہوں نے کبھی بت پرستی کی حمایت کا دعویٰ نہیں کیا؟

> پیروانِ مذاہب کی مخالفت اس لیے نہ تھی کہ جھٹلاتا کیوں ہے؟ بلکہ اس لیے کہ جھٹلاتا کیوں نہیں؟

اصل یہ ہے کہ پیروانِ مذاہب کی مخالفت اس لیے نہ تھی کہ وہ اُنہیں جھٹلاتا کیوں ہے؟ بلکہ اس لیے تھی کہ جھٹلاتا کیوں نہیں؟ ہر مذہب کا پیرو چاہتا تھا کہ وہ صرف اُسی کو سچا کہے، باقی سب کو جھٹلائے۔ اور چونکہ وہ یکساں طور پر سب کی تصدیق کرتا تھا، اس لیے کوئی بھی اُس سے خوش نہیں ہو سکتا تھا۔ یہودی اس بات سے تو بہت خوش تھے کہ قرآن حضرت موسیٰ کی تصدیق کرتا ہے لیکن وہ صرف اتنا ہی نہیں کرتا تھا۔ وہ حضرت مسیحؑ کی بھی تصدیق کرتا تھا، اور یہیں آکر اُس میں اور یہودیوں میں نزاع شروع ہو جاتی تھی۔ عیسائیوں کو اُس پر کیا اعتراض ہو سکتا تھا کہ حضرت مسیحؑ اور حضرت مریمؑ کی پاکی و صداقت کا اعلان کیا جائے؟ لیکن قرآن صرف اتنا ہی نہیں کرتا تھا۔ وہ یہ بھی کہتا تھا کہ نجات کا دارومدار اعتقاد و عمل پر ہے نہ کہ کفّارہ اور اصطباغ پر، اور قانونِ نجات کی یہ عالمگیر وسعت عیسائی کلیسا کے لیے ناقابلِ برداشت تھی۔

اسی طرح قریشِ مکّہ کے لیے اس سے بڑھ کر کوئی دل خوش صدا نہیں ہو سکتی تھی کہ حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسمٰعیلؑ کی بزرگی کا اعتراف کیا جائے، لیکن جب وہ دیکھتے تھے کہ قرآن جس طرح ان دونوں کی بزرگی کا اعتراف کرتا ہے، اُسی طرح یہودیوں کے پیغمبروں، اور عیسائیوں کے داعی کا بھی معترف ہے، تو اُن کے نسلی اور جماعتی غرور کو ٹھیس لگتی تھی۔ وہ کہتے تھے، ایسے لوگ حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسمٰعیلؑ کے پیرو کیونکر ہو سکتے ہیں، جو اُن کی بزرگی اور صداقت کی صف میں دوسروں کو بھی لا کھڑا کرتے ہیں؟

> تین اصول جو قرآن میں اور اس کے مخالفوں میں بنائے نزاع ہوئے

مختصراً یوں سمجھنا چاہیے کہ قرآن کے تین اصول ایسے تھے، جو اُس میں اور تمام پیروانِ مذاہب

یکر دہ نزاع ہو گئے :

(۱) وہ مذہبی گروہ بندی کی رُوح کا مخالف تھا، اور دین کی وحدت یعنی ایک ہونے کا اعلان کرتا تھا۔ اگر پیروانِ مذاہب یہ مان لیتے، تو انہیں تسلیم کرلینا پڑتا کہ دین کی سچائی کسی ایک ہی گروہ کے حصّے میں نہیں آئی ہے۔ سب کو یکساں طور پر ملی ہے، لیکن یہی ماننا اُن کی گروہ پرستی پر شاق گزرتا تھا؛

(۲) قرآن کہتا تھا، نجات اور سعادت کا دارومدار اعتقاد و عمل پر ہے۔ نسل، قوم، گروہ بندی، اور ظاہری رسم و ریت پر نہیں ہے۔ اگر یہ اصل وہ تسلیم کرلیتے، تو پھر نجات کا دروازہ بلا امتیاز، تمام نوعِ انسانی پر کھل جاتا، اور کسی ایک مذہبی حلقہ کی ٹھیکیداری باقی نہ رہتی، لیکن اس بات کے لیے اُن میں سے کوئی بھی تیار نہ تھا۔

(۳) وہ کہتا تھا، اصل دین خدا پرستی ہے، اور خدا پرستی یہ ہے کہ ایک خدا کی براہِ راست پرستش کی جائے لیکن پیروانِ مذاہب نے کسی نہ کسی شکل میں شرک و بُت پرستی کے طریقے اختیار کر لیے تھے۔ اور گو انہیں اس بات سے انکار نہ تھا کہ اصل دین خدا پرستی ہی ہے، لیکن یہ بات شاق گزرتی تھی کہ اپنے مالوف و معتاد طریقوں سے دست بردار ہو جائیں۔

خلاصۂ بحث

متذکرۂ صدر تفصیلات کا ماحصل حسبِ ذیل دفعات میں بیان کیا جا سکتا ہے :

(۱) نزولِ قرآن کے وقت دنیا کا مذہبی تخیّل اس سے زیادہ وسعت نہیں رکھتا تھا کہ نسلوں، خاندانوں، اور قبیلوں کی معاشرتی حد بندیوں کی طرح، مذہب کی بھی ایک خاص گروہ بندی کر لی گئی تھی۔ ہر گروہ بندی کا آدمی سمجھتا تھا: دین کی سچائی صرف اُسی کے حصّہ میں آئی ہے۔ جو انسان اُس کی مذہبی حد بندی میں داخل ہے، نجات یافتہ ہے، جو داخل نہیں ہے، نجات سے محروم ہے۔

(۲) ہر گروہ کے نزدیک مذہب کی اصل و حقیقت محض اُس کے ظاہری اعمال و رسوم تھے۔ جونہی ایک انسان انہیں اختیار کر لیتا، یقین کیا جاتا کہ نجات و سعادت اُسے حاصل ہو گئی۔ مثلاً عبادت کی شکل، قربانیوں کے رسوم، کسی خاص طعام کا کھانا یا نہ کھانا، کسی خاص وضع و قطع کا اختیار کرنا یا نہ کرنا۔

(۳) چونکہ یہ اعمال و رسوم ہر مذہب میں الگ الگ تھے، اور ہر گروہ کے اجتماعی مقتضیات یکساں نہیں ہو سکتے تھے، اس لیے ہر مذہب کا پیرو یقین کرتا تھا کہ دوسرا مذہب مذہبی صداقت سے خالی ہے۔ کیونکہ اُس کے اعمال و رسوم ویسے نہیں ہیں، جیسے خود اُس نے اختیار کر رکھے ہیں۔

(۴) ہر مذہبی گروہ کا دعویٰ صرف یہی نہ تھا کہ وہ سچا ہے، بلکہ یہ بھی تھا کہ دوسرا جھوٹا ہے۔ نتیجہ یہ تھا کہ ہر گروہ صرف

اتنے ہی پر قانع نہیں رہتا کہ اپنی سچائی کا اعلان کرے، بلکہ یہ بھی ضروری سمجھتا کہ دوسروں کے خلاف تعصب و نفرت پھیلائے۔ اس صورتِ حال نے نوعِ انسانی کو ایک دائمی جنگ و جدال کی حالت میں مبتلا کر دیا تھا۔ مذہب اور خدا کے نام پر ہر گروہ دوسرے گروہ سے نفرت کرتا اور اُس کا خون بہانا جائز سمجھتا۔

(۵) لیکن قرآن نے نوعِ انسانی کے سامنے مذہب کی عالمگیر سچائی کا اصول پیش کیا:

ا۔ اُس نے صرف یہی نہیں بتایا کہ ہر مذہب میں سچائی ہے، بلکہ صاف صاف کہہ دیا کہ تمام مذاہب سچے ہیں۔ اُس نے کہا، دین خدا کی عام بخشش ہے، اس لیے ممکن نہیں کہ کسی ایک جماعت ہی کو دیا گیا ہو۔ دوسروں کا اس میں کوئی حصہ نہ ہو۔

ب۔ اُس نے کہا، خدا کے تمام قوانینِ فطرت کی طرح انسان کی روحانی سعادت کا قانون بھی ایک ہی ہے، اور سب کے لیے ہے۔ پس پیروانِ مذہب کی سب سے بڑی گمراہی یہ ہے کہ اُنہوں نے دینِ الٰہی کی وحدت فراموش کر کے الگ الگ گروہ بندیاں کر لی ہیں، اور ہر گروہ بندی دوسری گروہ بندی سے لڑ رہی ہے۔

ج۔ اُس نے بتایا کہ خدا کا دین اس لیے تھا کہ نوعِ انسانی کا تفرقہ اور اختلاف دور ہو۔ اس لیے نہ تھا کہ تفرقہ و نزاع کی علت بن جائے۔ پس اس سے بڑھ کر گمراہی اور کیا ہو سکتی ہے کہ جو چیز تفرقہ دُور کرنے کے لیے آئی تھی، اُسی کو تفرقہ کی بنیاد بنا لیا ہے؟

د۔ اُس نے بتایا کہ ایک چیز دین ہے۔ ایک شرع و منہاج ہے۔ دین ایک ہی ہے، اور ایک ہی طرح پر سب کو دیا گیا ہے۔ البتّہ شرع و منہاج میں اختلاف ہوا، اور یہ اختلاف ناگزیر تھا۔ کیونکہ ہر عہد اور ہر قوم کی حالت یکساں نہ تھی، اور ضروری تھا کہ جیسی جس کی حالت ہو، ویسے ہی احکام و اعمال بھی اُس کے لیے اختیار کیے جائیں۔ پس شرع و منہاج کے اختلاف سے اصل دین مختلف نہیں ہو جا سکتے۔ تم نے دین کی حقیقت تو فراموش کر دی ہے محض شرع و منہاج کے اختلاف پر ایک دوسرے کو جھٹلا رہے ہو۔

ہ۔ اُس نے بتلایا کہ تمہاری مذہبی گروہ بندیوں اور اُن کے ظواہر و رسوم کو انسانی نجات و سعادت میں کوئی دخل نہیں۔ یہ گروہ بندیاں تمہاری بنائی ہوئی ہیں۔ ورنہ خدا کا ٹھہرایا ہوا دین تو ایک ہی ہے۔ وہ دینِ حقیقی کیا ہے؟ وہ کہتا ہے، ایمان اور عملِ صالح کا قانون۔

و۔ اُس نے صاف صاف لفظوں میں اعلان کر دیا کہ اُس کی دعوت کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ تمام مذاہب سچے ہیں، لیکن پیروانِ مذاہب سچائی سے منحرف ہو گئے ہیں۔

اگر وہ اپنی فراموش کردہ سچائی از سرِ نو اختیار کر لیں، تو میرا کام پورا ہو گیا، اور اُنہوں نے مجھے قبول کر لیا۔ تمام مذاہب کی یہی مشترک اور متفقہ سچائی ہے جسے وہ "الدِّین" اور "الاسلام" کے نام سے پکارتا ہے۔

ذ۔ وہ کہتا ہے، خدا کا دین اس لیے نہیں ہے کہ ایک انسان دوسرے انسان سے نفرت کرے، بلکہ اس لیے ہے کہ ہر انسان دوسرے انسان سے محبت کرے، اور سب ایک ہی پروردگار کے رشتۂ عبودیت میں بندھ کر ایک ہو جائیں۔ وہ کہتا ہے، جب سب کا پروردگار ایک ہے، جب سب کا مقصود اُسی کی بندگی ہے، جب ہر انسان کے لیے وہی ہونا ہے، جیسا کچھ اُس کا عمل ہے، تو پھر خدا اور مذہب کے نام پر یہ تمام جنگ و نزاع کیوں ہے؟

(۶) مذاہبِ عالم کا اختلاف صرف اختلاف ہی کی حد تک نہیں رہا ہے، بلکہ باہمی نفرت و مخاصمت کا ذریعہ بن گیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ مخاصمت کیونکر دُور ہو؟ یہ تو ہو نہیں سکتا کہ تمام پیروانِ مذاہب اپنے دعوے میں سچے مان لیے جائیں، کیونکہ ہر مذہب کا پیرو صرف اسی بات کا مدعی نہیں ہے کہ وہ سچا ہے، بلکہ اس کا بھی مدعی ہے کہ دوسرے جھوٹے ہیں۔ پس اگر اُن کے دعاوی مان لیے جائیں تو تسلیم کرنا پڑیگا کہ ہر مذہب بہ یک وقت سچا بھی ہے اور جھوٹا بھی ہے۔ یہ بھی نہیں ہو سکتا کہ سب کو جھوٹا قرار دیا جائے۔ کیونکہ اگر تمام مذاہب جھوٹے ہیں تو پھر مذہب کی سچائی ہے کہاں؟ پس اگر کوئی صورت رفعِ نزاع کی ہو سکتی ہے، تو وہ وہی ہے جس کی دعوت لے کر قرآن نمودار ہوا ہے۔ تمام مذاہب سچے ہیں، کیونکہ اصل دین ایک ہی ہے اور سب کو دیا گیا ہے، لیکن تمام پیروانِ مذاہب سچائی سے منحرف ہو گئے ہیں، کیونکہ دین کی حقیقت اور وحدت ضائع کر دی ہے، اور اپنی گمراہیوں کی الگ الگ ٹولیاں بنالی ہیں۔ اگر ان گمراہیوں سے لوگ باز آجائیں، اور اپنے اپنے مذہب کی حقیقی تعلیم پر کاربند ہو جائیں۔ تو مذاہب کی تمام نزاعات ختم ہو جائیں گی۔ ہر گروہ دیکھ لے گا کہ اُس کی راہ بھی اصلاً وہی ہے، جو اور تمام گروہوں کی راہ ہے۔ قرآن کہتا ہے، تمام مذاہب کی یہی مشترک اور متفقہ حقیقت "الدِّین" ہے یعنی نوعِ انسانی کے لیے حقیقی دین، اور اسی کو وہ "الاسلام" کے نام سے پکارتا ہے۔

(۷) نوعِ انسانی کی باہمی یگانگت اور اتحاد کے جتنے رشتے بھی ہو سکتے تھے، سب انسان کے ہاتھوں ٹوٹ چکے سب کی نسل ایک تھی، مگر ہزاروں نسلیں ہو گئیں۔ سب کی قومیت ایک تھی، مگر بے شمار قومیتیں بن گئیں۔ سب کی وطنیت ایک تھی، لیکن سیکڑوں وطنیتوں میں بٹ گئے۔ سب کا درجہ ایک تھا، لیکن امیر و فقیر، شریف و وضیع اور ادنیٰ و اعلیٰ کے بہت سے درجے ٹھہرا لیے گئے۔ ایسی حالت میں کونسا رشتہ ہے جو ان تمام تفرقوں پر غالب آ سکتا ہے، اور تمام انسان ایک ہی صف میں کھڑے ہو جا سکتے ہیں؟ قرآن کہتا ہے کہ خدا پرستی کا رشتہ یہی ایک رشتہ ہے جو انسانیت کا بچھڑا ہوا گھرانا پھر آباد کر دے سکتا ہے۔ یہ اعتقاد کہ ہم سب کا پروردگار ایک ہی پروردگار ہے

اور ہم سب کے سر اُسی ایک چوکھٹ پر جُھکے ہوئے ہیں، یک جہتی اور یگانگت کا ایسا جذبہ پیدا کر دیتا ہے، کہ ممکن نہیں، انسان کے بنائے ہوئے تفرقے اُس پر غالب آسکیں۔

صراطِ مستقیم

اِسی بنا پر سورۂ فاتحہ میں جس دُعا کی تلقین کی گئی، وہ "صراطِ مستقیم" پر چلنے کی طلبگاری ہے۔ صراط کے معنی راہ کے ہیں، اور "مستقیم" کے معنی سیدھا ہونے کے۔ پس "صراطِ مستقیم" ایسی راہ ہوئی جو سیدھی ہو، کسی طرح کا پیچ و خم نہ ہو۔ پھر اُس راہ کی پہچان یہ بتلائی کہ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۙ۬ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّاۗلِّيْنَ ۝ یعنی اُن لوگوں کی راہ جن پر خدا کا انعام ہُوا۔ ان کی راہ نہیں جو مغضوب ہوئے، نہ اُن کی جو گمراہ ہیں۔

یہ انعام یافتہ انسان کون ہیں جن کی راہ سیدھی راہ ہوئی؟ قرآن نے جابجا واضح کیا ہے کہ خدا کے تمام رسول اور راست باز انسان جو دنیا کے مختلف عہدوں اور گوشوں میں گزر چکے ہیں، انعام یافتہ انسان ہیں، اور انہیں کی راہ صراطِ مستقیم ہے:

وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰۗىِٕكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَاۗءِ وَالصّٰلِحِيْنَ ۚ وَحَسُنَ اُولٰۗىِٕكَ رَفِيْقًا ۝ (۴: ۶۹)

اور جس کسی نے اللہ اور رسول کی اطاعت کی، تو بلاشبہ وہ اُن لوگوں کا ساتھی ہُوا جن پر اللہ نے انعام کیا ہے۔ یہ انعام یافتہ جماعت نبیوں کی ہے، صدیقوں کی ہے، شہداء کی ہے، نیک عمل انسانوں کی ہے، اور (جس کے ساتھی ایسے لوگ ہوں تو) کیا ہی اچھی اُس کی رفاقت ہے!

اس آیت میں بالترتیب چار جماعتوں کا ذکر کیا گیا ہے، اور انہیں انعام یافتہ قرار دیا ہے: انبیاء، صدیقین، شہداء، صالحین۔

"انبیاء" سے مقصود خدا کی سچائی کے تمام پیغامبر ہیں جو نوعِ انسانی کی ہدایت کے لیے پیدا ہوئے۔

"صدیق" سے مقصود ایسے انسان ہیں جو کامل معنوں میں سچے ہوں۔ یعنی سچائی کے سانچے میں کچھ اس طرح ڈھلے ہوئے ہوں کہ سچائی کے خلاف کوئی بات اُن کے دماغ میں اُتر ہی نہ سکے۔

"شہید" کے معنی گواہ کے ہیں۔ یعنی ایسے انسان جو اپنے قول و فعل سے حق و صداقت کی شہادت بلند کرنے والے ہوں۔

"صالحین" سے مقصود وہ تمام انسان ہیں جو نیک عملی کی راہ میں استقامت رکھیں اور بُرائی کی راہوں سے کنارہ کش ہوں۔

پس معلوم ہُوا، انعام یافتہ انسانوں سے مقصود دنیا کے تمام رسول اور داعیانِ حق ہیں جو قرآن کے

نزول سے پہلے دنیا میں پیدا ہو چکے تھے، اور تمام راست باز انسان ہیں جو نوعِ انسانی میں گزر چکے تھے: اس میں نہ تو کسی خاص نسل و قوم کی خصوصیت رکھی گئی ہے، نہ کسی خاص مذہب اور اُس کے پیرؤوں کی۔ دنیا کے تمام نبی، تمام صدیق، تمام شہداءِ حق، تمام صالح انسان، خواہ کسی ملک و قوم میں ہوئے ہوں، قرآن کے نزدیک "انعام یافتہ" انسان ہیں، اور اُنہی کی راہ "صراطِ مستقیم" ہے۔

خدا کے اِن تمام رسولوں اور نوعِ انسانی کے راست باز افراد کی راہ کونسی راہ تھی؟ وہی راہ جسے قرآن دینِ حقیقی کی راہ قرار دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے، دنیا میں جس قدر بھی سچائی کے داعی آئے، سب نے یہی تعلیم دی کہ اَقِیْمُوا الدِّیْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِیْهِ! "خدا کا ایک ہی دین قائم رکھو، اور اس راہ میں جُدا جُدا نہ ہو جاؤ" یہی راہ سچائی کی سیدھی راہ ہے۔

چنانچہ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے جابجا الدّین کو صراطِ مستقیم سے بھی تعبیر کیا ہے۔ سورۂ شوریٰ میں پیغمبرِ اسلام کو مخاطب کرتے ہوئے کہتا ہے، تم صراطِ مستقیم کی طرف ہدایت کرنے والے ہو، اور صراطِ مستقیم ہی صراط اللہ ہے۔ یعنی اللہ کی ٹھہرائی ہوئی راہِ سعادت۔

وَاِنَّكَ لَتَهْدِيْۤ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۙ صِرَاطِ اللّٰهِ الَّذِيْ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ اَلَاۤ اِلَى اللّٰهِ تَصِيْرُ الْاُمُوْرُ ۝ (۴۲: ۵۲-۵۳)

اور (اے پیغمبر) بلاشبہ تم صراطِ مستقیم کی طرف ہدایت کرنے والے ہو، صراط اللہ، یعنی اللہ کی راہ کی طرف۔ وہ اللہ، کہ آسمان و زمین میں جو کچھ ہے، سب اُسی کا ہے۔ ہاں، یاد رکھو، کائناتِ خلقت کے تمام کاموں کا مرجع اُسی کی ذات ہے۔

اِسی طرح وہ جابجا کہتا ہے کہ خدا کے تمام رسولوں کی دعوت صراطِ مستقیم کی دعوت تھی۔ سورۂ نحل میں حضرت ابراہیم (علیہ السّلام) کی نسبت ہے: وَهَدٰىهُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (۱۶: ۱۲۱) خدا نے اُسے صراطِ مستقیم دکھا دی۔ سورۂ زخرف میں حضرت مسیح (علیہ السّلام) کی زبانی سُنتے ہیں، اِنَّ اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ۭ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ (۴۳: ۶۴) اللہ میرا اور تمہارا، سب کا پروردگار ہے۔ پس اُسی کی بندگی کرو۔ یہی صراطِ مستقیم ہے! سورۂ انعام میں پہلے حضرت نوحؑ اور حضرت ابراہیمؑ کا ذکر کیا ہے، پھر سلسلۂ ابراہیمیؑ کے متعدد نبیوں کا جو تورات کی مشہور شخصیتیں ہیں۔ اُس کے بعد کہا ہے: وَاجْتَبَيْنٰهُمْ وَهَدَيْنٰهُمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (۶: ۸۷) ان سب کو ہم نے صراطِ مستقیم دکھا دی۔

اصل یہ ہے کہ خدا کے عالمگیر دین کی حقیقت ظاہر کرنے کے لیے صراطِ مستقیم سے بہتر تعبیر نہیں ہو سکتی تھی۔ تم کسی خاص مقام تک پہنچنے کے لیے کتنی ہی راہیں نکال لو لیکن سیدھی راہ ہمیشہ ایک ہی ہوگی، اور اسی پر چل کر ہر مسافر منزلِ مقصود تک بحفاظت و امن پہنچ سکے گا۔ علاوہ بریں، سیدھی راہ ہی ہمیشہ شاہراہِ عام کی

حیثیت اختیار کرلیتی ہے۔ تمام مسافر، خواہ کسی گوشہ کے رہنے والے ہوں، لیکن سب مِل جُل کر وہی راہ اختیار کریں گے، اور کبھی یہ نہ کرینگے کہ الگ الگ ٹولیاں بنا کر ٹیڑھی ترچھی راہوں میں متفرق ہو جائیں۔ قرآن کہتا ہے، ٹھیک اسی طرح دین کی سیدھی راہ بھی ایک ہی ہے۔ بہت سی نہیں ہو سکتیں، اور وہ اوّل دن سے موجود ہے۔ ہر عہد، ہر قوم، ہر ملک، اُسی پر چل کر منزلِ مقصود تک پہنچا ہے۔ بعد کو پیروانِ مذاہب نے ایسا کیا کہ بہت سی ٹیڑھی ترچھی راہیں نکال لیں، اور ایک راہ پر متفق رہنے کی جگہ، الگ ٹولیاں بنا کر، متفرق ہو گئے۔ وہ کہتا ہے، اب اگر تم چاہتے ہو کہ منزلِ مقصود کا سُراغ پاؤ، تو چاہیے کہ اُسی سیدھی راہ پر اکٹھے ہو جاؤ۔ فهو طریقاً مستقیماً، سھلاً، مسلوکاً، واسعاً، موصلاً الی المقصود +

وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ ۭ ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۝ (۶: ۱۵۳)

اور (دیکھو) یہ میری راہ ہے۔ بالکل سیدھی راہ پس اسی ایک راہ پر چلو اور طرح طرح کے راستوں کے پیچھے نہ پڑو۔ وہ تمہیں خدا کی سیدھی راہ سے ہٹا کر، جُدا جُدا کر دینگے۔ یہی بات ہے جس کا خدا تمہیں حکم دیتا ہے تاکہ (اس کی نافرمانی سے) بچو!

چنانچہ یہ حقیقت بالکل واضح ہو جاتی ہے جب "صراطِ مستقیم" کی اُس تفسیر پر نظر ڈالی جائے جو خود پیغمبرِ اسلام (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمائی ہے:

عن ابن مسعودؓ قال خطّ لنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خطاً بیدہٖ ثمّ قال ھٰذا سبیل اللہ مستقیماً ثمّ خطّ خطوطاً عن یمین ذٰلك الخط وعن شمالہٖ ثمّ قال وھٰذہٖ السّبل لیس منھا سبیل الا علیہ شیطان یدعوا الیہ ثم قرأ ھٰذہٖ الاٰیۃ (اخرجہ النسائی واحمد والبزار وابن المنذر وابو الشیخ والحاکم وصححہ)

عبداللہ بن مسعودؓ کہتے ہیں، رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اپنی انگلی سے ایک لکیر کھینچی اور فرمایا، یوں سمجھو کہ یہ اللہ کا ٹھہرایا ہوا راستہ ہے۔ بالکل سیدھا، اس کے بعد اس لکیر کے دونوں طرف بہت سی ترچھی لکیریں کھینچ دیں، اور فرمایا، یہ طرح طرح کے راستے ہیں جو بنا لیے گئے ہیں، اور ان میں کوئی راستہ نہیں جس کی طرف بلانے کے لیے ایک شیطان موجود نہ ہو۔ پھر یہ آیت پڑھی: وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا الی آخرہ۔

اِس سے معلوم ہُوا، تمام اِدھر اُدھر کے ٹیڑھے ترچھے راستے "سُبل متفرقہ" ہیں جو جمعیت بشری کو متحد کرنے کی جگہ متفرق کر دیتے ہیں، اور درمیان کی ایک ہی سیدھی راہ "صراطِ مستقیم" ہے۔ یہ متفرق کرنے کی جگہ تمام رہروانِ منزل کو ایک ہی شاہراہ پر جمع کر دیتی ہے +

یہ سُبل متفرقہ کیا ہیں؟ اُسی گمراہی کا نتیجہ ہیں جسے قرآن نے "تشیّع" اور "تحزّب" کی گمراہی سے تعبیر کیا ہے، اور

تشریح اِس کی اوپر گزر چکی،

دینِ حقیقی کی راہ کا سیدھا ہونا، اُور "سُبلِ متفرقہ" یعنی خود ساختہ گروہ بندیوں کا پُر پیچ وخم ہونا، ایک ایسی حقیقت ہے جسے ہر انسان بغیر کسی عقلی کاوش کے سمجھ لے سکتا ہے۔ خدا کا دین اگر انسان کی ہدایت کے لیے ہے، تو ضروری ہے کہ خدا کے تمام قوانین کی طرح یہ بھی صاف اور واضح ہو، اِس میں کوئی راز نہ ہو، کوئی پیچیدگی نہ ہو، ناقابلِ حل معمہ نہ ہو۔ اعتقاد میں سہل ہو اور عمل میں ہلکا۔ ہر عقل اُسے بُوجھ لے۔ ہر طبیعت اُس پر مطمئن ہو جائے۔ اچھا، اب غور کرو، یہ تعریف کس راہ پر صادق آتی ہے؟ اُن مختلف راہوں پر جو پیروانِ مذاہب نے الگ الگ گروہ بندیاں کرکے نکال لی ہیں، یا اُس ایک ہی راہ پر جسے قرآن اصلِ دین کی راہ بتلاتا ہے؟

اِن گروہ بندیوں میں سے کوئی گروہ بندی بھی ایسی نہیں ہے جو اپنے بوجھل عقیدوں، ناقابلِ فہم عقدوں، اور ناقابلِ برداشت عملوں کی ایک طول طویل فہرست نہ ہو۔ ہم یہاں تفصیلات میں نہیں جائیں گے ہر شخص جانتا ہے کہ دنیا کے تمام پیروانِ مذاہب کے مزعومہ عقائد واعمال کا کیا حال ہے، اور اُن کی نوعیّت کیسی ہے! مذہب کا عقل کے لیے معمہ اور طبیعت کے لیے بوجھ ہونا، ایک ایسی بات ہے جو عام طور پر مذاہب کا خاصہ تسلیم کرلی گئی ہے لیکن قرآن جس راہ کو دینِ حقیقی کی راہ کہتا ہے، اُس کا کیا حال ہے؟ اُس کی راہ تو اتنی واضح، اتنی سہل، اتنی مختصر ہے، کہ عقائد واعمال کی پوری فہرست صرف دو لفظوں میں ختم کردی جاسکتی ہے؛ ایمان اور عملِ صالح۔ اُس کے عقائد میں عقل کے لیے کوئی بوجھ نہیں۔ اس کے اعمال میں طبیعت کے لیے کوئی سختی نہیں۔ ہر طرح کے پیچ وخم سے پاک۔ ہر معنی میں اعتقاد وعمل کی سیدھی سے سیدھی بات۔ حنیفیۃ السمحہ، لیلھا کنھارھا! اُس کی رات بھی اُس کے دن کی طرح روشن ہے!

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ عَلٰی عَبْدِهِ الْكِتٰبَ وَلَمْ يَجْعَلْ لَّهٗ عِوَجًا (۱۸ : ۱)

ہر طرح کی ستائش اللہ ہی کے لیے ہے جس نے اپنے بندے پر کتاب نازل کی، اور اس میں کسی طرح کی بھی کجی نہیں رکھی۔

بہر حال، قرآن کا پیرو وہ ہے جو دین کی سیدھی راہ پر چلنے والا ہے۔ وہ راہ نہیں جو کسی خاص گروہ، کسی خاص نسل، کسی خاص قوم، کسی خاص عہد کی راہ ہے، بلکہ خدا کی عالمگیر سچائی کی راہ، جو ہر جگہ اور ہر عہد میں نمایاں ہوئی ہے، اور ہر طرح کی جغرافیائی اور جماعتی حد بندیوں کے امتیازات سے پاک ہے:

اِنَّ اللّٰهَ رَبِّیْ وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ (۴۳ : ۶۴)

اللہ میرا اور تمہارا، دونوں کا پروردگار ہے، پس اسی کی بندگی کرو یہی صراطِ مستقیم ہے۔

علاوہ بریں بحث ونظر کے بعض دوسرے پہلو بھی ہیں جو اس موقع پر پیشِ نظر رہنے چاہئیں:

اوّلاً، فلاح وسعادت کی راہ کو "سیدھی راہ" سے تعبیر کیا گیا، اور "سیدھی راہ" پر چلنا ایک ایسی بات ہے جس کی

سمجھ اور طلب بالطبع ہر انسان کے اندر موجود ہے۔ پھر اس کی پہچان بتلاتے ہوئے کوئی اس طرح کی تعریف نہیں کی جس کے سمجھنے اور منطبق کرنے میں ذہنی کاوشوں کی ضرورت ہو، بلکہ ایک خاص طرح کے انسانوں کی طرف انگلی اُٹھادی کہ صراطِ مستقیم اِن لوگوں کی راہ ہے۔ اس اسلوبِ بیان نے ہر انسان کے سامنے صراطِ مستقیم کو ایک محسوس و مشہود صورت میں نمایاں کر دیا۔ ہر انسان خواہ کسی عہد اور کسی مُلک و قوم سے تعلق رکھتا ہو لیکن اِس بات سے بے خبر نہیں ہو سکتا کہ یہاں دو طرح کے انسان موجود ہیں۔ ایک وہ ہیں جن کی راہ سعادت و کامیابی کی راہ ہے۔ ایک وہ ہیں جن کے حصّے میں محرومی و شقاوت آئی ہے۔ پس کامیابی کی راہ کی پہچان اس سے زیادہ بہتر اور مؤثر طریقہ سے بیان نہیں کی جاسکتی کہ وہ کامیاب انسان کی راہ ہے۔ اگر اس کی پہچان منطقی تعریفوں کی طرح بیان کی جاتی، تو ظاہر ہے، نہ تو ہر انسان بغیر کاوش و فکر کے سمجھ سکتا، نہ قطعی طور پر کسی ایک ہی راہ پر منطبق کی جاسکتی۔

ثانیاً جہاں تک انسانی فلاح و سعادت کا تعلق ہے، صراطِ مستقیم کی تعبیر ہی ہر لحاظ سے حقیقی اور قدرتی تعبیر ہو سکتی تھی۔ انسان کے فکر و عمل کا کوئی گوشہ ہو، لیکن صحت و درستگی کی راہ ہمیشہ وہی ہوگی جو سیدھی راہ ہو۔ جہاں انحراف اور کجی پیدا ہوئی، نقص و فساد ظہور میں آگیا۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کی تمام زبانوں میں سیدھا ہونا اور سیدھی چال چلنا، فلاح و سعادت کے معنوں میں عام طور پر بولا جاتا ہے۔ گویا اچھائی کے معنوں میں یہ ایک ایسی تعبیر ہے، جو تمام نوعِ انسانی کی عالمگیر تعبیر کہی جاسکتی ہے۔

حضرت مسیح سے چار سو برس پہلے دارا یوشِ اوّل نے جو فرامین کندہ کرائے تھے، اُن میں سے بے ستون کا کتبہ آج تک موجود ہے اور اس کا خاتمہ ان جملوں پر ہوتا ہے "اے انسان! اہورامزدا کا (یعنی خدا کا) تیرے لیے حکم یہ ہے کہ بُرائی کا دھیان نہ کر۔ سیدھا راستہ نہ چھوڑ۔ گناہ سے بچتا رہ"۔

پس صراطِ مستقیم پر چلنے کی طلب، زندگی کی تمام راہوں میں درستگی و صحت کی راہ چلنے کی طلب ہوئی۔ اور اسی لیے سعی و عمل کے ہر گوشے میں، انعام یافتہ گروہ وہی ہو سکتا ہے جس کی راہ صراطِ مستقیم ہو۔

"المغضوب علیہم" اور "الضالین" پھر "صراط مستقیم" کی پہچان صرف اُس کے مثبت پہلو ہی سے واضح نہیں کی گئی، بلکہ اُس کا ضد و مخالف پہلو بھی واضح کر دیا گیا: غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ۔ اُن کی راہ نہیں جو مغضوب ہوئے۔ نہ اُن کی جو گمراہ ہو کر بھٹک گئے۔

"مغضوب علیہ" گروہ "منعم علیہ" کی بالکل ضد ہے۔ کیونکہ انعام کی ضد غضب ہے، اور فطرتِ کائنات کا قانون یہ ہے کہ راست باز انسانوں کے حصّے میں انعام آتا ہے۔ نافرمانوں کے حصّے میں غضب۔ "گمراہ" وہ ہیں جو راہِ حق نہ پاسکے، اور اُس کی جستجو میں بھٹک گئے۔ پس مغضوب وہ ہوئے جنہوں نے راہ پائی اور اُس کی نعمتیں بھی پائیں لیکن

پھر اُس سے منحرف ہو گئے، اور نعمت کی راہ چھوڑ کر محرومی و شقاوت کی راہ اختیار کر لی۔ گمراہ وہ ہوئے جو راہ ہی نہ پا سکے، اس لیے اِدھر اُدھر بھٹک رہے ہیں اور صراطِ مستقیم کی سعادتوں سے محروم ہیں۔

"مغضوب علیہ" کی محرومی حصول و معرفت کے بعد انکار کا نتیجہ ہے، اور گمراہ کی محرومی جہل کا نتیجہ۔ پہلے نے پا کر رُوگردانی کی، اس لیے محروم ہوا، دوسرا پا ہی نہ سکا، اس لیے محروم ہے۔ محروم دونوں ہوئے، مگر یہ ظاہر ہے کہ پہلے کی محرومی زیادہ مجرمانہ ہے۔ کیونکہ اُس نے نعمت حاصل کر کے پھر اُس سے رُوگردانی کی۔ اسی لیے اُسے مغضوب کہا گیا، اور دوسرے کی حالت صرف گمراہی کے لفظ سے تعبیر کی گئی۔

ہم دیکھتے ہیں، دنیا میں فلاح و سعادت سے محروم آدمی ہمیشہ دو ہی طرح کے ہوتے ہیں۔ جاحد اور جاہل۔ جاحد وہ ہوتا ہے جو حقیقت پا لیتا ہے، با ایں ہمہ اُس سے رُوگردانی کرتا ہے۔ جاہل وہ ہوتا ہے جو حقیقت سے ناآشنا ہوتا ہے، اور اپنے جہل پر قانع ہو جاتا ہے، پس صراطِ مستقیم پر چلنے کی طلبگاری کے ساتھ، محرومی و شقاوت کی اِن دونوں صورتوں سے بچنے کی طلب بھی سکھلا دی، تاکہ فلاح و سعادت کی راہ کا تصور ہر طرح کامل اور لغزشوں سے محفوظ ہو جائے۔

جہاں تک مذہبی صداقت کا تعلّق ہے، دونوں طرح کی محرومیوں کی مثالیں قوموں کی تاریخ میں موجود ہیں۔ کتنی ہی قومیں ہیں جن کے قدم صراطِ مستقیم پر اُستوار ہو گئے تھے، اور فلاح و سعادت کی تمام نعمتیں اُن کے لیے مہیّا تھیں، با ایں ہمہ اُنہوں نے رُوگردانی کی، اور راہِ حق کی معرفت حاصل کر کے پھر اُس سے منحرف ہو گئے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ وہی قوم جو کل تک دنیا کی انعام یافتہ جماعت تھی، سب سے زیادہ محروم و نامراد جماعت ہو گئی۔ اِسی طرح کتنی ہی جماعتیں ہیں، جن کے سامنے فلاح و سعادت کی راہ کھول دی گئی، لیکن اُنہوں نے معرفت کی جگہ جہل، اور روشنی کی جگہ تاریکی پسند کی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ راہِ حق نہ پا سکے، اور نامرادی و محرومی کی وادیوں میں گم ہو گئے۔

اَحادیث وآثار میں اس کی جو تفسیر بیان کی گئی ہے۔ اُس سے یہ حقیقت اور زیادہ واضح ہو جاتی ہے۔ ترمذی اور احمد و ابن حبان وغیرہم کی مشہور حدیث ہے کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا، "المغضوب" یہودی ہیں اور "الضالین" نصاریٰ ہیں۔ یقیناً اس تفسیر کا مطلب یہ نہیں ہو سکتا کہ مغضوب سے مقصود صرف یہودی اور گمراہ سے مقصود صرف نصاریٰ ہیں۔ بلکہ مقصود یہ ہے کہ مغضوبیت اور گمراہی کی حالت واضح کرنے کے لیے دو جماعتوں کا ذکر بطور مثال کے کر دیا جائے۔ چنانچہ ان دونوں جماعتوں کی تاریخ میں ہم محرومی کی دونوں حالتوں کا کامل نمونہ دیکھ لے سکتے ہیں۔ یہودیوں کی قومی تاریخ مغضوبیت کے لیے اور عیسائیوں کی تاریخ گمراہی کے لیے، عبرت و تذکیر کا بہترین سرمایہ ہے۔

قرآن کے قصص اور استقراءِ تاریخی

یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں، قرآن نے ہدایت و تذکیرِ اُمم کے لیے جن جن اصلوں پر زور دیا ہے، اُن میں سب سے زیادہ نمایاں اصل، پچھلی قوموں کے ایام و وقائع اور اُن کے نتائج ہیں۔ وہ کہتا ہے، کائناتِ ہستی کے ہر گوشے کی طرح قوموں اور جماعتوں کے لیے بھی خدا کا قانونِ سعادت و شقاوت ایک ہی ہے، اور ہر عہد اور ہر ملک میں ایک ہی طرح کے احکام و نتائج رکھتا ہے۔ اس کے احکام میں کبھی تبدیلی نہیں ہو سکتی، اور اُس کے نتائج ہمیشہ اور ہر حال میں اٹل ہیں۔ جس طرح سنکھیا کی تاثیر اس لیے بدل نہیں جاسکتی کہ وہ کس عہد اور کس سنہ میں استعمال کی گئی۔ اسی طرح قوموں اور جماعتوں کے اعمال کے نتائج بھی اس لیے متغیر نہیں ہو جا سکتے کہ کس ملک میں پیش آئے۔ اگر ماضی میں ہمیشہ شہد، شہد کا خاصہ رکھتا آیا ہے، اور سنکھیا کی تاثیر سنکھیا ہی کی رہی ہے، تو مستقبل میں بھی ہمیشہ شہد، شہد ہی رہیگا، اور سنکھیا کی تاثیر سنکھیا ہی کی ہوگی پس جو کچھ ماضی میں پیش آچکا ہے، ضروری ہے کہ مستقبل میں بھی پیش آئے:

سُنَّةَ اللّٰهِ فِی الَّذِیْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ ۚ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِیْلًا ۝ (۳۳ : ۶۲)

جو لوگ تم سے پہلے گزر چکے ہیں، اُن کے لیے اللہ کی سنت یہی رہی ہے۔ (یعنی اللہ کے قوانین و احکام کا دستور یہی رہا ہے) اور اللہ کی سنت میں تم کبھی ردّ و بدل نہیں پاؤ گے۔

فَهَلْ یَنْظُرُوْنَ اِلَّا سُنَّتَ الْاَوَّلِیْنَ ۚ فَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَبْدِیْلًا ۚ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَحْوِیْلًا ۝ (۳۵ : ۴۳)

پھر یہ لوگ کس بات کی راہ تک رہے ہیں؟ کیا اُس سُنّت کی جو اگلے لوگوں کے لیے رہ چکی ہے؟ تو یاد رکھو، تم اللہ کی سنت کو کبھی بدلتا ہوا نہیں پاؤ گے، اور نہ کبھی ایسا ہو سکتا ہے کہ اُس کی سُنّت کے احکام پھیر دیے جائیں۔

سُنَّةَ مَنْ قَدْ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنْ رُّسُلِنَا وَلَا تَجِدُ لِسُنَّتِنَا تَحْوِیْلًا ۝ (۱۷ : ۷۷)

(اے پیغمبر!) تم سے پہلے جن رسولوں کو ہم نے بھیجا ہے، ان کے لیے ہماری سنت یہی رہی ہے، اور ہماری سنت کبھی ٹلنے والی نہیں۔

چنانچہ وہ ایک طرف تو انعام یافتہ جماعتوں کی کامرانیوں کا بار بار ذکر کرتا ہے۔ دوسری طرف مغضوب اور گمراہ جماعتوں کی محرومیوں کی سرگزشتیں بار بار سُناتا ہے، پھر جا بجا اُن سے عبرت و بصیرت کے نتائج اخذ کرتا ہے، جن پر اقوام و جماعات کا عروج و زوال موقوف ہے۔ وہ کھول کھول کر بتلاتا ہے کہ انعام یافتہ جماعتوں کی سعادت و کامرانی ان ان اعمال کا انعام تھے، اور مغضوب و گمراہ جماعتوں کی شقاوت و محرومی ان ان بدعملیوں

کی پاداش تھی۔ اچھے نتائج کو "انعام" کہتا ہے، کیونکہ یہ فطرتِ الٰہی کی قبولیت ہے۔ بُرے نتائج کو "غضب" کہتا ہے، کیونکہ یہ قانونِ الٰہی کی پاداش ہے۔ وہ کہتا ہے، جن اسباب و علل سے دس مرتبہ ایک خاص طرح کا معلول پیدا ہو چکا ہے، تم کیونکر انکار کر سکتے ہو کہ گیارہویں مرتبہ بھی ویسا ہی معلول پیدا نہ ہوگا؟

قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ سُنَنٌ ۙ	تم سے پہلے بھی دنیا میں (خدا کے) احکام و قوانین کے نتائج گزر چکے ہیں پس
فَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَانْظُرُوا	ملکوں کی سیر کرو، اور دیکھو اُن لوگوں کا انجام کیا ہوا جنھوں نے (اللہ کے
كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِينَ ۝	احکام و قوانین کو) جھٹلایا تھا۔

(۳: ۱۳۱)

قُرآن کی سورتوں میں ایک بڑی تعداد ایسی سورتوں کی ہے، جو تمام تر اسی مطلب پر مشتمل ہیں۔ کہا جا سکتا ہے کہ قرآن میں جس قدر بیان بھی پچھلے عہدوں کے وقائع و قصص کا ہے، وہ تمام تر سورۂ فاتحہ کی اِسی آیت کی تفصیل ہے۔

سورۂ فاتحہ کی تعلیمی روح

اچھا، اب چند لمحوں کے لیے سورۂ فاتحہ کے مطالب پر بحیثیت مجموعی نظر ڈالو، اور دیکھو، اُس کی سات آیتوں کے اندر مذہبی عقائد و تصوّر کی جو روح مضمر ہے، وہ کس طرح کی ذہنیت پیدا کرتی ہے؟ سورۂ فاتحہ ایک دعا ہے۔ فرض کرو، ایک انسان کے دل و زبان سے شب و روز یہی دعا نکلتی رہتی ہے۔ اس صورت میں اُس کے فکر و اعتقاد کا کیا حال ہوگا؟

وہ خُدا کی حمد و ثنا میں زمزمہ سنج ہے، لیکن اُس خدا کی حمد میں نہیں جو نسلوں، قوموں، اور مذہبی گروہ بندیوں کا خدا ہے، بلکہ رَبُّ الْعٰلَمِیْن کی حمد میں جو تمام کائناتِ خلقت کا پروردگار ہے، اور اس لیے تمام نوعِ انسانی کے لیے یکساں طور پر پروردگاری و رحمت رکھتا ہے۔ پھر وہ اُسے اُس کی صفتوں کے ساتھ پکارنا چاہتا ہے، لیکن اُس کی تمام صفتوں میں سے صرف رحمت اور عدالت ہی کی صفتیں اُسے یاد آتی ہیں، گویا خدا کی ہستی کی نمود اُس کے لیے سرتاسر رحمت و عدالت کی نمود ہے، اور جو کچھ بھی اُس کی نسبت جانتا ہے، وہ رحمت و عدالت کے سوا کچھ نہیں ہے۔ پھر وہ اپنا سرِ نیاز جُھکاتا، اور اُس کی عبودیت کا اقرار کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے، صرف تیری ہی ایک ذات ہے جس کے آگے بندگی و نیاز کا سر جُھک سکتا ہے، اور صرف تو ہی ہے جو ہماری ساری درماندگیوں اور احتیاجوں میں مددگاری کا سہارا ہے۔ وہ اپنی عبادت اور استعانت، دونوں کو صرف ایک ہی ذات کے ساتھ وابستہ کر دیتا ہے، اور اس طرح دنیا کی ساری قوتوں اور ہر طرح کی انسانی فرمانروائیوں سے بے پروا ہو جاتا ہے۔ اب کسی چوکھٹ پر اُس کا سر جُھک نہیں سکتا۔ اب کسی قوت سے وہ ہراساں نہیں ہو سکتا۔ اب کسی کے آگے اُس کا دستِ طلب دراز نہیں ہو سکتا!

پھر وہ خدا سے سیدھی راہ چلنے کی توفیق طلب کرتا ہے۔ یہی ایک مدّعا ہے جس سے زبانِ احتیاج آشنا ہوتی ہے۔ لیکن کونسی سیدھی راہ؟ کسی خاص نسل کی سیدھی راہ؟ کسی خاص قوم کی سیدھی راہ؟ کسی خاص مذہبی حلقہ کی سیدھی راہ؟ نہیں، وہ راہ جو دنیا کے تمام مذہبی رہنماؤں اور تمام راست باز انسانوں کی متفقہ راہ ہے، خواہ کسی عہد اور کسی قوم میں ہوئے ہوں۔ اسی طرح وہ محرومی اور گمراہی کی راہوں سے پناہ مانگتا ہے، لیکن یہاں بھی کسی خاص نسل و قوم یا کسی خاص مذہبی گروہ کا ذکر نہیں کرتا۔ بلکہ ان راہوں سے بچنا چاہتا ہے جو دنیا کے تمام محروم اور گمراہ انسانوں کی راہیں رہ چکی ہیں۔ گویا جس بات کا طلبگار ہے، وہ بھی نوعِ انسانی کی عالمگیر اچھائی ہے، اور جس بات سے پناہ مانگتا ہے، وہ بھی نوعِ انسانی کی عالمگیر بُرائی ہے۔ نسل، قوم، ملک، یا مذہبی گروہ بندی کے

تفرقہ و امتیاز کی کوئی پرچھائیں اُس کے دل و دماغ پر نظر نہیں آتی۔

غور کرو، مذہبی تصور کی یہ نوعیت انسان کے ذہن و عواطف کے لیے کس طرح کا سانچا مہیا کرتی ہے؟ جس انسان کا دل و دماغ ایسے سانچے میں ڈھل کر نکلے گا، وہ کس قسم کا انسان ہوگا؟ کم از کم دو باتوں سے تم انکار نہیں کر سکتے۔ ایک یہ کہ اس کی خدا پرستی، خدا کی عالمگیر رحمت و جمال کے تصوّر کی خدا پرستی ہوگی۔ دوسری یہ کہ کسی معنی میں بھی نسل و قوم یا گروہ بندیوں کا انسان نہیں ہوگا۔ عالمگیر انسانیت کا انسان ہوگا، اور دعوتِ قرآنی کی اصلی روح یہی ہے!

ترجمان القرآن

(۱) الفَاتِحَۃُ

مَکِّیَّۃٌ وَھِیَ سَبْعُ اٰیَاتٍ

سورۂ فاتحہ۔ مکی۔ سات آیتیں

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○

اللہ کے نام سے جو الرحمٰن اور الرحیم ہے

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ○ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○ مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ ○ اِیَّاکَ
نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ ○ اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ ○ صِرَاطَ الَّذِیْنَ
اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ ۵ غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْھِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ ○ ع

ہر طرح کی ستائشیں اللہ ہی کے لیے ہیں جو تمام کائناتِ خلقت کا پروردگار ہے، جو رحمت والا ہے، اور جس کی رحمت تمام مخلوقات کو اپنی بخششوں سے مالا مال کر رہی ہے۔ جو اُس دن کا مالک ہے، جس دن کاموں کا بدلہ لوگوں کے حصے میں آئے گا۔ (خدایا!) ہم صرف تیری ہی بندگی کرتے ہیں، اور صرف تو ہی ہے جس سے (اپنی ساری احتیاجوں میں) مدد مانگتے ہیں (خدایا!) ہم پر (سعادت کی) سیدھی راہ کھول دے۔ وہ راہ جو اُن لوگوں کی راہ ہوئی جن پر تو نے انعام کیا۔ اُن کی نہیں جو پھٹکارے گئے، اور نہ اُن کی جو راہ سے بھٹک گئے ؛

البَقَرَةُ

مَدَنِيَّةٌ مِائَتَانِ وَسِتٌّ وَثَمَانُونَ آيَةً

(مدنی - ۲۸۶ - آیتیں)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

۱-۲ الٓمّٓ ۝ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۛۚ فِيْهِ ۛۚ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيْمُوْنَ
۳ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ
۴-۵ وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ۝ اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ ۖ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ اِنَّ الَّذِيْنَ
۶ كَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝ خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى
۷ ع۱ سَمْعِهِمْ ۖ وَعَلٰٓى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ ۖ وَّلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا
بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ

یہ کتاب متقی انسانوں پر فلاح و سعادت کی راہ کھولنے والی ہے، اور قبولیتِ حق کے لحاظ سے انسانوں کی پہلی قسم۔

۱ الف لام میم - یہ الکتاب ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں متقی
۲ انسانوں پر (سعادت کی) راہ کھولنے والی (متقی انسان وہ ہیں)
جو غیب (کی حقیقتوں) پر ایمان رکھتے ہیں، اور ہم نے جو کچھ روزی اُنہیں دے رکھی ہے، اُسے (نیکی کی راہ میں) خرچ کرتے
۳ ہیں۔ نیز وہ لوگ جو اُس (سچائی) پر ایمان رکھتے ہیں جو تم پر (یعنے پیغمبرِ اسلام پر) نازل ہوئی ہے، اور اُن تمام (سچائیوں)
پر، جو تم سے پہلے (یعنے پیغمبرِ اسلام سے پہلے) نازل ہو چکی ہیں، اور (ساتھ ہی) آخرت (کی زندگی) کے لیے بھی اُن کے اندر
۴ یقین ہے۔ تو یقیناً یہی لوگ ہیں جو اپنے پروردگار کے (ٹھہرائے ہوئے) راستہ پر ہیں، اور یہی ہیں (دنیا اور آخرت میں)
۵ کامیابی پانے والے!

دوسری قسم، منکرینِ حق کی، جو قبولیت کی استعداد کے لحاظ سے پہلی قسم کی ضد ہیں۔

(لیکن) وہ لوگ جنہوں نے (ایمان کی جگہ) انکار کی راہ اختیار کی (اور سچائی کے سُننے
اور قبول کرنے کی استعداد کھو دی) تو (ان کے لیے ہدایت کی تمام صدائیں بیکار
۶ ہیں) تم اُنہیں (انکارِ حق کے نتائج سے) خبردار کر دیا نہ کرو، وہ ماننے والے نہیں۔ اُن کے دلوں اور کانوں پر اللہ نے
مُہر لگا دی، اور اُن کی آنکھوں پر پردہ پڑ گیا۔ سو (جن لوگوں نے اپنا یہ حال بنا لیا ہے، وہ کبھی ہدایت نہیں پا سکتے۔ کامیابی
۷ کی جگہ) اُن کے لیے عذاب جانکاہ ہے!

تیسری قسم اُن لوگوں کی، جو اگرچہ خدا پرستی کا دعویٰ کرتے ہیں مگر فی الحقیقت اس سے محروم ہیں۔

(ان دو قسم کے آدمیوں کے علاوہ) کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو کہتے ہیں:
ہم اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتے ہیں، مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ

وَمَا هُم بِمُؤْمِنِينَ ۝ يُخَادِعُونَ اللَّهَ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَمَا يَخْدَعُونَ إِلَّا أَنفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُونَ فِي ۹-۸
قُلُوبِهِم مَّرَضٌ فَزَادَهُمُ اللَّهُ مَرَضًا ۖ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ بِمَا كَانُوا يَكْذِبُونَ ۝ وَإِذَا قِيلَ ۱۰
لَهُمْ لَا تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ قَالُوا إِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُونَ ۝ أَلَا إِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُونَ وَلَٰكِن لَّا ۱۱
يَشْعُرُونَ ۝ وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ آمِنُوا كَمَا آمَنَ النَّاسُ قَالُوا أَنُؤْمِنُ كَمَا آمَنَ السُّفَهَاءُ ۗ أَلَا إِنَّهُمْ ۱۲
هُمُ السُّفَهَاءُ وَلَٰكِن لَّا يَعْلَمُونَ ۝ وَإِذَا لَقُوا الَّذِينَ آمَنُوا قَالُوا آمَنَّا وَإِذَا خَلَوْا إِلَىٰ شَيَاطِينِهِمْ ۱۳
قَالُوا إِنَّا مَعَكُمْ إِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِئُونَ ۝ اللَّهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ وَيَمُدُّهُمْ فِي طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُونَ ۝ ۱۵-۱۴
أُولَٰئِكَ الَّذِينَ اشْتَرَوُا الضَّلَالَةَ بِالْهُدَىٰ فَمَا رَبِحَت تِّجَارَتُهُمْ وَمَا كَانُوا مُهْتَدِينَ ۝ ۱۶

مومن نہیں۔ وہ (ایمان کا دعویٰ کر کے) اللہ کو اور ایمان والوں کو دھوکا دیتے ہیں، حالانکہ وہ خود ہی دھوکے میں پڑے ہیں،
اگرچہ (جہل و سرکشی سے) اس کا شعور نہیں رکھتے۔ ان کے دلوں میں (انکار کا) روگ ہے۔ پس اللہ نے (دعوتِ حق ۹
کامیاب کر کے) انہیں اور زیادہ روگی کر دیا، اور ان کے لیے عذابِ جانکاہ ہوگا۔ اس لیے کہ اپنی نمائش میں سچے نہیں! ۱۰

وہ مفسد ہیں مگر اپنے آپ کو مصلح سمجھتے ہیں!

جب اِن لوگوں سے کہا جاتا ہے، ملک میں خرابی نہ پھیلاؤ (اور بدعملیوں سے باز
آجاؤ) تو کہتے ہیں، (ہمارے کام خرابی کا باعث کیسے ہو سکتے ہیں) ہم تو سنوارنے والے ہیں۔ یاد رکھو، یہی لوگ ہیں جو خرابی ۱۱
پھیلانے والے ہیں اگرچہ (جہل و سرکشی سے اپنی حالت کا) شعور نہیں رکھتے! ۱۲

وہ راست بازی کو بے وقوفی اور نفاق کو دانشمندی سمجھتے ہیں!

اور جب ان لوگوں سے کہا جاتا ہے، ایمان کی راہ اختیار کرو جس طرح اور لوگوں نے اختیار کی
ہے، تو کہتے ہیں، کیا ہم بھی اسی طرح ایمان لے آئیں جس طرح (یہ) بے وقوف آدمی ایمان لے
آئے ہیں (یعنے جس طرح ان لوگوں نے بے سروسامانی و مظلومی کی حالت میں دعوتِ حق کا ساتھ دیا، اسی طرح ہم بھی
بے وقوف بن کر ساتھ دے دیں؟) یاد رکھو، فی الحقیقت یہی لوگ بے وقوف ہیں، اگرچہ (جہل و غرور کی سرشاری میں
اپنی حالت کا) شعور نہیں رکھتے! ۱۳

راست بازوں کی تحقیر اور ایمان والوں کا تمسخر ان لوگوں کا شیوہ ہے

جب یہ لوگ اُن لوگوں سے ملتے ہیں جو (دعوتِ حق پر) ایمان لا چکے ہیں تو کہتے
ہیں، ہم ایمان لائے۔ لیکن جب اپنے شیطانوں کے ساتھ اکیلے میں بیٹھتے ہیں تو
کہتے ہیں: ہم تمہارے ساتھ ہیں، اور ہمارا اظہارِ ایمان اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ ہم تمسخر کرتے تھے (یہ لوگ ایمان کے معاملے ۱۴
میں تمسخر کرتے ہیں۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ خود انہی کے ساتھ تمسخر ہو رہا ہے کہ اللہ (کے قانونِ جزا) نے رسی ڈھیلی چھوڑ
رکھی ہے، اور سرکشی (کے طوفان) میں بہکے چلے جا رہے ہیں! (یقین کرو) یہی لوگ ہیں جنہوں نے ہدایت کے بدلے گمراہی ۱۵
مول لی۔ لیکن نہ تو ان کی تجارت فائدہ مند نکلی، نہ ہدایت ہی پر قائم رہے! ۱۶

مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِي اسْتَوْقَدَ نَارًا ۚ فَلَمَّا أَضَاءَتْ مَا حَوْلَهُ ذَهَبَ اللَّهُ بِنُورِهِمْ وَتَرَكَهُمْ فِي ظُلُمَاتٍ
لَا يُبْصِرُونَ ۝ صُمٌّ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَرْجِعُونَ ۝ أَوْ كَصَيِّبٍ مِنَ السَّمَاءِ فِيهِ ظُلُمَاتٌ وَرَعْدٌ وَ ۱۷، ۱۸
بَرْقٌ ۚ يَجْعَلُونَ أَصَابِعَهُمْ فِي آذَانِهِمْ مِنَ الصَّوَاعِقِ حَذَرَ الْمَوْتِ ۚ وَاللَّهُ مُحِيطٌ بِالْكَافِرِينَ ۝ ۱۹
يَكَادُ الْبَرْقُ يَخْطَفُ أَبْصَارَهُمْ ۖ كُلَّمَا أَضَاءَ لَهُمْ مَشَوْا فِيهِ وَإِذَا أَظْلَمَ عَلَيْهِمْ قَامُوا ۚ وَلَوْ شَاءَ
اللَّهُ لَذَهَبَ بِسَمْعِهِمْ وَأَبْصَارِهِمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ۝ يَا أَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا رَبَّكُمُ ۲۰
الَّذِي خَلَقَكُمْ وَالَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ۝ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ فِرَاشًا وَالسَّمَاءَ بِنَاءً ۲۱

تیسری قسم کے لوگوں کی محرومی کی ایک مثال

اِن لوگوں کی مثال ایسی ہے، جیسے ایک آدمی (رات کی تاریکی میں بھٹک رہا تھا
اُس) نے (روشنی کے لیے) آگ سُلگائی، لیکن جب (آگ سُلگ گئی، اور اُس کے شعلوں سے) آس پاس روشن ہو گیا، تو
قدرتِ الٰہی سے ایسا ہوا کہ (اچانک شعلے بُجھ گئے، اور) روشنی جاتی رہی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ روشنی کے بعد پھر اندھیرا چھا گیا، اور
آنکھیں اندھی ہو کر رہ گئیں، کہ کچھ سُجھائی نہیں دیتا۔ بہرے، گونگے، اندھے ہو کر رہ گئے۔ پس (جن لوگوں کی محرومیِ سعادت ۱۷
کا یہ حال ہے) وہ کبھی اپنی گم گشتگی سے لوٹ نہیں سکتے ؎ ۱۸

حق کے ظہور اور محروموں کی محرومی کی دوسری مثال۔ کائناتِ خلقت کی ہولناکیاں بھی خیر و برکت کے لیے ہیں لیکن محروموں کے حصے میں خوف و سراسیمگی کے سوا کچھ نہیں آتا!!

یا پھر ان لوگوں کی مثال ایسی سمجھو، جیسے آسمان سے پانی کا برسنا کہ اُس
کے ساتھ کالی گھٹائیں، بادلوں کی گرج، اور بجلی کی چمک ہوتی ہے (فرض
کرو، دنیا پانی کے لیے بے قرار تھی۔ اللہ نے اپنی رحمت سے بارش کا سماں
باندھ دیا۔ تو اب ان لوگوں کا حال یہ ہے کہ بارش کی برکتوں کی جگہ صرف اُس کی ہولناکیاں ہی اُن کے حصے میں
آئی ہیں) بادل جب زور سے گرجتے ہیں تو موت کا ڈر اُنہیں دہلا دیتا ہے (اُس کی گرج تو روک سکتے نہیں) اپنے
کانوں میں اُنگلیاں ٹھونسنے لگتے ہیں۔ حالانکہ (اگر بجلی گرنے والی ہی ہو تو اُن کے کان بند کر لینے سے رُک نہیں جائیگی)
اللہ کی قدرت تو (ہر حال میں) منکروں کو گھیرے ہوئے ہے۔ (جب) بجلی (زور سے) چمکتی ہے، تو ان کی خیرگی کا یہ حال ہوتا ۱۹
ہے، (گویا) قریب ہے کہ بینائی اُچک لے۔ اُس کی چمک سے جب فضا روشن ہو جاتی ہے تو دو چار قدم چل لیتے ہیں۔
جب اندھیرا چھا جاتا ہے تو ٹھٹک کر رُک جاتے ہیں۔ اگر اللہ چاہے، تو یہ بالکل بہرے اندھے ہو کر رہ جائیں۔ اور یقیناً
اللہ ہر بات پر قادر ہے ؎ ۲۰

توحیدِ الٰہی کی تلقین اور خالقیت اور ربوبیت سے استدلال، جس کا یقین انسان کی فطرت میں ہے

اے افرادِ نسلِ انسانی! اپنے پروردگار کی عبادت کرو (اُس پروردگار کی) جس نے
تمہیں پیدا کیا، اور اُن سب کو بھی پیدا کیا جو تم سے پہلے گزر چکے ہیں، (اور اس لیے
پیدا کیا) تاکہ اُس کی نافرمانی سے بچو ؎ ۲۱

وہ پروردگارِ عالم جس نے تمہارے لیے زمین فرش کی طرح بچھا دی، اور آسمان کو چھت کی طرح بلند کر دیا، اور پھر

۲۲ وَّاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ ۚ فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝
وَاِنْ كُنْتُمْ فِیْ رَیْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ ۪ وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ
۲۳ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ۝ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا وَلَنْ تَفْعَلُوْا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِیْ وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ ۚۖ
۲۴ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِیْنَ ۝ وَبَشِّرِ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ؕ
كُلَّمَا رُزِقُوْا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ رِّزْقًا ۙ قَالُوْا هٰذَا الَّذِیْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ ۙ وَاُتُوْا بِهٖ مُتَشَابِهًا ؕ وَلَهُمْ فِیْهَاۤ
۲۵ اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ ۙۗ وَّهُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ ۝ اِنَّ اللّٰهَ لَا یَسْتَحْیٖۤ اَنْ یَّضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوْضَةً فَمَا فَوْقَهَا ؕ

تم دیکھ رہے ہو کہ وہی ہے) جو آسمان سے پانی برساتا ہے جس سے زمین شاداب ہو جاتی ہے، اور طرح طرح کے پھل تمہاری غذا کے لیے پیدا ہو جاتے ہیں پس (جب خالقیت اُسی کی خالقیت ہے، اور ربوبیت اُسی کی ربوبیت، تو) ایسا
۲۲ نہ کرو کہ اُس کے ساتھ کسی دوسری ہستی کو شریک اور ہم پایہ بناؤ۔ اور تم جانتے ہو کہ اُس کے سوا کوئی نہیں ہے!

رسالت اور وحی

اور (دیکھو) اگر تمہیں اس (کلام) کی سچائی میں شک ہے جو ہم نے اپنے بندے پر (یعنے پیغمبر اسلام پر) نازل کیا ہے۔ تو (اس کا فیصلہ بہت آسان ہے۔ اگر یہ محض ایک انسانی دماغ کی بناوٹ ہے، تو تم بھی انسان ہو۔ زیادہ نہیں اُس کی سی ایک سورت ہی بنا لاؤ، اور اللہ کے سوا جن (طاقتوں) کو تم نے اپنا حمایتی سمجھ رکھا ہے، اُن سب کو بھی اپنی مدد
۲۳ کے لیے بلا لو۔ پھر اگر تم ایسا نہ کر سکو، اور حقیقت یہ ہے کہ کبھی نہ کر سکو گے، تو اُس آگ کے عذاب سے ڈرو، جو لکڑی کی جگہ انسان
۲۴ اور پتھر کے ایندھن سے سلگتی ہے، اور منکرینِ حق کے لیے طیار رہے!

(لیکن، ہاں،) جن لوگوں نے (انکار و سرکشی کی جگہ) ایمان کی راہ اختیار کی، اور اُن کے کام بھی اچھے ہوئے، تو اُن کے لیے (آگ کی جگہ ابدی راحت کے) باغوں کی بشارت ہے۔ (سرسبز و شاداب باغ) جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں (اور اس لیے وہ کبھی خشک ہونے والے نہیں) جب کبھی اِن باغوں کا کوئی پھل اُن کے حصّے میں آئے گا، (یعنے بہشتی زندگی کی کوئی نعمت اُن کے حصّے میں آئے گی) تو بول اُٹھیں گے، یہ تو وہ نعمت ہے جو پہلے ہمیں دی جا چکی ہے (یعنے نیک عملی کا وہ اجر ہے جس کے ملنے کی ہمیں دنیا میں خبر دی جا چکی ہے) اور یہ اس لیے کہیں گے کہ باہم دگر ملتی جلتی ہوئی چیزیں اُن کے سامنے آئیں گی (یعنے جیسا کچھ اُن کا عمل تھا، ٹھیک ویسی ہی بہشتی زندگی کی نعمت بھی ہوگی) علاوہ بریں اُن کے لیے نیک اور پارسا بیویاں ہونگی، اور اُن کی راحت ہمیشگی کی راحت ہوگی کہ اُسے کبھی زوال
۲۵ نہیں!

مثل فی یہ ہے کہ وحی کا کلام انسانی بول چال کے مطابق ہوتا ہے، اور بیان حقائق کے لیے مثالیں ضروری ہیں۔

اللہ (کا کلام جو انسانوں کو اُن کی سمجھ کے مطابق مخاطب کرتا ہے) ہے اس بات سے نہیں جھجکتا کہ کسی حقیقت کے سمجھانے کے لیے کسی حقیر سے حقیر چیز کی مثال سے کام لے۔ مثلاً مچھر کی، یا اس سے بھی زیادہ کسی حقیر چیز کی۔ پس جو لوگ ایمان رکھتے

فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ وَاَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَيَقُوْلُوْنَ مَاذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا
۲۶ مَثَلًا ۘ يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا ۙ وَّيَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا ۭ وَمَا يُضِلُّ بِهٖٓ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ
اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ ۠ وَيَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ وَيُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ
۲۷ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ۝ كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ ۚ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ اِلَيْهِ
۲۸ تُرْجَعُوْنَ ۝ هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ۤ ثُمَّ اسْتَوٰٓى اِلَى السَّمَاۗءِ فَسَوّٰىھُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ ۭ
۲۹ وَھُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۝ وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰۗىِٕكَةِ اِنِّىْ جَاعِلٌ فِى الْاَرْضِ خَلِيْفَةً ۭ قَالُوْٓا اَتَجْعَلُ فِيْهَا

ہیں، وہ (مثالیں سُن کر اُن کی دانائی میں غور کرتے ہیں، اور) جان لیتے ہیں کہ یہ جو کچھ ہے، اُن کے پروردگار کی طرف سے
ہے۔ لیکن جن لوگوں نے انکارِ حق کی راہ اختیار کی ہے، تو وہ (جہل اور کج فہمی سے حقیقت نہیں پا سکتے۔ وہ) کہتے ہیں:
بھلا ایسی مثال بیان کرنے سے اللہ کا مطلب کیا ہو سکتا ہے؟ بس کتنے ہی انسان ہیں جن کے حصّے میں اس سے
گمراہی آئے گی اور کتنے ہی ہیں جن پر اس (کی سمجھ بوجھ سے) راہ (سعادت) کھل جائے گی۔ اور (خدا کا قانون یہ ہے
۲۶ کہ) وہ گمراہ نہیں کرتا مگر اُنہی لوگوں کو جو (ہدایت کی تمام حدیں توڑ کر) فاسق ہو گئے ہیں:

(فاسق کون ہیں؟ فاسق وہ ہیں) جو احکامِ الٰہی کی اطاعت کا عہد کر کے پھر اُسے توڑ ڈالتے ہیں، اور جن رشتوں
کے جوڑنے کا خدا نے حکم دیا ہے، اُن کے کاٹنے میں بے باک ہیں، اور (اپنی بدعملیوں اور سرکشیوں سے) ملک میں فساد
پھیلاتے ہیں، سو (جن لوگوں کی شقاوتوں کا یہ حال ہے، وہ ہمیشہ گمراہی کی چال ہی چلیں گے۔ اور فی الحقیقت) یہی
۲۷ لوگ ہیں، جن کے لیے سرتاسر نامرادی اور نقصان ہے!

آخرت کی زندگی، اور پہلی پیدائش سے دوسری پیدائش پر استدلال

اے افرادِ نسلِ انسانی! تم کس طرح اللہ سے (اور اس کی عبادت
سے) انکار کر سکتے ہو، جبکہ حالت یہ ہے کہ تمہارا وجود نہ تھا، اُس نے زندگی بخشی، پھر وہی ہے جو زندگی کے بعد موت
۲۸ طاری کرتا ہے اور موت کے بعد دوبارہ زندگی بخشے گا، اور بالآخر تم سب کو اُسی کے حضور لوٹنا ہے!

زمین کی مخلوقات میں نوعِ انسانی کی برتری اور مخلوقاتِ ارضی کا اس لیے ہونا تاکہ انسان اُنہیں اپنے کام میں لائے۔

(اور دیکھو) یہ اُسی (پروردگار) کی کارفرمائی ہے کہ اُس نے زمین
کی ساری چیزیں تمہارے لیے پیدا کیں (تاکہ جس طرح چاہو اُن سے کام
لو) پھر وہ آسمان کی طرف متوجہ ہوا، اور سات آسمان درست کر دیے (جن سے طرح طرح کے فوائد تمہیں حاصل ہوتے
۲۹ ہیں) اور وہ ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے!

انسان کا زمین میں خدا کا خلیفہ ہونا، نوعِ انسانی کی معنوی تکمیل، آدمؑ کا ظہور، اور قوموں کی ہدایت و ضلالت کی ابتدا

اور (اے پیغمبر! اس حقیقت پر غور کر) جب ایسا ہوا تھا کہ تمہارے
پروردگار نے فرشتوں سے کہا: "میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا
ہوں" فرشتوں نے عرض کیا "کیا ایسی ہستی کو خلیفہ بنایا جا رہا ہے جو زمین میں خرابی پھیلائے گی اور خونریزی کرے گی؟

۳۰ مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَآءَ ۚ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ ۗ قَالَ اِنِّيْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝ وَ
۳۱ عَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ ۙ فَقَالَ اَنْۢبِئُوْنِيْ بِاَسْمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝
۳۲ قَالُوْا سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا ۭ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ۝ قَالَ يٰٓاٰدَمُ اَنْۢبِئْهُمْ بِاَسْمَآىِٕهِمْ ۚ فَلَمَّآ
اَنْۢبَاَهُمْ بِاَسْمَآىِٕهِمْ ۙ قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ اِنِّيْٓ اَعْلَمُ غَيْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۙ وَاَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا
۳۳ كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ ۝ وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ۭ اَبٰى وَاسْتَكْبَرَ ۤ وَكَانَ مِنَ
۳۴ الْكٰفِرِيْنَ ۝ وَقُلْنَا يٰٓاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا ۠ وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ
۳۵ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۝ فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ عَنْهَا فَاَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيْهِ ۠ وَقُلْنَا اهْبِطُوْا

حالانکہ ہم تیری حمد و ثنا کرتے ہوئے تیری پاکی و قدوسی کا اقرار کرتے ہیں (کہ تیری مشیت برائی سے پاک، اور تیرا کام نقصان سے
۳۰ منزہ ہے!) اللہ نے کہا "میری نظر جس حقیقت پر ہے، تمہیں اس کی خبر نہیں!"

(پھر جب ایسا ہوا کہ مشیتِ الٰہی نے جو کچھ چاہا تھا، ظہور میں آگیا) اور آدم نے (یہاں تک معنوی ترقی کی کہ تعلیم الٰہی
سے تمام چیزوں کے نام معلوم کر لیے، تو اللہ نے فرشتوں کے سامنے وہ (تمام حقائق) پیش کر دیے، اور فرمایا، اگر تم (اپنے
۳۱ شبہ میں) درستی پر ہو تو بتلاؤ، ان (حقائق) کے نام کیا ہیں؟" فرشتوں نے عرض کیا "خدایا ساری پاکیاں اور بڑائیاں
۳۲ تیرے ہی لیے ہیں۔ ہم تو اتنا ہی جانتے ہیں جتنا تو نے ہمیں سکھلا دیا ہے۔ علم تیرا علم ہے اور حکمت تیری حکمت!" (جب
فرشتوں نے اس طرح اپنے عجز کا اعتراف کر لیا، تو حکم الٰہی ہوا "اے آدم، تم (اب) فرشتوں کو ان (حقائق) کے نام بتلا دو۔"
جب آدم نے بتلا دیے، تو اللہ نے فرمایا "کیا میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ آسمان و زمین کے تمام غیب مجھ پر روشن ہیں؟
۳۳ اور جو کچھ تم ظاہر کرتے ہو وہ بھی میرے علم میں ہے، اور جو کچھ تم چھپاتے تھے، وہ بھی مجھ سے مخفی نہیں!"

فرشتوں کا آدم کے سامنے سربسجود ہو جانا مگر ابلیس کا انکار کرنا۔ آدم کی بہشتی زندگی اور شجرِ ممنوع

اور پھر (دیکھو) جب ایسا ہوا تھا کہ ہم نے فرشتوں کو حکم دیا۔ آدم کے آگے سربسجود ہو جاؤ۔ وہ جھک گئے، مگر ابلیس کی گردن نہیں جھکی، اس نے نہ مانا اور
۳۴ گھمنڈ کیا، اور حقیقت یہ ہے کہ وہ منکروں میں سے تھا۔

پھر ایسا ہوا کہ ہم نے آدم سے کہا "اے آدم، تو اور تیری بیوی، دونوں جنت میں رہو، جس طرح چاہو، کھاؤ پیو، امن
چین کی زندگی بسر کرو۔ مگر دیکھو، وہ جو ایک درخت ہے تو کبھی اس کے پاس بھی نہ پھٹکنا۔ اگر تم اس کے قریب
۳۵ گئے، تو (نتیجہ یہ نکلے گا کہ) حد سے تجاوز کر بیٹھو گے، اور ان لوگوں میں سے ہو جاؤ گے جو زیادتی کرنے والے ہیں۔"

آدم کی لغزش، اعترافِ قصور و قبولیتِ توبہ۔ اور ایک نئی زندگی کا آغاز!

پھر (ایسا ہوا کہ) شیطان کی وسوسہ اندازی نے ان دونوں کے قدم ڈگمگا دیے۔ اور یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ جیسی کچھ (راحت و سکون کی) زندگی بسر کر رہے تھے، اس سے
نکلنا پڑا۔ خدا کا حکم ہوا "یہاں سے نکل جاؤ۔ تم میں سے ہر وجود دوسرے کا دشمن ہے۔ اب تمہیں (جنت کی جگہ) زمین

٣٦ بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ وَلَكُمْ فِي الْأَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَمَتَاعٌ إِلَىٰ حِينٍ ۝ فَتَلَقَّىٰ آدَمُ مِن رَّبِّهِ كَلِمَاتٍ
٣٧ فَتَابَ عَلَيْهِ ۚ إِنَّهُ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ ۝ قُلْنَا اهْبِطُوا مِنْهَا جَمِيعًا ۖ فَإِمَّا يَأْتِيَنَّكُم مِّنِّي هُدًى فَمَن
٣٨ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ۝ وَالَّذِينَ كَفَرُوا وَكَذَّبُوا بِآيَاتِنَا أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ
٣٩ النَّارِ ۖ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ۝ يَا بَنِي إِسْرَائِيلَ اذْكُرُوا نِعْمَتِيَ الَّتِي أَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَأَوْفُوا بِعَهْدِي
٤٠ أُوفِ بِعَهْدِكُمْ وَإِيَّايَ فَارْهَبُونِ ۝ وَآمِنُوا بِمَا أَنزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ وَلَا تَكُونُوا أَوَّلَ كَافِرٍ
٤١ بِهِ ۖ وَلَا تَشْتَرُوا بِآيَاتِي ثَمَنًا قَلِيلًا وَإِيَّايَ فَاتَّقُونِ ۝ وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ وَ
٤٢ أَنتُمْ تَعْلَمُونَ ۝

٣٦ میں رہنا ہے، اور ایک خاص وقت تک کے لیے (جو علم الٰہی میں مقرر ہو چکا ہے) اُس سے فائدہ اُٹھانا ہے"۔
پھر ایسا ہوا کہ آدم نے اپنے پروردگار کی تعلیم سے چند کلمات معلوم کر لیے (جن کے لیے اُس کے حضور قبولیت
تھی) پس اللہ نے اُس کی توبہ قبول کر لی۔ اور بلاشبہ وہی ہے جو رحمت سے درگزر کرنے والا ہے، اور اُس کی درگزر
٣٧ کی کوئی انتہا نہیں!

وحی الٰہی کی ہدایت اور انسان کی سعادت و شقاوت کا قانون

(آدم کی توبہ قبول ہو گئی، اور) ہمارا حکم ہوا "اب تم سب یہاں
سے نکل چلو، (اور جس نئی زندگی کا دروازہ تم پر کھولا جا رہا ہے، اُسے اختیار کرو) لیکن (یاد رکھو) جب کبھی ایسا ہو گا کہ ہماری
جانب سے تم پر راہِ (حق) کھولی جائے گی، تو (تمہارے لیے دو ہی راہیں ہوں گی) جو کوئی ہدایت کی پیروی کریگا، اُس
٣٨ کے لیے کسی طرح کی غمگینی نہیں۔ جو کوئی انکار کریگا اور ہماری نشانیاں جُھٹلائے گا، وہ دوزخی گروہ میں سے ہو گا۔ ہمیشہ عذاب
٣٩ میں رہنے والا"۔

وحی الٰہی کی ہدایت کا جاری ہونا، اور اس سلسلہ میں بنی اسرائیل سے خطاب کہ کتاب اللہ کے سب سے بڑے حاملِ وحی سمجھے جاتے تھے

اے بنی اسرائیل! میری نعمت یاد کرو، وہ نعمت
جس سے میں نے تمہیں سرفراز کیا تھا، اور دیکھو،
اپنا عہد پورا کرو (جو ہدایت قبول کرنے اور اُس پر کاربند ہونے کا عہد ہے) میں بھی اپنا عہد پورا کرونگا
(جو ہدایت پر کاربند ہونے والوں کے لیے کامرانی و سعادت کا عہد ہے) اور دیکھو میرے سوا کوئی نہیں،
٤٠ پس دوسروں سے نہیں، صرف مجھی سے ڈرو!
اور اُس کلام پر ایمان لاؤ جو میں نے نازل کیا ہے، اور جو اُس کلام کی تصدیق کرتا ہوا نمایاں ہوا ہے جو تمہارے
پاس (پہلے سے) موجود ہے، اور ایسا نہ کرو کہ اُس کے انکار میں (شقاوت کا) پہلا قدم جو اُٹھے، وہ تمہارا ہو۔ اور (دیکھو)
٤١ میرے سوا کوئی نہیں، پس میری نافرمانی سے بچو!
٤٢ اور ایسا نہ کرو کہ حق کو باطل کے ساتھ ملا کر مشتبہ بنا دو، اور حق کو چھپاؤ، حالانکہ تم جانتے ہو حقیقت حال کیا ہے!

وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ ۝ اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ ۴۳
وَاَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝ وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ؕ وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ ۴۴
الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ وَاَنَّهُمْ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ۝ يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ ۴۶ ع ۵
عَلَيْكُمْ وَاَنِّيْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ۝ وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِيْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْئًا وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا ۴۷
شَفَاعَةٌ وَّلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ۝ وَاِذْ نَجَّيْنٰكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَسُوْمُوْنَكُمْ ۴۸
سُوْٓءَ الْعَذَابِ يُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ وَيَسْتَحْيُوْنَ نِسَآءَكُمْ ؕ وَفِيْ ذٰلِكُمْ بَلَآءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِيْمٌ ۝ ۴۹

نماز قائم کرو (جس کی حقیقت تم نے کھو دی ہے) زکوٰۃ ادا کرو (جس کا تم میں اخلاص باقی نہیں رہا) اور جب
اللہ کے حضور جھکنے والے جھکیں، تو اُن کے ساتھ تم بھی سرِ نیاز جھکا دو! ۴۳

تم لوگوں کو نیکی کا حکم دیتے ہو مگر خود اپنی خبر نہیں لیتے کہ تمہارے کاموں کا کیا حال ہے، حالانکہ خدا کی کتاب
تمہارے پاس ہے اور ہمیشہ تلاوت کرتے رہتے ہو؟ (افسوس تمہاری عقلوں پر!) کیا اتنی سی موٹی بات بھی تمہاری سمجھ
میں نہیں آتی؟ ۴۴

صبر اور نماز دو بڑی روحانی قوتیں ہیں، جن سے
اصلاحِ نفس اور انقلابِ حال میں مدد لی جا سکتی ہے

اور (دیکھو) صبر اور نماز (کی قوتوں) سے (اپنی اصلاح میں) مدد لو لیکن نماز
ایک ایسا عمل ہے جو (انسان کی راحت طلب طبیعت پر) بہت ہی کٹھن
گزرتا ہے۔ البتہ جن لوگوں کے دل اللہ کے حضور جھکے ہوئے ہیں، اور جو سمجھتے ہیں، انہیں اپنے پروردگار سے ملنا اور ۴۵
(بالآخر) اُس کے حضور لوٹنا ہے، تو اُن پر یہ عمل کٹھن نہیں ہو سکتا۔ ۴۶

بنی اسرائیل کے ایام و وقائع کا تذکرہ اور
قوموں کی ہدایت و ضلالت کے حقائق

اے بنی اسرائیل! میری نعمتیں یاد کرو جن سے میں نے تمہیں سرفراز کیا تھا، اور
(خصوصاً) یہ (نعمت) کہ دنیا کی قوموں پر تمہیں فضیلت دی تھی! اُس دن کی پکڑ سے ۴۷
ڈرو جبکہ (انسان کی کوئی کوشش بھی اُسے بُرے کاموں کے نتیجوں سے نہیں بچا سکے گی اُس دن) نہ تو کوئی انسان
دوسرے انسان کے کام آئے گا، نہ کسی کی سفارش سنی جائے گی، نہ کسی طرح کا بدلہ قبول کیا جائے گا، اور نہ کہیں سے
کسی طرح کی مدد ملے گی! ۴۸

مصر کے فرعونوں کی غلامی سے نجات اور کتابِ فرقان کا عطیہ، لیکن بنی اسرائیل
کا مصری بُت پرستی کی طرف مائل ہو جانا، اور گوسالہ پرستی شروع کر دینی۔

اور (اپنی تاریخ حیات کا) وہ وقت یاد کرو جب
ہم نے تمہیں خاندانِ فرعون (کی غلامی) سے،
جنہوں نے تمہیں نہایت سخت عذاب میں ڈال رکھا تھا، نجات دی تھی۔ وہ تمہارے لڑکوں کو بے دریغ ذبح کر ڈالتے
(تاکہ تمہاری نسل نابود ہو جائے) اور تمہاری عورتوں کو زندہ چھوڑ دیتے (تاکہ حکمراں قوم کی لونڈیاں بن کر زندگی بسر کریں)
اور فی الحقیقت اس صورتِ حال میں، تمہارے پروردگار کی طرف سے تمہارے لیے بڑی ہی آزمائش تھی! ۴۹

وَإِذْ فَرَقْنَا بِكُمُ الْبَحْرَ فَأَنْجَيْنٰكُمْ وَأَغْرَقْنَا آلَ فِرْعَوْنَ وَأَنْتُمْ تَنْظُرُونَ ○ وَإِذْ وٰعَدْنَا مُوسٰى أَرْبَعِينَ ۵۰
لَيْلَةً ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْ بَعْدِهٖ وَأَنْتُمْ ظٰلِمُونَ ○ ثُمَّ عَفَوْنَا عَنْكُمْ مِنْ بَعْدِ ذٰلِكَ لَعَلَّكُمْ ۵۱
تَشْكُرُونَ ○ وَإِذْ آتَيْنَا مُوسَى الْكِتٰبَ وَالْفُرْقَانَ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ ○ وَإِذْ قَالَ مُوسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ ۵۲-۵۳
إِنَّكُمْ ظَلَمْتُمْ أَنْفُسَكُمْ بِاتِّخَاذِكُمُ الْعِجْلَ فَتُوبُوا إِلٰى بَارِئِكُمْ فَاقْتُلُوا أَنْفُسَكُمْ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَكُمْ عِنْدَ
بَارِئِكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ إِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ ○ وَإِذْ قُلْتُمْ يٰمُوسٰى لَنْ نُؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى ۵۴
اللّٰهَ جَهْرَةً فَأَخَذَتْكُمُ الصّٰعِقَةُ وَأَنْتُمْ تَنْظُرُونَ ○ ثُمَّ بَعَثْنٰكُمْ مِنْ بَعْدِ مَوْتِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ○ ۵۵-۵۶
وَظَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْغَمَامَ

اور پھر وہ وقت یاد کرو، جب (تم مصر سے نکلے تھے اور فرعون تمہارا تعاقب کر رہا تھا) ہم نے سمندر کا پانی اس
طرح الگ الگ کر دیا کہ تم بچ نکلے، مگر فرعون کا گروہ غرق ہو گیا، اور تم (کنارے پر کھڑے) دیکھ رہے تھے! ۵۰
اور (پھر وہ واقعہ بھی یاد کرو) جب ہم نے موسیٰ سے چالیس راتوں والا وعدہ کیا تھا۔ پھر جب ایسا ہوا کہ وہ چالیس
دن کے لیے تمہیں چھوڑ کر پہاڑ پر چلا گیا، تو اُس کے جاتے ہی) تم نے ایک بچھڑے کی پرستش اختیار کر لی، اور تم راہِ حق
سے ہٹ گئے تھے۔ (یہ تمہاری بڑی ہی گمراہی تھی) لیکن ہم نے (اپنی رحمت سے) درگزر کی تاکہ اللہ کی بخشائشوں کی قدر کرو ۵۱ ۵۲
اور پھر (وہ واقعہ بھی یاد کرو) جب ہم نے (چالیس راتوں والا وعدہ پورا کیا تھا، اور) موسیٰ کو الکتاب (یعنے تورات)
اور الفرقان (یعنے حق و باطل میں امتیاز کرنے والی قوت) عطا فرمائی تھی، تاکہ تم پر (سعادت و فلاح کی) راہ کھل جائے ۵۳
اور (پھر وہ وقت) جب موسیٰ (کتابِ الٰہی کا عطیہ لے کر پہاڑ سے اترا تھا، اور تمہیں ایک بچھڑے کی پوجا میں
سرگرم دیکھ کر) پکار اٹھا تھا: اے میری قوم! (افسوس تمہاری حق فراموشی پر!) تم نے بچھڑے کی پوجا کر کے خود اپنے ہاتھوں
اپنے کو تباہ کر دیا ہے پس چاہیئے کہ اپنے خالق کے حضور توبہ کرو، اور گوسالہ پرستی کے بدلے اپنی جانوں کو قتل کرو۔ اسی میں
خدا کے نزدیک تمہارے لئے بہتری ہے۔ چنانچہ تمہاری توبہ قبول کر لی گئی) اور اللہ بڑا ہی رحمت والا اور رحمت سے درگزر
کرنے والا ہے! ۵۴

بنی اسرائیل کی یہ گمراہی کہ اُن کے دلوں میں وحی الٰہی پر کامل یقین نہ تھا

اور (پھر وہ واقعہ یاد کرو) جب تم نے کہا تھا: اے موسیٰ! ہم
کبھی تم پر یقین کرنے والے نہیں جب تک کہ کھلے طور پر اللہ کو (تم سے بات کرتا ہوا) نہ دیکھ لیں۔ پھر (تمہیں یاد ہے کہ اس
گمراہانہ جسارت کا نتیجہ کیا نکلا تھا؟ یہ نکلا تھا کہ بجلی کے کڑاکے نے (اچانک) آگھیرا، اور تم نظر اٹھائے تک رہے تھے! ۵۵
پھر ہم نے تمہیں اس ہلاکت کے بعد (دوبارہ) اٹھا کھڑا کیا، تاکہ اپنے آپ کو نعمتِ الٰہی کا قدر شناس ثابت کرو! ۵۶

صحرائے سینا کی بے آب و گیاہ سرزمین میں زندگی کی تمام ضروریات کا مہیا ہو جانا لیکن بنی اسرائیل کا کفرانِ نعمت کرنا

اور (پھر جب ایسا ہوا تھا کہ صحرائے سینا کی بے آب و گیاہ سرزمین
میں دھوپ کی شدت اور غذا کے نہ ملنے سے تم ہلاک ہو جانے والے

وَاَنْزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ وَمَا ظَلَمُوْنَا وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ
٥٧ يَظْلِمُوْنَ ۝ وَاِذْ قُلْنَا ادْخُلُوْا هٰذِهِ الْقَرْيَةَ فَكُلُوْا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ رَغَدًا وَّادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَّ
٥٨ قُوْلُوْا حِطَّةٌ نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطٰيٰكُمْ وَسَنَزِيْدُ الْمُحْسِنِيْنَ ۝ فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا قَوْلًا غَيْرَ الَّذِيْ
٥٩ قِيْلَ لَهُمْ فَاَنْزَلْنَا عَلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ۝ع وَاِذِ اسْتَسْقٰى مُوْسٰى ع ٦
لِقَوْمِهٖ فَقُلْنَا اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ فَانْفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا قَدْ عَلِمَ كُلُّ اُنَاسٍ
٦٠ مَّشْرَبَهُمْ كُلُوْا وَاشْرَبُوْا مِنْ رِّزْقِ اللّٰهِ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ۝ وَاِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى لَنْ نَّصْبِرَ

تھے، تو) ہم نے تمہارے سروں پر ابر کا سایہ پھیلا دیا، اور منؔ اور سلوٰی کی غذا فراہم کر دی (تم سے کہا گیا) خدا نے تمہاری غذا کے
لیے جو اچھی چیزیں مہیا کر دی ہیں، انہیں بفراغت کھاؤ، اور کسی طرح کی تنگی محسوس نہ کرو) لیکن اس پر بھی تم اپنی بدعملیوں
٥٧ سے باز نہ آئے۔ غور کرو) تم نے (اپنی ناشکریوں سے) ہمارا کیا بگاڑا؟ خود اپنا ہی نقصان کرتے رہے ؏

بنی اسرائیل کی یہ گمراہی کہ جب انہیں فتح و کامرانی عطا کی گئی تو عبودیت و نیاز کی جگہ غفلت و غرور میں مبتلا ہو گئے۔

اور پھر کیا اُس وقت کی یاد بھی تمہارے اندر عبرت پیدا نہیں کر سکتی؟
جب ایک شہر کی آبادی تمہارے سامنے تھی، اور ہم نے حکم دیا تھا
کہ اس آبادی میں (فتح مندانہ) داخل ہو جاؤ، اور پھر کھاؤ پیو، آرام چین کی زندگی بسر کرو، لیکن جب شہر کے دروازے میں
قدم رکھو، تو تمہارے سر اللہ کے حضور جھکے ہوئے ہوں، اور تمہاری زبانوں پر توبہ و استغفار کا کلمہ جاری ہو کہ "حطۃ! حطۃ!
(خدایا، ہمیں گناہوں کی آلودگی سے پاک کر دے!) اگر تم نے ایسا کیا، تو) اللہ تمہاری خطائیں معاف کر دیگا، اور (اُس کا قانون
٥٨ یہی ہے کہ) نیک کردار انسانوں کے اعمال میں برکت دیتا ہے، اور اُن کے اجر میں فراوانی ہوتی رہتی ہے ؏
لیکن پھر ایسا ہوا کہ تم میں سے اُن لوگوں نے جن کی راہ ظلم و شرارت کی راہ تھی، خدا کی بتلائی ہوئی بات ایک دوسری
بات سے بدل ڈالی (اور عجز و عبودیت کی جگہ غفلت و غرور میں مبتلا ہو گئے) نتیجہ یہ نکلا کہ ظلم و شرارت کرنے والوں پر ہم نے
٥٩ آسمان سے عذاب نازل کیا، اور یہ اُن کی نافرمانیوں کی سزا تھی ؏

صحرائے سینا میں پانی کے چشموں کا نمایاں ہو جانا لیکن بنی اسرائیل کا پانی کے لیے آپس میں جھگڑنا اور فتنہ و فساد پھیلانا

اور پھر (وہ واقعہ بھی یاد کرو) جب موسٰی نے اپنی قوم کے لیے پانی
طلب کیا تھا، اور ہم نے حکم دیا تھا، اپنی لاٹھی سے پہاڑ کی چٹان پر
ضرب لگاؤ (تم دیکھو گے کہ پانی تمہارے لیے موجود ہے۔ موسٰی نے اس حکم کی تعمیل کی) چنانچہ بارہ چشمے پھوٹ نکلے، اور تمام
لوگوں نے اپنے اپنے پانی لینے کی جگہ معلوم کر لی۔ اُسی وقت تم سے کہا گیا تھا) کھاؤ پیو، خدا کی بخشائش سے فائدہ اٹھاؤ
٦٠ اور اس سرزمین میں جھگڑا فساد نہ کرو ؏

محکومی غلامی سے قوم کا اخلاق پست ہو جاتا ہے، اور بلند مقاصد کے لیے جوش و عزم باقی نہیں رہتا۔ بنی اسرائیل فراعنۂ مصر کی غلامی سے

اور پھر (دیکھو، تمہاری تاریخ حیات کا وہ واقعہ بھی کس درجہ
عبرت انگیز ہے) جب تم نے موسٰی سے کہا تھا ہم سے یہ نہیں

ؔ منؔ درخت کا شیرہ ہے جو گوند کی طرح جم جاتا ہے اور خوش ذائقہ و مقوی ہوتا ہے۔ سلوٰی ایک پرند ہے۔ یہ دونوں چیزیں کوہ طور کے اطراف و
جوانب میں بکثرت ہوتی ہیں۔ من کا حلوا میں نے خود کھایا ہے جو فلسطین کے یہودی بنایا کرتے ہیں ١٢

عَلٰی طَعَامٍ وَّاحِدٍ فَادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُخْرِجْ لَنَا مِمَّا تُنْۢبِتُ الْاَرْضُ مِنْۢ بَقْلِهَا وَقِثَّآئِهَا وَفُوْمِهَا وَ
عَدَسِهَا وَبَصَلِهَا ؕ قَالَ اَتَسْتَبْدِلُوْنَ الَّذِیْ هُوَ اَدْنٰی بِالَّذِیْ هُوَ خَیْرٌ ؕ اِهْبِطُوْا مِصْرًا فَاِنَّ لَكُمْ مَّا
سَاَلْتُمْ ؕ وَضُرِبَتْ عَلَیْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ ۗ وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا یَكْفُرُوْنَ
٦١ بِاٰیٰتِ اللّٰهِ وَیَقْتُلُوْنَ النَّبِیّٖنَ بِغَیْرِ الْحَقِّ ؕ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا یَعْتَدُوْنَ ۟ اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ ع ٧
الَّذِیْنَ هَادُوْا وَالنَّصٰرٰی وَالصّٰبِـِٕیْنَ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ
٦٢ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ ۟ وَاِذْ اَخَذْنَا مِیْثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ ؕ خُذُوْا مَاۤ

آزاد ہو گئے تھے، اور قومی عظمت کا مستقبل اُن کے سامنے تھا، لیکن وہ اُن حقیر راحتوں کے لیے ترستے تھے جو مصر کی غلامانہ زندگی میں میسر تھیں، اور وہ چھوٹی چھوٹی تکلیفیں شاق گزرتی تھیں جو آزادی و عظمت کی راہ میں پیش آتی تھیں!

ہو سکتا کہ ایک ہی طرح کے کھانے پر قناعت کر لیں، پس اپنے پروردگار سے دعا کرو ہمارے لیے وہ تمام چیزیں پیدا کر دی جائیں، جو زمین کی پیداوار ہیں۔ سبزی، ترکاری، گیہوں، دال
پیاز، لہسن، وغیرہ جو مصر میں ہم کھایا کرتے تھے) موسیٰ نے یہ سُن کر کہا (افسوس تمہاری غفلت اور بے حسی پر!) کیا تم چاہتے ہو، ایک ادنیٰ سی بات کے لیے (یعنے غذا کی لذت کے لیے) اُس مقصدِ عظیم سے دست بردار ہو جاؤ جس میں بڑی ہی خیر و برکت ہے؟ (یعنے قومی آزادی و سعادت سے؟ اچھا، اگر تمہاری غفلت و بدبختی کا یہی حال ہے، تو) یہاں سے نکلو، شہر کی راہ لو، وہاں یہ تمام چیزیں مل جائیں گی جن کے لیے ترس رہے ہو۔ بہر حال بنی اسرائیل پر خواری و نامرادی کی مار پڑی، اور خدا کے غضب کے سزاوار ہوئے۔ اور یہ اس لیے ہوا کہ خدا کی آیتوں سے انکار کرتے تھے اور اُس کے نبیوں کے ناحق قتل میں بے باک تھے، اور (گمراہی و شقاوت کی یہ روح ان میں) اس لیے (پیدا ہو گئی) کہ (اطاعت کی جگہ) سرکشی سما
٦١ گئی تھی، اور تمام حدیں توڑ کر بے لگام ہو گئے تھے!

اس اصلِ عظیم کا اعلان کہ سعادت و نجات ایمان و عمل سے وابستہ ہے۔ نسل و خاندان یا مذہبی گروہ بندی کو اس میں کوئی دخل نہیں۔ یہودی جب ایمان و عمل سے محروم ہو گئے، تو نہ تو اُن کی نسل اُن کے کام آئی، نہ یہودیت کی گروہ بندی سود مند ہو سکی۔ خدا کے قانون نے یہ نہیں دیکھا کہ وہ کون ہیں اور کس گروہ بندی سے تعلق رکھتے ہیں؟ بلکہ صرف یہ دیکھا کہ عمل کا کیا حال ہے؟ اور پھر جب آزمائشِ عمل میں پورے نہ اترے، تو مغضوب و نامراد ہو گئے!

جو لوگ (پیغمبر اسلام پر) ایمان لا چکے ہیں، وہ ہوں، یا وہ لوگ ہوں جو یہودی ہیں، یا نصاریٰ اور صابی ہوں (کوئی ہو اور کسی گروہ بندی میں سے ہو) لیکن جو کوئی بھی خدا پر اور آخرت کے دن پر ایمان لایا، اور اُس کے اعمال بھی اچھے ہوئے تو وہ اپنے ایمان و عمل کا اجر اپنے پروردگار سے ضرور پائے گا۔ اس
٦٢ کے لیے نہ تو کسی طرح کا کھٹکا ہو گا، نہ کسی طرح کی غمگینی!

بنی اسرائیل کی یہ گمراہی کہ شریعت کے احکام پر سچائی کے ساتھ عمل نہیں کرتے تھے، اور ان سے بچنے کے لیے طرح طرح کے شرعی حیلے گڑھ لیے تھے یعنے محض نمائشی طور پر تو ان کی تعمیل کر لیتے، لیکن جو کچھ حقیقی مقصد تھا وہ پورا نہ کرتے۔

اور پھر (اپنی تاریخِ حیات کا وہ وقت بھی یاد کرو) جب ہم نے تم سے تمہارا عہد لیا تھا، اور (یہ وہ وقت تھا کہ تم نیچے کھڑے تھے، اور) کوہِ طور کی چوٹیاں تم پر بلند کر دی تھیں: "دیکھو، جو کتاب تمہیں دی گئی ہے مضبوطی

٦٣ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّاذْكُرُوْا مَا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ○ ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ ۚ فَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ
٦٤ وَرَحْمَتُهٗ لَكُنْتُمْ مِّنَ الْخٰسِرِيْنَ ○ وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِيْنَ اعْتَدَوْا مِنْكُمْ فِى السَّبْتِ فَقُلْنَا لَهُمْ كُوْنُوْا قِرَدَةً
٦٥ ٦٦ خٰسِـِٕيْنَ ○ فَجَعَلْنٰهَا نَكَالًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهَا وَمَا خَلْفَهَا وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ ○ وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖٓ
٦٧ اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تَذْبَحُوْا بَقَرَةً ۗ قَالُوْٓا اَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا ۗ قَالَ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ ○
قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا هِىَ ۗ قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا فَارِضٌ وَّلَا بِكْرٌ ۭ عَوَانٌۢ بَيْنَ
٦٨ ذٰلِكَ ۭ فَافْعَلُوْا مَا تُؤْمَرُوْنَ ○ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا لَوْنُهَا ۭ قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ
صَفْرَاۗءُ ۙ

٦٣ مضبوطی کے ساتھ جم جاؤ، اور جو کچھ اس میں بیان کیا گیا ہے، اُسے ہمیشہ یاد رکھو (اور یہ اس لیے ہے) تاکہ تم (نافرمانی سے) بچو۔
لیکن پھر تم اپنے عہد سے پھر گئے، اور اگر اللہ کا فضل اور اُس کی رحمت تمہارا ساتھ نہ دیتی، تو (تمہاری گمراہی کی چال
٦٤ تو ایسی تھی کہ) فوراً ہی تباہی کے حوالے ہو جاتے ؛

اور یقیناً تم اُن لوگوں کے حال سے بے خبر نہیں ہو جو تم ہی میں سے تھے، اور جنہوں نے "سبت" (یعنے تعطیل اور
عبادت کے مقدس دن) کے معاملہ میں راست بازی کی حدیں توڑ ڈالی تھیں (یعنے حکم شریعت سے بچنے کے لیے حیلوں
اور مکاریوں سے کام لیا تھا) ہم نے کہا، ذلیل و خوار بندروں کی طرح ہو جاؤ۔ (انسانوں کے پاس سے ہمیشہ دھتکارے
٦٥ نکالے جاؤ گے) چنانچہ ایسا ہی ہوا، اور ہم نے اس معاملہ کو اُن سب کے لیے جن کے سامنے ہوا، اور اُن کے لیے بھی جو
بعد کو پیدا ہوئے، تازیانۂ عبرت بنا دیا، اور اُن لوگوں کے لیے جو متقی ہیں، اس میں نصیحت و دانائی رکھ دی ؛

اور پھر (وہ معاملہ یاد کرو) جب موسیٰ نے اپنی قوم سے یہ بات کہی تھی کہ خدا کا حکم ہے ایک گائے ذبح کر دو۔ (بجائے اس کے کہ راست بازی کے ساتھ اس پر عمل کرتے، لگے طرح طرح کی کٹ حجتیاں کرنے) کہنے لگے: معلوم ہوتا ہے،

> کثرت سوال، اور تعمق فی الدین کی گمراہی۔ یعنے احکام حق کی سیدھی سادی اطاعت کرنے کی جگہ رد و کد کرنا، طرح طرح کے سوالات گڑھنا، بلا ضرورت باریک بینیاں اور دقیقہ سنجیاں کرنی، اور شریعت کی سادگی اور آسانی کو سختی اور پیچیدگی سے بدل دینا۔ حکم ذبح کے لیے گنتی باب ١٩: ٢ و استثنا ٢١: ٢ دیکھو

تم ہمارے ساتھ تمسخر کر رہے ہو۔ موسیٰ نے کہا۔ نعوذ باللہ اگر میں (احکام الٰہی کی تبلیغ میں تمسخر کروں اور) جاہلوں کا سا شیوہ
اختیار کروں۔ یہ سُن کر وہ بولے۔ (اگر ایسا ہی ہے، تو) اپنے پروردگار سے درخواست کرو، وہ کھول کر بیان کر دے، کس
طرح کا جانور ذبح کرنا چاہیے؟ (یعنے ہمیں تفصیلات معلوم ہونی چاہئیں) موسیٰ نے کہا۔ خدا کا حکم یہ ہے کہ ایسی گائے
ہو، جو نہ تو بالکل بوڑھی ہو، نہ بالکل بچھیا۔ درمیانی عمر کی ہو۔ اور اب (کہ تمہیں تفصیل کے ساتھ حکم مل گیا ہے،) چاہیے کہ
اس کی تعمیل کرو۔ لیکن انہوں نے پہلے سوال کا جواب پا کر ایک دوسرا سوال کھڑا کر دیا) کہنے لگے، اپنے پروردگار سے
درخواست کرو۔ وہ یہ بھی بتلا دے کہ جانور کا رنگ کیسا ہونا چاہیے؟ موسیٰ نے کہا۔ حکم الٰہی یہ ہے کہ اُس کا رنگ پیلا ہو۔

فَاقِعٌ لَّوْنُهَا تَسُرُّ النّٰظِرِيْنَ ۞ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا هِيَ اِنَّ الْبَقَرَ تَشٰبَهَ عَلَيْنَا وَاِنَّآ اِنْ شَآءَ ٦٩
اللّٰهُ لَمُهْتَدُوْنَ ۞ قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا ذَلُوْلٌ تُثِيْرُ الْاَرْضَ وَلَا تَسْقِي الْحَرْثَ مُسَلَّمَةٌ لَّا شِيَةَ ٧٠
فِيْهَا قَالُوا الْئٰنَ جِئْتَ بِالْحَقِّ فَذَبَحُوْهَا وَمَا كَادُوْا يَفْعَلُوْنَ ۞ وَاِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا فَادّٰرَءْتُمْ فِيْهَا وَاللّٰهُ ٧١ ع
مُخْرِجٌ مَّا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ ۞ فَقُلْنَا اضْرِبُوْهُ بِبَعْضِهَا كَذٰلِكَ يُحْيِ اللّٰهُ الْمَوْتٰى وَيُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۞ ٧٢-٧٣
ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ مِّنْ بَعْدِ ذٰلِكَ فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً وَاِنَّ مِنَ الْحِجَارَةِ لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْاَنْهٰرُ
وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَشَّقَّقُ فَيَخْرُجُ مِنْهُ الْمَآءُ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ۞ ٧٤

خوب گہرا پیلا۔ ایسا کہ دیکھنے والوں کا جی دیکھ کر خوش ہو جائے۔ (جب رنگ کی خصوصیت بھی معیّن ہو چکی تو اُنہوں نے ٦٩
ایک اور اُلجھاؤ پیدا کر دیا) کہنے لگے (ان ساری باتوں کے بعد بھی) ہمارے لیے جانور کی پہچان مشکل ہے۔ اپنے پروردگار
سے کہو کہ (اور زیادہ کھول کے) بتلا دے کہ جانور کیسا ہونا چاہیے؟ اِن شاء اللہ ہم ضرور پتہ لگا لینگے۔ اس پر موسیٰ نے ٧٠
کہا اللہ فرماتا ہے۔ ایسی گائے ہو، جو نہ تو کبھی ہل میں جوتی گئی ہو، نہ کبھی آب پاشی کے لیے کام میں لائی گئی ہو۔ پوری طرح
صحیح سالم، داغ دھبے سے پاک و صاف۔ (جب معاملہ اس حد تک پہنچ گیا، تو پھر عاجز ہو کر) بولے۔ ہاں، اب تم نے
ٹھیک ٹھیک بات بتلا دی۔ چنانچہ جانور ذبح کیا گیا۔ اگرچہ ایسا کرنے پر وہ (دل سے) آمادہ نہ تھے۔ ٧١

بنی اسرائیل کا قتلِ نفس میں بے باک ہو جانا جو شریعت الٰہی کے رو سے انسان کا بڑے سے بڑا جرم ہے

اور پھر (غور کرو، وہ واقعہ) جب تم نے (یعنے تمہاری قوم نے) ایک جان
ہلاک کر دی تھی، اور اس کی نسبت آپس میں جھگڑتے اور ایک دوسرے پر الزام
لگاتے تھے اور جو بات تم چھپانی چاہتے تھے، خدا اُسے آشکارا کر دینے والا تھا۔ ٧٢

چنانچہ ایسا ہوا کہ ہم نے حکم دیا، اُس (شخص) پر (جو فی الحقیقت قاتل تھا) مقتول کے بعض (اجزاءِ جسم) سے ضرب
لگاؤ (جب ایسا کیا گیا تو حقیقت کھُل گئی اور قاتل کی شخصیت معلوم ہو گئی) اللہ اسی طرح مُردوں کو زندگی بخشتا، اور تمہیں
اپنی (قدرت و حکمت کی) نشانیاں دکھلاتا ہے، تاکہ سمجھ بوجھ سے کام لو۔ ٧٣

بنی اسرائیل کی قلبی و اخلاقی حالت کا انتہائی تنزل، حتیٰ کہ اُس حالت کا پیدا ہو جانا جب عبرت پذیری اور تنبہ کی استعداد یک قلم معدوم ہو جاتی ہے اور فکرِ انسان اپنی تباہ شدہ حالت پر قانع و مطمئن ہو جاتا ہے۔

اور پھر تمہارے دل سخت پڑ گئے۔ ایسے سخت، گویا پتھر کی چٹانیں
ہیں! (نہیں) اِک پتھر سے بھی زیادہ سخت، کیونکہ پتھروں میں تو
بعض پتھر ایسے بھی ہیں، جن میں سے پانی کے چشمے پھوٹ نکلتے
ہیں، اور انہی پتھروں میں ایسی چٹانیں بھی ہیں جو شق ہو کر دو ٹکڑے ہو جاتی ہیں اور ان میں سے پانی اپنی راہ نکال لیتا ہے
اور پھر انہی میں وہ چٹانیں بھی ہوئیں جو خوفِ الٰہی سے لرز کر گر پڑتی ہیں (پس افسوس اُن دلوں پر، جن کے آگے پتھر کی سختی
اور چٹانوں کا جماؤ بھی ماند پڑ جائے! اور یاد رکھو، خدا (کا قانون) تمہارے کرتوتوں کی طرف سے غافل نہیں ہے۔ ٧٤

بنی اسرائیل کے گزشتہ ایام و وقائع کے ذکر کے بعد، اُن کے موجودہ

(مسلمانو!) کیا تم توقع رکھتے ہو کہ یہ لوگ (کلامِ حق پر غور کریں گے، اور

أَفَتَطْمَعُونَ أَنْ يُؤْمِنُوا لَكُمْ وَقَدْ كَانَ فَرِيقٌ مِنْهُمْ يَسْمَعُونَ كَلَامَ اللَّهِ ثُمَّ يُحَرِّفُونَهُ مِنْ بَعْدِ مَا عَقَلُوهُ
٧٥ وَهُمْ يَعْلَمُونَ ۝ وَإِذَا لَقُوا الَّذِينَ آمَنُوا قَالُوا آمَنَّا وَإِذَا خَلَا بَعْضُهُمْ إِلَىٰ بَعْضٍ قَالُوا أَتُحَدِّثُونَهُمْ
٧٦ بِمَا فَتَحَ اللَّهُ عَلَيْكُمْ لِيُحَاجُّوكُمْ بِهِ عِنْدَ رَبِّكُمْ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ۝ أَوَلَا يَعْلَمُونَ أَنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ مَا
النصف ٧٧، ٧٨ يُسِرُّونَ وَمَا يُعْلِنُونَ ۝ وَمِنْهُمْ أُمِّيُّونَ لَا يَعْلَمُونَ الْكِتَابَ إِلَّا أَمَانِيَّ وَإِنْ هُمْ إِلَّا يَظُنُّونَ ۝
فَوَيْلٌ لِلَّذِينَ يَكْتُبُونَ الْكِتَابَ بِأَيْدِيهِمْ ثُمَّ يَقُولُونَ هَٰذَا مِنْ عِنْدِ اللَّهِ لِيَشْتَرُوا بِهِ ثَمَنًا
٧٩ قَلِيلًا فَوَيْلٌ لَهُمْ مِمَّا كَتَبَتْ أَيْدِيهِمْ وَوَيْلٌ لَهُمْ مِمَّا يَكْسِبُونَ ۝ وَقَالُوا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ إِلَّا

اعمال و اقوال پر تبصرہ، اُن کی اعتقادی اور عملی گمراہیوں کی
تشریح، اور دینِ الٰہی کے جمع و براہین۔
سب سے پہلی اور بنیادی گمراہی یہ ہے کہ نہ تو کتاب اللہ
کا سچا علم باقی رہا ہے، نہ سچا عمل!

اُس کی سچائی پرکھ کر تمہاری بات مان لیں گے، حالانکہ ان میں ایک
گروہ ایسا تھا جو اللہ کا کلام سُنتا تھا، اور اُس کا مطلب سمجھتا تھا
لیکن پھر بھی، جان بُوجھ کر اُس میں تحریف کر دیتا تھا (یعنی اس کا مطلب
٧٥ بدل دیتا تھا)

اور (دیکھو، اِن کا حال تو یہ ہے، کہ) جب یہ ایمان والوں سے ملتے ہیں، تو اپنے آپ کو مومن ظاہر کرتے ہیں، لیکن
جب اکیلے میں ایک دوسرے سے باتیں کرتے ہیں، تو کہتے ہیں " جو کچھ تمہیں خدا نے (تورات کا) علم دیا ہے، وہ ان لوگوں پر
کیوں ظاہر کرتے ہو؟ کیا اس لیے کہ وہ تمہارے خلاف تمہارے پروردگار کے حضور اُس سے دلیل پکڑیں (یعنی تورات سے
٧٦ تمہارے خلاف دلیل لائیں؟) کیا (اتنی موٹی سی بات بھی) تم نہیں سمجھتے؟" (افسوس ان کے دعوائے ایمان و حق پرستی
پر!) کیا یہ نہیں جانتے کہ (معاملہ انسان سے نہیں بلکہ اللہ سے ہے، اور) اللہ کے علم سے کوئی بات چھپی نہیں؟ وہ جو کچھ
٧٧ چُھپا رکھتے ہیں، اُسے بھی وہ جانتا ہے، اور جو کچھ ظاہر کرتے ہیں، وہ بھی اُس کے سامنے ہے!

اُن کے علماء حق فروش ہیں، اور عوام کا سرمایۂ دین خوش اعتقادی کی
آرزوؤں اور جہالت کے ولولوں کے سوا کچھ نہیں ہے!
یہودیوں کے علماء کی یہ گمراہی کہ کتاب اللہ کے احکام پر اپنی رایوں
٧٨ اور خواہشوں کو ترجیح دیتے اور پھر اپنے گھڑے ہوئے حکموں اور رسموں
کو کتاب اللہ کی طرح واجب العمل بتلاتے۔

اور پھر انہی میں وہ لوگ بھی ہیں جو اَن پڑھ ہیں، اور جہاں تک
کتابِ الٰہی کا تعلق ہے، (خوش اعتقادی کی) آرزوؤں اور ولولوں
کے سوا اور کچھ نہیں جانتے، اور محض وہموں گمانوں میں گُن ہیں
پس افسوس اُن پر، جن کا شیوہ یہ ہے کہ خود اپنے، ہاتھ سے
کتاب لکھتے ہیں (یعنی اپنی رایوں اور خواہشوں کے مطابق احکام شرع کی کتابیں بناتے ہیں) پھر لوگوں سے کہتے ہیں، یہ اللہ
کی طرف سے ہے (یعنی اس میں جو کچھ لکھا ہے، وہ کتاب الٰہی کے احکام ہیں) اور یہ سب کچھ اس لیے کرتے ہیں، تاکہ اس کے
بدلے میں ایک حقیر سی قیمت دنیوی فائدہ کی حاصل کر لیں۔ پس افسوس اُس پر، جو کچھ اُن کے ہاتھ لکھتے ہیں، اور افسوس
٧٩ اُس پر، جو کچھ وہ اِس ذریعہ سے کماتے ہیں!

یہودیوں کی یہ گمراہی کہ سمجھتے تھے، اُن کی اُمت نجات یافتہ اُمت ہے

یہ لوگ (یعنی یہودی) کہتے ہیں جہنم کی آگ ہمیں کبھی چھونے والی

أَيَّامًا مَّعْدُودَةً ۚ قُلْ أَتَّخَذْتُمْ عِندَ اللَّهِ عَهْدًا فَلَن يُخْلِفَ اللَّهُ عَهْدَهُ ۖ أَمْ تَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ
۸۰ مَا لَا تَعْلَمُونَ ۝ بَلَىٰ مَن كَسَبَ سَيِّئَةً وَأَحَاطَتْ بِهِ خَطِيئَتُهُ فَأُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ ۖ هُمْ
۸۱ ۸۲ فِيهَا خَالِدُونَ ۝ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ الْجَنَّةِ ۖ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ع
وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَ بَنِي إِسْرَائِيلَ لَا تَعْبُدُونَ إِلَّا اللَّهَ وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا وَذِي الْقُرْبَىٰ
وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينِ وَقُولُوا لِلنَّاسِ حُسْنًا وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ إِلَّا
۸۳ قَلِيلًا مِّنكُمْ وَأَنتُم مُّعْرِضُونَ ۝ وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَكُمْ

اس لیے ممکن نہیں کہ کوئی یہودی ہمیشہ کے لیے دوزخ میں ڈالا جائے۔ قرآن ان کے اس زعم باطل کا رد کرتا ہے، اور کہتا ہے جنت و دوزخ کی تقسیم قوموں کی تقسیم کی بنا پر نہیں ہے کہ کسی خاص قوم کے لیے جنت ہو، اور باقی کے لیے دوزخ، بلکہ اس کا تمام تر دار و مدار ایمان و عمل پر ہے۔ جس انسان نے بھی اپنے اعمال کے ذریعہ برائی کمائی، اُس کے لیے برائی یعنی عذاب ہے۔ اور جس کسی نے بھی اپنے اعمال کے ذریعہ اچھائی کمائی اس کے لئے اچھائی یعنی نجات ہے۔ خواہ وہ کوئی ہو، اور کسی گروہ بندی کا ہو!

نہیں (کیونکہ ہماری اُمت خدا کے نزدیک نجات پائی ہوئی اُمت ہے) اگر ہم آگ میں ڈالے بھی جائیں گے تو اس لیے نہیں کہ ہمیشہ عذاب میں رہیں، بلکہ) صرف چند گنے ہوئے دنوں کے لیے (تاکہ گناہ کے میل کچیل سے پاک صاف ہو کر پھر جنت میں جا داخل ہوں) اے پیغمبر! ان لوگوں سے کہہ دو، یہ بات جو تم کہتے ہو تو (دو حالتوں سے خالی نہیں۔ یا تو تم نے خدا سے (غیر مشروط) نجات کا کوئی پٹہ لکھا لیا ہے کہ اب وہ اُس کے خلاف جا نہیں سکتا، اور یا پھر تم خدا کے نام پر ایک ایسی
۸۰ بات کہہ رہے ہو جس کے لیے تمہارے پاس کوئی علم نہیں:

نہیں، (آخرت کی نجات کسی ایک گروہ ہی کی میراث نہیں ہے کہ ہر حال میں اُنھی کے لیے ہو۔ خدا کا قانون تو یہ ہے کہ کوئی انسان ہو، اور کسی گروہ کا ہو، لیکن) جس کسی نے بھی اپنے کاموں سے بُرائی کمائی اور اُس کے گناہوں نے
۸۱ اُسے گھیرے میں لے لیا، تو وہ دوزخی گروہ میں سے ہے۔ ہمیشہ دوزخ میں رہنے والا اور جو کوئی بھی ایمان لایا، اور اس
۸۲ کے کام بھی اچھے ہوئے، تو وہ بہشتی گروہ میں سے ہے۔ ہمیشہ بہشت میں رہنے والا:

اور پھر (وہ وقت) یاد کرو جب ہم نے بنی اسرائیل سے عہد لیا تھا (وہ عہد کیا تھا؟ کیا اسرائیلیت کے گھمنڈ اور یہودی گروہ بندی کی نجات یافتگی کا عہد تھا؟ نہیں، ایمان و عمل کا عہد تھا) اللہ کے سوا اور کسی کی عبادت نہ کرنا، ماں باپ کے ساتھ احسان کرنا، عزیزوں قریبوں کے ساتھ نیکی سے پیش آنا، یتیموں مسکینوں کی خبرگیری کرنا تمام انسانوں سے اچھا برتاؤ کرنا، نماز قائم کرنی، زکوٰۃ ادا کرنی (ایمان و عمل کی یہی بنیادی سچائیاں ہیں جن کا تم سے عہد لیا گیا تھا) لیکن تم اس عہد پر قائم نہیں رہے) اور ایک تھوڑی تعداد کے سوا سب الٹی چال چلے، اور حقیقت یہ ہے کہ (ہدایت
۸۳ کی طرف سے) تمہارے رخ ہی پھرے ہوئے ہیں:

پیروانِ مذاہب کی گمراہی کی وہ حالت، جبکہ اتباعِ دین کی روح

اور پھر (وہ معاملہ یاد کرو) جب ایسا ہوا تھا کہ ہم نے تم

لَا تَسۡفِکُوۡنَ دِمَآءَکُمۡ وَلَا تُخۡرِجُوۡنَ اَنۡفُسَکُمۡ مِّنۡ دِیَارِکُمۡ ثُمَّ اَقۡرَرۡتُمۡ وَاَنۡتُمۡ تَشۡهَدُوۡنَ ۝ ثُمَّ اَنۡتُمۡ
هٰۤؤُلَآءِ تَقۡتُلُوۡنَ اَنۡفُسَکُمۡ وَتُخۡرِجُوۡنَ فَرِيۡقًا مِّنۡکُمۡ مِّنۡ دِيَارِهِمۡ تَظٰهَرُوۡنَ عَلَيۡهِمۡ بِالۡاِثۡمِ وَ
الۡعُدۡوَانِ ؕ وَاِنۡ يَّاۡتُوۡکُمۡ اُسٰرٰى تُفٰدُوۡهُمۡ وَهُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيۡکُمۡ اِخۡرَاجُهُمۡ ؕ اَفَتُؤۡمِنُوۡنَ بِبَعۡضِ
الۡکِتٰبِ وَتَکۡفُرُوۡنَ بِبَعۡضٍ ۚ فَمَا جَزَآءُ مَنۡ يَّفۡعَلُ ذٰلِكَ مِنۡکُمۡ اِلَّا خِزۡىٌ فِى الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا ۚ وَيَوۡمَ
۸۳ الۡقِيٰمَةِ يُرَدُّوۡنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الۡعَذَابِ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعۡمَلُوۡنَ ۝ اُولٰٓئِكَ الَّذِيۡنَ اشۡتَرَوُا الۡحَيٰوةَ
ع ۱۰ ی ۱۰ الدُّنۡيَا بِالۡاٰخِرَةِ فَلَا يُخَفَّفُ عَنۡهُمُ الۡعَذَابُ وَلَا هُمۡ يُنۡصَرُوۡنَ ۝ع وَلَقَدۡ اٰتَيۡنَا مُوۡسَى الۡکِتٰبَ

بلکہ ظلم مفقود ہو جاتی ہے، اور دینداری کی نمائش صرف اس لیے کی جاتی ہے
تاکہ نفسانی خواہشوں اور کام جوئیوں کے بنے بنائے آلۂ کار بنا یا جائے! اس
صورت حال کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ شریعت کے بنیادی اور اصولی احکام
پر کوئی توجہ نہیں کرتا۔ لیکن چھوٹی چھوٹی باتوں پر جو نمائش اور ریاکاری
۸۴ کا ذریعہ ہو سکتی ہیں، اور جن کے کرنے میں کچھ چھوڑنا اور کھونا نہیں پڑتا،
بہت زور دیا جاتا ہے۔ حالانکہ اگر ان اصولی باتوں پر ٹھیک ٹھیک
عمل کیا جاتا تو یہ فروعی خلاف ورزیاں ظہور ہی میں نہ آتیں، علماء یہود
اسی گمراہی میں مبتلا تھے۔

سے عہد لیا تھا: آپس میں ایک دوسرے کا خون نہیں بہاؤ گے
اور نہ اپنے آپ کو (یعنے اپنی جماعت کے افراد کو) جلاوطن
کرو گے۔ تم نے اس کا اقرار کیا تھا۔ اور تم (اب بھی) یہ بات
مانتے ہو۔ لیکن پھر (دیکھو) تم ہی وہ اقرار کرنے والی جماعت ہو
جس کے افراد ایک دوسرے کو بے دریغ قتل کرتے ہیں، اور
ایک فریق دوسرے فریق کے خلاف ظلم و معصیت سے جتھا
بندی کر کے اُسے اُس کے وطن سے نکال باہر کرتا ہے (اور
تم میں سے کسی کو بھی یہ بات یاد نہیں آتی کہ اس بارے میں خدا کی شریعت کے احکام کیا ہیں؟) لیکن پھر جب ایسا
ہوتا ہے کہ تمہارے جلاوطن کیے ہوئے آدمی (دشمنوں کے ہاتھ پڑ جاتے ہیں، اور) قیدی ہو کر تمہارے سامنے آتے ہیں،
تو تم فدیہ دے کر چھڑا لیتے ہو (اور کہتے ہو، شریعت کی رو سے ایسا کرنا ضروری ہے) حالانکہ (اگر شریعت کے حکموں کا تمہیں
اتنا ہی پاس ہے، تو) شریعت کی رو سے تو یہی بات حرام تھی کہ اُنہیں اُن کے گھروں اور بستیوں سے جلاوطن کر دو (پھر
یہ گمراہی کی کیسی انتہا ہے کہ قیدیوں کے چھڑانے اور اُن کے فدیہ کے لیے مال جمع کرنے میں تو شریعت یاد آجاتی ہے
لیکن اُس ظلم و معصیت کے وقت یاد نہیں آتی جس کی وجہ سے وہ دشمنوں کے ہاتھ پڑے اور قید ہوئے؟) کیا یہ
اس لیے ہے کہ کتابِ الٰہی کا کچھ حصہ تو تم مانتے ہو، اور کچھ حصے سے منکر ہو؟ پھر بتلاؤ، تم میں سے جن لوگوں کے
کاموں کا یہ حال ہے، اُنہیں پاداشِ عمل میں اس کے سوا کیا مل سکتا ہے کہ دنیا میں ذلت و رسوائی ہو، اور قیامت
کے دن سخت سے سخت عذاب! یاد رکھو، اللہ (کا قانونِ جزاء) تمہارے کاموں کی طرف سے غافل نہیں ہے! ۸۵
یقیناً یہی لوگ ہیں جنہوں نے آخرت (کی زندگی) تاراج کر کے دنیا کی زندگی مول لی ہے۔ (پس ایسے لوگوں کے لیے
علاج کی کوئی اُمید نہیں) نہ تو اُن کے عذاب میں کمی ہو گی، نہ کہیں سے مدد پا سکیں گے۔

یہ حالت اس بات کا نتیجہ ہے کہ راست بازی اور حق پرستی کی جگہ

اور (پھر دیکھو) ہم نے (تمہاری رہنمائی کے لیے پہلے) موسیٰ

وَقَفَّيْنَا مِنْ بَعْدِهٖ بِالرُّسُلِ وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ اَفَكُلَّمَا
جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ بِمَا لَا تَهْوٰٓى اَنْفُسُكُمُ اسْتَكْبَرْتُمْ فَفَرِيْقًا كَذَّبْتُمْ وَفَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ ۝ ٨٧
وَقَالُوْا قُلُوْبُنَا غُلْفٌ بَلْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ فَقَلِيْلًا مَّا يُؤْمِنُوْنَ ۝ وَلَمَّا جَآءَهُمْ كِتٰبٌ ٨٨
مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ وَكَانُوْا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَلَمَّا
جَآءَهُمْ مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ فَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ۝ بِئْسَمَا اشْتَرَوْا بِهٖٓ اَنْفُسَهُمْ اَنْ يَّكْفُرُوْا بِمَآ ٨٩

نفسانی خواہشوں کی پرستش کی جاتی ہے، اور یہی وجہ ہے کہ نفس پرستوں نے ہمیشہ داعیانِ حق و اصلاح کی مخالفت کی ہے۔ بنی اسرائیل کے تکذیبِ رُسل اور قتلِ انبیاء سے استشہاد، کہ جس طرح ہمیشہ سچائی کے منکر و معاند رہے، اُسی طرح اب بھی انکار و عناد میں سرگرم ہیں۔

کو کتاب دی۔ پھر موسیٰ کے بعد ہدایت کا سلسلہ پے در پے رسولوں کو بھیج کر جاری رکھا، بالآخر مریم کے بیٹے عیسیٰ کو سچائی کی روشن نشانیاں دیں، اور روح القدس کی تائید سے ممتاز کیا، لیکن ان میں سے ہر دعوت کی تم نے مخالفت کی (پھر کیا تمہارا شیوہ ہی یہ ہے کہ جب کبھی اللہ کا کوئی رسول ایسی دعوت لے کر آئے جو تمہاری نفسانی خواہشوں کے خلاف ہو، تو تم اُس کے مقابلے میں سرکشی کر بیٹھو، اور کسی کو جھٹلاؤ، کسی کو قتل کر دو: ٨٧

حق کے ثبات اور تقلید کے جمود میں فرق ہے۔ خیالات کی ایسی پختگی میں کوئی خوبی نہیں کہ ہم دوسروں کی بات سُننے ہی سے انکار کر دیں۔ علماء یہود ایسے ہی جمود میں مبتلا تھے، اور اُسے اعتقاد کی پختگی سمجھ کر فخر کرتے تھے۔

اور (یہ لوگ اپنے جمود اور بے حسی کی حالت پر فخر کرتے ہیں، اور) کہتے ہیں، ہمارے دل غلافوں میں لپٹے ہوئے ہیں (یعنے اب کسی نئی بات کا اثر اُن تک پہنچ ہی نہیں سکتا حالانکہ یہ اعتقاد کی پختگی اور حق کا ثبات نہیں ہے) بلکہ انکارِ حق کے تعصب کی پھٹکار ہے (کہ کلامِ حق سُننے اور اثر پذیر ہونے کی استعداد ہی کھو دی) اور اسی لیے بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ وہ دعوتِ حق سُنیں اور قبول کریں: ٨

چنانچہ جب ایسا ہوا کہ اللہ کی طرف سے اُن کی ہدایت کے لیے ایک کتاب نازل ہوئی اور وہ اس کتاب کی تصدیق کرتی تھی جو پہلے سے ان کے پاس موجود ہے تو باوجودیکہ وہ (تورات کی پیشین گوئیوں کی بناء پر اس ظہور کے منتظر تھے، اور) کافروں کے مقابلے میں اس کا نام لے کر فتح و نصرت کی دعائیں مانگتے تھے، لیکن جب وہی جانی بوجھی ہوئی بات سامنے آگئی تو صاف انکار کر گئے، پس اُن لوگوں کے لیے جو (جان بوجھ کر) کفر کی راہ اختیار کریں اللہ کی لعنت ہے (یعنے ایسوں پر فلاح و سعادت کی راہ کبھی نہیں کھلتی:

قبولِ حق کی راہ میں جو موانع پیش آتے ہیں، ان میں سب سے بڑا مانع نسلی، جماعتی، یا شخصی حسد ہے۔

(افسوس ان کی شقاوت پر!) کیا ہی بُری قیمت ہے جس کے بدلے اُنہوں نے اپنی جانوں کا سودا چکایا! اُنھوں نے اللہ کی بھیجی ہوئی سچائی سے انکار کیا، اور صرف اس لئے انکار کیا کہ وہ جس کسی پر چاہتا ہے اپنا فضل نازل کر دیتا ہے (اس میں خود اُن کی نسل و جماعت کی کوئی خصوصیت نہیں ہے۔ یہ لوگ اپنی بدعملیوں کی وجہ سے پہلے ہی ذلیل و خوار ہو چکے تھے، لیکن اس نئے انکار

أَنْزَلَ اللّٰهُ بَغْيًا أَنْ يُّنَزِّلَ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ۚ فَبَآءُوْ بِغَضَبٍ عَلٰى غَضَبٍ ۚ
وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ۝ وَإِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا بِمَآ أَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا نُؤْمِنُ بِمَآ أُنْزِلَ عَلَيْنَا
وَيَكْفُرُوْنَ بِمَا وَرَآءَهٗ ۗ وَهُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَهُمْ ۗ قُلْ فَلِمَ تَقْتُلُوْنَ أَنْۢبِيَآءَ اللّٰهِ مِنْ قَبْلُ
۹۱ إِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ وَلَقَدْ جَآءَكُمْ مُّوْسٰى بِالْبَيِّنٰتِ ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَأَنْتُمْ
۹۲ ظٰلِمُوْنَ ۝ وَإِذْ أَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ ۗ خُذُوْا مَآ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّاسْمَعُوْا ۗ قَالُوْا
سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا ۗ وَأُشْرِبُوْا فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْعِجْلَ بِكُفْرِهِمْ ۗ قُلْ بِئْسَمَا يَأْمُرُكُمْ بِهٖٓ إِيْمَانُكُمْ إِنْ كُنْتُمْ

سے اور زیادہ ذِلّت وخواری کے سزاوار ہوئے) پس اللہ کا غضب بھی ایک کے بعد ایک اُن کے حصّے میں آیا، اور
۹۰ اُس کا قانون یہی ہے کہ انکارِ حق کرنے والوں کے لیے (ہمیشہ) رسوا کرنے والا عذاب ہوتا ہے!

اہل مذاہب کی عالمگیر گمراہی یہ ہے کہ جب اُنہیں اتباعِ حق کی دعوت دی جاتی ہے، تو کہتے ہیں، ہمارے پاس ہمارا دین موجود ہے۔ ہمیں کسی نئی تعلیم کی ضرورت نہیں۔ حالانکہ وہ بھول جاتے ہیں کہ جس دین کو اپنا دین کہتے ہیں اُس پر اُن کا عمل کب ہے؟ قرآن کہتا ہے، دین سب کے لیے اور سب کا ایک ہی ہے، اور میں اس لیے نہیں آیا ہوں کہ پچھلی سچائیوں کی جگہ کوئی نیا دین پیش کروں، بلکہ اس لیے آیا ہوں کہ اُن کا سچا اعتقاد اور عمل پیدا کر دوں۔

اور جب اِن لوگوں سے کہا جاتا ہے، جو کچھ خدا نے اُتارا ہے اُس پر ایمان لاؤ، تو کہتے ہیں، ہم تو صرف وہی بات مانیں گے جو ہم پر اُتری ہے۔ یعنے اس کے سوا جو کچھ ہے اُس سے اُنہیں انکار ہے۔ حالانکہ وہ خدا کا سچا کلام ہے جو اُن کی کتاب کی تصدیق کرتا ہوا نمودار ہوا ہے۔ اے پیغمبر! تم ان لوگوں سے کہو، اچھا، اگر واقعی تم (اپنی کتاب پر) ایمان رکھنے والے ہو (اور قرآن کی دعوت سے صرف اِس لیے انکار کرتے ہو کہ تورات پر ایمان رکھنے کے بعد اِس کی ضرورت نہیں) تو پھر تم نے پچھلے وقتوں میں خدا کے نبیوں کو کیوں قتل کیا (جو تمہیں تورات پر عمل کرنے کی
۹۱ تلقین کرتے تھے، اور کیوں ایمان کی جگہ انکار و سرکشی کی راہ اختیار کی؟)

اور پھر دیکھو، یہ واقعہ ہے کہ موسیٰ سچائی کی روشن دلیلوں کے ساتھ تمہارے پاس آیا لیکن جب (چالیس[۴] دن
۹۲ کے لیے) تم سے الگ ہو گیا تو تم بچھڑے کے پیچھے پڑ گئے، اور ایسا کرتے ہوئے یقیناً تم حق سے گزر گئے تھے۔

اور پھر جب ایسا ہوا تھا کہ ہم نے (دینِ الٰہی پر قائم رہنے کا) تم سے عہد لیا تھا، اور کوہِ طور کی چوٹیاں تم پر بلند کر دی تھیں (تو تم نے اُس کے بعد کیا کیا؟) تمہیں حکم دیا گیا تھا کہ "جو کتاب تمہیں دی گئی ہے، اُس پر مضبوطی کے ساتھ جم جاؤ، اور اُس کے حکموں پر کاربند ہو" تم نے (زبان سے) کہا سنا، اور (دل سے کہا) نہیں مانتے۔ اور پھر ایسا ہوا کہ تمہارے کفر کی وجہ سے تمہارے دلوں میں بچھڑے کی پوجا رچ گئی (اے پیغمبر! ان سے کہو، (دعوتِ حق سے بے نیازی ظاہر کرتے ہوئے) تم اپنے جس ایمان کا دعویٰ کرتے ہو، اگر وہ یہی ایمان ہے، تو افسوس اس ایمان پر کیا ہی

٩٢ مُّؤْمِنِينَ ۝ قُلْ إِن كَانَتْ لَكُمُ الدَّارُ الْآخِرَةُ عِندَ اللَّهِ خَالِصَةً مِّن دُونِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا

٩٥،٩٤ الْمَوْتَ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ ۝ وَلَن يَتَمَنَّوْهُ أَبَدًا بِمَا قَدَّمَتْ أَيْدِيهِمْ ۗ وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِالظَّالِمِينَ ۝

معانقه وَلَتَجِدَنَّهُمْ أَحْرَصَ النَّاسِ عَلَىٰ حَيَاةٍ ۛ وَمِنَ الَّذِينَ أَشْرَكُوا ۛ يَوَدُّ أَحَدُهُمْ لَوْ يُعَمَّرُ

ع ١١ ٩٦ أَلْفَ سَنَةٍ وَمَا هُوَ بِمُزَحْزِحِهِ مِنَ الْعَذَابِ أَن يُعَمَّرَ ۗ وَاللَّهُ بَصِيرٌ بِمَا يَعْمَلُونَ ۝ قُلْ

مَن كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيلَ فَإِنَّهُ نَزَّلَهُ عَلَىٰ قَلْبِكَ بِإِذْنِ اللَّهِ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَ

٩٧ هُدًى وَبُشْرَىٰ لِلْمُؤْمِنِينَ ۝ مَن كَانَ عَدُوًّا لِّلَّهِ وَمَلَائِكَتِهِ وَرُسُلِهِ وَجِبْرِيلَ وَمِيكَالَ

٩٨ فَإِنَّ اللَّهَ عَدُوٌّ لِّلْكَافِرِينَ ۝ وَلَقَدْ أَنزَلْنَا إِلَيْكَ

---

٩٣ بُری راہ ہے جس پر تمہارا ایمان تمہیں لے جا رہا ہے!

> جن کے دل میں نجاتِ اُخروی کا سچا یقین ہے، وہ موت سے خائف و حیاتِ دنیوی کے پجاری نہیں ہو سکتے۔ بنی اسرائیل کی دنیا پرستی و حیاتِ دنیوی کی حرص سے اُن کے ایمان و یقین سے محرومی پر استشہاد۔

(یہ لوگ کہتے ہیں، آخرت کی نجات صرف اُنہی کے حصے میں آئی ہے، تم ان سے کہو، اگر آخرت کا گھر، خدا کے نزدیک، صرف تمہارے ہی لیے ہے۔۔ اور تم اپنے اس اعتقاد میں سچے ہو، تو تمہیں دنیا کی جگہ آخرت کا طلبگار ہونا چاہیے۔ پس بے خوف ہو کر موت کی آرزو کرو، حیاتِ فانی کے پجاری نہ بنو! اے پیغمبر! تم دیکھ لو گے کہ یہ لوگ اپنی بدعملیوں کی وجہ سے جس کا ذخیرہ جمع کر چکے ہیں کبھی ایسا

٩٤ کرنے والے نہیں! اور اللہ ظلم کرنے والوں کو اچھی طرح جانتا ہے"،

اور پھر اتنا ہی نہیں، بلکہ تم دیکھو گے زندگی کی سب سے زیادہ حرص رکھنے والے یہی لوگ ہیں۔ مشرکوں سے بھی زیادہ (ان مدعیانِ توحید کے دلوں میں حیاتِ فانی کا عشق ہے) ان میں سے ایک ایک آدمی کا دل یہ حسرت رکھتا ہے، کہ کاش ایک ہزار برس تک تو جیے! حالانکہ عمر کی درازی اُنہیں عذابِ آخرت سے نجات نہیں دلائے گی

٩٥ اور جو کچھ کر رہے ہیں، اللہ کی نظر سے چھپا نہیں ہے!

> جو کوئی سلسلۂ وحی کا مخالف ہے، تو وہ اللہ اور اُس کے قوانینِ ہدایت کا مخالف ہے

(اے پیغمبر) یہ اللہ کا کلام ہے جو جبریلؑ نے اُس کے حکم سے تمہارے دل میں اُتارا ہے اور یہ اُس کلام کی تصدیق کرتا ہوا آیا ہے، جو اس سے پہلے نازل ہو چکا ہے۔ اس میں انسان کے لیے ہدایت ہے، اور اُن لوگوں کے لیے جو ایمان رکھتے ہیں (فلاح و کامیابی کی) بشارت (پھر اگر یہ لوگ اللہ کی وحی و نبوت کے سلسلہ کے مخالف ہیں، اور جہل و تعصب سے کہتے ہیں ہم جبریلؑ کا اُتارا ہوا کلام نہیں مانیں گے اُس سے ہماری دشمنی ہے، تو تم کہہ دو، جو کوئی اللہ کا، اُس کے فرشتوں کا، اُس کے رسولوں کا، اور جبریلؑ اور میکالؑ کا

٩٦ دشمن ہے، تو یقیناً اللہ بھی منکرینِ حق کا دوست نہیں ہے!

> پیغمبرِ اسلام سے خطاب کہ دعوتِ حق کا ظہور سچائی کی روشن دلیلوں کے

اے پیغمبر! یقین کرو، ہم نے تم پر سچائی کی روشن دلیلیں

۹۹ اٰیٰتٍۭ بَیِّنٰتٍ ۚ وَمَا یَکْفُرُ بِھَاۤ اِلَّا الْفٰسِقُوْنَ ○ اَوَکُلَّمَا عٰھَدُوْا عَھْدًا نَّبَذَہٗ فَرِیْقٌ مِّنْھُمْ ؕ بَلْ اَکْثَرُھُمْ
۱۰۰ لَا یُؤْمِنُوْنَ ○ وَلَمَّا جَآءَھُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰہِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَھُمْ نَبَذَ فَرِیْقٌ مِّنَ الَّذِیْنَ
۱۰۱ اُوْتُوا الْکِتٰبَ ۙ کِتٰبَ اللّٰہِ وَرَآءَ ظُھُوْرِھِمْ کَاَنَّھُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ ○ وَاتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوا الشَّیٰطِیْنُ عَلٰی
مُلْکِ سُلَیْمٰنَ ۚ وَمَا کَفَرَ سُلَیْمٰنُ وَلٰکِنَّ الشَّیٰطِیْنَ کَفَرُوْا یُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ ۗ وَمَآ اُنْزِلَ عَلَی
الْمَلَکَیْنِ بِبَابِلَ ھَارُوْتَ وَمَارُوْتَ ؕ وَمَا یُعَلِّمٰنِ مِنْ اَحَدٍ حَتّٰی یَقُوْلَاۤ اِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ فَلَا
تَکْفُرْ ؕ فَیَتَعَلَّمُوْنَ مِنْھُمَا مَا یُفَرِّقُوْنَ بِہٖ بَیْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِہٖ ؕ وَمَا ھُمْ بِضَآرِّیْنَ بِہٖ مِنْ اَحَدٍ

ساتھ ہوا ہے، جن سے کوئی راست باز انسان انکار نہیں کرسکتا، اور اگر
علماء یہود باوجود کتاب اللہ کے حامل ہونے کے انکار کر رہے ہیں، تو یہ کفر و
۹۹ جحود کا کوئی نیا مظاہرہ نہیں ہے جس پر تعجب ہو۔ اس سے پہلے بھی ان
کی روش ایسی ہی رہ چکی ہے۔

نازل کی ہیں، اور ان سے کوئی انکار نہیں کرسکتا، مگر صرف
وہی جو راست بازی کے دائرہ سے باہر ہو گیا ہے۔
جب کبھی ان لوگوں نے اتباعِ حق کا کوئی عہد کیا،
تو کسی نہ کسی گروہ نے ضرور ہی اُسے پس پشت ڈال دیا،
۱۰۰ اور حقیقت یہ ہے کہ ان میں بڑی تعداد ایسے ہی لوگوں کی ہے جن کے دل ایمان سے خالی ہیں!
چنانچہ (دیکھو) جب ایسا ہوا کہ اللہ کا ایک رسول اُس کتاب کی تصدیق کرتا ہوا آیا جو پہلے سے اُن کے پاس موجود
تھی (یعنے حضرت مسیح کا ظہور ہوا) تو ان لوگوں میں سے ایک گروہ نے کہ کتاب الٰہی رکھتے تھے، کتاب الٰہی اس طرح پیٹھ
۱۰۱ پیچھے ڈال دی گویا اسے جانتے ہی نہیں!

بنی اسرائیل کے ضعف عقل و ایمان پر اس واقعہ سے استشہاد کہ
جادو گروں کے شعبدوں پر جھک پڑے تھے، اور کتاب الٰہی کی تعلیم
پسِ پشت ڈال دی تھی۔ ضمناً اس حقیقت کا اعلان کہ اس بارے
میں جو خرافات مشہور ہیں، ان کی کوئی اصلیت نہیں۔

اور پھر (دیکھو) ان لوگوں نے (کتاب الٰہی کی تعلیم
فراموش کرکے جادوگری کے) اُن (مشرکانہ عملوں کی پیروی
کی جنہیں شیطان، سلیمان کے عہد سلطنت کی طرف منسوب
کرکے پڑھا پڑھایا کرتے تھے۔ حالانکہ سلیمان کبھی کفر کا مرتکب
نہیں ہوا۔ دراصل یہ انہی شیطانوں کا کفر تھا کہ لوگوں کو جادوگری سکھلاتے تھے۔ اور یہ بھی صحیح نہیں ہے کہ بابل
میں دو فرشتوں ہاروت اور ماروت پر اس طرح کی کوئی بات نازل ہوئی تھی۔ (جیسا کہ ان لوگوں میں مشہور ہے۔
واقعہ یہ ہے کہ) وہ جو کچھ بھی کسی کو سکھلاتے تھے، تو یہ کہے بغیر نہیں سکھلاتے تھے کہ دیکھو ہمارا وجود تو ایک فتنہ ہے پھر
تم کیوں کفر میں مبتلا ہوتے ہو؟ (یعنے جادوگری کی باتوں کا بُرا ہونا ایک ایسی مانی ہوئی بات ہے، کہ جو لوگ اس کے سکھانے
والے تھے، وہ بھی تسلیم کرتے تھے کہ یہ بات خدا پرستی کے خلاف ہے) لیکن اس پر بھی لوگ ان سے ایسے ایسے عمل سیکھتے
جن کے ذریعے شوہر اور بیوی میں جُدائی ڈالنا چاہتے۔ حالانکہ وہ کسی انسان کو نقصان نہیں پہنچا سکتے تھے۔ ہاں، یہ

إِلَّا بِإِذْنِ اللّٰهِ ۚ وَيَتَعَلَّمُونَ مَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ ۚ وَلَقَدْ عَلِمُوا لَمَنِ اشْتَرَاهُ مَا لَهُ فِي الْآخِرَةِ
مِنْ خَلَاقٍ ۚ وَلَبِئْسَ مَا شَرَوْا بِهِ أَنْفُسَهُمْ ۚ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ ۝ وَلَوْ أَنَّهُمْ آمَنُوا وَاتَّقَوْا ١٠٢
لَمَثُوبَةٌ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ خَيْرٌ ۚ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ ۝ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقُولُوا رَاعِنَا وَ ١٠٣ ١٠ ع ١٢
قُولُوا انْظُرْنَا وَاسْمَعُوا ۗ وَلِلْكَافِرِينَ عَذَابٌ أَلِيمٌ ۝ مَا يَوَدُّ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ ١٠٤
وَلَا الْمُشْرِكِينَ أَنْ يُنَزَّلَ عَلَيْكُمْ مِنْ خَيْرٍ مِنْ رَبِّكُمْ ۗ وَاللّٰهُ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهِ مَنْ يَشَاءُ ۚ وَ
اللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيمِ ۝ مَا نَنْسَخْ مِنْ آيَةٍ أَوْ نُنْسِهَا نَأْتِ بِخَيْرٍ مِنْهَا أَوْ مِثْلِهَا ۗ أَلَمْ تَعْلَمْ أَنَّ اللّٰهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ۝ أَلَمْ تَعْلَمْ ١٠٥

ہو سکتا تھا کہ خدا کے حکم سے کسی کو نقصان پہنچنے والا ہو اور نقصان پہنچ جائے۔ (بہرحال) یہ لوگ (کتاب الٰہی کی
تعلیم فراموش کر کے) ایسی باتیں سیکھتے ہیں جو انہیں سراسر نقصان پہنچانے والی ہیں۔ اور (پھر کچھ یہ بات بھی نہیں کہ
انہیں احکام الٰہی کی خبر نہ ہو) انہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ جو کوئی (اپنا دین و ایمان بیچ کر) جادوگری کا خریدار ہوتا
ہے، اس کے لیے آخرت کی برکتوں میں کوئی حصہ نہیں ہوتا۔ پس افسوس ان کی اس خرید و فروخت پر! کیا ہی بری
جنس ہے جس کے بدلے انہوں نے اپنی جانوں کی نجات بیچ ڈالی! کاش وہ اس حقیقت کی خبر رکھتے۔ ١٠٢
اگر یہ لوگ (خدا کے حکموں پر سچائی کے ساتھ) ایمان لاتے، اور نیک عملی کی چال اختیار کرتے، تو ان کے لیے اللہ
کے حضور بہتر اجر تھا۔ کاش وہ سمجھ بوجھ سے کام لیں۔ ١٠٣

مسلمانو! (پیغمبر اسلام کو اپنی طرف متوجہ کرنا چاہو، تو ان
منکرین حق کی طرح) یہ نہ کہو کہ "راعنا" (جو مشتبہ اور دو معنی رکھنے
والا لفظ ہے، بلکہ) کہو "انظرنا" (ہماری طرف التفات کیجیے!)
اور پھر وہ جو کچھ بھی کہیں اسے جی لگا کر سنو اور اس کی اطاعت
کرو۔ باقی رہے یہ منکرین حق، تو یاد رکھو انہیں (پاداش عمل میں) دردناک عذاب ملنے والا ہے۔ ١٠٤

دعوت قرآنی کے پیروؤں سے خطاب کہ بنی اسرائیل کے ایام و نتائج سے عبرت پکڑیں، اور ان ٹھوکروں سے بچیں جو انہیں اس راہ میں لگ چکی ہیں۔ نیز ان شکوک اور اعتراضات کا جواب جو منکرین حق مسلمانوں کے دلوں میں پیدا کرنا چاہتے تھے۔

اہل کتاب میں سے جن لوگوں نے کفر کی راہ اختیار کی ہے، وہ، اور مشرکہ دونوں نہیں چاہتے کہ تمہارے
پروردگار کی طرف سے تم پر خیر و برکت (یعنی وحی الٰہی) نازل ہو (اور اس لیے وہ طرح طرح کے شک پیدا کر کے تمہیں
سچائی کی راہ سے باز رکھنا چاہتے ہیں) لیکن اللہ (کا قانون اس بارے میں انسانی خواہشوں کا پابند نہیں ہو سکتا
وہ) جسے چاہتا ہے، اپنی رحمت کے لیے چن لیتا ہے، اور وہ بہت بڑا فضل رکھنے والا ہے۔ ١٠٥

ہم اپنے احکام میں سے جو کچھ بدل دیتے ہیں، یا بھلا دیتے
ہیں، تو اس کی جگہ اس سے بہتر یا اس جیسا حکم نازل
کر دیتے ہیں (پس اگر اب ایک نئی شریعت ظہور میں آئی

ایک شریعت کے بعد دوسری شریعت کا ظہور اس لیے ہوا کہ یا تو "نسخ" کی حالت طاری ہوئی یا "نسیان" کی۔ "نسخ" یہ ہے کہ ایک بات پہلے سے موجود تھی، لیکن موقوف ہو گئی، اور اس کی جگہ دوسری بات آ گئی۔ "نسیان" کے معنی بھول جانے کے ہیں پس بعض حالتوں میں

۱۰۷ اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِؕ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِیٍّ وَّلَا نَصِیْرٍ۝ اَمْ تُرِیْدُوْنَ
اَنْ تَسْـَٔلُوْا رَسُوْلَكُمْ كَمَا سُىِٕلَ مُوْسٰى مِنْ قَبْلُؕ وَمَنْ یَّتَبَدَّلِ الْكُفْرَ بِالْاِیْمَانِ فَقَدْ
۱۰۸ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِیْلِ۝ وَدَّ كَثِیْرٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ یَرُدُّوْنَكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ اِیْمَانِكُمْ كُفَّارًاۚۖ
حَسَدًا مِّنْ عِنْدِ اَنْفُسِهِمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا تَبَیَّنَ لَهُمُ الْحَقُّۚ فَاعْفُوْا وَاصْفَحُوْا حَتّٰى یَاْتِیَ اللّٰهُ
۱۰۹ بِاَمْرِهٖؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ۝ وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَؕ وَمَا تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ

ایسا ہوا کہ پچھلی شریعت کسی نہ کسی شکل میں موجود تھی، لیکن احوال و ظروف بدل گئے تھے یا اُس کے پیرؤوں کی عملی روح معدوم ہو گئی تھی۔ اس لیے ضروری ہوا کہ نئی شریعت ظہور میں آئے۔ بعض حالتوں میں ایسا ہوا کہ امتدادِ وقت سے پچھلی تعلیم بالکل فراموش ہو گئی، اور اصلیت میں سے کچھ باقی نہ رہا، پس لامحالہ تجدید ہدایت ناگزیر ہوئی۔

سنتِ الٰہی یہ ہے کہ نسخ شرائع ہو یا نسیان شرائع، لیکن ہر نئی تعلیم پچھلی تعلیم سے بہتر ہو گی یا اُس کے مانند ہو گی۔ ایسا نہیں ہوتا کہ کمتر ہو۔ کیونکہ اصل تکمیل و ارتقا ہے، نہ کہ تنزل و تسفل۔

۱۰۷ کثرت سوال اور تعمق فی الدین کی ممانعت۔ "تعمق" یعنے ضرورت سے زیادہ باریکیاں نکالنی اور کاوشیں کرنی اور ایک سیدھے سادے معاملہ کو پیچیدہ بنا دینا۔

ہے، تو یہ کوئی ایسی بات نہیں جس پر لوگوں کو حیرانی ہو، کیا تم نہیں جانتے کہ اللہ کی قدرت سے کوئی بات باہر نہیں؟ (اگر وہ ایک مرتبہ تمہاری ہدایت کے لیے حسب ضرورت احکام بھیج سکتا ہے، تو یقیناً اُس کے بعد بھی بار بار ایسا کر سکتا ہے) اور پھر کیا تم نہیں جانتے کہ اللہ ہی کے لیے آسمان و زمین کی سلطانی ہے، اور اُس کے سوا کوئی نہیں جو تمہارا دوست اور مددگار ہو!

پھر کیا تم چاہتے ہو، اپنے رسول سے بھی (دین کے بارے میں) ویسے ہی سوالات کرو جیسے اب سے پہلے موسیٰ سے کیے جا چکے ہیں؟ (یعنے جس طرح بنی اسرائیل نے راست بازی کی جگہ کٹ حجتیاں کرنے اور بلا ضرورت باریکیاں نکالنے کی چال اختیار کی تھی، ویسی ہی تم بھی اختیار کرو؟ سو یاد رکھو) جو کوئی بھی ایمان کی نعمت پا کر، پھر اُسے کفر سے بدل دیگا
۱۰۸ تو یقیناً وہ سیدھے راستے سے بھٹک گیا، اور فلاح و کامیابی کی منزل اُس پر گم ہو گئی!

نماز اور زکوٰۃ یعنے قلبی اور مالی عبادت کی سرگرمی، ایک ایسی حالت ہے جس سے جماعت کی معنوی استعداد نشوونما پاتی ہے اور قوی ہوتی ہے۔ جس جماعت میں یہ سرگرمی موجود ہو، وہ نہ تو دین سے برگشتہ ہو سکتی ہے نہ اُس کی اجتماعی قوت میں کمزوری آ سکتی ہے۔

یاد رکھو، اہل کتاب میں ایک بڑی تعداد ایسے لوگوں کی ہے جو چاہتے ہیں، تمہیں ایمان کے بعد پھر کفر کی طرف لوٹا دیں، اور اگرچہ اُن پر سچائی ظاہر ہو چکی ہے، لیکن پھر بھی اُس حسد کی وجہ سے جس کی جلن اُن کے اندر ہے، پسند نہیں کرتے کہ تم راہِ حق میں ثابت قدم رہو۔ پس چاہیے کہ (اُن سے لڑنے جھگڑنے میں اپنا وقت ضائع نہ کرو، اور) عفو و درگزر سے کام لو۔ یہاں تک کہ اللہ کا فیصلہ ظاہر ہو جائے (اور وہ، حق کو فتح مند کر کے بتلا دے کہ کون حق
۱۰۹ پر تھا اور کس کی جگہ باطل پرستی کی جگہ تھی) بلاشبہ وہ ہر بات پر قادر ہے!

اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو۔ یاد رکھو، جو کچھ بھی تم اپنے لیے نیکی کی پونجی پہلے سے اکٹھی کر لو گے، اللہ کے

مِنْ خَيْرٍ تَجِدُوْهُ عِنْدَ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۝ وَقَالُوْا لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ ۱۱۰
كَانَ هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى ۭ تِلْكَ اَمَانِيُّهُمْ ۭ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝ بَلٰى مَنْ اَسْلَمَ ۱۱۱
وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗٓ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ۠ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝ وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ ۱۱۲ ۱۳
لَيْسَتِ النَّصٰرٰى عَلٰي شَيْءٍ ۠ وَّقَالَتِ النَّصٰرٰى لَيْسَتِ الْيَهُوْدُ عَلٰي شَيْءٍ ۙ وَّهُمْ يَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ ۭ
كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ مِثْلَ قَوْلِهِمْ ۚ

پاس اس کے نتیجے موجود پاؤ گے (یعنے مستقبل میں اُس کے نتائج و ثمرات ظاہر ہونگے) تم جو کچھ بھی کرتے ہو، اللہ اُسے
دیکھ رہا ہے ؛ ۱۱۰

اور یہودی کہتے ہیں، جنّت میں کوئی آدمی داخل
نہیں ہو سکتا، جب تک کہ وہ یہودی نہ ہو۔ اسی طرح عیسائی
کہتے ہیں، جنّت میں کوئی داخل نہیں ہو سکتا جب تک
کہ عیسائی نہ ہو۔ (یعنے اُن میں سے ہر گروہ سمجھتا ہے، آخرت
کی نجات صرف اُسی کے حصّے میں آئی ہے، اور جب تک
ایک انسان اس کی مذہبی گروہ بندی میں داخل نہ ہو
نجات نہیں پا سکتا) اے پیغمبر! یہ اُن لوگوں کی جاہلانہ
اُمنگیں اور آرزوئیں ہیں۔ نہ کہ حقیقتِ حال۔ تم ان سے
کہو، اگر تم اپنے اس زعم میں سچے ہو، تو ثابت کرو، تمہارے
دعوے کی دلیل کیا ہے ؛ ۱۱۱

ہاں! (بلاشک نجات کی راہ کھلی ہوئی ہے، مگر وہ کسی
خاص گروہ بندی کی راہ نہیں ہو سکتی۔ وہ تو ایمان و عمل کی
راہ ہے) جس کسی نے بھی اللہ کے آگے سر جھکا دیا، اور وہ
نیک عمل بھی ہوا، تو وہ اپنے پروردگار سے اپنا اجر ضرور
پائیگا۔ نہ تو اس کے لیے کسی طرح کا کھٹکا ہے، نہ کسی طرح
کی غمگینی ؛ ۱۱۲

اہلِ مذاہب کی عالمگیر گمراہی یہ ہے کہ اُنہوں نے دین کی سچائی، جو
ایک ہی تھی اور یکساں طور پر سب کو دی گئی تھی، مذہبی گروہ بندیوں کے
الگ الگ حلقے بنا کر ضائع کر دی۔ اب ہر گروہ دوسرے گروہ کو جھٹلاتا
ہے، اور صرف اپنے ہی کو سچائی کا وارث سمجھتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس
نزاع کا فیصلہ کیونکر ہو؟ اگر کوئی ایک گروہ ہی سچا ہے، تو کیوں دوسرے سچا ہو،
دوسرے سچے نہ ہوں؟ اگر سب سچے ہیں، تو پھر کوئی بھی سچا نہیں، کیونکہ
ہر گروہ دوسرے کو جھٹلا رہا ہے۔ اگر سب جھوٹے ہیں، تو پھر خدا کی سچائی گئی
کہاں؟

قرآن کہتا ہے، خدا کی سچائی سب کے لیے ہے اور سب کو ملی تھی لیکن
سب نے سچائی سے انحراف کیا۔ سب اصل کے اعتبار سے سچے ہیں اور
سب عمل کے اعتبار سے جھوٹے۔ میں چاہتا ہوں، اُسی مشترک اور عالمگیر
سچائی پر سب کو جمع کر دوں، اور مذہبی نزاع کا خاتمہ ہو جائے۔ یہ مشترک
اور عالمگیر سچائی کیا ہے؟ خدا پرستی اور نیک عمل کا قانون ہے۔ یہی قانون
خدا کا ٹھہرایا ہوا دین ہے، اور اسی کو میں الاسلام کے نام سے پکارتا
ہوں۔

یہودی کہتے تھے، جب تک ایک انسان یہودی گروہ بندی میں
داخل نہ ہو، نجات نہیں پا سکتا۔ عیسائی کہتے تھے، جب تک عیسائی
گروہ بندی میں داخل نہ ہو، نجات نہیں مل سکتی۔ قرآن کہتا ہے، نجات
کا دار و مدار خدا پرستی اور نیک عمل پر ہے، نہ کسی خاص گروہ بندی پر۔ جو
انسان بھی خدا پرست اور نیک عمل ہوگا، نجات پائیگا خواہ تمہاری ٹھہرائی
ہوئی گروہ بندیوں میں داخل ہو یا نہ ہو۔

یہودی کہتے ہیں، عیسائیوں کا دین کچھ نہیں ہے، عیسائی کہتے ہیں، یہودیوں کے پاس کیا دھرا ہے؟ ۱۱۳
حالانکہ اللہ کی کتاب دونوں پڑھتے ہیں، اور اصل دین دونوں کے لیے ایک ہی ہے، ٹھیک ایسی ہی بات ان لوگوں نے

۱۱۳ فَاللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ○ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ
اَنْ يُّذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ وَسَعٰى فِيْ خَرَابِهَا ؕ اُولٰٓئِكَ مَا كَانَ لَهُمْ اَنْ يَّدْخُلُوْهَآ اِلَّا خَآئِفِيْنَ ۬
۱۱۴ لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ وَّلَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ○ وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ۗ فَاَيْنَمَا
۱۱۵ تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ○ وَقَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا ۙ سُبْحٰنَهٗ ؕ بَلْ لَّهٗ مَا فِي
۱۱۶ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ ○ بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَاِذَا قَضٰٓى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ

بھی کہی، جو (مقدس نوشتوں کا) علم نہیں رکھتے (یعنے مشرکین عرب نے، کہ وہ بھی صرف اپنے طریقہ ہی کو سچائی کا طریقہ سمجھتے ہیں) اچھا، قیامت کے دن اللہ ان کے درمیان حاکم ہوگا، اور جس بات میں جھگڑ رہے ہیں اُس
۱۱۳ کا فیصلہ کر دیگا۔

اور غور کرو، اُس سے بڑھ کر ظلم کرنے والا انسان کون ہو سکتا ہے، جو اللہ کی عبادت گاہوں میں اُس کے نام کی یاد کو روکے اور اُن کی ویرانی میں کوشاں ہو؟ جن لوگوں کے ظلم کا یہ حال ہے، یقیناً وہ اس لائق نہیں کہ خدا کی عبادت گاہوں میں قدم رکھیں۔ بجز اس حالت کے کہ (دوسروں کو اپنی طاقت سے ڈرانے کی جگہ، خود دوسروں کی طاقت سے) ڈرے سہمے ہوئے ہوں۔ یاد رکھو، ایسے

مذہبی گروہ بندی کا تعصب یہاں تک بڑھ گیا ہے کہ ہر گروہ کے لیے اُس کی مخصوص عبادت گاہیں ہیں۔ اگر دوسرے گروہ کا کوئی آدمی ان میں خدا کی عبادت کرنی چاہے، تو اُسے روک دیا جاتا ہے، اور ہر گروہ چاہتا ہے، دوسرے گروہ کی عبادت گاہیں ڈھادے اور ویران کر دے حالانکہ سب خدا پرستی کے مدعی ہیں، اور سب کا خدا ایک ہی خدا ہے۔ خدا کسی خاص عبادت گاہ کی چار دیواری کے اندر محدود نہیں ہے کہ صرف وہیں اُس کی عبادت کی جا سکے۔ جہاں کہیں بھی اُسے اخلاص کے ساتھ یاد کیا جائے، وہ قبول کریگا۔

۱۱۴ لوگوں کے لیے دُنیا میں بھی رسوائی ہے اور آخرت میں بھی سخت عذاب ہے۔

اور دیکھو) پورب ہو یا پچھم، ساری دنیا اللہ ہی کے لیے ہے۔ (اُس کی عبادت کسی ایک رُخ اور مقام ہی پر موقوف نہیں) جہاں کہیں بھی تم اللہ کے طرف رُخ کرلو، اللہ تمہارے سامنے ہے۔ بلاشبہ اُس کی قدرت کی سمائی
۱۱۵ بڑی ہی سمائی ہے، اور وہ سب کچھ جاننے والا ہے۔

اور) عیسائیوں کو دیکھو) اُنھوں نے کہا، خدا نے (نوعِ انسانی کا گناہ معاف کرنے کے لیے مسیح کو) اپنا بیٹا بنایا حالانکہ

عیسائیوں کی یہ گمراہی کہ کتاب الٰہی کی تعلیم سے منحرف ہو گئے، اور ابنیتِ مسیح کے اعتقاد باطل پر اپنی کلیسائی گروہ بندی قائم کرلی۔

خدا کی ذات اس سے پاک ہے (وہ کیوں اس بات کا محتاج ہو کہ کسی کو اپنا بیٹا بنائے؟) زمین اور آسمان میں جو کچھ
۱۱۶ ہے، سب اُسی کا ہے، اور سب اس کے فرمان کے آگے جھکے ہوئے ہیں۔

وہ آسمان و زمین کا صنّاع ہے۔ وہ جب کسی کام کا فیصلہ کرلیتا ہے، تو (نہ تو اُسے کسی مددگار کی ضرورت ہوتی

لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ○ وَقَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ لَوْلَا يُكَلِّمُنَا اللّٰهُ اَوْ تَاْتِيْنَاۤ اٰيَةٌ ؕ كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ ١١٧
مِنْ قَبْلِهِمْ مِّثْلَ قَوْلِهِمْ ؕ تَشَابَهَتْ قُلُوْبُهُمْ ؕ قَدْ بَيَّنَّا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ○ اِنَّاۤ اَرْسَلْنٰكَ بِالْحَقِّ ١١٨
بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ۙ وَّلَا تُسْـَٔلُ عَنْ اَصْحٰبِ الْجَحِيْمِ ○ وَلَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰى حَتّٰى ١١٩
تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ ؕ قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى ؕ وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ بَعْدَ الَّذِيْ جَآءَكَ مِنَ

ہے بے ذریعوں کی) بس وہ حکم دیتا ہے کہ ہو جا، اور جیسا کچھ اُس نے حکم دیا تھا، ویسا ہی ظہور میں آجاتا ہے! ١٧

> مشرکین عرب اور اُن کے جاہلانہ و معاندانہ اعتراضات۔ جس طرح انسانی سچائی کا مزاج ہمیشہ ایک ہی طرح کا رہا ہے، اُسی طرح انسانی گمراہی کا مزاج بھی ایک ہی طرح کا رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں، ہر زمانہ میں منکرینِ حق نے ایک ہی طریقہ پر سچائی کو جھٹلایا ہے۔ اور ایک ہی طرح کی صدائیں بلند کی ہیں۔

اور جو لوگ (مقدس نوشتوں کا) علم نہیں رکھتے (یعنی مشرکین عرب) وہ کہتے ہیں (اگر یہ تعلیم خدا کی طرف سے ہے تو) کیوں ایسا نہیں ہوتا کہ خدا ہم سے براہِ راست بات چیت کرے، یا اپنی کوئی (عجیب و غریب) نشانی ہی بھیج دے، تو (دیکھو، گمراہی کی) جیسی بات یہ کہہ رہے ہیں، ٹھیک ایسی ہی بات اُن لوگوں نے بھی کہی تھی جو ان سے پہلے گزر چکے ہیں۔ اس بارے میں پہلوں، پچھلوں، سب کے دل ایک ہی طرح کے ہوئے۔ (بہرحال، اگر یہ لوگ نشانیوں ہی کے طلب گار ہیں، تو چاہیے، نشانیوں کی پہچان بھی پیدا کریں، ہم نے اُن لوگوں کے لیے جو ماننے والے ہیں، کتنی ہی نشانیاں نمایاں کر دی ہیں۔ ١٨

> سچائی کی پہچان رکھنے والوں کے لیے سب سے بڑی نشانی پیغمبر کی تعلیم اور اُس کی زندگی ہے، اور یہ بات سنتِ الٰہی کے خلاف ہے کہ لوگوں کے جاہلانہ خیالات کے مطابق فرمائشی معجزے دکھلائے جائیں

اے پیغمبر! یہ ایک حقیقت ہے کہ ہم نے تمہیں (خلق اللہ کی ہدایت کے لیے) بھیجا ہے، اور اس لیے بھیجا ہے کہ (ایمان و عمل کی برکتوں کی) بشارت دو، اور (انکارِ حق کے نتائج سے) متنبہ کر دو (یعنی تمہاری دعوت تمام تر خدا پرستی اور نیک عملی کی دعوت ہے۔ پھر جو لوگ نشانیاں مانگ رہے ہیں، اگر فی الحقیقت ان میں سچائی کی طلب ہے، تو غور کریں، تمہاری دعوت سے بڑھ کر اور کونسی نشانی ہو سکتی ہے؟ جو لوگ (اپنی محرومی و شقاوت سے) دوزخی گروہ ہو چکے، تم اُن کے لیے خدا کے حضور جوابدہ نہیں ہو گے (تمہارا کام صرف پیامِ حق پہنچا دینا ہے!) ١٩

> یہ جتنی ٹولیاں الگ الگ بنالی گئی ہیں یعنے الگ الگ گروہ بندیاں کرلی گئی ہیں، مثلاً یہودیت اور مسیحیت، تو یہ سب انسانی گمراہی کی بناوٹیں ہیں۔ ہدایت کی راہ تو بس ہدایت کی راہ ہے جو کوئی اُس پر چلے گا، ہدایت یافتہ ہوگا۔ خواہ ان بنائی ہوئی ٹولیوں میں داخل ہو یا نہ ہو۔

اور حقیقت یہ ہے کہ اپنی سچائی کی کتنی ہی نشانیاں پیش کرو، (لیکن) یہود اور نصاریٰ تم سے خوش ہونے والے نہیں۔ وہ تو صرف اُسی حالت میں خوش ہو سکتے ہیں کہ تم اُن کی (بنائی ہوئی) جماعتوں کے پیرو ہو جاؤ (کیونکہ

۱۲ الْعِلْمِ ۙ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ○ اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَتْلُوْنَهٗ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ ؕ اُولٰٓئِكَ
۱۲۱ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ ؕ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ○ يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ
۱۲۲ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَنِّيْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ○ وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِيْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْئًا وَّلَا
۱۲۳ يُقْبَلُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا تَنْفَعُهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ○ وَاِذِ ابْتَلٰٓى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ

مذہبی گروہ بندی کا نتیجہ یہ ہے کہ حق پسندی اور حقیقت بینی کی جگہ محض گروہ پرستی کی روح کام کر رہی ہے۔ لوگ یہ نہیں دیکھتے کہ ایک انسان کا اعتقاد اور عمل کیسا ہے؟ صرف یہ دیکھتے ہیں کہ وہ ہماری گروہ بندی میں داخل ہے یا نہیں؟ جب لوگوں کی ذہنیت ایسی ہو جائے، تو ظاہر ہے کہ دلائل و حقائق کچھ کام نہیں دے سکتے۔ کتنی ہی سچی اور معقول بات کیوں نہ کہی جائے۔ ان لوگوں کے لیے بیکار ہوگی!

جب تک تم یہودیت اور نصرانیت کی گروہ بندی میں داخل نہ ہو جاؤ، یہودی اور عیسائی تم سے تو خوش ہونے والے نہیں اگرچہ تمہارا اعتقاد اور عمل کتنا ہی اچھا اور معقول ہو، اور خود ان کی مسلّمہ تعلیمات کے ٹھیک
۱۲۰ ٹھیک مطابق ہی کیوں نہ ہو۔

جس بات کو انہوں نے دین سمجھ رکھا ہے، وہ گروہ پرستی کے تعصب کے سوا کچھ نہیں ہے، پس تم ان سے (صاف صاف) کہہ دو کہ خدا کی ہدایت کی راہ تو وہی ہے جو ہدایت کی اصلی راہ ہے (نہ کہ تمہاری خود ساختہ گروہ بندیاں) اور یاد رکھو، اگر تم نے ان لوگوں کی خواہشوں کی پیروی کی، باوجودیکہ تمہارے پاس علم و یقین کی روشنی آچکی ہے تو یہ ہدایت الٰہی سے منہ موڑنا ہوگا، اور پھر اللہ کی دوستی اور مددگاری سے تم یکسر محروم ہو جاؤ گے ؛

اہلِ کتاب میں جو لوگ ایسے ہیں جو کتاب الٰہی کی ٹھیک ٹھیک تلاوت کرتے ہیں (یعنے راست بازی و اخلاص کے ساتھ پڑھتے ہیں) تو وہی ہیں جو (قبولیت حق کی استعداد رکھتے ہیں، اور اس لیے وہی ہیں جو) اس پر ایمان لائیں گے، اور جو کوئی (ان میں سے) انکار کرتا ہے تو (اس کی ہدایت کی کوئی اُمید نہیں) یہ وہ لوگ ہیں جن کے
۱۲۱ لیے تباہی و نامرادی ہے ؛

اے بنی اسرائیل، میری وہ نعمتیں یاد کرو جن سے میں نے تمہیں سرفراز کیا تھا، میں نے تمہیں دنیا کی قوموں
۱۲۲ میں برگزیدگی عطا فرمائی تھی!

اور دیکھو، اُس دن سے ڈرو جو یقیناً آنے والا ہے (اور جس دن ہر انسان کو اپنے اعمال کے نتیجوں سے دوچار ہونا ہے) اُس دن نہ تو کوئی جان دوسری جان کے کام آئے گی (کہ اپنے بزرگوں اور پیشواؤں کا نام لے کر اپنے آپ کو بخشوا لو) نہ کسی طرح کا بدلہ قبول کیا جائے گا (کہ اپنی بدعملیوں کا فدیہ دے کر جان چھڑا لو) نہ کسی کی سعی و سفارش چل سکے گی (کہ
۱۲۳ اُن کا وسیلہ پکڑ کے کام نکال لو) اور نہ ہی ایسا ہو گا کہ مجرموں کو کہیں سے مدد ملے!

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی آزمائش، منصب امامت کا عطیہ، دینِ الٰہی کی دعوت، معبدِ کعبہ کی تعمیر اور اُمّتِ مسلمہ کے ظہور کی دعا، یہ ذکر اس محل میں بار بصیرتیں رکھتا ہے:

(۱) یہود، نصاریٰ اور مشرکین عرب، تینوں گروہوں کے لیے حضرت

اور (پھر غور کرو، وہ مراقبہ) جب ابراہیم کو اُس کے پروردگار نے چند باتوں میں آزمایا تھا، اور وہ اُن میں پورا اُترا تھا، جب ایسا ہوا، تو خدا نے فرمایا اے ابراہیم! میں تجھے

۱۲۴ قَالَ اِنِّیْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ؕ قَالَ وَمِنْ ذُرِّیَّتِیْ ؕ قَالَ لَا یَنَالُ عَهْدِی الظّٰلِمِیْنَ ۝ وَاِذْ جَعَلْنَا
الْبَیْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَاَمْنًا ؕ وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّی ؕ وَعَهِدْنَاۤ اِلٰۤی اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِیْلَ اَنْ
۱۲۵ طَهِّرَا بَیْتِیَ لِلطَّآئِفِیْنَ وَالْعٰكِفِیْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ۝ وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا
وَّارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ قَالَ وَمَنْ كَفَرَ فَاُمَتِّعُهٗ
قَلِیْلًا ثُمَّ اَضْطَرُّهٗۤ اِلٰی عَذَابِ

ابراہیم کی شخصیت ایک مسلّم شخصیت تھی۔ اس لیے اُن کی دعوت سے استشہاد تینوں کے لیے ناقابلِ انکار استشہاد تھا۔

(۲) مذہبی گروہ بندی کے خلاف اہمیوں گروہوں کے لیے ایک حجت قاطع ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ تینوں گروہ بندیاں اور اُن کے عقائد و رسوم حضرت ابراہیم کے بہت بعد پیدا ہوئے۔ سوال یہ ہے کہ حضرت ابراہیم کا طریقہ کیا تھا؟ یقیناً وہ ان گروہ بندیوں کا طریقہ نہ تھا۔ پس جو طریقہ اُن کا تھا، اُسی کی دعوت قرآن دیتا ہے!

(۳) یہودیوں کی جماعتی سرگرانی زیادہ تر نسلی غرور کا نتیجہ تھی۔ وہ کہتے تھے، ہم حضرت ابراہیم کی نسل سے ہیں۔ اور تورات میں ہے کہ خدا نے اس کی نسل کو برکت دی۔ اس بیان نے واضح کر دیا کہ اوّل تو نسل کے شرف میں بنی اسحاق کی طرح بنی اسماعیل بھی شریک ہیں۔ پھر جو کچھ بھی ہو، خدا کا عہدِ برکت نیک کرداروں کے لیے تھا۔ نہ کہ بدکرداروں کے لیے۔ جن لوگوں نے ایمان و عمل کی سعادت کھو دی اُن کے لیے نسل کا امتیاز کچھ سودمند نہیں ہو سکتا!

(۴) پچھلی اُمتوں کی محرومیوں کے ذکر کے بعد حقیقت واضح کرنی تھی کہ اب توفیقِ الٰہی نے پیروانِ دعوتِ قرآن کو خدمتِ حق کے لیے چن لیا ہے اور اقوامِ عالم کی ہدایت کا سررشتہ اُن کے سپرد کیا جا رہا ہے۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ پہلے دعوتِ قرآن کے ظہور کی معنوی تاریخ بیان کر دی جائے۔ چنانچہ معبدِ کعبہ کی تعمیر اور حضرت ابراہیم کی دعا کا ذکر اسی غرض سے کیا گیا ہے کہ آنے والے بیان کے لیے ایک قدرتی تمہید کا کام دے۔

انسانوں کے لیے امام بنانے والا ہوں (یعنے دنیا کی نسلیں والی قومیں تیری دعوت قبول کرینگی اور تیرے نقشِ قدم پر چلیں گی) ابراہیم نے عرض کیا، جو لوگ میری نسل میں سے ہونگے، اُن کی نسبت کیا حکم ہے؟ ارشاد ہوا، جو ظلم و معصیت کی راہ اختیار کریں، تو اُن کا میرے اس
۱۲۴ عہد میں کوئی حصہ نہیں ؂

اور (پھر دیکھو) جب ایسا ہوا تھا کہ ہم نے (مکّہ کے) اُس گھر کو (یعنے خانۂ کعبہ کو) انسانوں کی گرد آوری کا مرکز اور امن و حُرمت کا مقام ٹھہرا دیا، اور حکم دیا کہ ابراہیم کے کھڑے ہونے کی جگہ (ہمیشہ کے لیے) نماز کی جگہ بنالی جائے۔ اور ہم نے ابراہیم اور اسماعیل کو حکم دیا تھا کہ ہمارے نام پر جو گھر بنایا گیا ہے، اُسے طواف کرنے والوں، عبادت کے لیے ٹھہرنے والوں، اور رکوع و سجود کرنے والوں کے لیے (ہمیشہ) پاک رکھنا اور ظلم و معصیت
۱۲۵ کی گندگیوں سے آلودہ نہ کرنا!) ؂

اور (پھر) جب ایسا ہوا تھا کہ ابراہیم نے خدا کے حضور دعا مانگی تھی: "اے پروردگار! اس جگہ کو (جو دنیا کی آباد سرزمینوں سے دور اور سرسبزی و شادابی سے یک قلم محروم ہے) امن و امان کا ایک آباد شہر بنا دے، اور اپنے فضل و کرم سے ایسا کر، کہ یہاں کے بسنے والوں میں جو لوگ تجھ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھنے والے ہوں، اُن کی رزق کے لیے ہر طرح کی پیداوار مہیا ہو جائے ؂"

اس پر ارشادِ الٰہی ہوا تھا کہ (تمہاری دُعا قبول کی گئی) یہاں کے باشندوں میں سے) جو کوئی کفر کا شیوہ اختیار

١٢٦ النَّارِ ۭ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ۝ وَاِذْ يَرْفَعُ اِبْرٰھٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَاِسْمٰعِيْلُ ۭ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ۭ
١٢٧ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝ رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ ۠
١٢٨ وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا ۚ اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ۝ رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ
١٢٩ ع ١٥ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ ۭ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝ وَمَنْ يَّرْغَبُ
عَنْ مِّلَّةِ اِبْرٰھٖمَ اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ ۭ وَلَقَدِ اصْطَفَيْنٰهُ فِي الدُّنْيَا ۚ وَاِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ
١٣٠ الصّٰلِحِيْنَ ۝ اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗٓ اَسْلِمْ ۙ قَالَ اَسْلَمْتُ

کرے گا، سو اُسے بھی ہم (سر و سامانِ رزق سے) فائدہ اُٹھانے دیں گے۔ البتہ یہ فائدہ اُٹھانا بہت تھوڑا ہوگا کیونکہ
١٢٦ بالآخر اُسے (پاداشِ عمل میں) چار و ناچار دوزخ میں جانا ہے، اور کیا ہی بُرا اُس کا ٹھکانا ہُوا!
اور (پھر دیکھو، وہ کیسا عظیم الشان اور انقلاب انگیز وقت تھا) جب ابراہیم خانۂ کعبہ کی نیو ڈال رہا تھا، اور
اسمٰعیل بھی اُس کے ساتھ شریک تھا (اُن کے ہاتھ پتھر چُن رہے تھے اور دل و زبان پر یہ دعا طاری تھی:) "اے
١٢٧ پروردگار! ہمارا یہ عمل تیرے حضور قبول ہو! بلاشبہ تو ہی ہے جو دعاؤں کا سُننے والا اور (مصالحِ عالم کا) جاننے والا ہے:
اے پروردگار (اپنے فضل و کرم سے) ہمیں ایسی توفیق دے کہ ہم سچّے مسلم (یعنے تیرے حکموں کے فرمانبردار)
ہو جائیں، اور ہماری نسل میں سے بھی ایک ایسی اُمت پیدا کر دے جو تیرے حکموں کی فرمانبردار ہو! خدایا ہمیں ہماری عبادت
کے (سچّے) طور طریقے بتلا دے، اور ہمارے قصوروں سے درگزر کر۔ بلاشبہ تیری ہی ذات ہے جو رحمت سے درگزر کرنے
١٢٨ والی ہے اور جس کی رحیمانہ درگزر کی کوئی انتہا نہیں! اور خدایا! (اپنے فضل و کرم سے) ایسا کیجیو کہ اس بستی کے بسنے
والوں میں تیرا ایک رسول پیدا ہو جو اُنہی میں سے ہو۔ وہ تیری آیتیں پڑھ کر لوگوں کو سُنائے، کتاب اور حکمت کی تعلیم
دے، اور (اپنی پیغمبرانہ تربیت سے) اُن کے دلوں کو مانجھ دے۔ اے پروردگار! بلاشبہ تیری ہی ذات ہے جو حکمت والی
١٢٩ اور سب پر غالب ہے"

دین کی جو راہ حضرت ابراہیم نے اختیار کی تھی، وہ کیا تھی؟ اُن کے بعد اُن کی اولاد جس طریقہ پر چلتی رہی، وہ کونسا طریقہ تھا؟ خود اسرائیل یعنے حضرت یعقوب نے اپنے بسترِ مرگ پر جس دین کی وصیت کی وہ کونسا دین تھا؟ یقیناً وہ یہودیت اور مسیحیت کی گروہ بندی نہ تھی۔ وہ صرف خدا پر ایمان لانے اور اُس کے قانونِ سعادت کی فرمانبرداری کرنے کی فطری اور عالمگیر سچائی تھی اور اُسی کی دعوت قرآن دیتا ہے۔

دینِ الٰہی کو اسی لیے "الاسلام" کے نام سے تعبیر کیا گیا جس کے معنی اطاعت کرنے کے ہیں یعنے ہر طرح کی نسبتوں اور گروہ بندیوں سے الگ ہو کر صرف اطاعتِ حق کی طرف انسان کو دعوت دی جائے۔

(یہ ہے ابراہیم کا طریقہ) اور اُن لوگوں کے سوا جنہوں نے
اپنے آپ کو نادانی و جہالت کے حوالے کر دیا ہے، کون ہے جو
ابراہیم کے طریقے سے مُنہ پھیر سکتا ہے؟ اور واقعہ یہ ہے کہ
ہم نے دنیا میں بھی اُسے برگزیدگی کے لیے چُن لیا، اور آخرت
١٣٠ میں بھی اُس کی جگہ نیک انسانوں کے زمرے میں ہوگی!
جب ابراہیم کے پروردگار نے اُسے حکم دیا تھا کہ "فرمانبردار
ہو جا" تو وہ پکار اُٹھا تھا "میں اُس کے حکموں کا فرمانبردار

لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝ وَوَصّٰی بِهَآ اِبْرٰهٖمُ بَنِیْهِ وَیَعْقُوْبُ ؕ یٰبَنِیَّ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰی لَكُمُ الدِّیْنَ فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا ۱۳۱
وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ۝ اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ اِذْ حَضَرَ یَعْقُوْبَ الْمَوْتُ ۙ اِذْ قَالَ لِبَنِیْهِ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْۢ ۱۳۲
بَعْدِیْ ؕ قَالُوْا نَعْبُدُ اِلٰهَكَ وَاِلٰهَ اٰبَآئِكَ اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِیْلَ وَاِسْحٰقَ اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚۖ وَّنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ۱۳۳
تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۚ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ ۚ وَلَا تُسْـَٔلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ۝ وَقَالُوْا ۱۳۴
كُوْنُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰی تَهْتَدُوْا ؕ قُلْ بَلْ مِلَّةَ اِبْرٰهٖمَ حَنِیْفًا ؕ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ ۝ ۱۳۵

ہوگیا جو تمام دنیا کا پروردگار ہے"۔ ۱۳۱
اور پھر اسی طریقہ کی ابراہیم نے اپنے بیٹوں کو اور (اُس کے پوتے) یعقوب نے اپنی اولاد کو وصیت کی تھی۔
اُنہوں نے کہا "اے میرے بیٹو! خدا نے تمہارے لیے اِس دین (حقیقی) کی راہ پسند فرمالی ہے، تو دیکھو، دنیا سے نہ
جانا مگر اس حالت میں کہ تم مسلم ہو (یعنے فرمانبردار ہو)"۔ ۱۳۲
پھر کیا تم اس وقت موجود تھے جب یعقوب کے سرہانے موت آکھڑی ہوئی تھی، اور اُس نے اپنے بیٹوں کو
وصیت کرتے ہوئے پوچھا تھا "میرے بعد تم کس کی عبادت کروگے؟" اُنہوں نے جواب دیا "اُسی خدائے واحد
کی، جس کی تو نے عبادت کی ہے، اور تیرے بزرگوں ابراہیم، اسماعیل، اور اسحاق نے کی ہے، اور ہم اس کے
حکموں کے فرمانبردار ہوئے!" ۱۳۳

(بہر حال) یہ ایک اُمت تھی
جو گزر چکی اُس کے لیے وہ تھا
جو اُس نے اپنے عمل سے کمایا،
تمہارے لیے وہ ہوگا، جو تم
اپنے عمل سے کماؤگے تم سے
کچھ اس کی پوچھ کچھ نہیں ہوگی
کہ اُن لوگوں کے اعمال کیسے تھے! ۱۳۴

قانون الٰہی یہ ہے کہ ہر فرد اور جماعت کو وہی پیش آتا ہے، جو اُس نے اپنے عمل سے کمایا ہے۔ نہ تو ایک کی نیکی دوسرے کو بچا سکتی ہے۔ نہ ایک کی بدعملی کے لیے دوسرا جوابدہ ہو سکتا ہے۔
انسان کے لیے قدامت پرستی کا پھندا بڑا ہی سخت پھندا ہے۔ اس کے پیچ سے وہ نکل نہیں سکتا۔ وہ ہمیشہ ماضی کے افسانوں میں گم رہیگا اور ہر پرانے طور طریقہ کو تقدیس کی نظر سے دیکھے گا۔ ہندو ہزاروں برس سے مہابھارت اور پرانوں کے افسانوں میں پھنسے ہوئے ہیں۔ مسلمانوں کے دو فرقے آج تک اس نزاع سے فارغ نہیں ہوئے کہ تیرہ سو برس پہلے سقیفہ میں خلافت کا جو انتخاب ہوا تھا، وہ صحیح تھا یا غلط! لیکن قرآن کہتا ہے "تلک اُمۃ قد خلت لھا ما کسبت ولکم ما کسبتم" یہ ایک گروہ تھا جو گزر چکا۔ اب اس کے پیچھے پڑے رہنے سے تمہیں کوئی فائدہ نہیں مل سکتا۔ تم اپنی خبر لو ان کے اعمال ان کے لئے تھے۔ تمہارے تمہارے لئے ہیں۔

یہودیوں نے کہا یہودی ہو جاؤ، ہدایت پاؤگے۔ نصاریٰ نے کہا نصرانی ہو جاؤ، ہدایت پاؤگے لیکن تم کہو
نہیں، (خدا کی عالمگیر سچائی ان گروہ بندیوں میں محدود نہیں ہو جا سکتی) اُس کی راہ تو وہی "حنیفی" راہ ہے جو ابراہیم کی راہ
تھی یعنے تمام انسانی طریقوں سے منہ موڑنا، اور صرف خدا کے سیدھے سادے
فطری طریقہ کا ہو رہنا) اور یقیناً وہ شرک کرنے والوں میں سے نہ تھا۔ ۱۳۵

بہر حال ہدایت کی راہ ان گروہ بندیوں کی راہ نہیں ہو سکتی، اور نہ وہ کسی ایک قوم اور گروہ ہی کے

قُولُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ
وَمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَمَآ اُوْتِيَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ وَنَحْنُ لَهٗ
١٣٦ مُسْلِمُوْنَ ○ فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا هُمْ فِيْ شِقَاقٍ
١٣٧ فَسَيَكْفِيْكَهُمُ اللّٰهُ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ○ صِبْغَةَ اللّٰهِ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً وَّنَحْنُ
١٣٨ لَهٗ عٰبِدُوْنَ ○ قُلْ اَتُحَآجُّوْنَنَا فِي اللّٰهِ

مسلمانو! تم کہو، ہمارا طریقہ تو یہ ہے کہ ہم اللہ پر ایمان لائے ہیں۔ قرآن پر ایمان لائے ہیں جو ہم پر نازل ہوا ہے۔ اُن تمام تعلیموں پر ایمان لائے ہیں جو ابراہیم کو، اسمٰعیل کو، اسحاق کو، یعقوب کو، اور اولادِ یعقوب کو دی گئیں۔ نیز اُن کتابوں پر، جو موسیٰ اور عیسیٰ کو دی گئی تھیں۔ اور صرف اتنا ہی نہیں، بلکہ اُن تمام تعلیموں پر بھی ایمان رکھتے ہیں جو دنیا کے تمام نبیوں کو ان کے پروردگار سے ملی ہیں۔ ہم ان میں سے کسی ایک کو بھی دوسروں سے جُدا نہیں کرتے (کہ اُسے نہ مانیں، باقی سب کو مانیں۔ یا اُسے مانیں۔ مگر دوسروں سے منکر ہو جائیں۔ خدا کی سچائی کہیں بھی، اور کسی پر بھی آئی ہو) ہم خدا
١٣٦ کے فرمانبردار ہیں:

حصے میں آئی ہے۔ ہدایت کی راہ تو وہی ہے جو حضرت ابراہیم کی راہ تھی، اور وہ خدا کا عالمگیر قانونِ نجات ہے۔

پس سچائی کی راہ یہ ہوئی کہ دوسرے کو جھٹلانے کی جگہ سب کی تصدیق کرو۔ دنیا میں جس قدر بھی رہنمایانِ مذاہب آئے ہیں، خواہ وہ کسی عہد اور کسی ملک و قوم سے تعلق رکھتے ہوں، سب ایک ہی سچائی کے پیغامبر تھے، اور اس لیے سب کی یکساں طور پر تصدیق کرنی چاہیے۔

داعیانِ مذاہب میں سے کسی ایک کا انکار بھی، سب کا انکار ہے۔ جو کوئی "تفریق بین الرسل" کرتا ہے یعنے کسی کو مانتا ہے کسی کو نہیں مانتا، وہ فی الحقیقت خدا کے پورے سلسلۂ ہدایت کا منکر ہے۔

قرآن کہتا ہے، میری راہ عالمگیر تصدیق کی راہ ہے۔ اگر تم یہودی ہو اور تورات پر ایمان رکھتے ہو، تو میں اُس کا مصدِّق ہوں، اور اسی لیے آیا ہوں تاکہ دینِ حقیقی تازہ کروں۔ اگر تم مسیحی ہو تو میں انجیل کا منکر کب ہوں؟ میں تو اسی لیے آیا ہوں کہ تم انجیل کے سچے عامل بن جاؤ۔ اگر تم حضرت ابراہیم کے نام لیوا ہو، تو میری دعوت سرتاسر ملتِ ابراہیمی ہی کی دعوت ہے۔ اگر تم کسی دوسرے رسول اور دیانتِ مذہب کے پیرو ہو، تو میں تمہیں اُس کا منکر بنانا نہیں چاہتا۔ اُس کی تصدیق میں اور زیادہ پختہ کر دینا چاہتا ہوں۔

پھر اگر یہ لوگ بھی ایمان کی راہ اختیار کر لیں۔ اُسی طرح جس طرح تم نے اختیار کی ہے، تو سارے جھگڑے ختم ہو گئے اور انہوں نے ہدایت پالی۔ لیکن اگر اس سے روگردانی کریں، تو پھر سمجھ لو کہ (اُن کے ماننے کی کوئی اُمید نہیں) اُن کی راہ (طلبِ حق کی جگہ) ہٹ دھرمی کی راہ ہے۔ پس (اُن سے قطع نظر کر لو اور اپنے کام میں سرگرم رہو) وہ وقت دور
١٣٧ نہیں، جب اللہ کی مدد تمہیں ان کی مخالفتوں سے بے پروا کر دے گی۔ وہ سُننے والا اور سب کچھ جاننے والا ہے!
(ہدایت اور نجات کی راہ کسی رسمی اصطباغ یعنے رنگ دینے کی محتاج نہیں، جیسا کہ عیسائیوں کا شیوہ ہے) یہ اللہ
١٣٨ کا رنگ دینا ہے، اور بتلاؤ، اللہ سے بہتر اور کس کا رنگ دینا ہو سکتا ہے؟ اور ہم اُسی کی بندگی کرنے والے ہیں!

(اے پیغمبر) تم ان لوگوں سے کہو۔ (ہماری راہ تو خدا پرستی کی راہ ہے۔ پھر) کیا تم خدا کے بارے میں ہم سے جھگڑتے ہو؟ (یعنی

جب سب کا پروردگار ایک ہے، اور ہر انسان کے لیے اُس کا عمل ہے، تو پھر خدا اور دین کے نام پر یہ تمام جھگڑے کیوں ہیں؟ کیوں ہیں؟ کیوں

۳۹ وَهُوَ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ ۚ وَلَنَا أَعْمَالُنَا وَلَكُمْ أَعْمَالُكُمْ ۚ وَنَحْنُ لَهُ مُخْلِصُونَ ۝ أَمْ تَقُولُونَ إِنَّ إِبْرَاهِيمَ
وَإِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ وَالْأَسْبَاطَ كَانُوا هُودًا أَوْ نَصَارَىٰ ۗ قُلْ أَأَنتُمْ أَعْلَمُ أَمِ اللَّهُ ۗ
۴۰ وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّن كَتَمَ شَهَادَةً عِندَهُ مِنَ اللَّهِ ۗ وَمَا اللَّهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ ۝ تِلْكَ أُمَّةٌ
۱۴۱ قَدْ خَلَتْ ۖ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُم مَّا كَسَبْتُمْ ۖ وَلَا تُسْأَلُونَ عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ ۝ سَيَقُولُ
السُّفَهَاءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلَّاهُمْ عَن قِبْلَتِهِمُ الَّتِي كَانُوا عَلَيْهَا ۚ قُل لِّلَّهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ۚ
۱۴۲ يَهْدِي مَن يَشَاءُ إِلَىٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ ۝

ایک مذہب کا پیرو دوسرے مذہب کے پیرووں کا دشمن ہو؟ کیوں ایک انسان دوسرے انسان سے نفرت کرے؟

خدا پرستی کے شیوے ہی سے تمہیں اختلاف ہے؟) حالانکہ ہمارا اور تمہارا، دونوں کا پروردگار وہی ہے۔ ہمارے لیے
ہمارے اعمال ہیں، تمہارے لیے تمہارے اعمال۔ اور ہمارا طریقہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ صرف اسی کی بندگی
۳۹ کرنے والے ہیں! ∴

یا پھر تمہارا (یعنے یہود اور نصاریٰ کا) دعویٰ یہ ہے کہ ابراہیم، اسماعیل، اسحاق، یعقوب، اور اولادِ یعقوب بھی یہودی اور نصرانی تھے؟ اے پیغمبر! ان سے کہو، تم زیادہ جاننے والے ہو یا اللہ ہے؟ (اگر اللہ ہے، تو اس کی گواہی تو تمہارے خلاف، خود تمہاری کتاب میں موجود ہے جسے تم دیدہ و دانستہ چھپا رہے ہو) پھر بتلاؤ اس سے بڑھ کر کون ظالم ہو سکتا ہے ∴

کتمانِ حق یعنے سچائی کو دیدہ و دانستہ ظاہر نہ کرنا اللہ کے نزدیک سب سے بڑا گناہ ہے۔

جس کے پاس اللہ کی ایک گواہی موجود ہو، اور وہ اسے چھپائے؟ (اور محض اپنی بات کی پچ کے لیے سچائی کا اعلان نہ کرے؟) یاد رکھو جو کچھ بھی تم کر رہے ہو، اللہ
۴۰ اس سے غافل نہیں ہے! ∴

(اور پھر جو کچھ بھی ہو) یہ ایک اُمت تھی جو گزر چکی۔ اس کے لیے وہ تھا جو اس نے اپنے عمل سے کمایا۔ تمہارے
۱ لیے وہ ہوگا، جو تم اپنے عمل سے کماؤ گے۔ تم سے کچھ اس کی پوچھ گچھ نہیں ہوگی کہ اُن کے اعمال کیسے تھے ∴

دعوتِ ابراہیمی سے وحدتِ دین کے استشہاد کا بیان ختم ہوگیا۔ اب یہاں سے اس کا دوسرا حصہ شروع ہوتا ہے، جو پچھلے بیان کا قدرتی نتیجہ ہے۔ حضرت ابراہیم کو اقوامِ عالم کی امامت ملی تھی۔ اُنھوں نے مکہ میں عبادت گاہِ کعبہ تعمیر کی، اور اُمتِ مسلمہ کے ظہور کی الہامی دعا مانگی مشیت الٰہی میں اس ظہور کے لیے ایک خاص وقت مقرر تھا جب وہ وقت آگیا، تو پیغمبر اسلام کا ظہور ہوا، اور اُن کی تعلیم و تزکیہ سے موعودہ اُمت پیدا ہوگئی۔ اس اُمت کو "نیک ترین اُمت" ہونے کا نصب العین

جو لوگ عقل و بصیرت سے محروم ہیں، وہ کہیں گے مسلمان جس قبلہ کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھا کرتے تھے، کیا بات ہوئی کہ اُن کا رُخ اس سے پھر گیا؟ (اے پیغمبر! تم کہو: پورب ہو یا پچھم، سب اللہ ہی کے لیے ہے۔ (وہ کسی خاص مقام یا جہت میں محدود نہیں) وہ جس کسی کو چاہتا ہے (کامیابی و سعادت کی) سیدھی راہ دکھا دیتا ہے! ∴

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ؕ
وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِىْ كُنْتَ عَلَيْهَآ اِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَّتَّبِعُ الرَّسُوْلَ مِمَّنْ يَّنْقَلِبُ عَلٰى عَقِبَيْهِ ؕ وَ
اِنْ كَانَتْ لَكَبِيْرَةً اِلَّا عَلَى الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ ؕ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيْعَ اِيْمَانَكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ
لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ۝ قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِى السَّمَآءِ ۚ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰىهَا ۪ فَوَلِّ وَجْهَكَ ۱۴۳
شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ ؕ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَيَعْلَمُوْنَ
اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا يَعْمَلُوْنَ ۝

عطا کیا گیا، اور اقوامِ عالم کی تعلیم اُس کے سپرد کی گئی۔ ضروری تھا کہ اس کی روحانی ہدایت کا ایک مرکز بھی ہوتا۔ یہ مرکز، قدرتی طور پر، عبادت گاہِ کعبہ ہی ہو سکتا تھا۔ چنانچہ تحویلِ قبلہ نے اس کی مرکزیت کا اعلان کر دیا۔ یہی حقیقت "قبلہ" کے تقرر میں پوشیدہ تھی۔ چنانچہ "سیقول السفہاء" سے یہی بیان شروع ہوتا ہے۔ پیروانِ دعوتِ قرآنی مخاطب ہیں، اور انہیں بتلایا جا رہا ہے کہ حضرت ابراہیم کے عملِ حق نے جو بیج بویا تھا، وہ بارآور ہو گیا ہے اور "نیک ترین اُمت" تم ہو۔

اور (مسلمانو! جس طرح یہ بات ہوئی کہ بیت المقدس کی جگہ خانۂ کعبہ "قبلہ" قرار پایا) اسی طرح یہ بات بھی ہوئی کہ ہم نے تمہیں "نیک ترین اُمت" ہونے کا درجہ عطا فرمایا، تاکہ تمام انسانوں کے لیے (سچائی کی) گواہی دینے والے ہو اور تمہارے لیے اللہ کا رسول گواہی دینے والا ہو:

اور اگر ہم نے اتنے دنوں تک تمہیں اُسی قبلہ پر رہنے دیا جس کی طرف تم رُخ کر کے نماز پڑھا کرتے تھے، تو یہ اس لیے تھا، تاکہ (وقت پر) معلوم ہو جائے، کون لوگ اللہ کے رسول کی پیروی میں سچے ہیں، اور کون لوگ (دل کے کچے ہیں جو آزمائش میں پڑ کر) اُلٹے پاؤں پھر جانے والے ہیں اور اس میں شک نہیں کہ ہدایت یافتہ لوگوں کے سوا اور سب کے لیے اس معاملہ میں بڑی ہی سخت آزمائش تھی۔ بہرحال (جو لوگ آزمائش میں پورے اُترے ہیں، وہ یقین کریں، اُن کی استقامت کے ثمرات بہت جلد نہیں حاصل ہوں گے) ایسا نہیں ہو سکتا کہ خدا تمہارا ایمان رائگاں جانے دے۔ وہ تو انسانوں کے لیے سرتاسر شفقت و رحمت
۱۴۳ رکھنے والا ہے!:

(اے پیغمبر!) ہم دیکھ رہے ہیں کہ (حکمِ الٰہی کے شوق و طلب میں) تمہارا چہرہ بار بار آسمان کی طرف اُٹھ اُٹھ جاتا ہے، تو یقین کرو، ہم عنقریب تمہارا رُخ ایک ایسے ہی قبلہ کی طرف پھرا دینے والے ہیں جس سے تم خوشنود ہو جاؤ گے۔ (اور اب کہ اس معاملہ کے ظہور کا وقت آگیا ہے) تو چاہیے کہ تم اپنا رُخ مسجدِ حرام (یعنی خانۂ کعبہ کی طرف پھیر لو، اور جہاں کہیں بھی تم اور تمہارے ساتھی ہوں، ضروری ہے کہ (نماز میں) رُخ اُسی طرف کو پھر جایا کرے:

اور جن لوگوں کو کتاب دی گئی ہے (یعنی یہود اور نصاریٰ) وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ یہ معاملہ اُن کے پروردگار کی طرف سے ایک امرِ حق ہے (کیونکہ اُن کے مقدس نوشتوں میں اس کی پیشین گوئی موجود ہے) اور جیسے کچھ اُن کے
۱۴۴ اعمال ہیں، اللہ اُن سے غافل نہیں ہے!

وَلَئِنْ اَتَیْتَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ بِکُلِّ اٰیَةٍ مَّا تَبِعُوْا قِبْلَتَكَ ۚ وَمَآ اَنْتَ بِتَابِعٍ قِبْلَتَهُمْ ۚ وَمَا
بَعْضُهُمْ بِتَابِعٍ قِبْلَةَ بَعْضٍ ؕ وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ اِنَّكَ
وقف لازم ۱۴۵ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِیْنَ ۝ اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰهُمُ الْکِتٰبَ یَعْرِفُوْنَهٗ کَمَا یَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ ؕ وَاِنَّ فَرِیْقًا
۱۴۶ ع ۱۷ مِّنْهُمْ لَیَکْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَهُمْ یَعْلَمُوْنَ ۝ اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَکُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِیْنَ ۝ وَ
لِکُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّیْهَا فَاسْتَبِقُوا الْخَیْرٰتِ ؕ اَیْنَ مَا تَکُوْنُوْا یَاْتِ بِکُمُ اللّٰهُ جَمِیْعًا ؕ اِنَّ

اگر تم اہل کتاب کے سامنے دنیا جہان کی ساری دلیلیں بھی پیش کر دو، جب بھی وہ تمہارے قبلہ کی پیروی کرنے والے نہیں۔ نہ یہ ہو سکتا ہے کہ (علم و بصیرت سے بے بہرہ ہو کر) تم اُن کے قبلہ کی پیروی کرنے لگو، اور نہ خود وہی کسی ایک قبلہ پر متفق ہیں۔ اُن میں سے ایک گروہ دوسرے گروہ کا قبلہ ماننے والا نہیں۔ اور یاد رکھو، اگر تم نے ان لوگوں کی خواہشوں کی پیروی کی باوجودیکہ تمہیں اس بارے

یہود اور نصاریٰ کا تحویل قبلہ پر اعتراض کرنا محض گروہ پرستی کے تعصب کا نتیجہ ہے۔ اگر اُن میں حق پرستی ہوتی، تو وہ آپس میں کیوں ایک دوسرے سے مختلف ہوتے، اور کیوں ایسا ہوتا کہ یہودی عیسائیوں کا قبلہ نہیں مانتے، اور عیسائیوں کو یہودیوں کے قبلہ سے انکار رہتا؟ پس جب صورتِ حال ایسی ہے، تو متبع حق کو چاہیے، ایسے لوگوں کے اتفاق و یک جہتی سے قطع نظر کرے، کیونکہ جن لوگوں نے اتباعِ حق سے یک قلم کنارہ کشی کر لی ہے، ان کے ساتھ متبع حق کا کبھی اتفاق نہیں ہو سکتا۔

۱۴۵ میں علم حاصل ہو چکا ہے، تو تم یقیناً نافرمانی کرنے والوں میں سے ہو جاؤ گے! ؞

اور حقیقت یہ ہے کہ جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی ہے (یعنے اہل کتاب کے علماء) اُن پر حقیقتِ حال پوشیدہ نہیں ہے۔ وہ پیغمبر اسلام کو ویسے ہی جان پہچان گئے ہیں، جس طرح اپنی اولاد کو جانتے پہچانتے ہیں۔ لیکن اس پر
۱۴۶ بھی ان میں ایک گروہ ایسا ہے، جو جان بوجھ کر سچائی کو چھپاتا ہے۔ ؞

یقین کرو، یہ (تحویل قبلہ کا) معاملہ تمہارے پروردگار کی طرف سے ایک امر حق ہے (اور جو بات حق ہو، تو وہ اپنے قیام و ثبات سے اپنی حقانیت کا اعلان کر دے گی) پس دیکھو ایسا نہ ہو کہ تم شک کرنے والوں میں سے ہو جاؤ!

کسی بات کا حق ہونا ہی اُس کی حقانیت کی سب سے بڑی دلیل ہے۔ کیونکہ حق کے معنی ہی قائم و ثابت رہنے کے ہیں: اور جو بات قائم و ثابت رہنے والی ہے، اس کے لیے اس کے قیام و ثبات سے بڑھ کر اور کونسی دلیل ہو سکتی ہے؟

اور (دیکھو) ہر گروہ کے لیے ایک سمت ہے جس کی طرف وہ (عبادت کے وقت) رُخ پھیر لیتا ہے۔ (پس یہ کوئی ایسی بات نہیں جسے حق و باطل کا معیار سمجھ لیا جائے۔ اصلی چیز جو مقصود ہے، وہ تو نیک عملی ہے) پس نیکیوں کی راہ میں ایک دوسرے سے آگے نکل جانے کی کوشش کرو۔ تم جہاں کہیں بھی ہو (یعنے جس جگہ اور جس سمت میں

اور پھر جو کچھ بھی ہو، تقرر قبلہ کا معاملہ کوئی ایسی بات نہیں ہے جو دین کے اصول و مہمات میں سے ہو، اور اُسے حق و باطل کا معیار سمجھ لیا جائے۔ ہر گروہ کے لیے کوئی نہ کوئی جہت ہے، اور وہ اُسی کی طرف رُخ کر کے عبادت کرتا ہے۔ عبادت جس طرف بھی مُنہ کر کے کی جائے خدا کی عبادت ہے، وہ کسی ایک جہت ہی میں محدود نہیں۔ اصلی چیز

اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝ وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ وَاِنَّهٗ
149 لَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ۝ وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ
الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ ۙ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَيْكُمْ
حُجَّةٌ ۗ اِلَّا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ ۗ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِيْ ۗ وَلِاُتِمَّ نِعْمَتِيْ عَلَيْكُمْ وَلَعَلَّكُمْ
150 تَهْتَدُوْنَ ۝ كَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْكُمْ رَسُوْلًا مِّنْكُمْ يَتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا وَيُزَكِّيْكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ
151 152 ع ۱۸ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ۝ فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوْا لِيْ وَلَا تَكْفُرُوْنِ ۝

جو سمجھنے اور کرنے کی ہے، وہ "خیرات" ہے۔ یعنے نیک عمل۔ پس چاہیے کہ اس میں
148 ایک دوسرے سے بڑھ جانے کی کوشش کرو۔ اور اسی کو دینداری و خدا پرستی کا اصلی کام سمجھو

بھی خدا کی عبادت کرو) خدا تم سب کو پالے گا۔ یقیناً
اُس کی قدرت سے کوئی بات باہر نہیں۔

اور (اے پیغمبر!) تم کہیں سے بھی نکلو (یعنے کسی سمت اور کسی مقام میں بھی ہو لیکن (نماز میں) رُخ اُسی طرف

تقرر قبلہ کا حکمِ عام، اور اس کے مصالح و حکم

کو پھیر لو، جس طرف مسجدِ حرام واقع ہے۔ اور یقین کرو، یہ معاملہ تمہارے پروردگار
149 کی طرف سے ایک امرِ حق ہے، اور جانتے رہو کہ اللہ تمہارے اعمال کی طرف سے غافل نہیں ہے۔
اور (دیکھو) تم کہیں سے بھی نکلو (اور کسی مقام میں بھی ہو) لیکن چاہیے کہ (نماز میں) اپنا رُخ مسجدِ حرام ہی کی طرف
پھیر لو، اور (اے پیروانِ دعوتِ قرآنی) تم بھی اپنا رُخ اُسی طرف کو کر لیا کرو۔ خواہ کسی جگہ اور کسی سمت میں ہو۔ اور یہ (جو
تقررِ قبلہ پر اس قدر زور دیا گیا ہے، تو یہ) اس لیے ہے، تاکہ تمہارے خلاف لوگوں کے پاس کوئی دلیل باقی نہ رہے
(اور یہ حقیقت واضح ہو جائے کہ معبدِ ابراہیمی ہی تمہارا قبلہ ہے) البتہ جو لوگ حق سے گزر چکے ہیں، (اُن کی مخالفت ہر
حال میں جاری رہے گی) تو اُن سے نہ ڈرو۔ مجھ سے ڈرو۔ اور علاوہ بریں یہ (حکم) اس لیے بھی (دیا گیا) ہے کہ میں اپنی
150 نعمت تم پر پوری کر دوں۔ نیز اس لیے کہ (سعی و عمل کی) سیدھی راہ پر تم لگ جاؤ۔
یہ اُسی طرح کی بات ہوئی جیسے یہ ہوئی کہ ہم نے تم میں سے ایک شخص کو اپنی رسالت کے لیے چُن لیا۔ وہ ہماری
آیتیں تمہیں سُناتا ہے، (اپنی پیغمبرانہ تربیت سے) تمہارے دلوں کو صاف کرتا ہے، کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے، اور
151 وہ وہ باتیں سکھلاتا ہے جن سے تم یکسر ناآشنا تھے۔

کتاب و حکمت کی تعلیم، شخصِ نبوت کی پیغمبرانہ تربیت، مرکزِ ہدایت کا
قیام، اور "نیک ترین اُمت" ہونے کا نصب العین، یہی وہ بنیادی
عناصر تھے جن کی موعودہ اُمت کی نشو و نما کے لیے ضرورت تھی۔ جب یہ
تمام مراتب ظہور میں آ گئے، تو اب ضروری ہوا کہ پیروانِ دعوتِ قرآنی
کو مخاطب کیا جائے، اور سرگرمِ عمل ہو جانے کی دعوت دی جائے چنانچہ
152 "فاذکرونی اذکرکم" سے یہی مخاطبہ شروع ہوتا ہے۔

پس (اب) میری یاد میں لگے رہو۔ میں بھی تمہارے
طرف سے غافل نہ ہونگا (یعنے قانونِ الٰہی یہ ہے کہ اگر
تم اللہ سے غافل نہ ہو گے، تو اللہ کی مدد و نُصرت بھی
تمہاری طرف سے غافل نہ ہو گی) اور دیکھو، میری نعمتوں
کی قدر کرو۔ ایسا نہ کرو کہ کفرانِ نعمت میں مُبتلا ہو جاؤ!

۱۵۳ يَٰٓأَيُّهَا الَّذِينَ اٰمَنُوا اسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ۚ إِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِينَ ۝ وَلَا تَقُولُوا لِمَن
۱۵۴ يُقْتَلُ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ أَمْوَاتٌ ۚ بَلْ أَحْيَاءٌ وَلٰكِن لَّا تَشْعُرُونَ ۝ وَلَنَبْلُوَنَّكُم بِشَيْءٍ مِّنَ
۱۵۵ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنفُسِ وَالثَّمَرٰتِ ۗ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِينَ ۝ الَّذِينَ إِذَآ
۱۵۶ أَصَابَتْهُم مُّصِيبَةٌ قَالُوٓا إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّآ إِلَيْهِ رٰجِعُونَ ۝ أُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّن رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ
۱۵۷ وَأُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُونَ ۝ إِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِن شَعَآئِرِ اللّٰهِ ۖ فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ أَوِ اعْتَمَرَ فَلَا
۱۵۸ جُنَاحَ عَلَيْهِ أَن يَطَّوَّفَ بِهِمَا ۚ وَمَن تَطَوَّعَ خَيْرًا فَإِنَّ اللّٰهَ شَاكِرٌ عَلِيمٌ ۝ إِنَّ الَّذِينَ

اور پھر چونکہ سرگرمِ عمل ہونے کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ راہِ عمل کی مشکلیں اور آزمائشیں پیش آئیں، اس لیے دعوتِ عمل کے ساتھ ہی صبر و استقامت اور جاں فروشی و قربانی کی بھی دعوت دے دی گئی، اور واضح کر دیا گیا کہ اس راہ میں آزمائشوں سے گزرنا ناگزیر ہے۔ ساتھ ہی اُن اُصول و مہمات کی طرف بھی اشارہ کر دیا گیا، جن میں ثابت قدم ہو جانے کے بعد گمراہی و ناکامی سے قدم محفوظ ہو جا سکتے ہیں۔

(۱) صبر اور نماز کی قوتوں سے مدد لو۔ صبر کی حقیقت یہ ہے کہ مشکلات و مصائب کے جھیلنے اور نفسانی خواہشوں سے مغلوب نہ ہونے کی قوت پیدا ہو جائے۔ نماز کی حقیقت یہ ہے کہ اللہ کے ذکر و فکر سے رُوح کو تقویت ملتی رہے۔ جس جماعت میں یہ دُو قوتیں پیدا ہو جائینگی، وہ کبھی ناکام نہیں ہو سکتی!

(۲) راہِ حق میں موت، موت نہیں ہے۔ سرتاسر زندگی و ابدیت ہے۔ پس موت کے خوف سے اپنے دلوں کو پاک کر لو!

مسلمانو! صبر اور نماز (کی معنوی قوتوں) سے سہارا پکڑو
۱۵۳ یقین کرو، اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے!؛
اور جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل ہو جاتے ہیں تو یہ مت
کہو کہ مردے ہیں، نہیں، وہ تو زندہ ہیں، لیکن تم ان کی
۱۵۴ زندگی کا شعور نہیں رکھتے۔
اور یاد رکھو یہ ضرور ہونا ہے کہ ہم تمہارا امتحان لیں۔
خطرات کا خوف، بھوک کی تکلیف، مال و جان کا نقصان
پیداوار کی تباہی، وہ آزمائشیں ہیں جو تمہیں پیش آئینگی۔
پھر جو لوگ صبر کرنے والے ہیں، انہیں (فتح و کامرانی کی)
۱۵۵ بشارت دے دو۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ جب کبھی کوئی مصیبت
اُن پر آپڑتی ہے تو (بے قرار ہونے کی جگہ ذکر الٰہی سے اپنی روح کو تقویت پہنچاتے ہیں، اور) اُن کے زبانِ حال
کی صدا یہ ہوتی ہے کہ اِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّآ اِلیہ راجعون! (ہماری زندگی اور موت، رنج و غم، سود و زیاں، جو کچھ بھی ہے سب
۱۵۶ کچھ اللہ کے لیے ہے، اور ہم سب کو بالآخر مرنا اور اُسی کی طرف لوٹنا ہے!) سو یقیناً ایسے ہی لوگ ہیں، جن پر اُن کے
۱۵۷ پروردگار کے الطاف و کرم ہیں، جن پر اس کی رحمت اُترتی ہے، اور یہی ہیں جو (اپنے مقصد میں) کامیاب ہیں!؛

(۳) مرکزِ قبلہ سے وابستگی اور حج کا قیام

بلاشبہ صفا اور مروہ (نامی دُو پہاڑیاں) اللہ کی (حکمت و رحمت کی) نشانیوں
میں سے ہیں، پس جو شخص حج یا عمرہ کی نیت سے اس گھر کا (یعنے خانۂ کعبہ کا) قصد کرے، تو اُس کے لیے کوئی گناہ
کی بات نہیں کہ ان دونوں پہاڑیوں کے درمیان طواف کے پھیرے کر لے۔ اور جو کوئی خوشدلی کے ساتھ نیکی
۱۵۸ کا کوئی کام کرتا ہے، تو اللہ ہر عمل کی اس کی منزلت کے مطابق قدر کرنے والا، اور سب کچھ جاننے والا ہے

(۴) کتاب اللہ کی تعلیم و تذکیر ایک مقدس جماعتی فرض ہے جو لوگ

جن لوگوں کا شیوہ یہ ہے کہ (دنیا کے خوف یا طمع سے)

يَكْتُمُونَ مَا أَنْزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنٰتِ وَالْهُدٰى مِنْ بَعْدِ مَا بَيَّنّٰهُ لِلنَّاسِ فِي الْكِتٰبِ أُولٰٓئِكَ يَلْعَنُهُمُ
١٥٩ اللّٰهُ وَيَلْعَنُهُمُ اللّٰعِنُونَ ۝ إِلَّا الَّذِينَ تَابُوا وَأَصْلَحُوا وَبَيَّنُوا فَأُولٰٓئِكَ أَتُوبُ عَلَيْهِمْ وَأَنَا
١٦٠ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ ۝ إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَمَاتُوا وَهُمْ كُفَّارٌ أُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ لَعْنَةُ اللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَ
١٦١ النَّاسِ أَجْمَعِينَ ۝ خٰلِدِينَ فِيهَا لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْظَرُونَ ۝ وَإِلٰهُكُمْ إِلٰهٌ
١٦٢ ع ١٩ ١٦٣ وَّاحِدٌ لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيمُ ۝ إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَ
النَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِي تَجْرِي فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ وَمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَاءِ مِنْ مَاءٍ فَأَحْيَا
بِهِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِيهَا مِنْ كُلِّ دَابَّةٍ وَتَصْرِيفِ الرِّيٰحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ

> دنیا کے خوف یا طمع سے احکام حق چھپاتے ہیں، وہ اللہ کی لعنت کے سزاوار ہوتے ہیں۔

اُن باتوں کو چھپاتے ہیں جو سچائی کی روشنیوں اور رہنمائیوں میں سے
ہم نے نازل کی ہیں، باوجودیکہ ہم نے اُنہیں کتاب میں کھول
کھول کر بیان کر دیا ہے، تو یقین کرو، ایسے ہی لوگ ہیں جن پر اللہ لعنت کرتا ہے، (یعنے اس کی رحمت سے محروم ہو جاتے
١٥٩ ہیں) تمام لعنت کرنے والوں کی لعنتیں بھی اُن کے حصے میں آتی ہیں!

مگر ہاں، (توبہ کا دروازہ ہر گناہ کے بعد کھلا ہوا ہے۔ پس) جن لوگوں نے اس گناہ سے توبہ کر لی، اور اپنی (بگڑی)
حالت از سرِ نو سنوار لی، اور ساتھ ہی (احکامِ حق کو چھپانے کی جگہ) بیان کرنے کا شیوہ اختیار کر لیا، تو ایسے لوگوں
١٦٠ کی توبہ ہم قبول کر لیتے ہیں۔ اور ہم بڑے ہی درگزر کرنے والے اور رحمت سے بخش دینے والے ہیں! ٭

(لیکن) جن لوگوں نے راہِ حق سے انکار کیا، اور پھر مرتے دم تک اُسی پر قائم رہے، تو (ظاہر ہے کہ اُن کے
لیے اصلاحِ حال کا کوئی موقعہ باقی نہ رہا) یہ وہ لوگ ہیں جن پر اللہ کی، اُس کے فرشتوں کی، انسانوں کی، سب کی لعنت
١٦٢-١٦١ ہوئی۔ ہمیشہ اسی حالت میں رہنے والے۔ نہ تو کبھی اُن کے عذاب میں کمی کی جائیگی، اور نہ اُنہیں مہلت ملے گی!

> (۵) خدا پرستی میں ثابت قدم رہنے، عقل و بصیرت سے کام لینے، کائناتِ خلقت میں تدبر و تفکر کرنے، اور حقائقِ ہستی کی معرفت حاصل کرنے کا حکم، اور برہانِ فضل و رحمت سے استدلال۔

اور (دیکھو) تمہارا معبود ایک ہی معبود ہے۔ کوئی معبود نہیں
مگر صرف اُسی کی ایک ذات۔ رحمت والی، اور اپنی رحمت کی
١٦٣ بخشش سے تمام کائناتِ ہستی کو فیضیاب کرنے والی!

بلاشبہ آسمان و زمین کے پیدا کرنے میں، اور رات دن کے ایک کے بعد ایک آتے رہنے میں، اور جہاز میں جو انسان
کی کار برآریوں کے لیے سمندر میں چلتا ہے، اور برسات میں جسے اللہ آسمان سے برساتا ہے، اور اُس (کی آب پاشی)
سے زمین مرنے کے بعد پھر جی اُٹھتی ہے، اور اس بات میں کہ ہر قسم کے جانور زمین کے پھیلاؤ میں پھیلے ہوئے ہیں، اور
ہواؤں کے (مختلف رُخ) پھرنے میں، اور بادلوں میں جو آسمان و زمین کے درمیان (اپنی مقررہ جگہ کے اندر) بندھے
ہوئے ہیں، اُن لوگوں کے لیے جو عقل رکھنے والے ہیں (اللہ کی ہستی و یگانگی اور اس کے قوانین رحمت کی) بڑی ہی

۱۶۴ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ۝ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ
كَحُبِّ اللّٰهِ ۭ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ۭ وَلَوْ يَرَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اِذْ يَرَوْنَ الْعَذَابَ ۙ اَنَّ
۱۶۵ الْقُوَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعَذَابِ ۝ اِذْ تَبَرَّاَ الَّذِيْنَ اتُّبِعُوْا مِنَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْا
۱۶۶ وَرَاَوُا الْعَذَابَ وَتَقَطَّعَتْ بِهِمُ الْاَسْبَابُ ۝ وَقَالَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْا لَوْ اَنَّ لَنَا كَرَّةً فَنَتَبَرَّاَ
مِنْهُمْ كَمَا تَبَرَّءُوْا مِنَّا ۭ كَذٰلِكَ يُرِيْهِمُ اللّٰهُ اَعْمَالَهُمْ حَسَرٰتٍ عَلَيْهِمْ ۭ وَمَا هُمْ بِخٰرِجِيْنَ مِنَ
۱۶۷ النَّارِ ۝ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ كُلُوْا مِمَّا فِي الْاَرْضِ

۱۶۴ نشانیاں ہیں! ؎

اللہ پر ایمان، اور اللہ کی محبت، دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ پس اگر اللہ کے سوا کسی دوسری ہستی کو بھی ویسی ہی چاہت سے ماننے لگے جیسی چاہت سے ماننا صرف اللہ ہی کے لیے ہے، تو پھر یہ اللہ کے ساتھ دوسرے کو ہم پلہ بنا دینا ہوا، اور توحیدِ الٰہی کا اعتقاد درہم برہم ہو گیا۔ مومن وہ ہے جو سب سے زیادہ اللہ کی محبت رکھنے والا ہو۔

اور (دیکھو) انسانوں میں سے کچھ انسان ایسے بھی ہیں، جو خدا کے سوا دوسری ہستیوں کو اس کا ہم پلہ بنا لیتے ہیں۔ وہ انہیں اس طرح چاہنے لگتے ہیں جیسی چاہت اللہ کے لیے ہونی چاہیے۔ حالانکہ جو لوگ اللہ پر ایمان رکھتے ہیں، ان کے دلوں میں تو سب سے زیادہ محبت اللہ ہی کی ہوتی ہے۔

جو بات اِن ظالموں کو اُس وقت سوجھے گی جب عذاب اُن کے سامنے آجائے گا، کاش اِس وقت سوجھتی!
اُس دن یہ دیکھیں گے کہ قوت، اور ہر طرح کی قوت، صرف اللہ ہی کو ہے، اور (اگر اُس کے قوانینِ حق سے سرتابی
۱۶۵ کی جائے، تو) اُس کا عذاب بڑا ہی سخت عذاب ہے!

پیروانِ باطل کی پیروی کرنے کا حسرت انگیز نتیجہ جو ان کے بدقسمت پیرووں کے حصے میں آئے گا۔
پچھلی اُمتوں کی تباہی کا ایک بنیادی سبب، پیشوایانِ باطل کا اتباع ہے۔ ایسا نہ ہو کہ تم بھی اس میں مبتلا ہو جاؤ۔

اور (دیکھو) جب ایسا ہوگا کہ وہ (جھوٹے پیشوا) جن کی پیروی کی گئی تھی (بجائے اس کے کہ اپنے پیرووں کے کام آئیں) اپنے پیرووں سے بیزاری ظاہر کرنے لگیں گے (یعنے کہیں گے، ہمیں ان لوگوں سے کوئی واسطہ نہیں) کیونکہ عذاب اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے، اور اُن کے
۱۶۶ باہمی رشتوں وسیلوں کا تمام سلسلہ ٹوٹ جائے گا (کہ نہ تو کوئی کسی کا ساتھ دیگا، اور نہ کسی کو کسی کی فکر ہوگی) تب وہ لوگ
جنھوں نے ان کی پیروی کی تھی پکار اُٹھیں گے۔ کاش ہمیں ایک دفعہ پھر دنیا میں لوٹنے کی مہلت مل جائے، تو ہم ان
(جھوٹے پیشواؤں) سے اسی طرح بیزاری ظاہر کر دیں، جس طرح یہ ہم سے بیزاری ظاہر کر رہے ہیں! سو دیکھو، اس طرح
اللہ ان لوگوں کو ان کے اعمال کی حقیقت دکھلا دے گا کہ سرتاسر حسرت و پشیمانی کا منظر ہوگا، اور وہ آتشِ عذاب سے چھٹکارا
۱۶۷ پانے والے نہیں! ؎

اِن اصولی مہمات کی تلقین کے بعد، اب یہاں سے اُن فروعی

اے افرادِ نسلِ انسانی! زمین میں جس قدر حلال اور

١٦٨ حَلٰلًا طَيِّبًا ۖ وَّلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ؕ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ○ اِنَّمَا يَاْمُرُكُمْ بِالسُّوْٓءِ وَ
١٦٩ الْفَحْشَآءِ وَاَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ○ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ
١٧٠ نَتَّبِعُ مَآ اَلْفَيْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا ؕ اَوَلَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ شَيْـًٔا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ ○ وَمَثَلُ
الَّذِيْنَ كَفَرُوْا كَمَثَلِ الَّذِيْ يَنْعِقُ بِمَا لَا يَسْمَعُ اِلَّا دُعَآءً وَّنِدَآءً ؕ صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا
١٧١ يَعْقِلُوْنَ ○ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ

احکام کا بیان شروع ہوتا ہے جن کے متعلق طرح طرح کی گمراہیاں
لوگوں میں پھیلی ہوئی تھیں، اور دینِ حق کی بنیادی صداقتوں پر ان کا
اثر پڑتا تھا۔ یہ بیان اگرچہ فروعی احکام کا بیان ہے، لیکن اپنی تشریحات
و موعظت میں سرتاسر اصولی معارف ہیں:
من جملہ عالمگیر گمراہیوں کے، ایک بنیادی گمراہی یہ تھی کہ
کھانے پینے کے بارے میں طرح طرح کی بے اصل پابندیاں لگا لی گئی
١٦٨ تھیں، اور دینداری کی سب سے بڑی بات یہ سمجھی جاتی تھی کہ
انسان کھانے پینے میں سب سے زیادہ توہم پرست ہو۔ ظاہر ہے کہ جس
جماعت کی ذہنیت ایسی توہم پرستانہ پابندیوں میں جکڑی ہوئی ہو، وہ
١٦٩ کبھی آزادی کے ساتھ ترقی و وسعت کا قدم نہیں اٹھا سکتی۔ پس سب
سے پہلے اس معاملہ کی حقیقت واضح کی گئی، اور اُن تمام غلطیوں
کا ازالہ کر دیا گیا جو اس بارے میں پھیلی ہوئی تھیں۔
(١) خدا نے انسان کی غذا کے لیے جس قدر اچھی چیزیں زمین
میں مہیا کر دی ہیں، شوق سے کھانی چاہئیں بے اصل روک
ٹوک اور من گھڑت پابندیاں شیطانی وسوسے ہیں۔
(٢) ضمناً اس حقیقت کی طرف اشارہ کہ ایمان کی راہ عقل و
بصیرت کی راہ ہے، اور کفر کا خاصہ کورانہ تقلید اور بے بصیرتی ہے۔
اندھی تقلید کرنا، جو کچھ دیکھتے اور سنتے آئے ہیں، بے سمجھے بوجھے اُسی
١٧٠ پر جمے رہنا، اور دلیل و برہان کی جگہ اپنے بزرگوں پیشواؤں کا قول و
عمل حجت سمجھنا، ہدایت کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔
اندھی تقلید کرنے والوں کے سامنے علم و بصیرت کی بات پیش
کرنا ایسا ہے جیسے چارپایوں کو مخاطب کرنا۔

پاکیزہ چیزیں (تمہاری غذا کے لیے) مہیا کر دی گئی ہیں، شوق
سے کھاؤ، اور (یہ جو لوگوں نے اپنے وہموں خیالوں سے
طرح طرح کی رکاوٹیں اختیار کر رکھی ہیں، تو یہ شیطانی
وسوسے ہیں۔ تم) شیطان کے نقشِ قدم پر نہ چلو۔ وہ تو
تمہارا کھلا دشمن ہے۔
وہ تو تمہیں بُری اور قبیح باتوں ہی کے لیے حکم دیگا۔
نیز اس (گمراہی) کے لیے اُکسائے گا کہ اللہ کے نام سے
جھوٹی باتیں کہو جن کے لیے تمہارے پاس کوئی علم نہیں
اور جب ان لوگوں سے کہا جاتا ہے، اللہ نے جو ہدایت
نازل کی ہے اس کی پیروی کرو، تو کہتے ہیں نہیں، ہم تو
اُسی طریقے پر چلیں گے، جس پر اپنے بڑے بوڑھوں کو چلتے
دیکھ رہے ہیں۔ کوئی ان لوگوں سے پوچھے، اگر تمہارے
بڑے بوڑھے عقل سے کورے اور ہدایت سے محروم رہے
ہوں، تو تم بھی عقل و ہدایت سے انکار کر دو گے؟
اور (حقیقت) یہ ہے کہ) جن لوگوں نے کفر کی راہ اختیار
کی ہے، تو اُن کی مثال ایسی ہے (یعنی اُنہیں کورانہ تقلید
کی جگہ عقل و ہدایت کی دعوت دینا ایسا ہے) جیسے ایک
چرواہا چارپایوں کے آگے چیختا چلاتا ہے کہ چارپائے کچھ بھی نہیں سنتے مگر صرف بلانے اور پکارنے کی صدائیں۔ وہ
١٧١ بہرے، گونگے، اندھے ہو کر رہ گئے۔ پس کبھی سوچنے سمجھنے والے نہیں!
مسلمانو! اگر تم صرف اللہ ہی کی بندگی کرنے والے ہو (اور سمجھتے ہو کہ حلال و حرام میں حکم اُسی کا حکم ہے، تو) وہ

وَاشْكُرُوا لِلّٰهِ إِنْ كُنْتُمْ إِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ ○ إِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِيْرِ وَمَا ۱۷۲
أُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ ۚ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ ۚ إِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ○ إِنَّ ۱۷۳
الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ مَا أَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ الْكِتٰبِ وَيَشْتَرُوْنَ بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۙ أُولٰٓئِكَ مَا يَأْكُلُوْنَ
فِيْ بُطُوْنِهِمْ إِلَّا النَّارَ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَلَا يُزَكِّيْهِمْ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيْمٌ ○ أُولٰٓئِكَ ۱۷۴
الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى وَالْعَذَابَ بِالْمَغْفِرَةِ ۚ فَمَا أَصْبَرَهُمْ عَلَى النَّارِ ○ ۱۷۵

تمام پاکیزہ چیزیں بے کھٹکے کھاؤ، جو اللہ نے تمہاری غذا کے لیے مہیا کر دی ہیں، اور اُس کی نعمتیں کام میں لا کر اُس کی
بخشایشوں کے شکرگزار رہو! ۱۷۲
اللہ نے جو چیزیں تم پر حرام کر دی ہیں، وہ تو صرف یہ ہیں کہ مردار جانور
جیوانات کا خون، سُور کا گوشت، اور وہ (جانور) جو اللہ کے سوا کسی دوسری
ہستی کے نام پر پکارے جائیں۔ البتہ اگر ایسی حالت پیش آ جائے کہ ایک آدمی (حلال غذا نہ مل سکنے کی وجہ سے) بہ حالت
مجبوری کھا لے، اور یہ بات (نہ) ہو کہ حکم شریعت کی پابندی سے نکل جانا چاہتا ہو، یا اُتنی مقدار سے زیادہ کھانا چاہتا
ہو، جتنے کی (زندگی بچانے کے لیے) ضرورت ہے، تو اس صورت میں مجبور آدمی کے لیے کوئی گناہ نہ ہوگا۔ بلاشبہ اللہ
(خطاؤں لغزشوں کو) بخش دینے والا اور (ہر حال میں) تمہارے لیے رحمت رکھنے والا ہے۔ ۱۷۳

(۳) جن چارپایوں کا گوشت عام طور پر کھایا جاتا ہے، وہ سب حلال ہیں مگر چار چیزیں۔

جو لوگ اُن حکموں کو جو اللہ نے اپنی کتاب میں نازل کیے
ہیں، چھپاتے ہیں، اور اس (کتمانِ حق) کے بدلے دنیا کے
حقیر فائدے خریدتے ہیں، تو یقین کرو، یہ وہ لوگ ہیں جو آگ
کے شعلوں سے اپنا پیٹ بھر رہے ہیں (کیونکہ یہ کمائی اُن
کے لیے آتشِ عذاب کے شعلے بننے والی ہے) قیامت کے
دن یہ اللہ کے خطاب سے محروم رہیں گے، وہ انہیں (بخش
کر) گناہوں سے پاک نہیں کرے گا اور ان کے لیے عذابِ
دردناک میں مبتلا ہونا ہے! ۱۷۴
یہی لوگ ہیں جنہوں نے ہدایت بیچ کر گمراہی مول
لی، اور مغفرت کے بدلے عذاب کا سودا کیا، تو (بُرائی کی راہ
میں اُن کا حوصلہ کیا ہی عجیب حوصلہ ہے، اور) جہنم کی آگ کے لیے اُن کی برداشت کیسی سخت برداشت ہے! ۱۷۵

(۴) اور یہ جو اہل کتاب نے حلال و حرام کے بارے میں طرح طرح کی پابندیاں اپنے پیچھے لگالی ہیں، تو یہ اس لیے ہے کہ کتاب اللہ کا علم و عمل متروک ہو گیا ہے۔ اُن کے علما حق فروش ہیں کہ دنیا کی طمع سے احکام الٰہی میں تحریف کرتے ہیں۔ یا اُنہیں ظاہر نہیں کرتے۔ اور عوام اپنے مذہبی پیشواؤں کی اندھی تقلید میں مبتلا ہیں۔
کتاب اللہ علم و حقیقت ہے، اور اختلاف، جہل و ظن سے پیدا ہوتا ہے۔ پس جب علم و حقیقت آ جائے، تو اختلاف باقی نہیں رہنا چاہیے۔ پھر جو لوگ کتاب اللہ کے نزول کے بعد بھی اختلافات میں مبتلا ہو جاتے ہیں، اور الگ الگ مذہبی فرقہ بنا کر دین کی وحدت کھو دیتے ہیں، تو وہ "شقاق بعید" میں پڑ جاتے ہیں۔ یعنی ایسے گہرے اور دور دراز تفرقوں میں، جن سے کبھی نہیں نکل سکتے، اور جس قدر ہاتھ پاؤں مارتے ہیں اور زیادہ حقیقت سے دور ہوتے جاتے ہیں!

ع ۲۱ ۱۷۶ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ نَزَّلَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ ؕ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِى الْكِتٰبِ لَفِىْ شِقَاقٍۢ بَعِيْدٍ ۝ لَيْسَ
الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ
الْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ ۚ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِى الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَ
ابْنَ السَّبِيْلِ ۙ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِى الرِّقَابِ ۚ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ ۚ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ
اِذَا عٰهَدُوْا ۚ وَالصّٰبِرِيْنَ فِى الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ ؕ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا ؕ وَ
۱۷۷ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ۝

یہ اس لیے ہوا کہ اللہ نے کتاب (تورات) سچائی کے ساتھ نازل کردی تھی (اور جب وحی الٰہی کی روشنی آجائے تو پھر انسانی گمانوں وہموں کے لیے کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی، پھر بھی یہ لوگ اختلافات میں پڑ گئے) اور جن لوگوں نے کتاب اللہ (کے احکام) میں الگ الگ راہیں اختیار کی ہیں، تو وہ تفرقہ و مخالفت کی دور دراز
۱۷۶ راہوں میں کھوئے گئے!

نیکی اور بھلائی (کی راہ) یہ نہیں ہے کہ تم نے (عبادت کے وقت) اپنا منہ پورب کی طرف پھیر لیا یا پچھم کی طرف کر لیا (یا اسی طرح کی کوئی دوسری بات رسم ریت کی کر لی) نیکی کی راہ تو اُن لوگوں کی راہ ہے، جو:

اللہ پر، آخرت کے دن پر، فرشتوں پر، آسمانی کتابوں پر، اور خدا کے تمام نبیوں پر ایمان لاتے ہیں۔ :

خدا کی محبت کی راہ میں اپنا مال، رشتہ داروں، یتیموں مسکینوں، مسافروں، اور سائلوں کو دیتے ہیں اور غلاموں کو آزاد کرانے کے لیے خرچ کرتے ہیں۔

نماز قائم کرتے ہیں :

(۵) دینِ حق کی اس اصلِ عظیم کا اعلان کہ سعادت و نجات کی راہ یہ نہیں ہے کہ عبادت کی کوئی خاص شکل، یا کھانے پینے کی کوئی خاص پابندی، یا اسی طرح کی کوئی دوسری بات اختیار کر لی جائے۔ بلکہ وہ سچی خدا پرستی اور نیک عملی کی زندگی سے حاصل ہوتی ہے، اور اصلی شے دل کی پاکی اور عمل کی نیکی ہے۔ شریعت کے ظاہری احکام و رسوم بھی اسی لیے ہیں تاکہ یہ مقصود حاصل ہو۔
نزولِ قرآن کے وقت دنیا کی عالمگیر مذہبی گمراہی یہ تھی کہ لوگ سمجھتے تھے، دین سے مقصود محض شریعت کے ظواہر و رسوم ہیں، اور انہی کے کرنے نہ کرنے پر انسان کی نجات و سعادت موقوف ہے۔ لیکن قرآن کہتا ہے، اصل دین، خدا پرستی اور نیک عملی ہے، اور شریعت کے ظاہری رسوم و اعمال بھی اسی لیے ہیں کہ یہ مقصود حاصل ہو۔ پس جہاں تک دین کا تعلق ہے، ساری طلب مقاصد کی ہونی چاہیے۔ نہ کہ وسائل کی۔

زکوٰۃ ادا کرتے ہیں۔

اپنی بات کے پکے ہوتے ہیں۔ جب قول و قرار کر لیتے ہیں تو اُسے پورا کر کے رہتے ہیں۔

تنگی و مصیبت کی گھڑی ہو، یا خوف و ہراس کا وقت، ہر حال میں صبر کرنے والے (اور اپنی راہ میں ثابت قدم) ہوتے ہیں۔

۱۷۷ تو بلاشبہ ایسے ہی لوگ ہیں جو نیکی کی راہ میں سچے ہوئے، اور یہی ہیں جو بُرائیوں سے بچنے والے انسان ہیں!

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلٰى اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْاُنْثٰى
بِالْاُنْثٰى فَمَنْ عُفِيَ لَهٗ مِنْ اَخِيْهِ شَيْءٌ فَاتِّبَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ وَاَدَآءٌ اِلَيْهِ بِاِحْسَانٍ ذٰلِكَ
۱۷۸ تَخْفِيْفٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَرَحْمَةٌ فَمَنِ اعْتَدٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَلَهٗ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝ وَلَكُمْ فِي
۱۷۹ الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰاُولِي الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۝ كُتِبَ عَلَيْكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ
اِنْ تَرَكَ خَيْرَا اِۨ الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَ

تصاص کا حکم، اور اس سلسلہ میں اُن مفاسد کا ازالہ جو اس بارے میں پھیلے ہوئے تھے،

(۱) انسانی مساوات کا اعلان، اور نسل و شرف کے تمام امتیازات سے انکار جو لوگوں نے بنا رکھے ہیں، اور جن کی وجہ سے انسانی حقوق پامال ہو رہے ہیں۔ آزاد ہو یا غلام، مرد ہو یا عورت بڑا ہو یا چھوٹا، وضیع ہو یا شریف، انسان ہونے کے لحاظ سے سب برابر ہیں۔ اس لیے قصاص میں کوئی امتیاز تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔

(۲) اگر مقتول کے ورثا، خوں بہا لینے پر راضی ہو جائیں تو قاتل کی جان بخشی ہو سکتی ہے۔

(۳) قصاص میں اگرچہ جان کی ہلاکت ہے، مگر اس لیے ہے تاکہ زندگی کی حفاظت کی جائے۔ پس جب مقصود اصلی حفظِ نفس ہوا، نہ کہ قتلِ نفس، تو ظاہر ہے کہ اسے قتل نفس کا ذریعہ بنانا کیونکر جائز ہو سکتا ہے؟

مسلمانو! جو لوگ قتل کر دیے جائیں، اُن کے لیے تمہیں قصاص (یعنے بدلہ لینے کا) حکم دیا جاتا ہے۔ (لیکن بدلہ لینے میں ہر انسان دوسرے انسان کے برابر ہے) اگر آزاد آدمی نے آزاد آدمی کو قتل کیا ہے، تو اس کے بدلہ وہی قتل کیا جائے گا (یہ نہیں ہو سکتا کہ مقتول کی بڑائی یا نسل کے شرف کی وجہ سے دو آدمی قتل کیے جائیں جیسا کہ عرب جاہلیت میں دستور تھا) اگر غلام قاتل ہے، تو غلام ہی قتل کیا جائے گا (یہ نہیں ہو سکتا کہ مقتول کے آزاد ہونے کی وجہ سے دو غلام قتل کیے جائیں) عورت نے قتل کیا ہے، تو عورت ہی قتل کی جائے گی۔

اور پھر اگر ایسا ہو، کہ کسی قاتل کو مقتول کے وارث سے کہ (رشتۂ انسانی میں) اُس کا بھائی ہے، معافی مل جائے (اور قتل کی جگہ خوں بہا لینے پر راضی ہو جائے) تو (خوں بہا لے کر چھوڑ دیا سکتا ہے) اور (اس صورت میں) مقتول کے وارث کے لیے دستور کے مطابق (خوں بہا کا) مطالبہ ہے، اور قاتل کے لیے خوش معاملگی کے ساتھ ادا کر دینا۔ اور دیکھو، یہ (جو قصاص کے معاملہ کو تمام زیادتیوں سے پاک کر کے عدل و مساوات کی اصل پر قائم کر دیا گیا ہے، تو یہ) تمہارے پروردگار کی طرف سے تمہارے لیے سختیوں کا کم کر دینا اور رحمت کا فیضان ہوا۔ اب اس کے بعد جو کوئی زیادتی کرے گا، تو یقین کرو، وہ (اللہ کے حضور) عذاب دردناک کا
۱۷۸ سزاوار ہوگا!

اور اے اربابِ دانش! قصاص کے حکم میں (اگرچہ بظاہر ایک جان کی ہلاکت کے بعد دوسری جان کی ہلاکت
۱۷۹ گوارا کر لی گئی ہے، لیکن فی الحقیقت یہ ہلاکت نہیں ہے) تمہارے لیے زندگی ہے، اور یہ سب کچھ اس لیے ہے تاکہ تم برائیوں سے بچو

مرنے سے پہلے پس ماندوں کے لیے اچھی وصیت کرنے کا حکم،

مسلمانو! یہ بات بھی تم پر فرض کر دی گئی ہے کہ جب تم میں سے

۱۸۰ الْأَقْرَبِينَ بِالْمَعْرُوفِ ۖ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِينَ ۝ فَمَنْ بَدَّلَهُ بَعْدَ مَا سَمِعَهُ فَإِنَّمَا إِثْمُهُ عَلَى
۱۸۱ الَّذِينَ يُبَدِّلُونَهُ ۚ إِنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ۝ فَمَنْ خَافَ مِنْ مُوصٍ جَنَفًا أَوْ إِثْمًا فَأَصْلَحَ
۱۸۲ ع ۲۳ ۶ بَيْنَهُمْ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ ۚ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ ۝ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ
كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ۝ أَيَّامًا مَعْدُودَاتٍ ۚ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ
مَرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِنْ أَيَّامٍ أُخَرَ ۚ وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِينٍ ۖ

اور اس اصولی حقیقت کی تلقین کہ:

(۱) انسان موت کے بعد جو کچھ چھوڑ جاتا ہے، وہ اگرچہ دوسروں کے قبضہ میں جاتا ہے، لیکن مرنے سے پہلے اُس کے ٹھیک ٹھیک خرچ ہونے اور عزیزوں قریبوں کو فائدہ پہنچانے کی فکر مرنے والے کی زندگی کے فرائض میں سے ہے، اور اس ذمہ داری سے وہ بری الذمہ نہیں ہو سکتا۔

(۲) مرنے والے کی وصیت ایک مقدس امانت ہے۔ جو لوگ اس کے امین ہوں، ان کا فرض ہے کہ بے کم و کاست اُس کی تعمیل کریں۔

(۳) اگر وہ لوگ جن پر وصیت کی تعمیل چھوڑی گئی ہے، خیانت کریں تو اس کے لیے وہ خود جواب دِہ ہوں گے۔ وصیت کرنے والا، اور وصیت سے فائدہ اُٹھانے والے جواب دہ نہیں ہو سکتے۔

کوئی آدمی محسوس کرے۔ اُس کے مرنے کی گھڑی آگئی، اور وہ اپنے بعد مال و متاع میں سے کچھ چھوڑ جانے والا ہو، تو چاہیے کہ اپنے ماں باپ اور رشتہ داروں کے لیے اچھی وصیت کر جائے۔ جو متقی انسان ہیں، اُن کے لیے
۱۸۰ ایسا کرنا ضروری ہے:

پھر جو کوئی ایسا کرے کہ کسی آدمی کی وصیت سننے (اور اُس کے گواہ اور امین ہونے) کے بعد اُس میں ردّ و بدل
کر دے، تو اس گناہ کی ذمہ داری اُسی کے سر ہوگی جس نے ردّ و بدل کیا ہے۔ (وصیت پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑے گا
۱۸۱ اُس کی تعمیل ہر حال میں ضروری ہوگی) یقین کرو، اللہ سب کچھ سُننے والا اور سب کچھ جاننے والا ہے:

اور اگر کسی شخص کو وصیت کرنے والے سے بیجا رعایت کر لینے یا کسی معصیت کا اندیشہ ہو، اور وہ (بروقت مداخلت کر کے، یا وارثوں کو سمجھا بجھا کر) اُن میں مصالحت کرا دے، تو ایسا کرنے میں کوئی گناہ نہیں (کیونکہ یہ وصیت میں ردّ و بدل کرنا نہیں ہوگا، بلکہ ایک بُرائی کی اصلاح کر دینا ہوگا اور) بلاشبہ اللہ (انسانی کمزوریوں کو) بخشنے
۱۸۲ والا، اور (اپنے تمام احکام میں) رحمت رکھنے والا ہے!

رمضان میں روزہ رکھنے کا حکم، اور اس سلسلہ میں دینِ حق کے بعض اصولی حقائق کی تعلیم۔ نیز اُن غلطیوں کا ازالہ جو اس بارے میں عام طور پر پھیلی ہوئی تھیں:

(۱) روزہ کے حکم سے یہ مقصود نہیں ہے کہ انسان کا فاقہ کرنا اور اپنے جسم کو تکلیف و مشقت میں ڈالنا کوئی ایسی بات ہے جس میں پاکی و نیکی ہے۔ بلکہ تمام تر مقصود نفسِ انسانی کی اصلاح و تہذیب ہے۔ روزہ رکھنے سے تم میں پرہیزگاری کی قوت پیدا ہوگی، اور نفسانی خواہشوں کو قابو میں رکھنے کا سبق سیکھ لو گے۔

مسلمانو! جس طرح اُن لوگوں پر جو تم سے پہلے گزر چکے ہیں، روزہ فرض کر دیا گیا تھا، اُسی طرح تم پر بھی فرض کر دیا گیا ہے تاکہ تم میں پرہیزگاری پیدا ہو۔

(یہ روزے کے) چند گنے ہوئے دن ہیں (کوئی بڑی مدت نہیں) پھر جو کوئی تم میں بیمار ہو، یا سفر میں ہو، تو اُس کے لیے اجازت ہے کہ دوسرے دنوں میں روزے رکھ کر

فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ ؕ وَاَنْ تَصُوْمُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝ شَهْرُ رَمَضَانَ ۱۸۴
الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ ۚ فَمَنْ شَهِدَ
مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ ؕ وَمَنْ كَانَ مَرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ ؕ يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ
الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ ؗ وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ وَلَعَلَّكُمْ
تَشْكُرُوْنَ ۝ وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَاِنِّيْ قَرِيْبٌ ؕ اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ ۱۸۵

روزے کے دنوں کی گنتی پوری کرلے۔ اور جو لوگ ایسے ہوں کہ اُن کے لیے روزہ رکھنا ناقابلِ برداشت ہو (جیسے نہایت
بوڑھا آدمی کہ نہ تو روزہ رکھنے کی طاقت رکھتا ہے، نہ یہ توقع رکھتا ہے کہ آگے چل کر قضا کرسکے گا) تو اُس کے لیے
روزے کے بدلے ایک مسکین کو کھانا کھلادینا ہے۔ پھر اگر کوئی اپنی خوشی سے کچھ زیادہ کرے (یعنے زیادہ مسکینوں
کو کھلائے) تو یہ اس کے لیے مزید اجر کا موجب ہوگا۔ لیکن اگر تم سمجھ بوجھ رکھتے ہو، تو سمجھ لو کہ روزہ رکھنا تمہارے
لیے (ہر حال میں) بہتر ہے ۞ ۱۸۴

یہ رمضان کا مہینہ ہے جس میں قرآن کا نزول (شروع) ہوا۔ وہ
انسانوں کے لیے رہنما ہے، ہدایت کی روشن صداقتیں رکھتا ہے
اور حق کو باطل سے الگ کردینے والا ہے۔ پس جو کوئی تم میں
سے یہ مہینہ پائے، تو چاہیے کہ اُس میں روزہ رکھے۔ ہاں جو کوئی بیمار ہو یا سفر کی حالت میں ہو، تو اس کے لیے یہ
حکم ہے کہ دوسرے دنوں میں چھوٹے ہوئے روزوں کی گنتی پوری کرلے۔ اللہ تمہارے لیے آسانی چاہتا ہے، سختی
وتنگی نہیں چاہتا۔ اور یہ (جو بیماروں اور مسافروں کے لیے روزہ
قضا کرنے کا حکم دیا گیا ہے، تو یہ) اس لیے ہے، کہ (حکمتِ الٰہی
نے روزے کے فوائد کے لیے دنوں کی ایک خاص گنتی ٹھہرادی
ہے، تو تم اس کی) گنتی پوری کرلو (اور اس عمل میں ادھورے نہ رہو) اور اس لیے بھی کہ اللہ نے تم پر راہ (سعادت)
کھول دی ہے، تو اس پر اُس کی بڑائی کا اعلان کرو۔ نیز اس لیے کہ (اُس کی نعمت کام میں لاکر) اُس کی شکر گزاری
میں سرگرم رہو! ۞ ۱۸۵

(۲) روزہ کے لیے رمضان کا مہینہ اس لیے قرار پایا کہ اسی مہینے میں قرآن کا نزول شروع ہوا ہے، اور اس کا روزے کے لیے مخصوص ہوجانا نزولِ قرآن کی یادآوری و تذکیر ہے۔

(۳) دینِ حق میں اصل آسانی ہے، نہ کہ سختی۔ پس یہ سمجھنا کہ اس طرح کی عبادتوں میں سختی و تنگی اختیار کرنا خدا کی خوشنودی کا موجب ہوگا، صحیح نہیں ہوسکتا۔

اور (اے پیغمبر) جب میرا کوئی بندہ میری نسبت تم سے
دریافت کرے (کہ کیونکر مجھ تک پہنچ سکتا ہے؟ تو تم اُسے
بتلادو کہ میں) تو اُس کے پاس ہوں، وہ جب پکارتا ہے،
تو میں اُس کی پکار سنتا اور اُسے قبول کرتا ہوں۔ پس (اگر

(۴) اس طرح کی عبادتوں سے مقصود خود تمہارے نفس کی اصلاح و تربیت ہے۔ یہ بات نہیں ہے کہ جب تک فاقہ کشی کے چلے نہ کھینچے جائیں، خدا کو پکارا نہیں جاسکتا (جیسا کہ اہلِ مذاہب کا خیال تھا) خدا تو ہر حال میں انسان کی پکار سننے والا، اور اُس کی شہ رگ سے بھی زیادہ اُس سے قریب ہے۔ با ایمان و اخلاص کے ساتھ جب کبھی اُسے پکاروگے، اُس کا دروازۂ رحمت تم پر کھل جائیگا۔

١٨٧ فَلْيَسْتَجِيبُوا لِي وَلْيُؤْمِنُوا بِي لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُونَ ۝ أُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ إِلَىٰ نِسَائِكُمْ
هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَأَنتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ عَلِمَ اللَّهُ أَنَّكُمْ كُنتُمْ تَخْتَانُونَ أَنفُسَكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَعَفَا
عَنكُمْ فَالْآنَ بَاشِرُوهُنَّ وَابْتَغُوا مَا كَتَبَ اللَّهُ لَكُمْ وَكُلُوا وَاشْرَبُوا حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ
الْأَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْأَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ثُمَّ أَتِمُّوا الصِّيَامَ إِلَى اللَّيْلِ وَلَا تُبَاشِرُوهُنَّ وَأَنتُمْ
عَاكِفُونَ فِي الْمَسَاجِدِ تِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ فَلَا تَقْرَبُوهَا كَذَٰلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ آيَاتِهِ لِلنَّاسِ

وہ واقعی میری طلب رکھتے ہیں، تو چاہیے کہ میری پکار کا جواب دیں، اور مجھ پر ایمان لائیں، تاکہ حصولِ مقصد
١٨٦ میں کامیاب ہوں۔

تمہارے لیے یہ بات جائز کردی گئی ہے کہ روزہ کے دنوں میں رات کے وقت اپنی بیویوں سے خلوت کرو۔ تم میں اور ان میں چولی دامن کا ساتھ ہے (یعنی ان کی زندگی تم سے وابستہ ہے۔ تمہاری اُن سے) اللہ کے علم سے یہ بات پوشیدہ نہیں رہی کہ تم اپنے اندر ایک بات کا خیال رکھ کر، پھر اُس کی بجا آوری میں خیانت کر رہے ہو (یعنی اپنے ضمیر کی خیانت کر رہے ہو۔ کیونکہ اگرچہ اس بات میں بُرائی نہ تھی مگر تم نے خیال کر لیا تھا کہ بُرائی ہے) پس اُس نے (اپنے فضل وکرم سے تمہیں اس غلطی کے لیے جوابدہ نہیں ٹھہرایا) تمہاری ندامت قبول کر لی، اور تمہاری خطا بخش دی۔ اور اب (کہ یہ معاملہ صاف کر دیا گیا ہے) تم (بغیر کسی اندیشہ کے) اپنی بیویوں سے خلوت کرو، اور جو کچھ تمہارے لیے (ازدواجی زندگی میں) اللہ نے ٹھہرا دیا ہے اس کے خواہشمند ہو۔ اور (اسی طرح رات کے وقت کھانے پینے کی بھی کوئی روک نہیں) شوق سے کھاؤ پیو

(۵) یہودیوں کے یہاں روزہ کی شرطیں نہایت سخت تھیں۔ از انجملہ یہ کہ اگر شام کو روزہ کھول کر سو جائیں، تو پھر بیچ میں اُٹھ کر کچھ کھا پی نہیں سکتے تھے۔ اسی طرح روزے کے مہینے میں زناشوئی کا علاقہ بھی مطلقاً ممنوع تھا۔ مسلمانوں کو جب روزے کا حکم ہوا تو اُنہوں نے خیال کیا، اُن کے لیے بھی یہ پابندیاں ضروری ہونگی۔ اور چونکہ پابندیاں سخت تھیں، اس لیے بعض لوگ نبھا نہ سکے، اور اپنے فعل کو کمزوری سمجھ کر چھپانے لگے "علم اللہ انکم کنتم تختانون انفسکم" میں اسی معاملہ کی طرف اشارہ ہے۔

روزے سے مقصود یہ نہیں ہے کہ جسمانی خواہشیں بالکل ترک کر دی جائیں بلکہ مقصود ضبط واعتدال ہے پس کھانے پینے اور زناشوئی کے معاملہ کی جو کچھ ممانعت ہے، صرف دن کے وقت ہے۔ رات کے وقت کوئی روک نہیں۔

(۶) زناشوئی کا تعلق کوئی بُرائی اور ناپاکی کی بات نہیں ہے جس کا عبادت کے مہینے میں کرنا جائز نہ ہو۔ وہ مرد اور عورت کا ایک فطری تعلق ہے، اور دونوں ایک دوسرے سے اپنے حوائج میں وابستہ ہیں۔ پس ایک فطری علاقہ عبادتِ الٰہی کے منافی کیوں ہو؟

(۷) مومن وہ ہے جس کے عمل میں کوئی کھوٹ اور راز نہ ہو۔ اگر ایک بات بُری نہیں ہے، مگر تم نے اُسے بُرا سمجھ لیا ہے، اور اس لیے چوری چھپے کرنے لگے ہو، تو گو تم نے اصلاً بُرائی نہیں کی، مگر تمہارے ضمیر کے لیے بُرائی ہو گئی ہے، اور تمہارے دل کی پاکی پر دھبہ لگ گیا۔

یہاں تک کہ صبح کی سفید دھاری (رات کی) کالی دھاری سے الگ نمایاں ہو جائے (یعنی صبح کی سب سے پہلی نمود شروع ہو جائے) پھر اس وقت سے لے کر رات (شروع ہونے) تک روزے کا وقت پورا کرنا چاہیے۔ البتہ اگر تم مسجد میں اعتکاف کر رہے ہو، تو اس حالت میں نہیں چاہیے کہ اپنی بیویوں سے خلوت کرو۔ (جہاں تک روزے کا

۱۸۷ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُونَ ۝ وَلَا تَأْكُلُوٓا أَمْوَالَكُم بَيْنَكُم بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوا بِهَآ إِلَى الْحُكَّامِ لِتَأْكُلُوا فَرِيقًا مِّنْ
ع ۲۳ ۱۸۸ أَمْوَالِ النَّاسِ بِالْإِثْمِ وَأَنتُمْ تَعْلَمُونَ ۝ يَسْـَٔلُونَكَ عَنِ الْأَهِلَّةِ ۖ قُلْ هِيَ مَوَاقِيتُ لِلنَّاسِ وَ
الْحَجِّ ۗ وَلَيْسَ الْبِرُّ بِأَن تَأْتُوا الْبُيُوتَ مِن ظُهُورِهَا وَلَٰكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقَىٰ ۗ وَأْتُوا الْبُيُوتَ مِنْ أَبْوَابِهَا ۚ
۱۸۹ وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ۝ وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَكُمْ

تعلق ہے) یہ اللہ کی ٹھہرائی ہوئی حدیں ہیں، پس ان سے دور دور رہنا۔ اللہ اسی طرح اپنے احکام واضح کر دیتا ہے، تاکہ
۱۸۷ لوگ (نافرمانی سے) بچیں۔

اور (دیکھو) ایسا نہ کرو کہ آپس میں ایک دوسرے کا مال ناجائز طریقے سے کھاؤ، اور نہ ایسا کرو کہ مال و دولت کو حاکموں کے دلوں تک پہنچنے کا (یعنے اُنہیں اپنی طرف مائل کرنے کا) ذریعہ بناؤ، تاکہ دوسروں کے مال کا کوئی حصہ ناحق
۱۸۸ حاصل کرلو۔ اور تم جانتے ہو کہ حقیقت حال کیا ہے۔ ؞

(۸) اس حقیقت کی طرف اشارہ کہ مشقت نفس کی عبادتیں کچھ سود مند نہیں ہوسکتیں اگر ایک شخص بندوں کے حقوق سے بے پروا ہے اور مالِ حرام سے اپنے آپ کو نہیں روک سکتا۔ نیکی صرف اسی میں نہیں ہے کہ چند دنوں کے لیے تم نے جائز غذا ترک کردی۔ نیکی کی راہ یہ ہے کہ ہمیشہ کے لیے ناجائز غذا ترک کردو۔

اے پیغمبر! لوگ تم سے (مہینوں کی) چاند رات کی بابت دریافت کرتے ہیں۔ ان لوگوں سے کہہ دو، یہ انسان کے لیے وقت کا حساب ہے، اور اس سے حج کے مہینے کا تعین ہوجاتا ہے (باقی جس قدر توہمات لوگوں میں پھیلے ہوئے ہیں، اور طرح طرح کی رسمیں اختیار کر رکھی ہیں، تو اُن کی کوئی اصلیت نہیں) اور یہ کوئی نیکی کی بات نہیں ہے کہ اپنے گھروں میں (دروازہ چھوڑ کر) پچھواڑے سے داخل ہو (جیساکہ عرب کی رسم تھی کہ حج کے مہینے کا چاند دیکھ لیتے اور احرام باندھ لینے کے بعد، اگر گھروں میں داخل ہونا چاہتے، تو دروازے سے داخل نہ ہوتے۔ پچھواڑے سے راہ نکال کر جاتے) نیکی تو اُس کے لیے ہے جس نے اپنے اندر تقویٰ پیدا کیا پس (ان وہم پرستیوں میں مبتلا نہ ہو) گھروں میں آؤ تو دروازے ہی کی راہ آؤ (پچھواڑے سے راہ نکالنے کی مصیبت میں کیوں پڑو؟) البتہ اللہ کی نافرمانی سے بچو،
۱۸۹ تاکہ (طلبِ سعادت میں) کامیاب ہو! ؞

حج کے احکام، اور اس سلسلہ میں دین حق کی بعض اصولی ہدایتیں، اور اہل عرب اور دیگر اقوام کی گمراہیوں کا ازالہ:

(۱) چاند کے طلوع و غروب سے مہینوں کا حساب لگایا جاتا ہے اور حج کے موسم کا تعین اسی حساب سے کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ جو وہم پرستانہ خیالات لوگوں میں پھیلے ہوئے ہیں خواہ اُن کا تعلق کواکب پرستی سے ہو یا نجوم کے عقائد سے، ان کی کوئی اصلیت نہیں۔

(۲) مقدس زیارت گاہوں اور تیرتھوں پر جانے کے لیے لوگوں نے طرح طرح کی پابندیاں لگائی ہیں اور اجر و ثواب کے لیے اپنے آپ کو تکلیفوں مشقتوں میں ڈالتے ہیں لیکن یہ سب گمراہی کی باتیں ہیں۔ نیکی کی اصلی راہ یہ ہے کہ اپنے اندر تقویٰ پیدا کرو۔

اور (دیکھو) جو لوگ تم سے لڑائی لڑ رہے ہیں، چاہیے

(۳) اہل مکہ کے ظلم و تعدی سے حج کا دروازہ مسلمانوں پر بند

١٩٠ وَلَا تَعْتَدُوْا اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ۝ وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ وَاَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ حَيْثُ
اَخْرَجُوْكُمْ وَالْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ ۚ وَلَا تُقٰتِلُوْهُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتّٰى يُقٰتِلُوْكُمْ فِيْهِ ۚ
١٩١ ١٩٢ فَاِنْ قٰتَلُوْكُمْ فَاقْتُلُوْهُمْ ۗ كَذٰلِكَ جَزَآءُ الْكٰفِرِيْنَ ۝ فَاِنِ انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ وَ
١٩٣ قٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ ۭ فَاِنِ انْتَهَوْا فَلَا عُدْوَانَ اِلَّا عَلَى الظّٰلِمِيْنَ ۝
اَلشَّهْرُ الْحَرَامُ بِالشَّهْرِ الْحَرَامِ وَالْحُرُمٰتُ قِصَاصٌ ۭ

ہو گیا تھا، پس حکم دیا گیا کہ جنگ کے بغیر چارہ نہیں۔ ضروری ہے کہ اس مقام کو ظالموں کے قبضہ و تصرف سے نجات دلائی جائے۔

اس بارے میں اصل یہ ہے کہ امن کی حالت ہو یا جنگ کی لیکن
١٩٠ مسلمانوں کے کسی کام میں بھی عدل و راستی کے خلاف کوئی بات نہیں ہونی چاہیے ؛

(۴) جنگ بُرائی ہے، لیکن فتنے کا قائم رہنا اس سے بھی زیادہ سخت بُرائی ہے۔ پس ناگزیر ہوا کہ فتنے کے ازالے کے لیے جنگ کی حالت گوارا کر لی جائے۔

قریش مکہ کا فتنہ کیا تھا؟ یہ تھا کہ وہ جبر و قہر سے لوگوں کو مجبور کرتے تھے کہ جس بات کو حق سمجھتے ہیں، اُسے حق نہ سمجھیں۔ یعنے دین و اعتقاد کی آزادی مفقود ہو گئی تھی۔ قرآن کہتا ہے، یہ بُرائی، جنگ کی بُرائی سے بھی زیادہ سخت ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ اس کے انسداد کے لیے جنگ کی بُرائی گوارا کر لی جائے ؛

کہ اللہ کی راہ میں تم بھی اُن سے لڑو۔ (پیٹھ نہ دکھلاؤ) البتہ کسی طرح کی زیادتی نہیں کرنی چاہیے۔ اللہ اُن لوگوں کو پسند نہیں کرتا جو زیادتی کرنے والے ہیں۔

(اہل مکہ نے تمہارے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا ہے، تو تمہاری طرف سے بھی اب اعلانِ جنگ ہے) جہاں کہیں پاؤ، اُنہیں قتل کرو، اور جس جگہ سے اُنھوں نے تمہیں نکالا ہے، تم بھی اُنہیں لڑ کر نکال باہر کرو۔ اور فتنہ کا قائم رہنا قتل و خونریزی سے بھی بڑھ کر ہے (باقی رہا حرم کی حدود کا معاملہ کہ ان کے اندر لڑائی کی جائے یا نہ کی جائے؟ تو اس بارے میں حکم یہ ہے کہ) جب تک وہ
خود مسجدِ حرام کے حدود میں تم سے لڑائی نہ کریں، تم بھی اُس جگہ اُن سے لڑائی نہ کرو۔ پھر اگر ایسا ہو کہ اُنھوں نے
١٩١ لڑائی کی، تو تمہارے لیے بھی یہی ہوگا کہ لڑو۔ منکرینِ حق (کی ظالمانہ پیش قدمیوں) کا یہی بدلہ ہے۔ لیکن اگر ایسا ہو
١٩٢ کہ وہ لڑائی سے باز آ گئے، تو (پھر اللہ کا دروازہ بخشش بھی بند نہیں ہے) بلاشبہ وہ رحمت سے بخش دینے والا ہے!

جنگ کی اجازت اس لیے دی گئی ہے کہ دین و اعتقاد کی آزادی حاصل ہو جائے۔ یعنے دین کے معاملہ میں جس کا تعلق صرف اللہ سے ہے، انسان کے ظلم و تشدد کی مداخلت باقی نہ رہے۔

اور دیکھو، ان لوگوں سے لڑائی جاری رکھو یہاں تک کہ فتنہ (یعنے ظلم و فساد) باقی نہ رہے، اور دین صرف اللہ ہی کے لیے ہو جائے، پھر اگر ایسا ہو کہ یہ لوگ لڑائی
سے باز آ جائیں، تو تمہیں بھی ہاتھ روک لینا چاہیے۔ کیونکہ لڑائی نہیں لڑنی ہے، مگر اُنہی لوگوں کے مقابلہ میں،
١٩٣ جو ظلم کرنے والے ہیں۔

اگر حُرمت کے مہینوں کی رعایت کی جائے، تو تمہاری طرف سے بھی رعایت ہونی چاہیے۔ اگر نہ کی جائے، تو تمہاری طرف سے بھی نہیں ہے۔ (مہینوں کی) حُرمت کے معاملہ میں (جب کہ لڑائی ہو) ادلہ کا بدلہ ہے (یعنے جیسی

فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ
الْمُتَّقِيْنَ ۝ وَاَنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ ۚ وَاَحْسِنُوْا ۚ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ ۱۹۴
الْمُحْسِنِيْنَ ۝ وَاَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلّٰهِ ۭ فَاِنْ اُحْصِرْتُمْ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ ۚ وَلَا تَحْلِقُوْا ۱۹۵
رُءُوْسَكُمْ حَتّٰى يَبْلُغَ الْهَدْيُ مَحِلَّهٗ ۭ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ بِهٖٓ اَذًى مِّنْ رَّاْسِهٖ فَفِدْيَةٌ
مِّنْ صِيَامٍ اَوْ صَدَقَةٍ اَوْ نُسُكٍ ۚ فَاِذَآ اَمِنْتُمْ ۣ فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ اِلَى الْحَجِّ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ

روش ایک فریقِ جنگ کی ہوگی، ویسی ہی دوسرے فریق کو بھی اختیار کرنی پڑے گی۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ ایک فریق تو مہینوں کی حرمت سے بے پروا ہو کر حملہ کرے، اور دوسرا فریق حرمت کے خیال سے ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا رہے، پس جو کوئی تم پر زیادتی کرے، تو چاہیے کہ جس طرح کا معاملہ اُس نے تمہارے ساتھ کیا ہے، ویسا ہی معاملہ تم بھی اُس کے ساتھ کرو، البتہ (ہر حال میں) اللہ سے ڈرتے رہو، اور یہ بات نہ بھولو کہ اللہ اُنہی کا ساتھی ہے جو (اپنے تمام کاموں میں) پرہیزگار ہیں!

(۵) جو لوگ جہاد کی راہ میں مال خرچ نہیں کرتے، وہ اپنے ہاتھوں اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈال دیتے ہیں۔ کیونکہ جہاد سے اعراض کا نتیجہ قومی زندگی کی ہلاکت ہے

اور اللہ کی راہ میں مال خرچ کرو۔ ایسا نہ کرو کہ (جہاد کی اعانت سے غافل ہو کر) اپنے ہاتھوں اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈال دو، نیکی کرو! یقیناً اللہ کی محبت اُنہی لوگوں کے لیے ہے جو نیکی کرنے والے ہیں!

(۶) اگر لڑائی کی وجہ سے یا کسی دوسری وجہ سے راہ میں رُک جانا پڑے تو اس صورت میں کیا کرنا چاہیے؟ نیز حج اور عمرہ کے تمتع کی صورت (یعنے دونوں کو ملا کر کرنے کی صورت)

اور دیکھو، حج اور عمرہ کی جب نیت کر لی جائے تو اُسے اللہ کے لیے کرنا چاہیے۔

اور اگر ایسی صورت پیش آجائے کہ تم (اس نیت سے نکلے مگر) راہ میں گھِر گئے (لڑائی کی وجہ سے یا کسی دوسری وجہ سے) تو پھر ایک جانور کی قربانی کرنی چاہیے، جیسا کچھ بھی میسّر آئے۔

اور اس وقت تک سر کے بال نہ منڈاؤ (جو اعمال حج سے فارغ ہو کر احرام اُتارتے وقت کیا جاتا ہے) جب تک کہ قربانی اپنے ٹھکانے نہ پہنچ جائے۔

ہاں اگر کوئی شخص بیمار ہو۔ یا اُسے سر کی کسی تکلیف کی وجہ سے مجبوری ہو، تو چاہیے کہ (بال اُتارنے کا) فدیہ دیے، اور وہ یہ ہے کہ روزہ رکھے، یا صدقہ دے۔ یا جانور کی قربانی کرے۔

اور پھر جب ایسا ہو کہ تم امن کی حالت میں ہو، اور کوئی شخص چاہے کہ (عمرہ، حج سے ملا کر) تمتع کرے (یعنے ایک ہی سفر میں دونوں عملوں کے ثواب سے فائدہ اُٹھائے) تو اُس کے لیے بھی جانور کی قربانی ہے جیسی کچھ میسّر آجائے۔

الْهَدْيِ ۚ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ فِي الْحَجِّ وَسَبْعَةٍ اِذَا رَجَعْتُمْ ۭ تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ ۭ ذٰلِكَ

ع ۲۴ ۸ 196 لِمَنْ لَّمْ يَكُنْ اَهْلُهٗ حَاضِرِي الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۭ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝

اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ ۚ فَمَنْ فَرَضَ فِيْهِنَّ الْحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ ۭ

197 وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ يَّعْلَمْهُ اللّٰهُ ۭ وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى ۡ وَاتَّقُوْنِ يٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ ۝

لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ ۭ فَاِذَآ اَفَضْتُمْ مِّنْ عَرَفٰتٍ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ

عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ ۠ وَاذْكُرُوْهُ كَمَا هَدٰىكُمْ ۚ وَاِنْ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلِهٖ

اور جس کسی کو قربانی میسر نہ آئے، تو اُسے چاہیے، تین روزے حج کے دنوں میں رکھے، سات روزے واپسی پر، یہ دس کی پوری گنتی ہوگئی۔

البتہ یاد رہے کہ یہ حکم (یعنے عمرہ کے تمتع کا حکم) اُس کے لیے ہے جس کا گھر بار مکہ میں نہ ہو (باہر سے حج کے لیے آیا ہو)

196 اور دیکھو، ہر حال میں اللہ کی نافرمانی سے بچو، اور یقین کرو، وہ (نافرمانوں کو) سزا دینے میں بہت ہی سخت ہے!

(۷) حج کے دنوں میں (اور وہ اُس وقت سے شروع ہو جاتے ہیں جب تم نے احرام باندھ لیا) نہ تو عورت کے ساتھ خلوت کرنی چاہیے، نہ گناہ کی کوئی بات، اور نہ کسی طرح کی لڑائی جھگڑا۔ اعمالِ حق کے لیے سب سے بڑی طیاری یہ ہے کہ تم میں تقویٰ پیدا ہو!

حج (کی طیاری) کے مہینے عام طور پر معلوم ہیں۔ پس جس کسی نے اِن مہینوں میں حج کرنا اپنے اوپر لازم کر لیا تو (وہ حج کی حالت میں ہوگیا، اور) حج کی حالت میں نہ تو عورتوں کی طرف رغبت کرنا ہے، نہ گناہ کی کوئی بات کرنی ہے، اور نہ لڑائی جھگڑا۔ اور (یاد رکھو) تم نیک عمل کی باتوں میں سے جو کچھ بھی کرتے ہو، اللہ کے علم سے پوشیدہ نہیں رہتا پس (حج کرو تو اُس کے) سر و سامان کی طیاری بھی کرو۔ اور سب سے بہتر سر و سامان (دل کا سر و سامان ہے، اور وہ تقویٰ) ہے!

197 اور اے اربابِ دانش (ہر حال میں) اللہ سے ڈرتے رہو (کہ خوفِ الٰہی سے پرہیزگاری پیدا ہوتی ہے۔

(۸) دینِ حق کی اِس اصلِ عظیم کا اعلان کہ خداپرستی اور دینداری کی راہ دنیوی معیشت اور دنیوی فلاح و ترقی کے خلاف نہیں ہے، بلکہ وہ ایک ایسی کامل زندگی پیدا کرنی چاہتا ہے جس میں دنیا اور آخرت دونوں کی سعادتیں موجود ہوں۔ حج ایک عبادت ہے لیکن اُس کا عبادت ہونا اس سے مانع نہیں کہ کاروبارِ دنیوی کا بھی فائدہ اُٹھاؤ۔ مال و دولت اللہ کا فضل ہے۔ پس چاہیے کہ اللہ کے فضل کی تلاش میں رہو۔

(۹) دین اور دنیا کے معاملہ میں دنیا کی عالمگیر گمراہی یہ ہے کہ یا تو افراط میں پڑ گئے ہیں، یا تفریط میں، اور راہ اعتدال گم ہوگئی ہے یعنے یا تو دنیا کا انہماک اس درجہ بڑھ جاتا ہے کہ آخرت سے یک قلم بے پروا ہو جاتے

(اور دیکھو) اس میں تمہارے لیے کوئی گناہ کی بات نہیں، اگر (اعمالِ حج کے ساتھ) تم اپنے پروردگار کے فضل کی بھی تلاش میں رہو (یعنے کاروبارِ تجارت کا بھی مشغلہ رکھو) پس جب عرفات (نامی مقام) سے انبوہ در انبوہ لوٹو، تو مشعر الحرام (یعنے مزدلفہ) میں (ٹھہر کر) اللہ کا ذکر کرو۔ اور اُسی طرح ذکر کرو جس طرح ذکر کرنے کا طریقہ تمہیں تبلا دیا گیا ہے اگرچہ اس سے پہلے تم بھی اُنہی لوگوں میں سے تھے، جو

۱۹۸ ۱۹۹ مِنَ الضَّآلِّيْنَ ۝ ثُمَّ اَفِيْضُوْا مِنْ حَيْثُ اَفَاضَ النَّاسُ وَاسْتَغْفِرُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝
فَاِذَا قَضَيْتُمْ مَّنَاسِكَكُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ اٰبَآءَكُمْ اَوْ اَشَدَّ ذِكْرًا ؕ فَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ
۲۰۰ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِى الدُّنْيَا وَمَا لَهٗ فِى الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ۝ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِى الدُّنْيَا
۲۰۱ حَسَنَةً وَّفِى الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ ۝ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ نَصِيْبٌ مِّمَّا كَسَبُوْا ؕ وَاللّٰهُ سَرِيْعُ
۲۰۲ الْحِسَابِ ۝ وَاذْكُرُوا اللّٰهَ فِىْٓ اَيَّامٍ مَّعْدُوْدٰتٍ ؕ فَمَنْ تَعَجَّلَ فِىْ يَوْمَيْنِ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۚ وَمَنْ تَاَخَّرَ
فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۙ لِمَنِ اتَّقٰى ؕ

۱۹۸ ہیں یا آخرت کے استغراق میں اتنے دور نکل جاتے ہیں کہ ترکِ دنیا اور رہبانیت کا دم بھرنے لگتے ہیں لیکن دینِ حق کی راہ ہر گوشۂ عمل کی طرح یہاں بھی اعتدال کی راہ ہے، اور صحیح زندگی اُس کی زندگی ہے جو کہتا ہے "خدایا، میں دنیا اور آخرت دونوں کی سعادتیں چاہتا ہوں!"

راہِ حق سے بھٹک گئے ہیں۔

پھر (یہ بات بھی ضروری ہے کہ) جس جگہ (تک جاکر) لوگ انبوہ در انبوہ لوٹتے ہیں، تم (اہلِ مکہ) بھی وہیں سے
۱۹۹ لوٹو، اور اللہ سے اپنے گناہوں کی بخشش طلب کرو[1]۔ بلاشبہ اللہ (خطائیں) بخشنے والا اور (ہر حال میں) رحمت رکھنے والا ہے!

پھر جب تم حج کے تمام ارکان پورے کر چکو، تو چاہیے کہ جس طرح پہلے اپنے آباؤ اجداد کی بڑائیوں کا ذکر کیا کرتے تھے، اب اُسی طرح اللہ کا ذکر کیا کرو۔ بلکہ اُس سے بھی زیادہ (کہ تمام اعمالِ حج سے اصل مقصود یہی ہے)

اور پھر (دیکھو) کچھ لوگ تو ایسے ہیں، (جو صرف دنیا ہی کے پجاری ہوتے ہیں، اور) جن کی صدائے حال یہ ہوتی ہے
۲۰۰ کہ خدایا! ہمیں جو کچھ دینا ہے، دنیا ہی میں دیدے" پس آخرت کی زندگی میں اُن کے لیے کوئی حصہ نہیں ہوتا۔ اور کچھ لوگ ایسے ہیں جو (دنیا و آخرت، دونوں کی فلاح چاہتے ہیں۔ وہ) کہتے ہیں خدایا! ہمیں دنیا میں بھی بھلائی دے اور آخرت میں
۲۰۱ بھی بھلائی دے، اور ہمیں عذابِ دوزخ سے بچالے!" تو یقین کرو، ایسے ہی لوگ ہیں جنہیں اُن کے عمل کے مطابق (دنیا و آخرت کی) فلاح میں حصہ ملنا ہے، اور اللہ (کا قانون) اعمال کی جانچ میں سست رفتار نہیں (وہ ہر انسان کو
۲۰۲ اس کے عمل کے مطابق فوراً نتیجہ دیدینے والا ہے!)

اور (دیکھو) حج کے گنے ہوئے دنوں میں (جو معلوم ہیں اور دسویں ذوالحج سے لے کر تیرہویں تک ہیں) اللہ کی یاد میں مشغول رہو۔ پھر جو کوئی (واپسی میں) جلدی کرے، اور دو ہی دن میں روانہ ہوجائے تو اُس میں کوئی گناہ کی بات نہیں۔ اور جو کوئی تاخیر کرے، تو وہ تاخیر بھی کر سکتا ہے۔ لیکن یہ (جلدی اور تاخیر کی رخصت) اُسی کے لیے ہے جس میں تقویٰ ہو (کیونکہ تمام اعمال سے اصل مقصود تقویٰ ہے۔ اگر ایک شخص کے ارادے اور عمل میں تقویٰ نہیں، تو اُس کا کوئی عمل بھی صحیح

[1] حج کے اعمال میں سے ایک عمل عرفات جاکر ٹھہرنا اور وہاں سے لوٹنا ہے، لیکن باشندگانِ مکہ نے یہ طریقہ اختیار کرلیا تھا کہ حدودِ حرم تک جاکر لوٹ آتے، اور کہتے، ہم تو اسی مقام کے باشندے ہیں۔ ہمارے لیے حدودِ حرم سے باہر جانا ضروری نہیں۔ یہ کچھ تو اس لیے تھا کہ باشندۂ مکہ ہونے کا غرور باطل تھا۔ اور زیادہ تر اس لیے کہ دنیوی کاروبار کے انہماک سے اعمالِ حج کی مشغولیت اُن پر شاق گزرتی تھی۔ چاہتے تھے کم سے کم حاجی حج میں مشغول رہیں۔ ہم موسم سے تجارت کا فائدہ اُٹھائیں۔